

گر کے ہر فرد کے لئے

# پاکینہ

کراچی

دسمبر 2017

نگران اعلیٰ  
معراج رسول



مایہ ناز راکٹر سیماف کی بزم میں خوشگوار

# پاکینہ

ران اعلیٰ : معراج رسول

ریرہ اعلیٰ : عذرار رسول

مدیرہ : نزہت اصغر

معاون : آمنہ حماد



دکن آل پاکستان نرسیں و مسالیں

منیجر اشتہارات

محمد شہزاد خان

0333-2256789

سرکولیشن منیجر

سید منیر حسین

0333-3285269

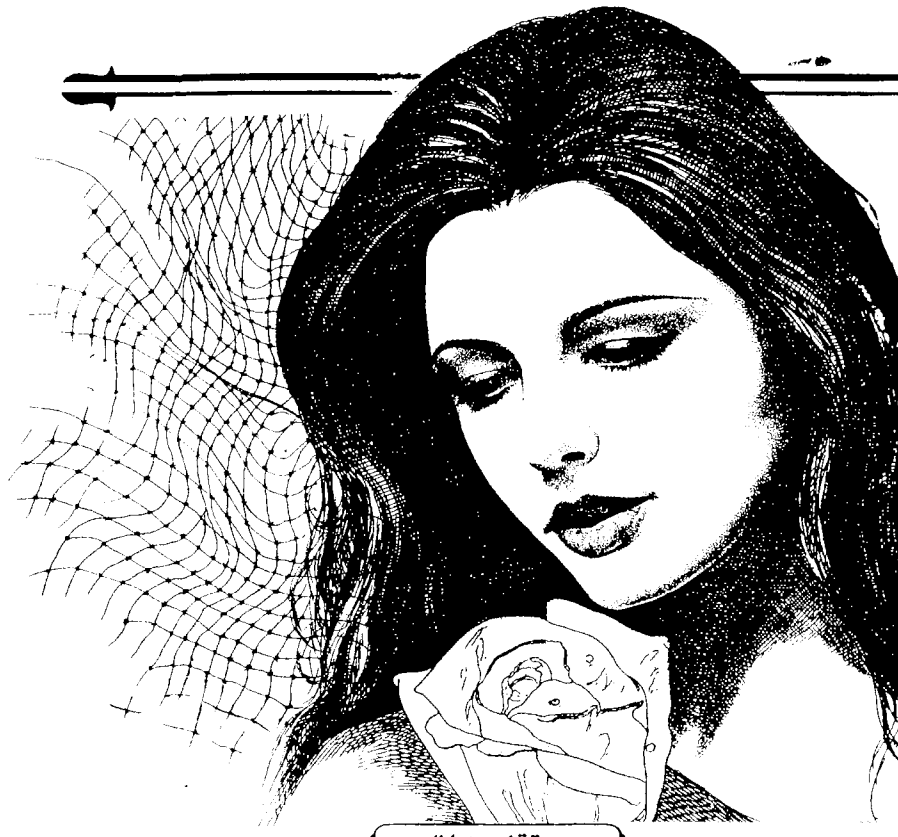


دکن فی پرچا (پاکستان) 60 روپے

دکن فی پرچا (سعودی عرب) 12 ریال یا اسلامی شہرہ عرب الامارات

الاند (اندرون ملک) 800 روپے

جلد 45 شمارہ 09 ستمبر 2017ء



### مستقل عنوانات

|                  |               |                     |                     |
|------------------|---------------|---------------------|---------------------|
| پاکیزہ بہنیں 295 | خوش آئینہ     | ادارہ 16            | دین کی باتیں        |
| پاکیزہ بہنیں 297 | بڑا پاکیزہ    | ادارہ 275           | گوشہ نظروں پر       |
| مہ حبیب 299      | حسن نگار کریم | مدیرہ 278           | بہنوں کی محفل       |
| ادارہ 300        | روحانی شوق    | عظمیٰ آفاق سعید 288 | پاکیزہ ڈائری        |
| 302              | ہومیو پیتھک   | صغریٰ زیدی 292      | میں اکثر گنہگار ہوں |
|                  |               | ادارہ 294           | بہنوں کی باتیں      |

### افسانے

|                       |                    |
|-----------------------|--------------------|
| شہر گل میں تینا بھاری | غزالہ جلیل راؤ 49  |
| جیون کپانی            | شاہدہ ذاکر 83      |
| چاند کا داغ           | ہما بیگ 113        |
| ایسا بھی ہوتا ہے      | ہالہ احمد 145      |
| غلطی                  | مریم شہزاد 147     |
| راز افشا              | بشری سیال 149      |
| محبت کا رنگ میں تارا  | شمائلہ دلعباد 183  |
| میرے خواب چھین لو     | عقیلہ حق 196       |
| انفقا                 | شہلا جمال 205      |
| محبت ہنس اور قسیم     | دُرّ صدف ایمان 215 |
| عروسی چوڑا            | طیبہ عنصر مغل 219  |

### خصوصی مضامین

|                     |                       |
|---------------------|-----------------------|
| اللہ اور ازل کا نور | ڈاکٹر ذکیہ بلگرامی 18 |
| شہزادہ کی           | اختر شجاعت 257        |
| وہ آجے نرم ہونے     | نرہت اصغر 261         |
| پڑھو                | شائستہ زرین 271       |

### اداریہ

مجھے کچھ کہنا  
مدیرہ 15

### سلسلے وار ناول

پہلی بیکری کر دے  
رفعت سراج 22

امرت  
شیریں حیدر 88

### منی ناول

تیری چاہ ہے  
سدرۃ المنتہیٰ 226

### ناولٹ

محبت لفظ ہے لیکن  
حیا بخاری 60

جو کہہ رہا وہ دل تھا  
بنت سحر 118

بدلتے رشتے  
غزالہ عزیز 164

سرگزشت کراچی

# مرگِ ناگہاں نمبر

اس خاص شمارے میں وہ سب کچھ ہے جو آپ پڑھنا چاہتے ہیں، آپ کو پڑھنا چاہیے۔

ان مشہور و مقبول شخصیات کی روداد جو بے وقت موت کا شکار ہوئے جنہیں عہدِ شباب میں موت اپنے ساتھ لے گئی

جنوری 2018ء کے اس شمارے کو آپ مجلد کر کر رکھنے پر مجبور ہوں گے

سال کا پہلا شمارہ سب سے اہم شمارہ

آج ہی اپنے عزیز کی ایک سال پر اپنا شمارہ بخش کرالیں

مجھے کچھ کہنا ہے.....

قارئین کرام: السلام علیکم.....

تمام ملت اسلامیہ کو جشنِ عید میلاد النبی مبارک ہو۔

یہ وہ متبرک ساعتیں ہیں کہ جب خورشید نبوت کی تابناکیوں سے ظلمت کے اندھیرے چھٹے، کفر و شرک کے آتشِ کدے بجھے اور جہالت و گمراہی کی گھٹا ٹوپ سیاسی ایک روشن و منورج میں ڈھلی اور رحمتِ العالمین کا شر بار ساری دنیا سے عالم پر فوٹکن ہوا۔

آپ کی ذاتِ اقدس و جہِ تخلیق کائنات سے قرآن پاک میں جہاں اطاعتِ الہی کا بیان ہے وہیں اطاعتِ ختم المرسل حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کا بھی ذکر بابرکت ہے۔ تمام مسلمانانِ عالم پر پیرویِ نبی اکرم فرض ہے۔

امت محمدی کہلانے کے معراجِ حق دار ہم اسی وقت ہو سکتے ہیں جب حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت طیبہ پر مکمل عمل کریں جیسا کہ آلِ رسول اور اصحابِ پاکِ رسول کی زندگیوں سے ثابت ہے۔ زبان سے تو آپ کی نبوت کی گواہی ہم ہر وقت دیتے ہیں مگر عمل سے ثابت نہیں کرتے۔

آج معاشرے میں بے راہ روی، فحشی انتشار، اخلاقی گراؤ اور نفسا نفسی ہی بنا پر مبینی جارہی ہے کہ ہم دین میں اپنی مرضی کے معنی و مطالب اور تاویلیں نکال رہے ہیں۔ جو رسولِ خلقِ عظیم کے اعلیٰ ترین منصب پر فائز ہیں انہی کی امت کے دعویدار ہونے کے باوجود ہم انتہا درجے کی بداخلاقی، بدکلامی، بدسلوکی، بے اعتنائی و خود غرضی، کبر و نخوت، شرفِ فساد اور نسلی و طبقاتی امتیاز کے مظاہرے سرعام کرتے ہیں اور پھر بھی رحمتِ العالمین سے شفاعت کے طلب گار ہیں۔

عزیز قارئین سال 2017ء کا سورج حسب معمول غروب ہونے کو ہے تو کیوں نہ اس ڈھلتے سورج کے ساتھ ساتھ ہم اپنے روحانی عیبوں، اخلاقی کمزوریوں اور شخصی برائیوں کو بھی رخصت کر دیں اور اس مبارک ماہ کی فضیلتوں اور برکتوں سے اپنی زندگیوں کو حقیقی طور پر سیراب کر لیں۔ رب کائنات کے حضور دعا گو ہیں کہ اس کا کرم، رحم، عطا اور بخشش ہمارے ساتھ رہے تاکہ دنیا و آخرت میں سرخروئی نصیب ہو۔ الہی آمین

تمام اہل وطن کو بانی پاکستان حضرت قائدِ عظم محمد علی جناح کا یومِ ولادت مبارک ہو۔ اپنے ملک و ملت سے وفا کا تقاضا ہے کہ ہم برصغیر کے مسلمانوں کو آزادی دلانے والے اس عظیم رہنما کی خدمات اور اقوال کے مطابق تعمیرِ وطن کرتے رہیں۔

مدیرہ

نزهت اصغر

اور بے شک ہم نے ان کو ایک (ایسی) کتاب دی ہے جس کی تفصیل ہم نے علم سے کر دی ہے، ان لوگوں کے لیے جو ایمان لاتے ہیں ہدایت اور رحمت ہے۔ (۵۲) کیا وہ اس کی حقیقت کا انتظار کرتے ہیں؟ جس دن اس کی حقیقت ظاہر ہوگی۔ تو وہ لوگ جنہوں نے اسے پہلے ہی بھلا رکھا تھا کہیں گے، بے شک ہمارے پروردگار کے رسول حق لے کر آئے تھے۔ پھر کیا ہمارے لیے بھی کوئی شفاعت کرنے والے ہیں جو ہماری شفاعت کریں یا ہمیں واپس بھیج دیا جائے کہ جیسے عمل (بد) ہم کیا کرتے تھے۔ ان کے خلاف (نیک) عمل کریں۔ یقیناً انہوں نے اپنے آپ کو نقصان پہنچایا اور جو کچھ وہ اقرار کیا کرتے تھے سب ان سے کم ہو گیا۔ (۵۳) یقیناً تمہارا پروردگار اللہ تعالیٰ ہے جس نے آسمانوں اور زمین کو چھ دن میں پیدا کیا۔ پھر عرش پر مستولی ہوا۔ وہ رات کو دن سے ڈھانپتا ہے جو جلدی (جلدی) اس کی تلاش میں (پیچھے چلا) آتا ہے۔ اور سورج اور چاند اور ستارے اس کے حکم کے تابع ہیں۔ آگاہ رہو کہ پیدا کرنا اور حکم دینا اسی کے لیے ہے۔ اللہ تعالیٰ کل جہانوں کا پرورش کرنے والا صاحب برکت ہے۔ (۵۴) تم اپنے پروردگار سے عاجزی سے اور چپکے، چپکے دعا مانگا کرو۔ یقیناً وہ زیادتی کرنے والوں کو دوست نہیں رکھتا۔ (۵۵) اور زمین میں اس کی اصلاح کے بعد فساد مت کرو۔ اور اس (اللہ تعالیٰ) سے خوف کرتے ہوئے اور امید لگائے ہوئے دعا مانگا کرو، یقیناً اللہ تعالیٰ کی رحمت نیکو کاروں کے قریب ہے۔ (۵۶) اور وہ وہی ہے جو اپنی رحمت (بارش) سے پہلے خوشخبری دینے کے لیے ہوا میں بھیج دیتا ہے۔ یہاں تک کہ جب وہ بھاری بادل کو اٹھالائیں تو ہم نے اسے سُردہ بستی کی طرف ہانک دیا۔ پھر ہم نے اس سے (بارش) کا پانی اتارا۔ پھر ہم نے اس سے ہر طرح کے پھل (زمین سے) باہر نکالے۔ اسی طرح ہم مُردوں کو (بھی زندہ کر کے قبروں سے) نکالیں گے، تاکہ تم نصیحت حاصل کرو۔ (۵۷) اور پاکیزہ زمین کی نباتات تو حکم خدا سے (خوب) اگتی ہے۔ اور جو (زمین) ناکارہ ہوتی ہے اس میں سے کچھ نہیں اگتا مگر تھوڑا۔ اسی طرح ہم لوگوں کے لیے جو شکر کرتے ہیں آیتوں کو پھر پھر اکر بیان کرتے ہیں (۵۸) یقیناً ہم نے نوح کو اس کی قوم کی طرف بھیجا۔ پس اس نے کہا اے میری قوم اللہ تعالیٰ کی عبادت کرو اس کے سوا تمہارے لیے کوئی معبود نہیں۔ یقیناً میں تم پر بڑے دن کے عذاب سے ڈرتا ہوں۔ (۵۹) اس کی قوم کے سرداروں نے کہا کہ ہم تجھے یقیناً کھلی گمراہی میں دیکھتے ہیں۔ (۶۰)

(سورہ اعراف، پارہ ۸، آیات ۵۲ تا ۶۰)

## آنحضرت ﷺ کے اسمائے گرامی

اَللّٰهُمَّ صَلِّ عَلٰی سَيِّدِ النَّبِيِّیْنَ

افضل الانبیاء حتی مرتبت، سید المرسلین، حبیب پاک حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے صفاتی اسمائے مبارکہ میں سے ایک نام..... سیدنا نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بھی ہے جس کے معنی و مفہوم۔ نبی، غیب کی خبر دینے والے کے ہیں یعنی احکام الہی پہنچانے والا۔

نبی اور رسول میں فوق...

نبی اور رسول میں یہ فرق ہے کہ نبی عام ہے اور رسول خاص بعض مفسرین نے فرمایا کہ رسول شرع کے واضح ہوتے ہیں اور نبی اس کے محافظ و نگہبان..... ہر رسول نبی ہوتا ہے مگر ہر نبی، رسول نہیں ہوتا۔ رسول صاحب کتاب و شریعت ہوتا ہے جبکہ نبی اس کا شارح 2: القرآن (غیب کی خبر دینے والے)

ترجمہ: اور یہ غیب کی خبریں ہیں جو ہم تمہاری طرف وحی کرتے ہیں (آیت ۴۴، آل عمران)

3: الحدیث۔ (نبی)۔ حضرت ابو ہریرہؓ سے مروی ہے کہ ایک دفعہ صحابہ کرامؓ نے عرض کیا یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم آپ کب نبی بنائے گئے؟ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا، اس وقت جب آدم (آب و گل) روح اور جسد کے درمیان تھے تب مجھ سے میثاق نبوت لیا گیا۔ یعنی روح اور جسم کا باہمی تعلق ابھی نہیں ہوا تھا۔

4: الوانے: نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے منہ سے جو بات نکلتی ہے ہمارا ضمیر گواہی دیتا ہے کہ وہ غیر معمولی بات ہے اس جیسے الفاظ کسی عام انسان کی زبان سے نکل ہی نہیں سکتے۔ اس کی زندگی کا مقصد و دعا، اس کے ہر لفظ اور ہر حرکت سے منعکس ہوتا ہے۔ سنی سنائی باتوں سے وہ قطعی بیگانہ ہوتا ہے۔ اس کا دل سچائیوں کا امین اور حقائق کی روشنیوں سے منور ہوتا ہے۔ اس کی باتیں الہامی ہوتی ہیں۔ یہ الفاظ دیگر وہ کائنات کے حقیقی اسرار سے آگاہی رکھتا ہے اس کی ہر بات ترجمان حقیقت ہوتی ہے اس سے پہلے بھی انبیاء پر وحی آتی رہی ہے لیکن اب کی بار وحی آخری اور تازہ ترین ہے۔ کیا یہ نبی اس خدا کا بندہ نہیں، اس کی باتوں کو ہم کیسے سنی ان ہی کر سکتے ہیں۔

(تھامس کارلائل ہیر و اینڈ ہیر وزر شپ)  
4: الغضائل بہر نماز کے بعد 62 بار اس ہم پاک سیدنا نبیؐ پڑھنے والے کو عرفان حق حاصل ہوگا، نیز کسی مشکل میں یا وضو حالت میں بکثرت پڑھنے والے کی ہر مشکل آسان ہو جائے گی۔

قصرہ حیات کی کتاب انوار اسماء النبی ﷺ سے اقتباس

## لبیک اللہ لبیک

بیت اللہ کی تعمیر نو کے بعد اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو حکم دیا کہ اب آپ کھڑے ہو کر آوازیں کہہ کر لوگو! اللہ کا گھر بن کر تیار ہو گیا ہے۔ اس کی زیارت اور حج کے لیے آؤ۔ ابواہیم علیہ السلام نے عرض کیا کہ اے مولائے کریم! میری آواز پہنچے گی کہاں تک؟ حق تعالیٰ نے فرمایا۔ میرے غلیل! آواز دینا آپ کا کام ہے اور اسے اپنی مخلوق کے کانوں تک پہنچانا میرا کام ہے۔ آپ آواز دیجیے۔

چنانچہ روایت ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے ایک چٹان پر کھڑے ہو کر جب یہ آواز دی کہ اے لوگو! اللہ کا گھر تیار ہو گیا ہے، اس کی زیارت اور حج کے لیے پہنچو تو اللہ تعالیٰ نے ان کی یہ آواز روئے زمین کے تمام لوگوں کے کانوں تک پہنچائی اور جو بچے شکم مادر میں تھے، ان کے کانوں تک اور جو روحیں عالم ارواح میں تھیں ان کے کانوں تک پہنچائی۔ اس آواز کو سن کر جس نے ایک بار لبیک کہا اس کو ایک حج نصیب ہوگا۔ جس نے دوبار لبیک کہا اسے دو حج نصیب ہوں گے۔ اس واقعہ کو سورہ حج (22) میں مختصر طور پر بیان کیا گیا ہے۔ (آیات نمبر 26 تا 29)

مجھے نہیں معلوم تھا کہ میں کبھی حج کر سکوں گی یا نہیں..... کوکہ ہر مسلمان کی طرح میری بھی یہ آرزو تھی کہ اللہ کے گھر کا طواف کروں۔ اس سال میں نے اپنے بڑے بیٹے آصف کے ساتھ اپنی حج الکیس کے تحت حج کیا۔ ہم لوگوں کی روانگی 5 فروری کو بھی 4 مارچ کو معلوم ہوا کہ ویزا انہیں لگا ہے، روانگی 6 کو ہے۔ پھر اگلے دن پتا چلا کہ ویزا انہیں لگا، روانگی 7 کو ہے۔ اب دوسرے دن میں جگہ پانے لگے، یا الہی! اب صرف حج کے بیچ ایک دن رہ گیا ہے۔ کیا میری روح نے حضرت ابراہیم کی آواز پر لبیک نہیں کہا تھا؟ جس قدر دعائیں ہو سکتی تھیں، کر ڈالیں۔ صرف یہی نہیں، میں اپنے ساتھ آصف کے دوست عمران کو بھی لے جا رہی تھی جن کو میرے شوہر مرحوم (جن کا انتقال ایک سال قبل ہوا) کی طرف سے حج بھی کرنا تھا۔ ہم تینوں امید و بیم کی حالت میں تھے کہ خوشخبری ملی ویزا لگ گیا ہے۔ ہم 7 فروری کی

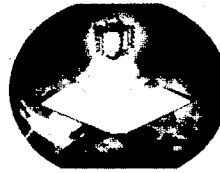
ایمان لائے اور اپنے پروردگار پر بھروسہ رکھتے ہیں۔“  
سورہ آل عمران آیت نمبر 14: ”لوگوں کو ان کی خواہشوں کی چیزیں یعنی عورتیں اور بیٹے اور سونے اور چاندی کے بڑے، بڑے ڈھیر اور نشان لگے ہوئے ٹھوڑے اور مویشی اور کھیتی باڑی زینت دار معلوم ہوتی ہیں۔ (مگر) یہ سب دنیا کی زندگی کے سامان ہیں اور خدا کے پاس بہت اچھا ٹھکانا ہے۔“

سورہ نسا (4) آیت 77۔ ”(اے پیغمبر ان سے) کہہ دو کہ دنیا کا فائدہ بہت تھوڑا ہے اور بہت اچھی چیز تو پرہیزگار کے لیے (نجات) آخرت ہے اور تم پردھا گے برابر بھی ظلم نہیں کیا جائے گا۔“  
آیت نمبر 120: ”وہ ان کو وعدے دیتا ہے اور امیدیں دلاتا ہے اور جو کچھ شیطان انہیں وعدے دیتا ہے وہ دھوکا ہی دھوکا ہے۔“

مضمون کے شروع میں سورہ حدید کی آیت نمبر 20 کا ذکر ہوا تھا اس کا مکمل ترجمہ یوں ہے۔ ”جان رکھو کہ دنیا کی زندگی محض کھیل اور تماشا اور زینت.... (آرائش) اور تمہارے آپس میں فخر (وستائش) اور مال و اولاد کی ایک دوسرے سے زیادہ طلب (وخواہش) ہے (اس کی مثال ایسی ہے) جیسے بارش کہ (اس سے کھیتی اُگتی اور) تو اس کو دیکھتا ہے کہ (پک کر) زرد پڑ جاتی ہے اور پھر چورا، چورا ہو جاتی ہے اور آخرت میں (کافروں کے لیے) عذاب شدید اور (مومنوں کے لیے) خدا کی طرف سے بخشش اور خوشنودی ہے اور دنیا کی زندگی تو متاع فریب ہے۔“

اور یہی تمام آیات پڑھ کر یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ دنیاوی عیش و عشرت، مال، اولاد، مویشی، کھیتی، زر و جواہر ان سب چیزوں کی ہوس اور غرور، یہ سب شیطان کے بہکاوے اور دھوکے بازیاں ہیں۔ یہ ختم ہونے والی چیزیں ہیں۔ باقی رہ جانے والی چیز صرف اچھے اعمال ہیں جن کا صلہ اس زندگی میں ملے گا جو ہمیشہ رہنے والی ہے۔

اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ ہم سب کو ظاہری و خفیہ آزمائش، دولت کی ہوس اور شیطان کی دھوکا بازیوں سے محفوظ رکھے اور نیک و سیدھے راستے پر گامزن کرے۔ (آمین)



قرآن پاک سے عشق کی پر نور داستان ڈاکٹر ذکیہ بلگرامی کے قلم سے

## باب یازدہم

تم کو دنیا کی زندگی دھوکے میں نہ ڈال دے اور نہ (شیطان) فریب دینے والا تمہیں فریب دے۔“  
آیت نمبر 6۔ ”شیطان تمہارا دشمن ہے۔ تم بھی اسے دشمن ہی سمجھو..... وہ اپنے (پیر ووں) کے گروہ کو بلاتا ہے تاکہ وہ دوزخ والوں میں ہوں۔“  
جس طرح سورہ عنکبوت میں دنیا کی زندگی کو کھیل تماشا کہا گیا ہے، اسی طرح سورہ محمد (45) میں بھی ارشاد باری تعالیٰ ہوتا ہے۔ ”دنیا کی زندگی تو محض کھیل تماشا ہے اور لوگو تم ایمان لاؤ گے اور پرہیز گاری کرو گے تو تم کو تمہارا اجداد سے تمہارا مال طلب نہیں کرے گا۔“ (آیت 36)

سورہ شوریٰ کی آیت نمبر 36 میں اللہ تعالیٰ خبردار کر رہا ہے کہ ”لوگو! جو (مال متاع) تم کو دیا گیا وہ دنیا کی زندگی کا (نیا ہمار) فائدہ ہے اور جو کچھ خدا کے ہاں ہے وہ بہتر اور قائم رہنے والا ہے۔ (یعنی) ان لوگوں کے لیے جو

**متاع الغرور**  
جو لوگ اس دنیا کی زندگی کو سب کچھ سمجھ بیٹھے ہیں اور مال و متاع، عیش و عشرت کی طلب کرتے ہیں دراصل وہ شیطان کے بہکاوے میں ہیں۔ شیطان انہیں فریب دیتا ہے۔ اسی وجہ سے ہر جائز و ناجائز طریقے سے لوگ اپنے لیے دولت اکٹھی کرتے ہیں اور اپنی آخرت برباد کرتے ہیں۔  
سورہ لقمان (31) آیت نمبر 33 میں ارشاد ربانی ہے۔ ”لوگو! اپنے پروردگار سے ڈرو اور اس دن کا خوف کرو کہ نہ تو باپ اپنے بیٹے کے کچھ کام آئے گا اور نہ بیٹا باپ کے کچھ کام آئے گا۔ بے شک خدا کا وعدہ سچا ہے پس دنیا کی زندگی تم کو دھوکے میں نہ ڈال دے اور نہ فریب دینے والا (شیطان) تمہیں خدا کے بارے میں کسی طرح کا فریب دے۔“

سورہ فاطر (35) کی آیت نمبر 5 میں بھی اسی طرح کی بات کہی گئی ہے۔ ”لوگو! خدا کا وعدہ سچا ہے تو

ویسے میرا ذاتی خیال ہے کہ محبت میں نہ فاصلہ اہمیت رکھتا ہے اور نہ ہی ظاہری آنکھ کی کوئی حقیقت ہے۔ اگر انسان کی باطنی آنکھ کھلی ہو تو فاصلے آپ ہی آپ مٹ جاتے ہیں۔ مدینے کی گلیوں میں پھرتے ہوئے ہمیشہ یہ احساس ساتھ، ساتھ رہا کہ ان گلیوں میں ہمارے پیارے آقا نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے قدم مبارک پڑے ہوں گے۔ اپنے 9 روزہ قیام کے دوران مسجد قبا دو بار گئے۔ وہاں پر دو رکعت نماز کا ثواب ایک عمرہ کے برابر ہے۔ مسجد قبلین اور دوسری جگہیں بھی دیکھیں۔ جنت البقیع میں مدفون عظیم ہستیوں کے حضور سلام کا نذرانہ پیش کیا اور فاتحہ پڑھی۔ مسجد نبوی ی میں نماز پڑھنے کا جولوطف و سرور ملا شاید اب وہ کہیں نہ ملے۔ مسجد نبوی کے امام کی آواز اس قدر دلنشین تھی کہ کانوں میں رس کھلتی اور دلوں کو مسخر کر لینے کی صلاحیت رکھتی تھی۔ ان کی تلاوت تاحیات یاد رہے گی۔ حج سے واپس آئے ہوئے ڈیڑھ ماہ گزر گیا ہے لیکن ہر نماز کے وقت خانہ کعبہ اپنی پوری رعنائی، آب و تاب کے ساتھ نگاہوں کے سامنے آ جاتا ہے اور مسجد نبوی کے امام کی آوازیں دور ہواؤں میں سرسرا تی، آج بھی محسوس ہوتی ہیں۔ آخر کوئی توجہ ہے کہ ہم مسلمان جو ایک بار وہاں جاتا ہے، دل میں بار بار جانے کی تمنا لے کر آتا ہے۔ آخر میں اسے ہی کہے ہوئے چند اشعار لکھ رہی ہوں جو پانچ سال قبل لکھے تھے۔

اور کچھ دیر ٹھہر جاؤں تو پھر بات بنے خانہ کعبہ کو نگاہوں میں بسالوں یا رب ایک ٹھنڈک سی اتر جاتی ہے دھیرے، دھیرے پھول رحمت کے چنوں اور سجالوں یا رب ہاں عبادت کے لیے عمر بہت تھوڑی ہے اشک کچھ اور ندامت کے بہالوں یا رب دل مضطر یہی کہتا ہے ٹھہر جاؤں یہاں تیری سرکار میں آؤں تو نہ جاؤں یا رب اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ میرا اور تمام حاجیوں کا حج قبول فرمائے، آمین! (قارئین ڈاکٹر ذکیہ بلگرامی کا لکھا ہوا یہ مضمون پہلی مرتبہ 2003 میں بھی شائع ہو چکا ہے) (جاری ہے)

جو دعا کی جائے، پوری ہوتی ہے۔ وقوف عرفات کے وقت سب گریہ و زاری میں مصروف ہوتے ہیں۔ کسی کو دوسرے کے بارے میں سوچنے کا وقت نہیں ہوتا۔ عرفات سے مزدلفہ اور پھر منی واپسی کا سفر بھی آسان رہا۔۔۔۔۔ بڑے شیطان کو ننگریاں مارنے، میں دوپہر کے بعد گئی تھی۔ رش کم تھا۔ آسانی سے ننگریاں ماریں۔ پھر واپس رہائش گاہ پر گئے۔ بال کاٹ کر احرام سے باہر نکلے۔ نہادھو کر کپڑے تبدیل کیے۔ اب طواف زیارت اور حج کی سعی باقی تھی۔ خیال ہے کہ اس سال تقریباً 32 لاکھ کا جمع تھا۔ چونکہ سب لوگوں کو ایک ساتھ ہی طواف اور سعی کرنی ہوتی ہے اس وجہ سے یہ دن سخت ہوتا ہے۔ لیکن اللہ تعالیٰ ہمت دیتا ہے۔ طواف زیارت اور سعی بھی میں نے اوپر کی۔ کافی وقت لگا مگر سکون سے فریضہ ادا ہو گیا۔ میرے ساتھ جو گروپ کے لوگ تھے، وہ سب بہت خوش اخلاق اور مخلص تھے۔ زیادہ تعداد نو جوان لڑکیوں کی تھی۔ ان سب نے میرا بہت خیال رکھا۔

حج کے بعد ہم لوگوں نے حرم شریف کے قریب رہائش لے لی تھی۔ اس لیے چار دن بہت آسانی رہی۔ کئی طواف کیے مگر مجمع اتنا زیادہ تھا کہ اوپر ہی سے کرنے پڑے۔ 20 تاریخ کو مدینہ منورہ گئے۔

مدینہ منورہ جا کر رہنا اور مسجد نبوی میں عبادت کرنا یہ ایک منفرد تجربہ تھا۔ ہماری رہائش انصار گولڈن ہوٹل میں تھی۔ مسجد نبوی کا گیٹ نمبر 25 اور ہوٹل کے گیٹ کے درمیان صرف ایک سڑک تھی۔ ہمارا کمرہ چودھویں منزل پر تھا اور رخ مسجد نبوی کی جانب۔۔۔۔۔ تمام رات بیٹناروں کی روشنی کمرے کے اندر چمکن، پھنکن کر آتی رہتی اور کھڑکی سے سبز گنبد اور مسجد کے اندر کا سب احوال نظر آتا رہتا۔ اذان ہونے کے بعد روانہ ہوتے تو بھی دو منٹ میں پہنچ جاتے۔ اب وہاں خواتین کے لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے روضہ مبارک کی زیارت منع ہو گئی ہے۔ سامنے پارٹیشن کھڑا کر دیا جاتا ہے۔ اور وہاں پر بھی اوقات مقرر ہیں۔ اس لیے یہ حسرت ہی رہ گئی کہ حضور پاک صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے روضے کے پاس جاتے۔ بہر حال دور سے سلام درود بھیج کر واپس آ گئے۔

ہے۔ مجھے چلنے کی عادت کہاں تھی، پاؤں زخمی ہو گئے مگر دل خوشی سے معمور تھا کہ طواف قدوم ہو گیا۔ مگر ہم ماں، بیٹا وہ جگہ بھول گئے جہاں عمران نے ملنے کو کہا تھا اور جہاں ایک تھیلی کے اندر ہمارے جوتے تھے۔ اب کیا کریں؟ چلتے، چلتے اور ڈھونڈتے، ڈھونڈتے فجر ہو گئی۔ ہم نے خوشی، خوشی نماز فجر ادا کی۔ یہ میری زندگی کی پہلی نماز تھی جو میں نے مسجد میں ادا کی۔

نماز پڑھ کر پھر وہ جگہ ڈھونڈنے لگے۔ اب سورج نکل چکا تھا۔ بہت دیر ہو گئی تھی۔ ہم رات دو بجے سے اب تک مستقل پیدل چل رہے تھے۔ میرا قدم اٹھانا محال تھا۔ پھر یاد آیا کہ کسی نے کہا تھا کہ آب زم، زم کی کر دعا کرو، فوراً قبول ہوتی ہے۔ ہم دونوں نے خانہ کعبہ کی طرف منہ کر کے کھڑے ہو کر آب زم زم پیا اور دعا کی۔ ”یا اللہ! تو عمران کو ملا دے۔“ اب جو پیچھے گھوم کر دیکھا تو عمران چپلوں کا تھلا لیے کھڑے تھے۔ جان میں جان آئی۔ سواری کر کے کسی نہ کسی طرح رہائش گاہ پر واپس آئے۔

اگلی صبح منی روانہ ہو گئے۔ یہ ہماری رہائش گاہ سے قریب ہی تھا۔ منی میں ہمارا خیمہ بھی جرات کے بہت قریب تھا اس لیے ہمیں کسی قسم کی کوئی تکلیف نہ ہوئی۔ منی میں پانچ نمازیں ادا کر کے 9 ذوالحجہ کو میدان عرفات میں گئے۔ یہاں بھی خیمہ نصب تھا۔ کوئی پریشانی نہ ہوئی۔ عالمگیر مسجد والوں نے بہت اچھا انتظام کیا تھا۔ جزل ضیاء الحق نے اپنے دور حکومت میں نیم کے ایک لاکھ درخت میدان عرفات میں لگوائے تھے جو کہ اب بڑے ہو چکے ہیں اور حجاج کو آرام دیتے ہیں۔ ہمارے خیمے کے آس پاس کئی نیم کے درخت تھے۔ نیم کے درخت کے نیچے کھڑے ہو کر میں نے وقوف عرفات کا فریضہ ادا کیا۔ اس وقت ہر حاجی کو چاہیے کہ صرف اپنے گناہوں کی بخشش کی دعا نہ کرے بلکہ اپنے والدین کے لیے بھی ضرور دعا کرے۔ ان کے گناہوں کی بخشش اور جنت الفردوس میں جگہ دینے کی دعا۔۔۔۔۔ اسی طرح ان تمام لوگوں کے لیے دعا جو اپنے پیارے تھے اور اس دنیا سے جا چکے، اس وقت مغفرت اور بخشش کے در کھلے ہوتے ہیں۔

صبح روانہ ہوئے اور وہاں رہائش تک پہنچتے، پہنچتے شام ہو گئی۔ اب صرف ایک دن رہ گیا تھا۔ ہم لوگوں نے حج افراد کا احرام باندھا تھا، اس میں ثواب زیادہ ہے کیونکہ جب تک حج نہ ادا ہو جائے، احرام نہیں کھلتا، اسی دن رات کے دو بجے ہم تینوں طواف زیارت کے لیے روانہ ہوئے۔

ہماری رہائش حرم شریف سے کئی کلومیٹر دور تھی۔ جگہ کا نام ششہ بن داؤد تھا۔ کھانے پینے اور رہائش کا نفیس انتظام تھا۔ سواری کر کے حرم شریف پہنچے۔ عمران چونکہ ایک سال قبل حج کر چکے تھے اس لیے ہمیں اطمینان تھا۔ ہم دونوں بھی ان کے ساتھ تھے۔ خانہ کعبہ پر پہلی نظر پڑنے کا مرحلہ سب سے زیادہ یادگار ہوتا ہے۔ عمران کی ہدایت کے مطابق میں زمین کی طرف دیکھ کر آگے بڑھ رہی تھی۔ ”ابھی اوپر مت دیکھیے گا۔“ عمران مستقل کہتے رہے۔

جب خانہ کعبہ بالکل سامنے نظر آنے لگا تو انہوں نے کہا۔ ”ہاں اب نظرس اٹھائیے۔“ میں نے شوق کے عالم میں نگاہیں اوپر اٹھائیں، سبحان اللہ! کیا روح پرور نظارہ تھا۔ خانہ کعبہ اپنی تمام تر خوبصورتی کے ساتھ روشنی میں جگمگا رہا تھا اور لاکھوں انسانوں کا ٹھانٹھا مارتا سمندر۔۔۔۔۔ وہ سب کے سب خانہ کعبہ کے ارد گرد گھوم رہے تھے۔ ایک ہی جذبہ، ایک ہی لگن، اللہ کی رضا، قرب الہی کی تمنا اور وہ ہزاروں دعائیں جو قبولیت کے لیے چل رہی تھیں، لوگوں کے ہونٹوں سے نکل رہی تھیں۔

کہتے ہیں خانہ کعبہ پر پہلی نظر پڑنے پر جو دعائیں گئی جاتے، وہ پوری ہوتی ہے، چنانچہ میں نے کیا دعائیں گئی تھیں۔ میں تو اللہ کے گھر کی خوبصورتی میں کھو گئی تھی، گلتا تھا ہر طرف سے نور کی بارش ہو رہی ہے اور میں اس میں نہا رہی ہوں۔ منہ سے کچھ الفاظ نکلے تھے تو ٹوٹے پھوٹے سے۔ ”اے اللہ! تو خود جانتا ہے میں کیا چاہتی ہوں۔ بس تو وہ تمام جائز دعائیں پوری کر دے، ہر اس دعا کو پورا کر دے جو میں حج کے دوران مانگوں۔“

بس پھر میں بھی نیت کر کے طواف کرنے والوں میں شامل ہو گئی۔ دو چکر نیچے کیے۔ اس قدر مجمع تھا کہ مزید چکر کا متشکل لگا تو ہم اوپر چلے گئے اور باقی چکر اوپر ہی کیے۔ گو کہ وقت بہت لگتا ہے مگر سہولت رہتی

# ..... یہ کہاں بچیں کہ دل ہے

رفعت سراج

بنی اسرائیل کا سونے کا بچہ آج ڈالر، پونڈ، یورو، ڈیم و دینار کی شکل اختیار کر چکا ہے۔

Pakistan Point

دل جذبات کا استعارہ ہے مگر اب وہ دل کہاں ...

سونے کے بچہ کے سینے میں دل بھی سونے کا ہے ...

دل کو رو یا جاتا ہے، جگر کو پیٹا جاتا ہے ...

کبھی ناقدروں کے حوالے کر دیا جاتا ہے، داریاں ٹوٹ جاتی ہیں۔

الزام تراشیوں کا ایک طوفان بدتمیزی برپا ہو جاتا ہے۔

دل سے دل کو راہ بھی ہوتی ہے ...

آج کا انسان بد راہ سٹیلانٹ کے ذریعے search کرنے کی کوشش کرتا ہے۔

دل اور سونے کا بچہ ...

عبادت، معاملات ...

جنت گم گشتہ کے لیے دخل باسیوں کی ازلی کہانی ...

رگ سنگ سے ٹپکتا وہ لبو کہ پھر نہ تھمتا  
جسے غم سمجھ رہے ہو یہ اگر شرار ہوتا  
غم اگرچہ جاں گسل ہے پہ کہاں بچیں کہ دل ہے  
غم عشق گر نہ ہوتا، غم روزگار ہوتا  
ہوئے مر کے ہم جو رسوا ہوئے کیوں نہ غرق دریا  
نہ کبھی جنازہ اٹھتا نہ کہیں مزار ہوتا

قطع 17

”ہیلو.....! خیریت ہے ساحل؟ ابھی، ابھی میں نے آپ کی مسڈ کالز دیکھیں۔ کال بیک کرنے لگی تو آپ

کی کال آگئی۔“ تا جو رکی تشویش بھری آواز ساعت سے نگرانی۔

”خیریت نہیں ہے میم..... میں دو گھنٹے سے ٹرائی کر رہا ہوں..... سائٹ پر دیوار گرنے سے ایک مزدور کی

ڈیو تھ ہو گئی ہے۔“

”مائی گاڈ.....“ تا جو رکی دم بہت بڑا دھچکا پہنچا تھا۔

”میم آپ کو سائٹ پر آنا ہوگا..... مزدور کی ٹیلی اور پولیس دونوں آپ کا انتظار کر رہی ہیں۔ دوسرے مزدور

بھی یہاں آگئے ہیں۔ میں سائٹ برملوں گا آپ وہیں تشریف لے آئیں.....“

”میں پہنچتی ہوں.....“ تا جو رکی گھبرائی ہوئی آواز اتر پڑی میں ابھری اور رابطہ منقطع ہو گیا۔



کا ہاتھ تھام کر ہاتھ کی پشت پر بوسہ ثبت کیا..... انہوں نے بھی اسے گلے لگا کر گرم جوشی سے پیار کیا۔

☆☆☆

مرحوم کے گھر میں بہت سے لوگ عرصے بعد پیٹ بھر کر کھاتے ہیں۔ کئی لوگوں کا قافہ ختم ہوتا ہے..... مہینہ گزارنے کے لیے پیسہ نہیں مگر..... برباد کرنے کے لیے وقت بہت وقفہ، وقفے سے مرحوم با مرحومہ کی خوبیاں بیان کرنے کے بعد (جو اس کی زندگی میں کسی کو دنیا کی سب سے بڑی دور بین سے بھی نظر نہیں آ سکتی تھیں) برادری یا خاندان کے تنازعات زیر بحث لائے جاتے۔

ہاتھ میں کھجور کی گٹھلیاں..... ہر گٹھلی پر کلہ پڑھنا ضروری نہیں (ان کے انداز سے تو یہی لگتا) نند بھانوج ساس، آوارہ دیور، ظالم جیٹھ، فساد ہیسا..... کا تعلق کسی بھی گٹھلی سے بن سکتا تھا۔

”جہالت قدرتی آفات سے بڑا عذاب ہے.....“ ساحل سوچ رہا تھا۔ ساحل کو مرحوم کے لواحقین نے گھیرا ہوا تھا..... وقت گزرنے کے ساتھ، ساتھ جن کی تعداد بڑھتی جا رہی تھی۔ عورتیں بین کر رہی تھیں، سیدہ کوئی کر رہی تھیں..... اس ملک میں رکشے والا جس بے فکری سے چوراہوں، دوراہوں پر رکشا گھماتا ہے اس کی وجہ بھی یہی غربت و جہالت ہے۔ کسی لاش گاڑی سے نکلے ہوئے بھی رزق کے دروازے کھولنے کا بہانہ بن سکتا ہے۔

”میرا نقصان ہو گیا..... مجھے پیسے دو..... ورنہ میری بدعائیں تمہارے پیچھے پڑ جائیں گی..... میں غریب

ساحل نے اب کھل کر سانس لی۔ اور گاڑی کی طرف گھور کر دیکھا جو ہنق دق کھڑا اس کی صورت تک رہا تھا۔  
”اے چوراچکا سمجھتا ہے؟ آج پتا چل گیا..... یہ شکل ہوتی ہے چوراچکوں کی.....؟“ وہ برس پڑا..... یوں جیسے لاوا بہہ نکلا ہو.....

پھر پاؤں پختا اپنی کاری طرف چل دیا..... گاڑی روٹ کی طرح ٹکر، ٹکر دیکھتا رہا تھا۔

☆☆☆

تاجور کے سوال، الفاظ غیر معمولی تھے۔ سفینہ اور زارا بھی پریشان ہو کر ان کی طرف دیکھ رہی تھیں۔ لیڈی صوفیہ کی ”بس“ ہو چکی تھی وہ اپنے معمولات سے ہٹ کر مصروف رہی تھیں۔ اب بالکل غائب دماغی کی کیفیت میں مبتلا تھیں۔

اب وقتِ رخصت تھا وہ آدابِ میزبانی حتی المقدور نبانے کی الیتہ کوشش ضرور کر رہی تھیں۔  
”کیا ہوا اماں.....؟“ سفینہ جو پرنس اور ٹوبان کے درمیان چند لمحے پہلے بہت شاداں و فرحاں نظر آ رہی تھی۔ ماں کے چہرے پر کھنچی تفکرات کی لہر اسے ہولانے لگیں۔

”کچھ نہیں..... بس وہ سائٹ پر کوئی پراہلم آگئی ہے، لیبرز کی طرف سے۔ ساحل ابھی نیا ہے ٹھیک سے tackle نہیں کر پا رہا تھا۔ پریشان ہو رہا ہے..... میرا خیال ہے اب ہمیں چلنا چاہیے.....“ وہ بجلت میں مبتلا محسوس ہونے لگیں۔

پرنس نے غیر ارادی طور پر سفینہ کی طرف دیکھا تھا..... گھٹنے پل میں گزر گئے تھے۔ رخصت کی گھڑی سر پر آ پہنچ تھی..... اس کے بعد سفینہ نے لاہور چلے جانا تھا..... اور پھر کسی تقریب بہر ملاقات کا انتہا کرنا تھا۔ زارا کی کسی ہوئی پٹنائیں کھل گئی تھیں۔ اتنی دیر سے وہ سفینہ کی شادمانی دیکھ کر اندرونی جنگ میں مبتلا تھی۔ پرنس کی سفینہ کے لیے وارفتگی بھی ڈھکی چھپی نہیں تھی۔ جھٹ ماں کی ہمدردی بن کر اٹھ کھڑی ہوئی۔

”اماں آپ پریشان نہ ہوں، سب ٹھیک ہو جائے گا.....“ وہ ماں کے شانوں پر ہاتھ رکھ کر بہت اپنائیت سے کہہ رہی تھی..... ذہن تھا کہ بل بھر کے لیے پرنس سے غافل ہو کر نہیں دے رہا تھا..... ایک تپش بھی جو سینے سے اٹھتی تھی اور آنکھوں کو جھلساتی تھی۔

”ہمیں اجازت.....؟ تاجور نے لیڈی صوفیہ کے قریب جا کر نرمی سے ان کا ہاتھ تھام لیا۔ جو مندی، مندی آنکھوں سے بچوں کی سی معصومیت کے ساتھ سب کی طرف دیکھ رہی تھیں۔

”تھینک یو تاجور.....“ انہوں نے اٹھنا چاہا تو انجیلانے انہیں اٹھنے میں مدد دی۔

”it was a very precious time“ وہ اپنے نازک وجود کا بوجھ بھی اس وقت سنبھال نہ پا رہی تھیں۔  
”جی بالکل..... انشاء اللہ..... آپ سے بہت جلد ایک اور خوب صورت ملاقات ہوگی.....“ تاجور مردانہ مضبوط اعصاب کی حامل ہونے کا مظاہرہ بہت خوبی سے کر رہی تھیں اور دل کا حال یہ تھا کہ اڑ کر سائٹ پر پہنچ جائیں۔

”زارا..... پیاری لڑکی تم تو میری فرینڈ بن چکی ہو..... میں تمہارا ویٹ کروں گی۔“ زارا کیونکہ لیڈی صوفیہ کے قریب تھی اس لیے الوداعی کلمات سے اسے پہلے نوازا گیا۔

زارا کو یوں لگا جیسے دھوپ میں چلتے، چلتے گھنے نیم کی چھاؤں میسر آگئی ہو۔ اس نے فرط مسرت سے لیڈی صوفیہ کے شانے سے سر نکا دیا۔

”اوہ گریٹ.....!“ اس کے منہ سے بے ساختہ نکلا۔

لیڈی صوفیہ کی اپنائیت اسے پرامید بنارہی تھی۔ حوصلے بلند کر رہی تھی۔ سفینہ نے خود آگے بڑھ کر لیڈی صوفیہ

## یہ کہاں ہیں کہ دل ہے

ساحل بچ و تاب کھارہا تھا۔ اپائنٹ لیٹر پر یہ نہیں لکھا ہوا تھا کہ تھانے پولیس کے چکروں کو بھی فیس کرنا ہوگا۔ کیا ٹھانڈا تھا یہ رئیسوں کے۔۔۔۔۔ دن بھر مزدوروں کا خون پیٹتے ہیں۔ رات کو دعوتیں اڑاتے ہیں۔

تاجور کو دوبارہ فون کرنا بہت غیر مہذبانہ لگ رہا تھا۔۔۔۔۔ جب ان کو ایمر جنسی یا ناگہانی صورت حال کی خبر پہنچ گئی تھی تو اسے اب صبر سے انتظار کرنا تھا۔

اتنی شاندار ملازمت کو وہ کسی خطرے سے تو ہرگز دوچار نہیں کر سکتا تھا۔

”بیگم صاحبہ ابھی تک نہیں پہنچیں۔۔۔۔۔“ ڈی ایس پی نے قریب آ کر اپنی رسٹ واپ پر نگاہ دوڑاتے ہوئے کہا۔

”جی بس پہنچ رہی ہیں۔۔۔۔۔ شاید وہ پرائم فشر کے ساتھ ڈنر کر رہی تھیں۔“ اس نے جل بھن کر بظاہر نارمل انداز میں جواب دیا۔

”پرائم فشر۔۔۔۔۔ تو کیا وہ اسلام آباد سے آرہی ہیں۔۔۔۔۔؟“ ڈی ایس پی کی پھیلی آنکھیں مدھم روشنی میں بھی چمک رہی تھیں۔ یوں بھی پولیس افسروں کا اپنا ایک خاص انداز ہوتا ہے۔ پکلیں کم جھپکتے ہیں۔

”سسر۔۔۔۔۔ پرائم فشر کراچی بھی بھی، کبھی آجاتے ہیں۔۔۔۔۔ آپ خود بھی اچھی طرح جانتے ہیں۔ لندن تو بس چار قدم کے فاصلے پر ہے۔ کراچی بہت دور ہے۔ سمندر پھلانگ کر آنا پڑتا ہے ناں۔۔۔۔۔“ وہ دانت پیس رہا تھا مگر نرمی اور اخلاق کا مظاہرہ کرنے پر مجبور تھا۔

”ہا۔۔۔۔۔ ہا۔۔۔۔۔“ پولیس آفیسر بہت محظوظ ہوا۔۔۔۔۔ اسے گدگدانے کے بعد وہ اس سے دور ہٹ گیا۔۔۔۔۔ اس سے زیادہ گدگدانے کی گنجائش نہیں تھی نہ توفیق۔۔۔۔۔

☆☆☆

”اماں۔۔۔۔۔ آپ۔۔۔۔۔ اس وقت سائٹ جا رہی ہیں؟“ سفینہ نے حیران ہو کر ماں کی طرف دیکھا۔۔۔۔۔ کیونکہ انہوں نے ڈرائیور کو ہدایت کی تھی کہ وہ پہلے انہیں سائٹ ڈراپ کرے۔ بعد میں بیچوں کو لے کر گھر چلا جائے۔

واپس کا کچھ نہیں بتایا کہ ذہن میں تھا کہ ساحل سائٹ پر موجود ہے۔ وہ بھی انہیں ڈراپ کر سکتا ہے۔ دوئم انہی تو یہ بھی واضح نہیں تھا کہ وہاں کتنا وقت گنگا۔ کس، کس مرحلے سے گزرنا ہوگا۔

”ایک ایکسڈنٹ ہو گیا ہے۔۔۔۔۔“ تاجور کو بہر حال حقیقت بتانا تھی۔

سفینہ اور زارا مارے تھکرے کے ہم آہنگ ہوئیں۔۔۔۔۔

”وہ جو کال آئی تھی۔“ سفینہ الفاظ ترتیب نہ دے پائی۔۔۔۔۔ تاجور نے جملہ خود ہی مکمل کر دیا۔

”ہاں ساحل کی کال تھی۔۔۔۔۔ وہ بھی اس وقت سائٹ پر ہی ہے۔۔۔۔۔ افس وقت اس نے بہت ہمت دکھائی اور بہت اچھی طرح چوہن کنٹرول کی ہے۔۔۔۔۔ مجھے اندازہ تو تھا کہ پڑھا لکھا خاندانی سختی لڑاکا ہے مگر یہ واقعی اندازہ نہیں تھا کہ وہ کسی ایمر جنسی میں بہت اسٹراٹیک رول بھی لے کر سکتا ہے۔“ تاجور نے بیٹیوں کے سامنے پہلی بار کسی ایمپلائ کی اس طرح دل کھول کر تعریف کی تھی۔ لاشعوری طور پر نظریں زارا پر لگی گئی تھیں۔

سفینہ یک دم بہت متشکر نظر آنے لگی تھی۔

”اماں آپ نے یہ تو بتایا نہیں کہ ہوا کیا ہے؟“ زارا بھی اب ہر طرف سے ذہن ہٹا کر موجودہ لمحے میں مدغم ہو رہی تھی۔ لفظ ایکسڈنٹ ہی بہت چونکا دینے والا تھا۔۔۔۔۔ پھر ماں رات کے اس پہر کسی ناگہانی صورت حال کا سامنا کرنے جا رہی تھی۔ ساری تصویرانی دنیا پلک جھپکتے ہی پس پردہ چلی گئی۔۔۔۔۔ خوفناک حقیقت عریاں ہو رہی تھی۔

”وہ فیکٹری کے ایکسٹینشن میں کنکشن ٹکڑ ہو رہی تھی۔۔۔۔۔ دیوار جو آج شام ہی مکمل ہوئی تھی کسی سوئے ہوئے مزدور پر گر گئی۔“

ہوں، پیسے کہاں سے دوں۔۔۔۔۔؟ مجھے بچ دو۔۔۔۔۔ جتنے کا بکوں وغیرہ، وغیرہ۔۔۔۔۔“

ساحل سمجھ رہا تھا۔۔۔۔۔ کہ یہ سب مالک سے خطیر رقم کا مطالبہ کرنے کے لیے جمع ہو رہے ہیں۔ حق تو مرحوم کے لواحقین کا بنتا تھا مگر لوگوں کو دلچسپی تھی کہ پیسے کتنا ملے گا۔

افلاس کے دائرے میں پھرانے والے بندگان خدا اپنے آس پاس ان گھروں میں بھی دلچسپی رکھتے ہیں جو کسی کو بوقت ضرورت قرض، ادھار دینے کی استطاعت رکھتے ہوں۔

”یا اللہ۔۔۔۔۔ میم کب پہنچیں گی۔۔۔۔۔؟ کم از کم میں تو اس un wanted جے سے خطاب نہیں فرما سکتا۔“

وہ بے چینی سے پہلو بدلتے ہوئے سوچ رہا تھا۔

☆☆☆

تاجور کے انداز میں غلٹ بھرے تلکفات تھے، وہ خود پر بہت کنٹرول کر رہی تھیں۔ اس کے باوجود ان کی ماحول میں غیر حاضر دماغی محسوس ہو رہی تھی۔ وہ درپیش بحران میزبان کے سامنے لا کر اس خوب صورت تقریب کا تاثر غلط منظر نہیں کرنا چاہتی تھیں پیش نظر یہ تھا کہ کسی طرح سواری میں سوار ہو جائیں۔

زارا کو اپنے خیالات سے فرصت نہیں تھی، وہ تاجور کے پہلو بہ پہلو چل رہی تھی مگر توجہ پشت پر تھی۔ سفینہ اور پرنس مسک خرامی سے چل رہے تھے اور زارا سے دس ہاتھ کے فاصلے پر تھے۔ پلٹ کر دیکھنا تو غیر اخلاقی حرکت تھی جیسے کوئی دیوار سے کان لگائے کھوج لگا رہا ہو۔

سفینہ اور پرنس باتیں کر رہے تھے مگر آواز اتنی آہستہ تھی کہ کوشش کے باوجود زارا کے کچھ پلے نہیں پڑ رہا تھا۔۔۔۔۔

کچھ دل میں اٹھنے طوفان بھی سماعت کو متاثر کر رہے تھے۔

پرنس ہوا کے دوش پر تھا۔ پاؤں کے نیچے زمین کا فرش محسوس نہیں ہو رہا تھا، رومانویت جو اس کے وجود کے کیسیائی عناصر کی مضبوط بنیاد تھی اس وقت اوج کمال پر تھی۔ وہ پل، پل اپنی گرفت میں لے رہا تھا۔۔۔۔۔ ایک تصور جو برسوں اس کی تخلیقات پر حاوی رہا۔۔۔۔۔ اس وقت جسم تھا۔ اپنے خوش قسمت ہونے کا یقین تو پہلے بھی تھا۔۔۔۔۔ آج مہر ثبت ہو رہی تھی۔ ڈرائیور نے لینڈ کروزر کا ڈروا کر دیا تھا۔

تاجور نے سوار ہونے سے پہلے پلٹ کر پرنس کی طرف دیکھ کر الوداعی انداز میں ہاتھ ہلایا اور سوار ہو گئیں۔۔۔۔۔ زارا نے ان کی تھلید کی۔۔۔۔۔ سفینہ نے توقف کیا۔

ایک باوقار نفیس انسان کم سے کم الفاظ کا بوجھ ضرور اٹھا رہا تھا مگر احساسات تکمیل کے سنگ میل کی طرف سرپٹ دوڑ رہے تھے۔

سفینہ نے نازک سا ہاتھ بلند کر کے پرنس کو خدا حافظ کیا اور اس بات سے بے خبر کہ ماں گھڑیاں گن رہی ہے۔

پرنس کی جادو جھری مسکراہٹ کا نظارہ کہ تا ضروری خیال کیا۔ تاجور بے چینی سے پہلو بدل رہی تھیں۔

زارا نے سیاہ شیشے سے ناک ٹکا کر باہر جھانکا۔

پرنس اب پشت پر ہاتھ باندھے لینڈ کروزر کو گیٹ کی طرف جاتا دیکھ رہا تھا۔۔۔۔۔

”کمال شخص ہے یہ۔۔۔۔۔ کتنا relaxed۔۔۔۔۔ کتنا خوش۔۔۔۔۔ ملتے وقت بھی چہرہ ایسا ہی تھا۔۔۔۔۔ رخصت ہوتے ہوئے بھی۔۔۔۔۔“ وہ سوچ رہی تھی۔

سفینہ خوابوں کا خزانہ گود میں بھرے بہت سرشار نظر آرہی تھی۔

☆☆☆

## یہ کہاں ہیں کہ دل ہے

ہماری ذمہ داری ہے..... اور اس کے بیوی، بچوں کو ہم خرچہ بھی دیں گے..... اب تم لوگ اپنے، اپنے گھر جاؤ..... پوسٹ مارٹم کے بعد میت پہنچا دی جائے گی۔“ پولیس آفیسر نے ساحل کی لیڈر انہ خصوصیت سے خاص حد محسوس کرتے ہوئے مورچہ سنبھالا۔

بیگم صاحبہ کو تو پولیس نے ممنون احسان کرنا تھا۔  
”پتا نہیں یہ کون پھنسنے خان ہے.....“ پولیس افسر کو اپنی موجودگی میں ساحل کی کوئی کارکردگی انتہائی ناقابل برداشت تھی۔

”مزدور کا کوئی بھائی یا بیٹا یہاں موجود ہے؟“ تاجور کو مشکل دکھائی دے رہا تھا کہ یہ لوگ کچھ لیے بغیر یہاں سے نکلے گئے..... غربت و افلاس کے مارے لوگ جو چالیسویں کے کھانے کا انتظار کرتے ہیں کہ اس کھانے میں کوئی لافانہ یا تحفہ نہیں دینا پڑتا۔

ایک ادھیر عمر کا لبا ترنگا آدمی جھٹ جمع میں گھسا اور پلک جھپکتے ہی ایک بارہ، تیرہ سال کے لڑکے کا ہاتھ تھام کر تاجور کے سامنے آکھڑا ہوا۔  
”بیگم صاحبہ یہ صادق کا بڑا بیٹا ہے۔“

تاجور نے بچے کی طرف دیکھا..... جس کی رو، رو کر آنکھیں متورم ہو رہی تھیں۔ ہلکی، ہلکی سسکیاں لے رہا تھا۔  
ایک ناگہانی نے اسے قیموں کی فہرست میں شامل کر دیا تھا۔  
تاجور نے اپنا کچھ کھول کر پانچ ہزار کے کی گڑا سٹوٹ نکالے..... مزید تلاش کیے..... پھر ساحل کی طرف دیکھا۔  
”آپ کے پاس کچھ ہیں تو مجھے دیں..... صبح اکاؤنٹ سے لے لیجیے گا۔“ ساحل تو اس وقت نفلوں کا بھوکا تھا

”مائی گاڈ!.....“ سفینہ کا تو خوف سے خون ہی خشک ہونے لگا..... زارا ابھی دم بخود رہ گئی۔  
”تم لوگ گھر جا کر آرام کرو..... ڈیڈ باڈی اسپتال پہنچا کر کچھ دیر میں، میں بھی آ جاؤں گی..... پریشان ہونے کی ضرورت نہیں..... یہ جینٹلمن تو لائف کا حصہ ہیں..... انہیں فیس کرنا ہوتا ہے۔“ تاجور نے حقیقت بتا کر ساتھ ہی گھبرائی ہوئی بیٹیوں کو تسلی بھی دی.....

”اماں..... میں آپ کے ساتھ چلتی ہوں۔“ سفینہ کو ادراک ہو رہا تھا کہ صورت حال گھبر اور نازک ہے..... یہ الگ بات کہ ماں بہت مضبوط اعصابی قوت کا مظاہرہ کر رہی تھی.....  
”نہیں..... تمہارا دہاں کیا کام..... تم ریٹ کر دو، کل تمہیں فلائی بھی کرنا ہے۔“ زارا نکر، نکر تاجور کی طرف دیکھ رہی تھی۔ عجب لاجواب کر دینے والی صورت حال تھی..... تمام ترین جذبات کے ساتھ دونوں اس مرحلے پر ماں کی خدمت سے قاصر تھیں۔

☆☆☆

پولیس، سول انجینئرز، آرکیٹیکٹ سرویئر، ٹھیکیدار، مرحوم کے پھرے ہوئے لواحقین..... ایک آفت تھی جو تاجور کی منتظر تھی۔ جیسے ہی وہ گاڑی سے باہر آئیں ایک جم غفیر میں گھر گئیں۔ وہاں موجود ہر شخص ان سے کچھ کہنے کا خواہش مند تھا۔

ایسے میں ساحل نے ان کے قریب کھڑے ہو کر بہت اعتماد سے پھرے ہوئے مجمع کو مخاطب کیا۔  
”آپ لوگ بات نہیں کر رہے شور کر رہے ہیں..... بات کریں گے تو بات سمجھ آئے گی۔“ ساحل کی گھن گرج بڑی موثر تھی۔ معا خاموشی چھا گئی۔ پولیس آفیسر بھی چھڑی بغل میں دبائے ہوئے بچوں کے انداز میں تاجور تک پہنچنے میں کامیاب ہو گیا تھا..... اور بہت مٹو بانہ انداز میں تاجور کو سلام کیا تھا۔

”آپ پریشان نہ ہوں بیگم صاحبہ..... ہمیں تو ضابطے کی کارروائی پوری کرنا ہوتی ہے..... پولیس آپ کی ہر طرح سے خدمت کے لیے تیار ہے..... بہر حال ان لوگوں کو.....“ اس نے جھجھکی کی طرف اشارہ کیا۔  
”کچھ دے دلا کر ہی جان چھڑاتا ہوگی۔“

لینڈ کروزر سے اترنے والی بڑی جیسر پرسن کو آفیسر نے گھاگ شکاری کی طرح آنک لیا تھا..... اور اب یہ حال تھا..... ساری کائنات کا اخلاق و حلاوت اس کے لہجے میں اتر رہی تھی۔

”ارے ہمارا بندہ مار دیا..... ریت میں سینٹ بھی ملایا تھا یا نہیں.....؟“ ایک قوی الجھن شخص جس کے آدھے بال سامنے سے اڑ چکے تھے..... انداز سے کسی یونین کالیڈر لگ رہا تھا، بڑے ڈرامائی انداز میں بولا تھا۔

”چپ کرو..... تحقیقات پولیس کا کام ہے.....“ آفیسر نے فوراً بھاڑ پلائی۔ سول انجینئر اور ٹھیکیدار کی حالت غیر تھی..... تاجور نے اس پہلوان نما شخص پر ایک نگاہ کی اور بہت وقار سے گویا ہوئیں۔

”تمہارے بندے کو میں نے نہیں مارا..... دیوار گرنے کی وجہ سے ڈھبھٹ ہوئی ہے۔“  
”میں، میں منزل کے ٹاؤڈ کھڑے ہیں..... وہ نہیں گرتے..... دیوار کیسے گرتی، مسالے میں ڈنڈی ماری ہوگی۔“

”ڈرا آرام سے، مسالہ بیگم صاحبہ نے نہیں بنایا تھا۔“ ساحل نے فوراً اس پہلوان کے سامنے آکر اسے روکا۔  
”ارے جب سیٹھ تھوک میں پکڑوے تلے گا تو پھر ٹھیکیدار یہی کریں گے ناں..... ارے وہ ٹھیکیدار ہی کیا جو ہیرا پھیری نہ کرے..... وہ تو اپنا حصہ نکالے گا۔ بھلے بلاکوں کو گوند لگا کر چپکا دے۔“ یہ کہہ کر اس نے اپنے خیر خواہوں کی طرف یوں دیکھا گویا داد طلب کر رہا ہو۔

”اچھا..... ذرا آرام سے..... رات ہے، بینک بند ہیں..... کل تمہیں پیسے مل جائیں گے..... کفن دفن بھی

جنوری 2018ء  
نئے سال کا پہلا شمارہ ایک نظر میں

خوشحورت کہانیوں کا مجموعہ

سیرہ طالع  
پیش

مزید

خلیہ کی عقل  
محفل شہرہ

مرد و انجمن کے گاہکوں کے انداز

حریف

آخری صفحات پر نشور ہادی کے قلم سے ایک دلچسپ

کہانی..... رشتوں کی الجھی ڈوری اور مشاورت کی رسائی کا عجب ماجرا

اک دور تھا

شیخ شاہ نصیر چراغ دہلوی کی پیش گوئی کا سفر جسے مختلف آزمائشوں

کے درمیان سے ہوتے ہوئے ہر حال میں پورا ہوتا تھا..... تاریخی

صفحات کا دلربا ریک ڈاکٹر ساجد امجد کے قلم سے

رنگ آسمان

فرنگی حین کی راہ گزری دشواریوں کا احوال جسے اس کے محبوب نے دھیرے

دھیرے آسان بنا دیا۔ ایسے آدرجیوت کے خیالات کی پرواز

وقت

سابق کی طرح مل کھاتی چال چلتے ہوئے دقت کی ایسی روداد جس کے کسی پل

کا اعتبار نہیں ہوتا کہ جانے کب کہاں بدل جائے۔ مسلم بٹ کے قلم کا جادو

تنویر دھاض۔ سلیم انور۔ ڈاکٹر شیر شاہ سید۔ منظر امام۔

شاہکر لطیف اور محمد ہاسر اعوان کی دلچسپ کہانیاں آپ کی منتظر

اسی کے علاوہ

## یہ کہاں ہیں کہ دل ہے

لگائے بیٹھی ان دونوں کو اندر آتے ہوئے دیکھ رہی تھی۔ پرئس کو پوری آنکھیں کھول کر اس کی طرف دیکھتے ہوئے عجیب سی جھجک محسوس ہو رہی تھی۔ تاہم اس نے بہت مہذبانہ انداز اور دھیمی آواز میں سلام کیا تھا..... جس کا جواب سر کی جنبش سے دیا گیا۔

”مسز سلمان..... یہ آپ کے neighbour مسٹر پرئس شہپر علی خان زادہ.....!“ ڈاکٹر ذکی نے اتنے اہتمام سے پرئس کا نام بتایا کہ عورت پر ایک طرح سے ہیبت طاری ہونے لگی۔ صرف پرئس ہی حادی ہونے کے لیے کافی تھا..... عورت نے پرئس کی جادو اثر شخصیت سے خوف کھا کر ادھر اُدھر دیکھا۔

”وہ..... ٹوبان؟“ باقی الفاظ حلق میں اٹک گئے..... یوں محسوس ہو رہا تھا کہ سر عام رسوائی ہو رہی ہو..... اعتماد کی بہت کی محسوس ہو رہی تھی۔

”جی وہ بہت گہری نیند سو رہا تھا، میں نے جگا تا مناسب نہیں سمجھا.....“ پرئس نے محتاط انداز میں جواب دیا۔ رسوائی پر مجبوع، بیٹے کے لیے آنکھوں میں تڑپ..... غیر مطمئن زندگی کے اشارے ایک، ایک اداسے آشکار تھے۔ پرئس کے سامنے کچھ مناظر فلم کی طرح چلنے لگے۔

ایک مرتبہ جب وہ ٹوبان سے ملنے گیا تھا اور دوسری مرتبہ جب گیٹ سے باہر کھڑی کار میں میاں، بیوی کو ابھتے دیکھا تھا اور یہ خاتون کار سے اتر کر اندر چلی گئی تھی۔

”اٹس اوکے..... پلیز آپ بھی گھر جا کر ریٹ کیجیے..... میں اب کافی بہتر ہوں۔“ ٹوبان کی ماں جس کو ڈاکٹر ذکی نے مسز سلمان کہہ کر مخاطب کیا تھا۔ ان دونوں کی موجودگی سے خاصی گھبرا رہی تھی۔

پرئس تو حتی المقدور اس کی طرف دیکھنے سے گریز کر رہا تھا..... اس کی زندگی میں سفینہ پہلی لڑکی تھی جس کے ساتھ اس نے کچھ وقت تنہا گزارا تھا۔ اس کی روح میں جو پاکیزگی سرایت کر چکی تھی وہ اسے بہت محتاط کرتی تھی..... اس کی دادی نے عورت کی نقدیں و احترام کا سبق پڑھایا تھا..... بقول لیڈی صوفیہ کہ حسین مرد اسے کہتے ہیں جو بہت احتیاط سے جیتا ہے۔

کبھی، کبھی حضرت علیؑ کا ایک قول بھی وہ دُہرایا کرتی تھیں کہ ”حیا عورت کے لیے خوب ہے اور مرد کے لیے خوب تر.....“

ڈاکٹر ذکی کی تو طمانیں کھل گئیں جھٹ پرئس سے ہاتھ ملانے لگے۔

”مجھے اجازت.....؟“

”آپ کے لیے لفظ شکریہ ادا کرنا ایسا ہی ہے جیسے کوئی رسم پوری کی جائے۔ میں ہمیشہ یاد رکھوں گا..... ایک چھوٹے سے معصوم بچے کے لیے آپ نے اپنا قیمتی وقت دیا۔ یوں سمجھیں اتنی دیر آپ عبادت میں مصروف رہے۔“ پرئس نے گرم جوشی سے مصافحہ کرتے ہوئے..... نظر سے بھی پاس گزاری کی۔

”اوہ..... یہ کچھ زیادہ ہو گیا..... بہر حال..... آپ کا اس میں حصہ زیادہ ہے۔“ وہ دونوں ایک دوسرے کے ساتھ جھوکام تھے اور ٹوبان کی ماں حیرت سے ساکت تھی کہ اس کے بچے کی خاطر لوگ اپنا آرام قربان کیے ہوئے تھے۔

اتنی انسانیت، اتنی خوش کلامی..... شاید پہلی بار سن رہی تھی..... بچوں کی سی حیرانی نے اس کے حسن کو دو چند کر دیا تھا۔

ڈاکٹر ذکی چلے گئے..... پرئس نے بہت احتیاط سے اس کی طرف دیکھا۔

”مجھے بھی اجازت..... البتہ میرے لائق کوئی اور خدمت ہو تو ضرور بتائیں۔“

والٹ میں سات ہزار روپے تھے نکال کر تاجور کی طرف بڑھا دیے۔ تمام لوگ بڑی دلچسپی سے نوٹوں کی طرف دیکھ رہے تھے۔ اس میں کوئی تخصیص نہیں تھی..... ”مایا“ کے لشکارے سب کی نگاہ کو چند ہیار رہے تھے۔ بات کرنی نوٹوں کی نہیں..... نوٹ بانٹنے کے انداز کی تھی..... تین کم چالیس ہزار فوراً ہاتھ میں آ گئے۔

”یہ رکھ لو..... اپنی امی کو دینا..... باقی جو کچھ بھی ہو گا وہ کل ہو گا..... میں خود تمہاری امی سے ملنے آؤں گی۔“

تاجور نے نوٹ بچے کو دیتے ہوئے اس کے خاک آلودہ بالوں کے نوکرے پر ہاتھ بھی رکھ دیا۔ اب بچے کے ہمدردوں، خیر خواہوں کی نظریں جن میں رشک بھی تھا اور حیرت بھی بچے پر مرکوز تھیں۔

مجمع منتشر کرنے کا منتر تاجور کے پاس تھا..... آہستہ، آہستہ مجمع واقعی منتشر ہو گیا..... تاجور نے اسٹاف کے لوگوں، کنسرکشن ٹیم اور پولیس کی طرف دیکھا۔

”آپ سب لوگ میرے ساتھ سائٹ آفس آئیے۔“ تاجور کے اداسان قابو میں تھے۔ وہ ایک منجھی ہوئی برئس پر سن تھیں۔ وہ نہ خوفزدہ تھیں نہ ہراساں..... ان کے پاس قوت خرید موجود تھی..... بس اب سب نے اپنے، اپنے دام بتانا تھے۔

☆☆☆

ٹوبان، پرئس کے بیڈ پر سو رہا تھا۔ اسے پرئس کے دیس سے واپس لانے کے خیال سے ہی پرئس کو تکلیف محسوس ہو رہی تھی۔ چند ٹاپے کی غور و فکر کے بعد اس نے تنہا اسپتال جانے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ آج جماعت سے نماز نہیں پڑھ سکا تھا۔ پہلے اپنے مخصوص مصلے پر عشا کی نماز ادا کی..... خاص طور پر ٹوبان کے لیے دعا کی اور ملازمین کو ضروری ہدایت دے کر اسپتال چلا آیا تھا۔ جہاں ڈاکٹر ذکی اس کے منتظر تھے۔

”پینٹ ممل ہوش میں ہے۔“ انہوں نے فوراً خوشخبری سنائی تھی۔

”ویسے کچھ پتا چلا کہ بے ہوشی کی وجہ کیا تھی.....؟“ پرئس کو ٹوبان کے گھر کی پراسرار خاموشی یاد آئی تو تجسس کی حس پوری قوت سے بیدار ہوئی۔

”سر پر شاید چوٹ لگی تھی..... شاید سردیوار سے یا کسی سخت چیز سے ٹکرایا تھا۔ اچھی خاصی swelling ہے۔“ ڈاکٹر ذکی نے جس انداز میں بتایا، لگ رہا تھا کہ انہیں بھی یقین ہے کہ عورت پر جسمانی تشدد کیا گیا ہے۔

”آپ بچے کو ساتھ نہیں لائے، وہ بار، بار بچے کا پوچھ رہی ہیں۔“ معاذ ڈاکٹر ذکی کو دھیما ہوا کہ پرئس کے ساتھ بچہ نہیں ہے۔

”وہ بہت گہری نیند سو گیا تھا..... میں اس کی مدر سے مل کر انہیں تسلی دے دیتا ہوں۔“

”اوہ شیو! آئیں میرے ساتھ۔“ ڈاکٹر ذکی اب غلٹ میں نظر آئے۔ رات کافی ہو چکی تھی وہ دن بھر آپریشنز میں مصروف رہے تھے۔ کچھ عمر کا تقاضا بھی تھا کافی تھک چکے تھے پرئس کی آمد سے انہیں اس خیال سے تقویت ہوئی کہ اب وہ گھر جا کر آرام کر سکتے ہیں۔ وہ ڈاکٹر ذکی کی تقلید میں انجیل وارڈ میں داخل ہوا تو ایک دلفریب خنکی، فنانکل و اسپرٹ کی ملی جلی خوشبو نے اس کا استقبال کیا۔

کمرے میں روشنی بہت ہلکی تھی، کافی کشادہ اور آرام دہ کمر تھا۔ اینڈینٹ کے لیے بھی بیڈ موجود تھا۔ ڈارک براڈن لیدر صوفیٹ، سینئر ٹیبل، وارڈروپ..... بیڈروم فرنیچر بہت قریب سے سب رکھا ہوا تھا۔

پرئس کی خصوصی ایڈوائز پر ڈاکٹر ذکی نے اس کے لیے انجیل وارڈ کا انتظام کیا تھا۔ ٹوبان کی ماں بیڈ پر ٹیک

## یہ کہاں بیس کہ دل ہے

اس وقت جس تکلیف سے گزر رہی ہوگی اس کا احساس کرنے کی ضرورت ہے۔ ”دھڑام سے کچھ گرا..... سفینہ نے تو گویا تقریب بہر ملاقات پر تبصرہ کرنے ہی سے انکار کر دیا تھا..... اب وہ کیا پرس کے فسانے چھیڑتی۔

”Sorry to say..... زارا..... اس وقت ہمیں اپنی ماں کی پریشانی کے بارے میں سوچنا چاہیے..... میرا ذہن تو مسلسل اماں کی طرف لگا ہوا ہے..... اتنا بڑا ایکسڈنٹ ہوا ہے..... اور اماں کو سب کچھ اکیلے فیس کرنا ہے۔“

”ساحل ہے ناں.....“ زارا نے اپنے مخصوص لاابالی پن سے گرہ لگائی تھی۔

”ساحل صرف employ ہے۔ اماں کا بیٹا نہیں..... ایک حد تک ہی اماں کو اپنی سروس پروڈامڈ کر سکتا ہے ناں۔“ سفینہ نے بڑی متانت سے جواب دیا۔

”اماں کا بیٹا.....؟ زارا اطر یہ مسکرائی.....“ اماں بہت لگی ہیں جو ساحل جیسا کوئی بیٹا نہیں.....“

”کیوں.....“ اس بیچارے نے تمہارا کیا بگاڑا ہے..... جو تم اس کے بارے میں اتنے ٹکٹو خیال رکھتی ہو.....“ سفینہ کو درحقیقت حیرانی ہوئی۔

”جنگلی ہے بالکل..... شکل دیکھی ہے اس کی.....“ کلاس..... نہیں ہے..... چچہ لگتا ہے۔“ زارا نے کوفت سے اپنی ہی شکل بگاڑی۔

”in fact کلاس تو نہیں ہے..... کلاس ہوتی تو ہمارے ہاں جاب کیوں کرتا..... اپنا پرنس کرتا.....“ یہ کہہ کر سفینہ نے انھیں کے لیے پرتولے۔

”ایک دن صبح آگیا..... سفینہ، تم دیکھتیں..... بہت انجوائے کرتیں..... میں نے تو کئی ماؤس کی طرح انجوائے کیا تھا.....“ زارا مسکرا تو ضرور رہی تھی مگر مظلوم استہزا نمایاں تھا۔

”ریڈی میڈ سوٹ..... آلٹرن بھی نہیں کرایا..... ایسے ہی پہن لیا..... اور پرفیوم کل کے لیے بچایا ہی نہیں..... سارا الٹ لیا۔“

”یہ بہت غلط بات ہے زارا..... اس کی کلاس نہیں ہے تو اس کا کیا قصور ہے..... ہمیں کوئی حق نہیں پہنچتا کہ ہم لوگ کے بچرل سیٹ اپ کو criticize کریں..... تم بہت انچور ہو..... بس جودل میں آتا ہے بولنے لگتی ہو۔“

سفینہ کے انداز میں اب بڑی بہن والی سرزنش تھی..... اس نے خاصی خفگی سے زارا کی طرف دیکھا تھا۔

”بھلا یہ کوئی موقع تھا اس طرح کی باتوں کا..... گھر میں اتنی..... پریشانی آگئی ہے اور اس کو فکر ہی نہیں.....“ سفینہ نے سوچا..... اسے تو اس وقت صرف اپنی ماں کی فکر لگی ہوئی تھی جو آدھی رات کو ایک بھران سے برسر پیکار تھیں۔

”اماں کو فون کر کے پتا کرتی ہوں، اس وقت کیا چویشن ہے؟“ سفینہ نے زارا سے جان چھڑانے کے لیے جھوٹ کا سہارا نہیں لیا۔ درحقیقت وہ یہی کرنا چاہتی تھی۔

سفینہ چلی گئی..... زارا نے ماسک نوچ کر خلا میں اچھال دیا۔

”تم کو تو سب کچھ مل گیا ہے..... تمہارے پاس سوچنے کے لیے اس ایکسڈنٹ کے سوا اور ہے کیا..... اسٹوڈیو میں پرنس نے اتنی پیاری باتیں کی ہوں گی..... بیچارے کو پتا نہیں کہ سب ضائع ہو گئیں..... یہ statue سلکون سے بنا ہے ویری سیڈ..... پرنس..... miss selection ہو گیا ہے..... استہزا ایسے مسکراہٹ ہونوں پر کھیل رہی تھی۔

حاصل بہت مظلوم ہوتا ہے مگر ظلم وہ خود اپنے آپ پر کرتا ہے..... ایک بے قراری کا عذاب تو قدرت کی طرف سے دیے ہی ملے ہے۔

”جی میرا خیال ہے مجھے آپ کی مزید خدمات کی ضرورت پرکرتی ہے۔ اس وقت آپ میرے بچے کو سنبھال کر بہت بڑی خدمت تو کر رہی رہے ہیں۔“

آواز کی ٹھنک بڑی دلنشین تھی..... ذکارانہ مزاج کے حامل پرنس کو اس ٹھنک سے ماناؤس سی گھبراہٹ محسوس ہوئی۔

”یفون آپ کے بیڈ کے ساتھ ہی لگا ہوا ہے۔ آپ اپنے ہز بیڈ کو فون کر کے انفارم کر سکتی ہیں۔“ یہ کہہ کر پرنس نے اپنے والٹ سے وزیٹنگ کارڈ نکال کر اس کی طرف بڑھایا۔

”یہ میرا کارڈ رکھ لیجیے..... اگر ٹوبان سے صبح بات کرنا چاہیں تو اس پر نمبر درج ہیں۔ آپ بات کر سکتی ہیں..... میرا پی اے فون اینڈ کرے گا، آپ ٹوبان کے ریفرنس سے بات کیجیے گا تو وہ آپ کی بات کرادے گا..... باقی رہی آپ کے ڈسچارج ہونے کی بات تو وہ صبح ہی ہوگی..... میرا خیال ہے آپ کو ابھی ریٹ کرنا چاہیے۔ اچھا اب مجھے اجازت دیجیے.....“ وہ والٹ کرتے کی جیب میں رکھتے ہوئے گویا ہوا۔

اس پر آپ کا سیل نمبر نہیں.....؟ وہ کارڈ کو دیکھتے ہوئے بولی۔

”جی میرے پاس سیل ہی نہیں ہے۔“ پرنس نے اب بھی اس کی طرف دیکھنے سے گریز کیا تھا، اس بنا پر وہ اسے بہت اچھی طرح سے دیکھ سکتی تھی۔

عجیب ذرا شخص ہے، دیکھنے میں بھی اور انداز کلام بھی..... بہت منفرد، شائستہ، طمانیت کا قیمتی احساس دینے والا.....

”مسز سلمان..... آپ ٹوبان کے لیے.....“

”میرا نام صندل ہے۔“ ٹوبان کی ماں نے پرنس کو جملہ مکمل کرنے نہیں دیا۔

پرنس کو نام خوش آیا..... مگر وہ بڑے وقار سے مسکرایا۔

”آپ مسز سلمان ہیں میرے لیے یہ کافی ہے..... اپنا خیال رکھیے گا.....“ یہ کہتے ہوئے اس نے ایک اچھٹی نگاہ بھی اس پر نہ ڈالی تھی۔

اس کو بہت دیکھا جاتا تھا..... بہت چاہ سے دیکھا جاتا تھا..... اس لیے یہ اس کی خاص ادا بن گئی تھی کہ وہ لوگوں کے دیکھنے کو نہیں دیکھتا تھا۔

مزاج میں شکرگزاری اتنی رچی ہوئی تھی کہ خود نمائی کو داغی کا راستہ نہیں ملتا تھا۔ بارش سے سیراب ہونے والے سبزے کی طرح تروتازہ و شاداب..... وہ جا چکا تھا۔

صندل مطمئن بھی تھی اور کم صبر بھی.....

”سلمان میں تم ہو جاؤں گی تو کیا کرو گے؟ حالانکہ میں تم ہونا نہیں چاہتی..... تم میری جگہ ایک اور صندل کو لے آؤ گے کیونکہ تم نفس کے ہاتھوں اتنے مغلوب ہو کہ حوا کی بیٹی کے بال سوکھنے نہیں دیتے..... کیونکہ وہ تو انسان ہی نہیں ہے۔“

صندل کی آنکھوں سے ٹپ، ٹپ آنسو گرنے لگے..... ضبط کرنا چاہا تو سر میں ٹیسس اٹھنے لگیں۔

☆☆☆

”اتنے خوب صورت ڈنر کا سارا مزہ کر کر اہو گیا.....“ زارا نے بیڈروم میں جانے سے پہلے سفینہ کے ساتھ کچھ وقت گزارنے کا ارادہ کیا تھا..... وہ شاید سفینہ کے تاثرات جاننے کے لیے بھی بے چین تھی۔ اس وقت سے جب پرنس، سفینہ کو اسٹوڈیو لے کر گیا تھا..... وہ جانا چاہتی تھی پرنس رومانس کے کس مرحلے تک پہنچ چکا ہے۔

سفینہ کا جواب بالکل توقع کے خلاف آیا تھا۔

”ہم اپنے مزے خراب ہونے پر افسوس کریں..... ایک زندگی اچانک دنیا سے رخصت ہو گئی۔ اس کی فیملی

”ہونہ۔ ایک یڈنٹ تو ہوتے رہتے ہیں۔ نچرل ہے۔۔۔۔۔ اب اسی کو لے کر بیٹھے رہیں۔۔۔۔۔“ وہ اپنے شاندار بیڈروم کی طرف بڑھتے ہوئے بڑی نخوت سے سوچ رہی تھی۔

☆☆☆

تا جو رنڈم گھر واپس آئی تھیں۔۔۔۔۔ اتنی نڈھال تھیں چلتے ہوئے محسوس کر رہی تھیں کہ جیسے گر پڑیں گی۔ سفینہ کی تدری طور پر آنکھ ضرور لگ گئی مگر دو گھنٹے بعد خود بخود ایک اندیشے نے جھنجھوڑ چکا دیا تھا۔ جاگتے ہی ماں کو فون کیا تو انہوں نے اسے سکون سے سو جانے کے لیے کہا۔۔۔۔۔ اور بتایا دیا کہ پانچ بجے تک وہ گھر آجائیں گی۔۔۔۔۔ اسپتال، پولیس اسٹیشن، آفس میں ڈنٹے داروں کے ساتھ میٹنگ۔۔۔۔۔ چار گھنٹے تو چار پل کی طرح سرک گئے تھے۔

وہ آہستہ آہستہ چلتی بیڈروم کی طرف جاری تھیں کہ سفینہ اپنے بیڈروم کا دروازہ کھول کر سامنے آگئی۔۔۔۔۔ اور بے اختیار ماں کو حاکم کر گلے سے لگ گئی۔

”تھینک گاڈ! آپ آئیں ابھی میں آپ کے لیے دعائیں کر رہی تھی۔“ بیٹی نے جس انداز میں سواگت کیا اور دعاؤں کے نذرانے بھیجے گا انکشاف کیا تا جو رنڈم کو انتہائی تھکن کے باوجود ٹوٹ کر پیارا آیا تھا۔ بے اختیار سفینہ کی پیشانی چوم لی۔

”آج تمہیں واپس جانا ہے سفینہ۔۔۔۔۔ تم ریٹ کرو بیٹا۔۔۔۔۔“ وہ دروازہ کھولتے ہوئے تھکے، تھکے لہجے میں گویا ہوئیں۔۔۔۔۔ سفینہ بھی ان کے ساتھ بیڈروم میں داخل ہو گئی۔

”آپ میری فکر نہ کریں اماں۔۔۔۔۔ مجھے اسٹڈی اور ریٹ کے علاوہ کام ہی کیا ہے۔“ سفینہ نے کلچ ان کے ہاتھ سے لیا۔۔۔۔۔ کھولا۔۔۔۔۔ سیل فون نکال کر سائنڈ ٹیبل پر رکھا اور کلچ وارڈ روپ کھول کر مخصوص جگہ پر رکھ دیا۔

”اماں آپ چھینچ کر لیں تو میں آپ کے پاؤں کا مساج کر دوں گی۔ پھر آپ کو نیند بہت اچھی آئے گی۔۔۔۔۔“ وہ جبک کرتا جو کرے سینڈل اٹھا رہی تھی۔

بہترین فرمانبردار اولاد کی نعمت کا خوشگوار احساس ہی تا جو رنڈم کی آدمی تھکن اتار گیا تھا۔ وہ ماں کی سینڈل کسی قیمتی سوغات کی طرح پیار سے اٹھائے مخصوص جگہ پر رکھنے ڈریسنگ کی طرف جاری تھی۔

”اماں آج آپ آفس نہیں جائیں گی۔۔۔۔۔ بس صرف آرام کریں گی۔۔۔۔۔ وہ جو آپ نے اتنے سارے لوگ رکھے ہوئے ہیں وہ ایک دن کے لیے نہیں سنبھال سکتے۔“ وہ ڈریسنگ سے واپس آتے ہوئے کہہ رہی تھی۔

بیڈروم فرنج سے اس نے ٹھنڈے پانی کی بوتل نکالی۔۔۔۔۔ سینڈل ٹیبل پر رکھے سادہ پانی کا جگ اٹھا کر گلاس آدھا بھرا پھر اس میں ٹھنڈا پانی ملایا اور تا جو رنڈم کے قریب آ کر بہت محبت سے پیش کیا۔

”سوری اماں۔۔۔۔۔! سب سے پہلے تو مجھے پانی دینا چاہیے تھا۔“

”کوئی بات نہیں، ان چار گھنٹوں میں آج جتنا پانی پیا ہے کبھی چوبیس گھنٹوں میں نہیں پیا۔۔۔۔۔“ وہ اس کے ہاتھ سے گلاس لیتے ہوئے مضطرب انداز میں مسکرائیں۔

”سفینہ۔۔۔۔۔ میری جان۔۔۔۔۔ یہ پاس ہوتی ہے تو گھر، گھر لگتا ہے۔“ وہ پانی کے گھونٹ لیتے ہوئے سوچ رہی تھیں۔

☆☆☆

پرنس واپس آ کر صرف دو گھنٹے سو پایا تھا۔۔۔۔۔ اس کے اپنے اندر کی گھڑی نے مخصوص وقت پر بیدار کر دیا۔ ٹوبان اس کے پہلو میں گہری نیند میں بلورے لے رہا تھا۔۔۔۔۔ پرنس کو یک دم احساس ہوا جیسے اس کی خواب گاہ، خواب گاہ نہیں ایک بہشت ہے۔۔۔۔۔ جس کے سرسبز درخت آنکھوں کو فرحت و راحت دے رہے ہوں۔۔۔۔۔ نیچے

## بہ کمال بچیں کہ دل ہے

نہیں بہہ رہی ہوں۔۔۔۔۔ پرندے خالق کی تسبیح میں رطب اللسان ہوں۔۔۔۔۔ ہر طرف سے سلام کی آوازیں آرہی ہوں۔ ایک معصوم بچے نے فطرت کو مادی دنیا کے عقب میں دھکیل دیا تھا۔

بچے سوز رہے ہوں تو فطرت کی جلوہ آرائی کمال ہوتی ہے۔ اس کا جی چاہا کہ جھک کر ایک بوسہ ثبت کرے۔ مگر احتیاط دامن گیر تھی۔ مبادا وہ جاگ پڑے۔۔۔۔۔ اور بہشت کے اطلس و دیبا کا نٹوں کی چادر میں تبدیل ہو جائیں۔

وہ بہت احتیاط سے بیڈ سے اتر۔۔۔۔۔ یوں کہ بول کی جھاڑوں کے درمیان سے گزرتے ہوئے ملبوس سمیٹ کر احتیاط کی جاتی ہے۔

اب اس کے سامنے اپنے معمولات تھے۔ نیم گرم پانی سے شاور لیتا۔ وضو کرنا، مراقبہ کرنا پھر مسجد چلے جانا۔ مسجد سے واپس آ کر دادی کو سلام کرنا، ان کی خیریت معلوم کرنا اپنی بے لوث و انمول محبت کا نئے سرے سے یقین منتقل کرنا۔۔۔۔۔ پھر وہ جب تک چاہیں پرنس کا وقت اپنی مرضی سے استعمال کریں۔

اس کا خیال تھا کہ ٹوبان چونکہ دیر سے سویا تھا چنانچہ وہ سورج نکلنے تک تو کم از کم خود سے بیدار نہیں ہو سکتا۔۔۔۔۔ پھر بھی جب وہ مسجد کے لیے روانہ ہوا تو اپنی خاندانی ملازمہ (جس کی ماں، نانی، دادی سب نے پرنس کے گھر خدمات انجام دی تھیں) کو مستعد رہنے کی تاکید کی۔۔۔۔۔ یہ خادمہ لیڈی صوفیہ اور پرنس سے پہلے جاگتی تھی اسی بنا پر اس کو ظہر کے بعد تین گھنٹے کا آرام دیا جاتا تھا اور اس سے مزید کوئی خدمت نہیں لی جاتی تھی۔

خادمہ کو ہدایات دینے کے بعد وہ مطمئن ہو کر مسجد چلا گیا تھا۔

☆☆☆

ایک بوڑھے نوجوان کی کہانی  
کہانی بھی اس کی اپنی زبانی  
دال روٹی کی تلاش میں نکلا  
اپنی say کھوئی پھر سب کی مانی  
وہ چار چوٹ کی پڑی کہ یاد آئی  
اپنی پیاری سی ماں وہ جنت مکانی  
راڈ سلک کا کرتا، راڈو گھڑی پہن کر  
اہل منبر فرما رہے ہیں دنیا ہے فانی  
دو بیٹیاں والن دے پکھن پراٹھے  
کچھ جمع ہو تو ملے ڈھول دے دا جانی

بھوک سے پیٹ میں گڑگڑسی ہو رہی تھی۔ اور شاید بھوک کی وجہ سے نیند ٹوٹی تھی۔ باہر نکل کر ناشتا کرنے کی ہمت نہیں تھی۔۔۔۔۔ لیکن میں کوئی ایسی شے رکھی یا نہیں آرہی تھی جس سے فی الفور بھوک مٹائی جاسکے۔ سوائے نمکواور ملک پیک کے۔ جب سے سائٹ آفس ٹرانسفر ہوا تھا سر کھانے کی فرصت نہیں تھی ورنہ اتنی گروسی تو گھر میں موجود ہوتی تھی کہ فائنٹ کچھ کھالی کر دھندے سے لگ جائے۔

اپنی حالت پر خود ترسی کی کیفیت پیدا ہوئی جو فوراً ہی اشتعال میں تبدیل ہو گئی۔ یہ بھی شاید ماں کی دعا تھی جو زہریلے اشعار سطح فرط اس کردل کی بھڑاس نکال لیا کرتا تھا اور تا پختہ ذہن نوجوان کی طرح نشے کا سہارا نہیں لیتا تھا۔ معاً سے یاد آیا کہ وہ جی ٹیبل سکٹ جار میں پڑے ہوئے ہیں۔ اس کا ایک دوست جو اس سے بھی زیادہ کنجوس

## یہ کہاں ہیں کہ دل ہے

”مئی بولتی ہیں جب خوب سارا رو کر دعا مانگتے ہیں تو دعا قبول ہو جاتی ہے۔“ پرنس کے حساس و فنکارانہ ادراک پر ایک ضرب کاری پڑی۔۔۔۔۔ وار او چھا نہیں تھا۔۔۔۔۔ ٹھیک نشانے پر تھا۔  
”لیکن ابھی تک مئی کی دعا تو قبول نہیں ہوئی انکل۔۔۔۔۔؟“ ٹوبان نے پلکیں جھپکیں۔

”جو لوگ اللہ کو بہت اچھے لگتے ہیں۔ ان کے پاس بہت سارے آنسو ہوتے ہیں۔ اللہ ان کی دعائیں جمع کرتا رہتا ہے۔۔۔۔۔ جمع کرتا رہتا ہے۔ اور پھر وہ ان کو جنت میں بہت خوب صورت گھر دے گا۔۔۔۔۔ خوش ہو کر خود ان سے باتیں کرے گا۔۔۔۔۔ فرشتے السلام علیکم کہنے آئیں گے۔۔۔۔۔ وہاں سب لوگ فریضہ ہوں گے۔۔۔۔۔ نہ کوئی کسی سے ناراض ہوگا۔ نہ لڑائی کرے گا۔“

”پھر تو پاپا جنت میں نہیں جائیں گے وہ تو لڑائی کرتے ہیں۔۔۔۔۔“ پرنس کے سامنے (یونیورسل) کانٹاتی فراست تھی۔۔۔۔۔ ایک لمحے کو تو چکرا کر ہی رہ گیا۔

”وہ بات یہ ہے کہ اللہ کی مرضی سے لوگ جنت میں جائیں گے۔ ہو سکتا ہے اللہ تعالیٰ تمہارے پاپا کے برین کی ڈسک چھین کر دیں اور پاپا ابھی اچھے بچے بن کر جنت میں چلے جائیں۔ ابھی تو فی الحال ہم جلدی سے مئی کے پاس جا رہے ہیں۔۔۔۔۔ آپ ٹائف فریش ہو کر بریک فاسٹ لے لو۔“ پرنس نے نونہال کو ولایت کے گھر لکھانے کے بجائے آنا فارا راستہ تبدیل کرنا ضروری سمجھا۔

”میں مئی کے ساتھ ہی بریک فاسٹ لوں گا۔۔۔۔۔“

پرنس کا سیاب ہو گیا۔۔۔۔۔ ٹوبان کو اب ماں کے علاوہ کچھ نہ سوجھ رہا تھا۔ ماں سے ملنے کی تڑپ نے اسے۔۔۔۔۔ بے چین کر دیا۔

”میرا اوتھ برش تو نہیں ہے انکل۔۔۔۔۔“ بیڈ سے اترتے ہوئے ٹوبان کو یاد آیا۔  
”اوہ۔۔۔۔۔ آج تو بس ایسے ہی کام چلانا ہوگا۔۔۔۔۔ مئی کے پاس اسپتال جائیں گے ناں تو وہاں اسٹور سے برش لے لیں گے۔“

”اوکے۔۔۔۔۔“ ٹوبان کو اب یقین واثق ہو گیا کہ وہ اپنی ماں سے ملنے جا رہا ہے۔ آنسو بھی خشک ہو گئے۔۔۔۔۔ اب وہ مکمل طور پر مطمئن نظر آ رہا تھا۔

☆☆☆

کہاں کی نیند اور کیسی نیند بس آگئی تھی۔۔۔۔۔ تھکاوٹ کی انتہا پر فطری نیند ضرور آئی تھی مگر اچانک یوں ٹوٹی جیسے کسی نے جھنجھوڑ کر جگا دیا ہو۔  
آنکھ کھلتے ہی گزشتہ رات فلم کی طرح آنکھوں کے سامنے چلنے لگی۔ احساس ذمے داری نے نیند کا فطری نشہ ہرن کر دیا۔

مردور کی تدفین ہونے تک انہیں بہت کام تھے۔۔۔۔۔ اسی آن سرعت سے ساحل کا دھیان ہوا اور ہاتھ خود بخود بیل فون پر جا پڑا۔

ساحل کا نمبر ڈائل کیا تو خوشگوار حیرت۔۔۔۔۔ پہلی بیل پر کال وصول ہو گئی تھی۔

”السلام علیکم مسیم۔۔۔۔۔“ ساحل کی چوکس آواز سماعت سے نگرانی۔

”وعلیکم السلام۔۔۔۔۔ ساحل آپ ابھی گھر پر ہیں۔؟“ تاجور نے ہدایات سے پہلے معلوم کرنا ضروری خیال کیا۔

”میں راستے میں ہوں۔۔۔۔۔ سائٹ پہنچنے میں مجھے پانچ یا سات منٹ لگیں گے۔“

”او۔۔۔۔۔ گڈ۔۔۔۔۔“ تاجور کے اعصاب یکدم پرسکون ہو گئے۔

تھاکسی فارما کمپنی میں کوالٹی کنٹرول انچارج لگا ہوا تھا۔۔۔۔۔ اس نے اسے حیرت انگیز معلومات سے نوازا کہ ہمیشہ کے لیے relaxed کر دیا تھا۔ اس کا کہنا تھا کہ ایک کوالٹی سکٹ میں دو روٹیوں کی کیلوریز ہوتی ہیں اس کے بعد۔۔۔۔۔ اس نے چائیکٹ کھا کر خود کو مطمئن کر لیا کہ اس نے اٹھ روٹیاں کھالی ہیں۔

کھانے کا مطلب کیا ہے۔۔۔۔۔ جسم کی مشین کو ایندھن دینا۔۔۔۔۔ چائیکٹ جب مشین چلا سکتے ہیں تو فکر کرنے کی ضرورت ہی نہیں۔ اور اشعار لکھنے کے بعد یادداشت نے کام شروع کیا تھا۔۔۔۔۔ اس نے فوراً اٹھ کر لاؤنج کی راہ لی۔ جہاں ٹیبل پر سکٹ کا جار کھا ہوا تھا۔ چائیکٹ ایک گلاس دودھ۔۔۔۔۔ ٹھیک ٹھاک ناشتا ہو گیا۔۔۔۔۔ کمال ہی ہو گیا۔

پانچ روپے دیباڑی کرنے والا مزدور چار پلے یا نان کھاتا ہے۔ اور ڈیڑھ لاکھ تنخواہ لینے والا چائیکٹ۔۔۔۔۔ اب وہ دودھ گلاس میں نکالتے ہوئے خود پرنس رہا تھا۔ سیدھے ہاتھ سے سکٹ کھا رہا تھا۔ اگلے ہاتھ سے دودھ اٹھ لے رہا تھا۔

آج اسے معمول سے پہلے سائٹ آفس پہنچ کر تاجور کے رجسٹر میں اپنی فرض شناسی رجسٹر کرنا تھی۔

شارٹ کٹ کی تلاش میں رہنے والے کبھی کوئی موقع ضائع نہیں کرتے۔

☆☆☆

پرنس نے آج اپنے معمول میں قدرے تبدیلی کی، لیڈی صوفیہ کے پاس جانے کے بجائے اپنے بیڈروم میں چلا آیا۔ فکر یہی تھی کہ ٹوبان بیدار نہ ہو گیا ہو۔

آہستگی سے دروازہ کھولا اور لمبی روشنی میں پہلی نگاہ ٹوبان پر پڑی۔ وہ آلتی پالتی مارے بیٹھا تھا۔۔۔۔۔ دونوں ہاتھ پھولے، پھولے گالوں پر تھے۔

پرنس سرعت رفتار سے آگے بڑھا۔۔۔۔۔ سب سے پہلے بلاسٹڈ سرکائے۔۔۔۔۔ کمرے میں یک دم اجالے بکھر گئے۔ اس کے بعد وہ ٹوبان کے پاس آیا تو ایک دھچکا سا لگا۔ ٹوبان بے آواز رو رہا تھا۔ اپنی سسکیاں دبانے کی بھی کوشش کر رہا تھا۔

پرنس نے اسے یوں سینے سے لگا جیسے وہ اس کی اپنی اولاد ہو۔۔۔۔۔

”نہ، نہ ٹوبان۔۔۔۔۔ be brave۔۔۔۔۔ آپ اپنے دوست کے گھر میں ہو پھر کیوں روتے ہو؟“ پرنس نے اس کے آنسو چوم لیے۔

”آپ کہاں چلے گئے تھے انکل۔؟ مجھے ڈر لگ رہا تھا۔“ ٹوبان نے ہچکیاں روکنے کی مقدور بھر سعی کی تھی۔  
”یہ میرا بیڈروم ہے۔۔۔۔۔ رات آپ نے میرے ساتھ یہ بیڈ شیئر کیا تھا۔۔۔۔۔ وہ نماز کے لیے مسجد تو جاتے ہیں ناں۔۔۔۔۔“

”پاپا تو نہیں جاتے۔“ ٹوبان نے برجستہ کہا۔

”بہت سے لوگ گھر میں ہی پڑھ لیتے ہیں۔“ اس نے ٹوبان کی برجستگی پر خود کو شاید پہلی مرتبہ جواب ہوتا محسوس کیا تھا مگر لمحاتی وقفے سے جواب سوجھ گیا تھا۔

”وہ گھر میں بھی نہیں پڑھتے۔۔۔۔۔ میں نے تو نہیں دیکھا۔۔۔۔۔ مئی پڑھتی ہیں اور انکل جب وہ دعا مانگتی ہیں ناں تو بہت روتی ہیں۔۔۔۔۔ میں نے بولا۔۔۔۔۔ مئی آپ اتنا سارا کیوں روتی ہیں؟ پتا ہے انکل، مئی کیا بولتی ہیں۔“ اب ٹوبان مڑ جوش نظر آیا اور جلدی، جلدی آنسو صاف کرنے لگا۔

”کیا بولتی ہیں بیٹا؟“ پرنس زندگی کے ایک انوکھے تجربے سے آشنا ہونے جا رہا تھا۔ اس کی لائبریری میں ہزاروں کتابیں تھیں۔۔۔۔۔ اور یہ بچہ بجائے خود لائبریری تھا۔۔۔۔۔ اس کی سنگت میں بل، بل کتاب بن رہا تھا۔

**سرما بہار زیست ہے..... دُر دانہ نوشین خان**

”اتنی دھند اور دبی میں جائے کاب کے لڑکھلی سڑکیوں میں جا بیٹھی ہو، عجیب سر بھری لڑکی ہو۔“ (ایک یاد)

کل کی سر بھری لڑکی آج کی سر بھری عورت ہے۔ وقت بیتاتے، سال گزرتے ہیں مگر فطرت تو نہیں بدلتی تاں، میری طرح کی کئی سر بھریاں ہوں گی جو سمر کی دیوانی ہوں گی۔ دھند اور دبیر ایک کسین رو مانوی عنوان بن چکا ہے۔ ہر سال دبیر کی آمد پوری تازگی سے وارد ہوتی ہے۔ عرش حد لہی کی یہ نظم ”اے کہتا، دبیر لوٹ آیا ہے.....“

ہو ایں سرد چن اور وادیاں دھند میں کم ہیں۔“

سدا ابھار ہے۔ یہ ایک ایسی نظم ہے جس کی کوکھ سے جانے کتنے شاعروں نے نکتی نظمیں نکالی ہیں..... نیکل کا در پچھ چھلتا ہے۔ یہ یوں میری ہم زاد ہے جو عرف کی پیموار میں اود کوٹ اسراف لے جائیں پھیلانے چھوٹی ہے، جو سرا کی بھون کی رخ بستگی کا والہانہ استقبال کرتی ہے جو سرا کی شاموں کے آنکھن میں کونلوں سے بھری آنکھٹیاں ملتا جھلتا جھل کر ننگائی اور بدھائی ہے۔ جو سرا کی انتری شام میں بام کی منڈیروں سے جلد آشیانوں کو لوٹ جانے والے پرندوں کی ڈاریں دور تلک دھیمتی ہے جو سرا کی کیار یوں میں کھلے سفید گلاب کا انجمنی بوسہ لیتی ہے۔ سرا کی روفوں کا آغا ز ہوتا ہے کوئین مل جل کر سر کی بند۔ کی کڑا ہی چڑھتی ہے۔ کہیں شب دیگ کا اہتمام ہوتا ہے۔ سحر بیا اور طو لوجات بنتے ہیں۔ آگ کے الاؤ کے گرد بیٹھے رہنے اور ہاتھ پاؤں تاپنے میں اپنا ہی مزہ ہے۔

حضرت علی کریم اللہ وجہ کار فرماں ہے کہ گمراہ کاروزہ اور سردی کی شب بیداری مومن کی بہار ہے۔ سبحان اللہ! یہ تو علی پاپی کی روحانی مدارج کی رمز ہیں..... مجھی گناہ گار، بے گناہ کے روزے بھاتے ہیں۔ نفلی روزے، منت کے روزے اور تقاروزے درکھنے کے لیے موزوں موسم ہے۔ جیاس کا احساس تک نہیں ہوتا۔ اظفاری بھی خوب کھائی جاتی ہے۔ یعنی ہم خرم و ہم شوہا پاکستان کے میدانِ عیسیٰ کے علاقہ جات میں شادیاں اکثر برائیں رکھی جاتی ہیں۔ اس میں جہاں پچھلے، اے سی کی بچت ہوتی ہے وہاں مل بیٹنے کا خلف دو بالا ہوتا ہے۔ خواتین خانہ سے پوچھتے تو سراپا ایک ایسا شب پہلو جتا جس کی جو عام طور پر خیال میں نہ آئے۔ وہ شب ہیں باورچی خانے سے چوڑی نیاں،

”میم، بوڈونٹ وری..... اگر آپ ریٹ کرنا چاہیں تو ریٹ کریں..... میں دیکھ لوں گا..... مجھے پتا ہے کہ ان سب کو کس طرح ٹریٹ کرنا ہے“

”جھینک دیویری بیچ ساحل..... آپ نے اس موقع پر بہت اچھی پرفارمنس دکھائی ہے۔“  
 ”یو آر ویلکم لیکن یہ میری ڈیوٹی ہے.....“ ساحل بھولا نہیں سارہا تھا کیسے ہاتھ کے ہاتھ محنت کا صلہ مل رہا تھا..... ساری تھکانیں اتر گئیں۔ یوں جیسے چٹان پر پڑی دھول بارش کی پہلی پھور سے صاف ہو جاتی ہے۔  
 ”ہاں تم ذرا دیکھو..... میں تھوڑا لیٹ پہنچوں گی۔ صادق (مرحوم) کے گھر بھی جاتا ہے۔ آپ میرے ساتھ، ساتھ رہیں گے..... اسی لیے فون کیا ہے کہ آپ بیچ کر لیں۔“

”او کے.....میم.....کوئی خاص بات ہوئی تو میں خود آپ کو کلائٹ کر دوں گا۔ ڈونٹ وری.....اللہ حافظ.....“  
اس کے ساتھ ہی رابطہ منقطع ہو گیا۔

تاجور نے سکون کی گہری سانس لی اور بیڈٹی کے لیے گھنٹی بجائی۔

☆☆☆

شاید عرصہ دراز بعد اتنی بزرگ خواب گاہ کا تجربہ ہوا تھا..... پرنس سے ملنے کے بعد گویا پریوں نے تھک، تھک کر سلا دیا تھا۔ کچھ ممکن اذیت کا اثر بھی تھا..... وہ تب جامی جب پرنس، ٹوبان کو لے کر روم میں داخل ہوا..... کیونکہ ٹوبان نے اندر داخل ہوتے ہی اضطرابی کیفیت میں ماں کا ہاتھ پکڑ لیا تھا..... جس سے اس کی نیند ٹوٹ گئی تھی۔

ننید بھری آنکھوں سے اس نے ٹوپان کو یوں دیکھا جیسے اسے شک ہو کر وہ کوئی خواب دیکھ رہی ہے۔  
 ”ممی.....“ ٹوپان کی آواز نے ننید کا براہ کرم بھی چاک کر دیا۔ وہ ایک جھٹکے سے اٹھ کر بیٹھ گئی اور ٹوپان کو پلٹا لیا۔

کا کروج بھی غائب ہو جاتے ہیں۔ کروں کی دیواروں پر چڑھ چکیاں نظر نہیں آتیں۔ موزی حشرات بجز مکوڑے، سمجھو رے، بچھو، سانپ بھی ختم ہو جاتے ہیں۔ یا زہر زمین چلے جاتے ہیں۔ ماحول کی ازخود صفائی ہو جاتی ہے۔ جہاں تک جاڑے کی بارش کا تعلق ہے۔ عامی موسمی تبدیلیوں کی وجہ سے سرما میں اب کم بارش ہوتی ہے۔ بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ منتوں، مردوں کے بعد ہوتی ہے۔ اب مکاؤں میں برآمدے بھی نہیں ہوتے۔ برآمدے میں بیٹھ کر بارش کا نظارہ کرنے اور شاہیں، مہل لپیٹ کر سمیٹنے درختوں کو دیکھنے کا اپنا ہی لطف ہوتا تھا۔ قلیٹ اور اونچی عمارتوں میں رہنے والے بالکونی یا ٹیرس سے بارش کا نظارہ کرتے اور نکلتا ہے۔

جومرہ چوبارے

بَلِّغْ نَهْ بَخَارِے

کبھی جو ٹوٹ کے برساتا دیکھ

لگا اپنا، بہت اپنا دمبر

جمع پونجی ہے۔ یہی عمر بھر کی

میری تنہائی اور میرا دمبیر

جوں، جوں زمانہ اپنی منزل کی جانب بڑھ رہا ہے..... موسموں سے رعنائی اور برکت کم ہو رہی ہے..... آلودہ زہریلی دھند جیسے اسوگ کہتے ہیں اس کا چند سال بیشتر شعور نہ تھا، یہ دھان ہے (دھواں)۔ اذیت ناک ہے اور اس میں محض بھری ہوئی ہے۔ بارشیں کیا بھری ہوئی ہیں۔ سر با کا دورانیہ سکرسمٹ رہا ہے۔

دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ رحمت کی بارشیں برسائے اور سبزے سبز نظر آئیں، فنائیں مصفا ہوں۔ دلوں کے میل بھی دور ہوں..... حسد، کینہ، بغض اور دیور یا ختم ہو جائیں۔ انسان کے اندر کا موسم، حیرت، بھرا اور شکر گزار بچہ بھی نہ معدوم ہو۔ یہی انسان کا باطنی حس ہے اور یہی خالق کو پسند ہے۔

”مئی آپ ٹھیک ہیں ناں.....“ ٹوبان دونوں ہاتھوں سے ماں کا چہرہ تھام کر بہت غور سے دیکھ رہا تھا۔

”میں بالکل ٹھیک ہوئی مئی کی جان.....“ وہ رو پڑی۔

”تو پھر آپ کیوں روتی ہیں، کیا پین ہو رہا ہے؟“ ثوبان آنسو دیکھ کر گھبرا گیا۔

ایک مصور کے لیے یہ ایک تصویر کشی کے جانے والا منظر تھا..... وہ ایک ننگ اس نظارے سے محفوظ ہو رہا تھا۔

”اوہ آئی ایم سوری..... مجھے خیال نہیں رہا..... بس ثوبان کو دیکھتے ہی سب کچھ بھول گئی..... یہ تو مئی کی جان

اس نے پرس سے کلام کیا مگر توجہ اب بھی ثوبان پر تھی۔

”میں..... ہم بابا والے لڑھپیں جائیں گے۔ انفل کے لڑھپیں گے.....  
 ناز و بھال کے لڑھپیں گے۔ سب سے زیادہ ان کے لڑھپیں گے۔“

”نہیں! مثلاً..... وہ صرف بابا کا گھر تھوڑا ہے،..... میرا اور آپ کا بھی تو ہے۔“

”نہیں..... ماما پھر مار س گئے۔“

صندل مارے شرمندگی کے گویا زمین میں گڑنے لگی۔

”وہ آپ کے گھر میں کوئی ملازم وغیرہ نظر نہیں آیا تھا..... گیٹ میں آٹومینک لاک ہے وہ بند کر دیا تھا..... اب

”اور غیرہ کا تو مجھے علم نہیں.....“

”اس کی آپ فکر نہیں کریں، سلمان کے پاس ہونی ہے چابی، میں کچھ دیر بعد ان کو واپس لائی کر

”اوہ.....“ صندل نے اب ایک دم جو آواز اٹھایا جو کہ رسل کی طرف سے دیکھا ”وہاں وہاں غصہ دیکھ کر صندل

خیال کرتا۔“

زارا ثنا کر رہی تھی اور رات کے منظر میں کھوئی ہوئی تھی کہ سفینہ نے آکر چونکا دیا۔

”ہوں..... وہ تو میں کرتی ہوں..... وہ صرف تمہاری نہیں میری اماں ہیں۔“ زار نے ٹکڑا توڑ جواب دینے کے بعد سینڈوچ کا ٹکڑا بھی منہ میں لیا۔

”میرا یہ مطلب نہیں ہے کہ تم خیال نہیں کرتیں..... مگر رات جو صورت حال ہوئی ہے اماں پر اس کا بہت بڑا اثر آگیا ہے۔“

”ہوں.....“ زار نے ہنکارا بھرا..... یوں جیسے جان چھڑائی ہو۔

”تمہاری فلاٹ کا کیا ٹائم ہے؟“ اس نے موضوع بدل کر نصیحت و نصیحت سے پیچھا چھڑانے کی کوشش کی۔

”شام پانچ بجے کی ہے..... گھر سے تو چار بجے نکل جاؤں گی۔“ سفینہ نے بکھرے بالوں کو سمیٹ کر جوڑا بناتے ہوئے جواب دیا۔

”پرنس تو سی آف کرنے ضرور پہنچیں گے؟“ زار نے اعصاب پر حاوی پرنس کو لاشعوری طور پر موضوع گفتگو بنایا۔

”ارے نہیں.....“ سفینہ قدرے شرما کر مسکرائی۔ ”میں کون سا ملک سے باہر راج پر جا رہی ہوں۔“

زار نے سفینہ کے چہرے پر ایک گہری نگاہ دوڑائی۔

چاہے جانے کی خوش خبری عورت کے انگ، انگ سے جھلکتی ہے..... یہی خالص عورت پن ہے..... عورت کی تخلیق کا مقصد ہی یہ ہے کہ اسے چاہا جائے اور بدلے میں اس کی ذہانت و وفا داری سے لطف اندوز ہوا جائے..... انسانی خیالات تخلیق میں کارفرما کیسیائی عناصر کو یا تو توازن دیتے ہیں یا فطرت کو ناراض کر کے توازن کا ڈھکے دیتے ہیں۔

جب تخلیق متوازن ہوتی ہے تو انسانیت مکمل ہوتی ہے..... اور ابلتیس کی مکاری سے پہلے والی بہشت کا نظارہ دنیا میں نظر آتا ہے، جہاں آدم اور حوا ایک دوسرے کی قربت میں سرشار نظر آتے ہیں۔

ابھی سفینہ ابلتیس چالوں کی گرفت میں نہیں تھی..... اس لیے خوشی کو خوف کا ادراک بھی نہیں تھا۔

گزر جانے والا لمحہ آگئی کہلاتا ہے۔ ابھی گزرے لمحات صرف مسرتوں کے پیام دے رہے تھے..... یہ موجودہ لمحے کی آگئی تھی۔

”پرنس نے تو کل بہت ڈائلاگ بولے ہوں گے.....“ زار نے اپنی فضول سی کھونج کو نئے سرے سے جگایا۔

”نہیں بھئی..... وہ بہت ڈفرنٹ ہیں..... فضول بات تو کرتے ہی نہیں ہیں فلش create کرتے ہیں..... مگر بہت realistic ہیں میری ایک تصویر بنائی ہے وہ دکھائی اور..... بس.....“

سفینہ چاہت کی خوش رنگ دھوپ میں خوب چمک رہی تھی۔

”اور بس.....!“ زار نے حیرت سے یوں دیکھا گویا کوئی جھوٹ پکڑنا چاہ رہی ہو۔

”اور بس.....“ سفینہ مسکرائی۔

”اتنا زیادہ پرسل نہیں ہوتے بھئی..... یہ باتیں کوئی بتانے والی ہوتی ہیں۔“ اس نے شریر انداز میں کہا تو زارا کا دل ہی بیٹھ گیا۔

اسی لمحے دروازہ ہلکی آواز سے وا ہوا..... صندل نے براہ راست اور پرنس نے پلٹ کر دیکھا..... ٹوبان خوفزدہ ہو کر بیڈ پر چڑھ گیا اور ماں سے لپٹ گیا، آنے والے کو پرنس نے پہچان لیا..... یہ وہی شخص تھا جو کار میں صندل سے جھگڑ رہا تھا..... یقیناً سلمان ہی تھا..... پرنس خود کار انداز میں بیڈ سے دوڑھٹ گیا تھا۔ سلمان کی آنکھوں سے جھلکنے والی سردہری اور خشونت بہت ہی واضح تھی۔

”السلام علیکم.....!“ پرنس نے مضبوط اعصاب کا مظاہرہ کرتے ہوئے مصافحے کے لیے ہاتھ آگے بڑھایا..... سلمان نے مصافحہ ضرور کیا مگر یوں گویا بحالت مجبوری کرتا پڑ رہا ہے۔

”یہ سلمان ہیں..... میرے پڑ بیٹہ.....“ صندل نے تھوک نچلتے ہوئے پرنس سے تعارف کرایا۔

”اور یہ شہر علی خان زادہ.....“ سلمان نے طنزیہ مسکراہٹ کے ساتھ کہا تو پرنس نے چونک کر سلمان کی طرف دیکھا تھا..... صندل کی حیرت کمال تک پہنچی..... اس حیرت میں سرایتی، خوف اور وحشت تھی۔

”آپ نے کیسے پہچانا؟“

”میرے سب سے دوکانر کی گئی تھیں..... میں نے دونوں کو ٹرائی کیا ایک نمبر تو کسی ڈاکٹر ذکی صاحب کا تھا اور دوسرا لینڈ لائن نمبر تھا جو کسی شہر علی خان زادہ کے ہاؤس نمبر نے ریسیو کیا اور بتایا کہ یہ پرنس شہر علی خان زادہ کے گھر کا نمبر ہے۔“

سلمان مخاطب پرنس سے تھا مگر صندل کی طرف یوں دیکھ رہا تھا گویا کہہ رہا ہو کہ ”ابھی بتاتا ہوں۔“ سر کو ہلکا سا ہلا بھی رہا تھا..... جیسے کوئی غصے میں دانت پیستے ہوئے ہلاتا ہے۔

پرنس کو اندازہ ہوا کہ اب ضروری بات کر کے ہی اس قہر کو ٹھنایا جاسکتا ہے۔

”جی میں آپ کے پڑوس میں رہتا ہوں..... ٹوبان نے مدد کے لیے بلایا تھا۔ آپ کی مسز بے ہوش تھیں۔“

”تھینک یو ویری مچ مسٹر..... اب یہ بات سمجھنا ضروری ہے کہ ٹوبان اتنی دور تک کے neighbour تک کیوں اور کیسے پہنچا؟“ دو گھر جو بالکل ساتھ ہیں..... ٹوبان ان کے پاس کیوں نہیں گیا؟ بہت خوش قسمت ہیں میری مسز..... آپ رات سے ان کی خدمت کر رہے ہیں۔“ سلمان طنزیہ مسکرا کر بولا تو پرنس کو یوں لگا گویا چھت سر پر آرہی ہو۔

”آئی ایم سوری..... میں کچھ دیر پہلے ٹوبان کو لے کر آیا ہوں..... آپ کچھ زیادہ ہی مس انڈر اسٹینڈ کر رہے ہیں.....“ پرنس نے بہت باوقار انداز میں ایک طرح سے اسے لتاڑ دیا تھا۔

”جی سلمان..... یہ ابھی آئے ہیں، ٹوبان رات کو ان کے گھر ہی سویا تھا۔“

”گنڈ پلانگ.....“ سلمان پر شاید ابھی تک نشے کا اثر تھا، بہت غیر محاط انداز تھا..... یوں جیسے سامنے والے کو جان بوجھ کر اشتعال دلا رہا ہو تاکہ وہ پہل کرے تو وہ اسے شوٹ کر دے۔

پرنس نے بہت جلد سے کچھ صاف کرنے کی نیت کی۔

”آپ اپنی فیملی کے پاس ہیں..... اگر آپ اپنی فیملی کے ساتھ نظر آئیں تو کسی کو آپس نہیں مل سکتی..... اس پر غور کیجئے گا۔“ پرنس کا انداز بدبرائتہ کا صحنہ تھا..... مگر سلمان کی آنکھوں میں خون اترنے لگا۔

”اوکے ٹوبان..... ٹیک کیئر.....!“ اس نے ٹوبان کے قریب ہونے کے بجائے دور ہی سے ہاتھ ہلایا..... اور سلمان سے الوداعی مصافحہ کرنے کا خطرہ مول نہیں لیا بلکہ اس کی طرف دیکھا ہی نہیں اور سیدھا دروازے سے باہر ہو گیا۔ اس کی چھٹی حس بتا رہی تھی کہ ٹوبان کی ماں کو اب ایک نئی آزمائش کا سامنا ہوگا۔

”جتنا نام ہے وہ سب اماں کے ساتھ گزاروں گی..... اماں کو بھی اچھا لگے گا۔“ سفینہ نے اپنی مخصوص سادگی سے جواب دیا۔

”ہاں اماں کو تو بہت اچھا لگے گا..... لاڈلی بیٹی ہوتا.....“ زار نے جلد دل کے پھولے..... مسکرا، مسکرا کر پھوڑے۔ زار نے دل فریب انداز میں ہاتھ اٹھا کر خدا حافظ کہا اور ڈانٹنگ سے چلی گئی۔

”فرق تو کرتی ہیں اماں..... مجھے تو ہزاروں مرتبہ جھاڑیں پلائی ہیں مگر یاد نہیں پڑتا کہ کبھی غلطی سے سفینہ کو ڈانٹا ہو۔“ عموماً سمجھا جاتا ہے کہ پردہ عقل پر پڑتا ہے..... مگر درحقیقت پردہ دل پر ہوتا ہے..... اور جب پردہ دل پر ہو تو انسان خود غرضی کا کمال حاصل کیے بغیر دنیا سے رخصت نہیں ہوتا۔

☆☆☆

”رات سفینہ بہت پیاری لگ رہی تھی ماشاء اللہ.....“ لیڈی صوفیہ آج نماز پڑھ کر دوبارہ سو گئی تھیں..... کبھی کبھار ہی ایسا ہوتا تھا کہ وہ رات کا کھانا لٹ کھاتی تھیں پھر صبح کو ناشتے کے بجائے فریش جوس لیتی تھیں۔ برنج نام میں بھوک مٹاتی تھیں اور دوپہر کا کھانا وقت پر کھا کر دوبارہ اپنے معمول پر آ جاتی تھیں۔

اب نیند پوری ہونے کی وجہ سے بہت فریش نظر آ رہی تھیں اور خوشگوار موڈ میں باتیں کر رہی تھیں۔ اسپتال سے واپس آ کر پرنس نے بھی دو گھنٹے آرام کر کے معمولات بحال کرنے کی کوشش کی تھی اور اس کے بعد اسٹوڈیو چلا آیا تھا..... اس کا موڈ بن گیا تھا کہ وہ کچھ دیر سفینہ سے بات کرے..... دل کے کسی کوٹے میں ایک نامعلوم احساس جرم چھپا ہوا تھا کہ شاید رات ٹوبان کی وجہ سے سفینہ کو وہ توجہ نہیں دے پایا جو بہر حال اس کا حق سمجھتا تھا۔ اس نے اپنے پی اے کو نمبر ملانے کے لیے کہا تو چند منٹوں بعد جواب ملا سفینہ گھر پر نہیں ہے۔ ابھی وہ سوچ ہی رہا تھا کہ کسی طرح سفینہ کا سیل نمبر حاصل کر کے کی لیڈی صوفیہ اسٹوڈیو پہنچ آئیں۔

وہ سفینہ سے بات کرنے کی کوشش اس لیے بھی کر رہا تھا کہ خیالات کی ایک یلغار اسے وقفے، وقفے سے گھیر رہی تھی..... بار بار ٹوبان اور اس کی ماں صندل ذہن کے پردے پر نمودار ہو جاتے تھے۔ لیکن اب لیڈی صوفیہ کی آمد کے باعث اسے اپنے تمام پروگرام موخر کرنا پڑے۔

”پرنس..... اب ایک مرحلہ طوطے ہو گیا ہے..... تمہارا کیا خیال ہے، انگیج منٹ کی رسم کرتی چاہیے یا ڈائریکٹ شادی کی بات کی جائے؟“ وہ بڑی معصومیت سے پرنس کے تاثرات دیکھنے کی کوشش بھی کر رہی تھیں۔

”یہ تا جورا آئی سے ڈسکس ہونا چاہیے۔“ پرنس نے بڑا مناسب جواب دیا۔

”ہو سکتا ہے وہ انگیج منٹ کرنا چاہیں اور آپ پہلے سے کہہ دیں کہ یہ ضروری نہیں..... پھر وہ اپنی بات نہیں کر پائیں گی۔“

”یہ تو تم نے بہت اچھی بات کی..... میں آج ہی تا جور سے کاٹلیٹ کروں گی۔“ وہ خوش نظر آ رہی تھیں۔ محبت بھری نظریں پرنس پر بچھاؤ کر رہی تھیں۔

”اگر وہ انگیج منٹ کی بات کرتی ہیں تو پھر تم سفینہ کو ساتھ لے کر انگیج منٹ رنگ لینے جانا..... چاہے ایک دن کے لیے لاہور بھی جانا پڑے..... رنگ اس کی پسند کی ہونا چاہیے۔“

”اُف کورس..... رنگ پسند کی ہوگی..... لیکن گرینڈ نام یہ کیئر کر دیجیے گا کہ وہ لوگ میرے لیے رنگ نہ بنوائیں۔ مسلمان مرد کو سونا پہننے کی اجازت نہیں ہے۔“ پرنس کو اچانک خیال آیا کہ عام طور پر معنی کی تقریب میں لڑکے کو بھی انگوٹھی پہنائی جاتی ہے۔

”ہاں..... یہ ضروری ہے..... ویسے تو ہر مسلم کو خود ہی ان تمام باتوں کی معلومات ہونی چاہیں خیر..... ہم بات

## یہ کہاں بیٹھ کہ دل ہے

اے لیس کے۔ بس اب مجھ سے مبر نہیں ہو رہا..... جی چاہتا ہے سفینہ کل ہی اس گھر میں آ جائے، میں بہت خوش ہوں۔ یہ وہی لڑکی ہے جو میرے پرنس کے لیے تخلیق کی گئی ہے..... اجلی، پاکیزہ سی..... کتنی حیا ہے اس کی اٹھوں میں جو اس کو بے پناہ حسین بناتی ہے۔ تمہیں معلوم ہے حیا تو خود حسن ہے۔“ لیڈی صوفیہ چونکہ بے حد خوش تھیں چنانچہ خوشی کے اظہار کے لیے راستے نکالتی جا رہی تھیں۔

سفینہ کا ذکر تھا..... تعریف تھی..... پرنس کو اور کیا چاہیے تھا..... وہ اپنی طرف سے کوئی بات کر کے موضوع بدلنا پسند نہ کرتا تھا..... اس کے لیے یہ بہت تھا کہ کوئی اس کے پاس موجود ہے اور سفینہ کی باتیں کر رہا ہے۔

”میری ساس نے جو انگوٹھی مجھے پہنائی تھی وہ بہت منحوس ہے..... وہ میں نے سنبھال کر ضرور رکھی ہے مگر اپنی سی بہو کو نہیں دی..... وہ اتنی قیمتی ہے کہ اس کے بدلے میں بیس تو لے سونا مل سکتا ہے..... میرے مرنے کے بعد اس کو سیل کر کے کسی غریب بچی کو شادی کا خرچہ دے دینا..... مگر اسے استعمال نہ کرنا۔“ لیڈی صوفیہ کی رواب بکنے لگی۔

انگوٹھی یاد آنے کا مطلب تھا اب وہ ماضی کی طرف لوٹ رہی ہیں..... اور کسی بھی وقت ماضی کا کوئی واقعہ انہیں حال سے منقطع کر سکتا ہے..... یہی وہ لمحات ہوتے تھے جب پرنس کو بڑی ذہانت و مہارت سے صورت حال سنبھالنا ہوتی تھی۔

”گریڈ نام..... آپ کے پاس سفینہ کا سیل نمبر ہے..... میں نے لینڈ لائن نمبر پر ٹرائی کیا مگر وہ available نہیں ہے۔“

”اوہ..... تم کتنے سہیل ہو پرنس..... تم نے ابھی تک اس کا سیل نمبر ہی نہیں لیا۔ یہ کام تو پہلی فرصت میں ہی کرتے ہیں ڈارلنگ..... ہو..... ہو.....“ لیڈی صوفیہ کھل کر ہنسیں..... جیسے بہت لطف اندوز ہو رہی ہوں۔

”میں ابھی زارا کو فون کر کے لے لیتی ہوں۔“ بھئی مجھے ایک نہیں دو پیاری سی لڑکیاں ملی ہیں..... تمہیں لائف پارٹنر اور مجھے فرینڈ بہت مزے کی باتیں کرتی ہے۔ جب باتیں کرتی ہے تو بہت اچھی لگتی ہے۔ چلو اس سے باتیں کرتی ہوں۔ شریسی بھی ہے اور ڈین بھی..... جب تم نے گھرفون کیا تھا تو زارا سے پوچھ لیتے..... ویسے بھی آج سنڈے ہے وہ گھر رہو گی۔“

”ہاں، یہ خیال ہی نہیں رہا..... بس اب آپ اپنی فرینڈ سے خود ہی نمبر لے لیں۔“ پرنس نے خوشگوار احساسات سے لطف اندوز ہوتے ہوئے کہا تھا۔

”اب میں اپنے بیڈروم میں جا کر اس سے کاٹلیٹ کروں گی..... اس چیئر پر زیادہ دیر نہیں بیٹھ سکتی..... تھوڑی دیر کے لیے تو یہ ٹھیک ہے۔“ وہ اب اپنی مخصوص کرسی سے اٹھ کھڑی ہوئی تھیں..... اور اسٹک پر دباؤ ڈال کر قدم اٹھانے کی کوشش کی۔ پرنس نے فوراً کھڑے ہو کر تھا۔

”اب اتنی بھی جلدی نہیں ہے گریڈ نام..... میں انجیلا کو کال کرتا ہوں۔“ لیڈی صوفیہ ہنستی ہوئی دوبارہ بیٹھ گئیں۔

”تم نے دیکھا خوشی نے مجھے کتنا از حیل کر دیا ہے۔“

”مجھے بھی.....“ پرنس نے شریرانہ انداز میں کہا۔

”لو یو مائی سن.....!“ لیڈی صوفیہ نے پرنس کا ہاتھ تھام کر چوم لیا۔



زارا نے ریسیور اٹھایا..... موڈ اچھا نہیں تھا اس لیے..... سی ایل آئی پر نمبر دیکھنے کی کوشش نہیں کی۔

”ہیلو.....؟“ جیسے پتھر پھوڑے۔

”جی..... مس زارا سے بات کرنی ہے.....“ مردانہ آواز میں بلا کی شائستگی تھی۔

”بول رہی ہوں۔“ ماما نوس آواز پر جیج زارا کے کان کھڑے ہو گئے..... لہجہ بھی بدل گیا۔

”ظاہر ہے۔“ وہ مختصر سا جواب دے کر باہر جانے لگی تو اس نے پھر اسے پکارا۔  
 ”سنو کتنے روز کا قیام ہے؟“  
 ”معلوم نہیں۔“ اس نے پھر دو لفظی جواب دیا۔  
 ”اماں پریشان ہو جائیں گی۔“  
 اس کا دل چاہا کہ۔ ”میری بلا سے اماں تمہاری ہیں اور ان کی پریشانیاں بھی تمہاری پیدا کردہ ہیں، تم

وہ کمرے میں آیا تو وہ تیار بیٹھی تھی۔ سادے سے لٹن کے سوٹ میں بے پروائی سے ادھر ادھر دیکھتی ہوئی وہ کچھ ایسا تاثر دے رہی تھی کہ شاہ میر کچھ اندازہ نہ کر سکا۔ اس نے کمرے پر طائرانہ سی نظر ڈالی ایک اٹپٹی، ایک بیک اور ایک شولڈر بیک سامنے پڑا تھا۔  
 ”تیار ہو؟“ اس نے سامان کی طرف بڑھتے ہوئے کہا۔

## شہر گل میں تمنا بہار کی

غزالہ جلیل راؤ



”لیڈی صوفیہ خانزادہ لائن پر ہیں۔ بات کیجیے۔“ یہ کہہ کر غالباً اس نے کال ٹرانسفر کی تھی۔  
 ”لیڈی صوفیہ۔“ اب تو زارا کے ہاتھ پاؤں پھول گئے۔  
 ”ہیلو۔“ لیڈی صوفیہ کی دھیمی مگر موسیقیت سے لبریز آواز سماعت سے نگرانی۔  
 ”جی السلام علیکم گرینڈ مام۔“ اس نے جلدی سے کیچلی بدلی اور حد درجہ تہذیب و خوش اخلاق لہجہ میں سمونے کے لیے پورا، پورا زور صرف کیا۔  
 ”کیسی ہو زارا۔“ وہ پوچھ رہی تھیں۔  
 ”آئی ایم سو فائن۔ آپ کیسی ہیں؟“ وہ اپنے اندر خوشی کی لہریں دوڑتی محسوس کر رہی تھی۔  
 ”میں بھی ٹھیک ہوں۔“ اکیچو نیکی۔ سفینہ سے کانٹیلٹ نہیں ہو پا رہا تھا۔  
 ”جی، وہ اماں کے پاس سائٹ آفس میں ہے۔“ احساس مسرت جھگ کی طرح پیٹھ گیا۔  
 ”اوہ آئی سی۔“ اچھا تو تم میرے آپریٹر کو سفینہ کا سیل نمبر لکھوا دو۔ I, I be very thankfull to you ok!  
 ”وہ انہیں میں سنا ناپا کر قدرے متفکر انداز میں گویا ہوئیں۔  
 ”جی۔ ٹھیک ہے۔“ زارا کو اپنی آواز بہت دور سے آئی محسوس ہوئی۔ کتنا حیر زدہ کرنے والا جملہ تھا۔  
 لیڈی صوفیہ لائن پر ہیں۔ وہ بھی زارا سے بات کرنے کے لیے۔ اسے سفینہ کی وجہ سے ڈسٹرب کیا گیا۔  
 کتنا خوش ہوئی تھی۔ جیسے لیڈی صوفیہ اس سے بات کرنے کے لیے بے قرار ہو رہی ہوں۔ وہ ان کے دل و روح میں سما گئی ہو۔ ٹوٹ کر یاد آ رہی ہو۔ آپ یوں لگ رہا تھا جیسے حلق میں کڑواہٹ چل گئی ہو۔  
 ”ہیلو۔“ وہی مردانہ آواز اسے متوجہ کر رہی تھی۔  
 ”جی پلیز۔ نوٹ کیجیے۔“ سخت مجبور سی تھی وہ غلط نمبر بھی نہیں لکھوا سکتی تھی، یہ بھی نہیں کہہ سکتی تھی کہ سگی بہن کا نمبر اسے یاد نہیں۔ یا سرے سے اس کے پاس ہی نہیں۔  
 اس نے مارے باندھے نمبر بولا۔ ڈہرانے کا تکلف بھی نہیں کیا۔ آہستگی سے ریسیور رکھ دیا۔  
 ”کیا ڈرامے بازی ہے۔“ پرنس کے پاس سفینہ کا نمبر ہی نہیں۔“ اب وہ کڑھ رہی تھی۔

☆☆☆

نمبر حاصل ہونے کے بعد پرنس نے بہت اہتمام سے سفینہ سے بات کرنا چاہی تھی۔ فریش جوس کا گلاس تھام کر وہ الفاظ ترتیب دینے لگا جیسے تصویر بنانے سے پہلے خاکہ مرتب کرتا تھا۔  
 اسی لمحے لینڈ لائن پر آپریٹر نے اسے کسی گیٹ کے آنے کی اطلاع دی۔ سارا مزہ کر کر اہو گیا۔  
 ”نام کیا بتاتے ہیں۔“ اس نے اندازوں میں کھیلنے کے بجائے دو ٹوک بات کی۔  
 ”جی سلمان!“ آپریٹر نے شرمندہ انداز میں جواب دیا کیونکہ اصولاً تو اسے نام معلوم کرنے کے بعد ہی پرنس کو مطلع کرنا چاہیے تھا۔

”سلمان۔ کیا ان کا بیٹا ٹوبان بھی ساتھ ہے۔“ وہ الجھن میں پڑ چکا تھا۔

”جی نہیں۔ ان کے ساتھ کوئی نہیں ہے۔“

”اچھا۔“ (نمبر) ابراہیم سے کہو وہ انیس ڈرائنگ روم میں بٹھائے۔ اور پانچ منٹ انتظار کرنے کا بولے۔“

اس نے ریسیور رکھ کر اضطرابی انداز میں اپنے چہرے پر کئی بار ہاتھ پھیرا۔

”سلمان مجھ سے ملنے کیوں آیا ہے؟“

(جاری ہے)

”تو پھر.....؟“ اس نے کئی بار ہلکتی چوڑیوں سے بے جان کمرے میں ارتعاش پیدا کیا۔

نہ جانے کتنے سوالات شکلیں بدل، بدل کر اس کے سامنے آتے رہے اور رات دھیرے، دھیرے بتتی رہی پھر وہ اٹھا اور اس کے قریب آن کھڑا ہوا۔ چند لمحے خاموش رہنے کے بعد بولا۔

”ارم.....“ وہ چپ رہی، البتہ گٹھڑی بنے وجود میں ذرا سا ہلچل ہوئی۔

”آپ مجھے بے حس سمجھتی ہوں گی۔ مجھے اپنی کوتاہی کا اعتراف ہے لیکن میں مجبور تھا اور یہ حالت مجبوری مجھے یہ شادی کرنا پڑی۔ یہ شادی نہیں میری

آرزوؤں کی موت ہے۔ اس لیے میں آپ سے سمجھوتا بھی نہیں کر سکوں گا۔ ماں کی شدید بیماری اور بہنوں کے اصرار نے مجھے یہ قدم اٹھانے پر مجبور کر دیا تھا لیکن.....“

”لیکن کیا.....؟“ اس نے ایک جھٹکے سے سروا پر اٹھایا اور حیرت سے پھٹی ہوئی آنکھوں سے اسے دیکھنے لگی۔ ”آپ کو اندازہ ہے کہ آپ کیا کہہ رہے ہیں۔“

اس نے غصے سے کانپتے ہوئے کہا۔ ”آپ مجھے اس لیے بیاہ کر لائے ہیں؟“ وہ رکی۔

”وہ لڑکی جو ٹیکڑوں لوگوں کی موجودگی میں قانون، مذہب اور تمام رسوں، رواجوں کے ساتھ بیوی کی صورت میں موجود ہے۔ اس کو آپ اپنی مجبوریوں کی کہانی سنارہے ہیں اگر آپ اتنے ہی مجبور تھے تو آپ نے انکار کر دیا ہوتا۔“

وہ بکا بکا کھڑا تھا اسے اندازہ نہیں تھا کہ چند گھنٹے پہلے جولڑکی اس کے کمرے میں لا کر بٹھادی گئی تھی وہ اتنی بے باکی سے اس کی غلطی کا احساس دلائے گی۔ وہ کسی صورت یہ گوارا نہیں کر سکتا تھا۔ اس نے ہٹ دھرمی سے کام لینا چاہا۔

”جو ہو گیا سو ہو گیا لیکن مجھے یقین ہے کہ تم جب تک میرے نکاح میں رہو گی میرا ساتھ دو گی۔ میں کوشش کروں گا کہ تمہیں ہر طرح سے خوش رکھ سکوں۔“

”اس کا مجھے اندازہ ہو چکا ہے۔“ اس نے طنز

ہو گیا وہ جو مروتھا اس کی یاد میں برسوں سے تڑپ رہا تھا اور وہ عورت ہو کر سب کچھ بھول بیٹھی۔

وہ ماں، بہنوں کی منتوں ساجتوں کے باوجود شادی سے انکار کرتا رہا۔ لیکن اب بستر مرگ پر تڑپتی فاج زدہ ماں کی آرزو ورنہ نہ کر سکا جس نے بیوی کے

لا تعداد ماہ و سال ان بچوں کو بالے میں گزار دیے تھے۔ اس نے بہت سی تکلیفیں اٹھا کر انہیں پروان چڑھایا تھا۔ تعلیم دلائی تھی اور بیٹیوں کو ان کے گھروں میں آباد کیا تھا۔ لیکن بچے کا گھر بساتے، بساتے اپنے ابدی ٹھکانے کا سوچ بیٹھی۔

وہ اس کے انکار سے تنگ آ کر عرصہ دراز سے خاموش تھیں لیکن اس بار وہ انکار نہ کر سکا۔ اور یوں ارم اس کی بہنوں کی پسند اس کی دلہن بن کر اس کے چلے

عروسی میں چلی آئی لیکن شادی کی پہلی رات ہی اس نے ارم سے دو ٹوک بات کرنے کا سوچ رکھا تھا۔

وہ کمرے میں موجود تھا۔ سگریٹ کے کش پہ کش لگاتا کسی ذہنی الجھن کا شکار تھا۔ کمرے میں تازہ پھولوں کی مہک کے ساتھ اسٹریٹ لائٹ کی خوشبو ہم آہنگ ہو کر خوشگوار سا تاثر چھوڑ رہی تھی۔

ماحول میں چھائی خاموشی اور سناٹے میں صرف گٹھڑی کی ٹپ، ٹپ زندگی کی علامت بن کر ابھر رہی تھی ورنہ کمرے میں رکھی ہر شے ساکت، بے جان اور.....

بے حس و حرکت تھی۔ وہ روایتی دلہنوں کی طرح سر جھکائے اپنے بھاری بھر کم لباس میں ہراساں، ہراساں اس کی موجودگی کو محسوس کرتے ہوئے اپنے آپ میں سمٹ رہی تھی۔

”شاید میں اسے پسند نہیں آئی؟“ دل نے..... گوش کی..... ”لیکن اس نے تو تمہیں دیکھا ہی نہیں.....“ ”داغ نے دل کی بات رد کر دی۔“ ”اپنی ماں کی بیماری کی وجہ سے فکر مند ہے۔“ دل نے پھر سہارا

دیا۔ لیکن وہ اس کے ہمراہ ماں سے ملنے گیا تھا۔ ماں بہت خوش تھی اور خوشی کے اظہار نے اس کی فاج زدہ آنکھوں سے آنسو رواں کر دیے تھے۔

تھیں۔ لیکن شاید رشتہ کرنے والوں کو بھی معلوم نہیں تھا کہ اچھے خاندان کے اندر بھی تا سورا پیدا ہو جاتے ہیں..... اور

شاہ میر واقعی ایک تا سورا تھا۔ جس کے ساتھ رہ کر وہ اس کے ختم کی طرح سلگ تو سکتی تھی لیکن جی نہیں سکتی تھی۔

شاہ میر کو اپنی آفس کو لیگ عہدین سے محبت تھی۔ اس نے بہت چاہا کہ اس کے ماں، باپ رشتہ دے دیں لیکن ذات پات اور رسم و رواج کی پابندیوں نے

اسے مجبور کر دیا تھا کہ وہ اپنی محبت سے دست بردار ہو جائے کیونکہ عہدین کے ماں، باپ نے اس کی نوکری چھڑوا کر اس پر بہت پابندیاں لگا دی تھیں۔ جی بھی وہ

اپنی محبت کی خاطر پیچھے ہٹ گیا تھا۔

ماں باپ کے نزدیک سب سے بہتر علاج یہی تھا کہ وہ عہدین کی شادی کر دیں۔ اور عہدین نے ماں باپ کی مرضی کے آگے سر تسلیم خم کر دیا تھا۔ اپنے پورے

خاندان کو مصائب و آلام سے دو چار کرنے کے بجائے وہ خود مصلوب ہو گئی لیکن شاہ میر اپنی شکست قبول نہ کر سکا۔ یوں بھی دسترس میں نہ آنے والی چیز زیادہ

پیاری لگتی ہے۔ معمولی ناک، نقشہ اور واجبی سی قد و قامت والی عہدین اس کے خوابوں میں اپسراؤں کا

روپ دھارے بیٹھی تھی اور وہ اس کے فراق میں دنیا چھوڑنے پر آمادہ ہو گیا۔ عہدین شادی کے بعد اپنے

شوہر کے ساتھ یو کے چلی گئی تھی۔ اور چار برس بعد جب واپس لوٹی تو شاہ میر اسے دیکھ کر دنگ رہ گیا۔ وہ

اتنی بدل چکی تھی کہ اسے پہچاننا مشکل تھا۔ شادی نے اس کو نکھارا ہی نہیں سنوارا دیا تھا، وہ پہلے سے کہیں خوب

صورت اور تروتازہ تھی۔

دو بچوں کی ماں بن کر اس نے اپنے ذہن کے ہر گوشے سے شاہ میر کو نکال پھینکا تھا، وہ اپنے آفس کے

ساتھیوں سے ملنے اپنے شوہر کے ہمراہ آئی تھی اور شاہ میر کی ٹیبل پر تو وہ دوسرے ساتھیوں سے بھی کم وقت

گھڑی رہی تھی۔

قیامت خیز گھڑیاں گزر چکی تھیں وہ چلی گئی اور اس کے ساتھ ہی سوچوں کا ایک لٹائیا ہی سلسلہ شروع

کس برتے پر اپنی اماں کی خواہش اور خوشیوں کو مجھ سے پورا کروانا چاہتے ہو۔ آخر تم ہو کوئی؟ میں کسی

افسانے کی یا فلم کی ہیروئن نہیں کہ تم مجھے بیچ کر تاپنا کر کے چلے بنو گے اور میں گھٹ، گھٹ کر تمہاری چست

تلے خواہ خواہ سکتی رہو گی۔ اگر اپنی اماں کی خوشیوں کا ایسا ہی خیال تھا تو پھر اس کو بھی خوشیاں دیتے.....“

مگر فی الوقت وہ کچھ نہ کہہ سکی کیونکہ آخر کو ایک انسان تھی اور انسانیت کے ناتے اس بوڑھے وجود کے

لیے اپنے لب سی لیے تھے۔

اور جس کے ساتھ دھوکا اس کی اپنی اولاد نے کیا تھا۔ وہ جانتی تو ایک جھٹکے میں بوڑھے وجود کو آریا پار

کر دیتی تھیں جس گھر انے میں اس نے آنکھ کھولی تھی..... جہاں وہ پروان چڑھی تھی۔ وہاں تربیت ہی

ایسی دی گئی تھی کہ وہ بھی محسوس کرنے لگی کہ بستر پر پڑا وہ بزرگ وجود اس کی اپنی ماں کا ہے اور ماں اس کے

نزدیک خدا کا پرتو تھی چاہے وہ کسی کی بھی ہو آخری تو ماں..... اس میں اس کا کیا تصور تھا۔ اس کے نزدیک

یہ قربانی نہ تھی بلکہ دھوکا دینے والے کا ساتھ دینا تھا۔ اس کا دل تو چاہ رہا تھا کہ وہ شاہ میر کو عدالتوں میں اتنا

کھینچے اتنا کھینچے کہ وہ بے موت مر جائے۔

مگر فی الحال اس کے لیے ممکن نہ تھا کہ ایک تو اس کی ماں اپنے مرنے کی گھڑیاں گن رہی تھی اور وہ

اسے آخری لمحوں میں اس اذیت سے دو چار نہیں کرنا چاہتی تھی دوسرے شادی کے چند دنوں میں وہ اپنے

ماں، باپ کو مسائل سے دو چار کرنا مناسب نہیں سمجھتی تھی۔ اس کے ماں، باپ نے اسے بے تحاشا جہیز دیا

تھا اور وہ جہیز جوں کا تو پڑا تھا۔

اس نے چند سادہ جوڑوں کے علاوہ کسی چیز کو ہاتھ تک نہیں لگایا تھا۔ مگر وہ اپنی طرح اپنی چیزوں کی حفاظت کرنا خوب جانتی تھی۔

شاہ میر خوب صورت تھا، پڑھا لکھا تھا اور اچھے عہدے پر فائز تھا۔ ایک مشرقی لڑکی کے لیے جن خصوصیات کی پرکھ کرتے ہیں وہ سب اس میں موجود

جانیں تو پھر بکھرتے دونوں ہیں..... لیکن عورت اپنے آپ کو سمیٹ لیتی ہے۔ مگر مرد..... مرد بکھر جاتا ہے۔

اس نے آنکھوں سے بے دریغ اُمڈ آنے والے آنسوؤں کو بہنے دیا اور بند کی پشت سے سر نکالیا۔ ایک نظر آئیے میں اپنا سراپا دیکھا۔ وہ اپنے ہاتھ پیروں پر بنے گل بوٹوں کو نہیں کھرچ سکتی تھی کتنی خوش ہو رہی تھی۔ وہ مہندی کا گہرا، گہرا رنگ دیکھ کر۔ مہندی والی نے بھی دونوں ہاتھوں میں اس کا نام بھر دیا تھا۔

”میری مہندی، میرے گجرے، میری چوڑیاں، میرا منگول بھرا بھرا سلوتا جو دو کوئی چیز بھی تو اسے متاثر نہیں کر سکی۔ ایک دم ہی جھولی بھر کر دکھ مجھ پر انڈیل گیا۔“ وہ سوچتی رہی اور آنسو بھل، بھل بہتے رہے۔ موزن کی آواز نے اس کے لبوں پر خفیف سی مسکراہٹ بکھیر دی۔ اس کی امی ہمیشہ کہتی تھیں ارم تمہیں نماز کے لیے کئی بار اٹھانا پڑتا ہے اور وہ ہنس دیتی تھی۔

”امی جان.....! دراصل تیسرے پہر کی نیند ہوتی ہی مزیدار اور گہری ہے لاکھ کوشش کرتی ہوں آنکھ ہی نہیں کھلتی۔“ آج تیسرے پہر کی نیند اچاٹ تھی اس نے اٹھ کر وضو کیا اور الماری کے اوپر رکھا مصلیٰ بچھا کر نماز پڑھنے لگی۔

اس کا دل بھر، بھر آیا وہ ہلک، ہلک کر تپ کر روتی رہی اور خدائے بزرگ و برتر سے اپنے لیے صبر اور ہمت کی دعائیں مانگتی رہی۔ پھر اس سر در فلی شب کی سحر بھی دن میں بدل گئی۔ اس کی نیند صائمہ کمرے میں آئی تو ایک دم ٹھنک کر کھڑی ہو گئی۔

”بھابی آپ کی آنکھیں بہت سرخ اور سوجی ہوئی ہیں۔“ اس نے مسکرا کر صائمہ کو دیکھا اور ہنس کر بولی۔

”دراصل رات مجھے نیند ہی نہیں آئی اپنے بستر اور کمرے کے بغیر تو میں کبھی سوئی ہی نہیں۔“

شاہ میر کمرے میں آیا تو صائمہ نے اپنا سر جھکا لیا۔ اس کی آنکھیں بھی بہت سرخ تھیں۔

”میں ناشتا لاتی ہوں۔“ صائمہ نے باہر جاتے ہوئے کہا۔ ”ناشتے کے بعد بھائی، بھابی تو دروازہ بند

ان پر سایہ قن پلکیں اس کے جذبات کو چھپانے میں پوری طرح کامیاب تھیں۔ اس نے اپنے لیے بالوں کو سمیٹا اور ایک پن لگا کر کھڑی ہو گئی۔ مطلب صاف ظاہر تھا کہ اب وہ سونا چاہتی ہے۔ شاہ میر نے تکیہ اٹھایا اور سامنے صوفے پر رکھ کر سونے کی تیاری کرنے لگا۔

”میں دوسرے کمرے میں سونا چاہتی ہوں۔“ وہ اسے دیکھ کر بولی تھی۔

”یہ مناسب نہیں۔“ وہ سپاٹ لہجے میں بولا۔

”اور میرے لیے یہ مناسب نہیں۔“ اس نے سخت لہجے میں کہا تو وہ نرمی سے بولا۔

”میں دوسرے کمرے میں سو جاتا ہوں مگر صبح میری بہنیں آئیں گی تو.....؟“

”صبح کی صبح دیکھی جائے گی۔“

رات بھر اسے نیند نہیں آئی۔ بلکہ سے کھٹکے پر اس کی جان نکل جاتی تھی۔ اتنے بڑے دھوکے کے بعد اس کا اعتبار یکسر ختم ہو چکا تھا۔ وہ اس شخص کی بنی ہی نہیں تھی

کہ سارے جذبے مٹی ہو گئے۔ اور اس کے بعد ابھر ابھر کر سامنے آنے والا جذبہ بھر پور نفرت کے سوا کچھ نہیں تھا۔ اب اس سے اس کا کوئی مطلب نہیں تھا۔ صبح کے قریب اس کی آنکھ لگ گئی۔ اچانک وہ چونک کر اٹھ بیٹھی۔

اسے یوں محسوس ہوا جیسے کوئی اس کے قریب آیا تھا۔ کسی نے جھک کر اسے دیکھا تھا۔ اس نے اپنے چہرے کے قریب کسی کی بے ترتیب سانسون کو محسوس کیا تھا۔ اور پھر گہرا کر اس نے آنکھیں کھول دیں تو ساری آوازیں قدموں کی چاپ میں گم ہو گئیں۔

اس نے بند پر بیٹھے، بیٹھے چاروں طرف گھرائی، گہرائی نظروں سے دیکھا۔ کمرے میں گہرا سناٹا تھا خاموشی تھی۔ درمیانی دروازہ اسی طرح بھڑا ہوا تھا جس طرح وہ رات بھر سے دھبھی رہی تھی۔ البتہ شاید یہ ان کا

برآمدہ تھا جس میں ہلکی، ہلکی روشنی جھلک رہی تھی۔ بند سے نیچے پیر لٹکائے وہ سوچتی رہی آخر وہ کیا کرے؟

مہرت واقعی عورت ہوتی ہے اور مرد صرف مرد ہوتا ہے۔

”اب مرد بھی دیکھتے ہیں اور عورتیں بھی اور خواب ٹوٹ

والے اور تمہارے گھر والے کچھ کہیں تو جواب تم ہی دو گے، اس لیے کہ مجبور میں نہیں، تم ہو۔ اور یہ کہ میں طلاق سے نہیں ڈرتی، میں ایک پڑھی لکھی لڑکی ہوں، آج کے دور کی لڑکی..... میرے خاندان والے روشن خیال ہیں، میں سمجھتی ہوں کہ اسلام میں سب سے

نا پسندیدہ چیز طلاق ہے اور ہمارے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو اس لفظ سے نفرت تھی لیکن انہوں نے ہم

عورتوں کو یہ حق دیا ہے کہ وہ ناپسندیدہ مرد کے ساتھ زندگی بسر نہیں کرنا چاہیں تو اپنا یہ حق ضرور استعمال کریں

اور مجھے سارے حق استعمال کرنے آتے ہیں، کاش مجھے معلوم ہوتا تو میں اپنا سہلا حق استعمال کرتی جو نکاح جیسے

مقدس فریضے کی ادائیگی کے وقت استعمال کرنا ہوتا ہے۔ بہر حال میں مجبور نہیں اور نہ میں مجبوری کی ہر بات

قبول کرنے کو تیار ہوں گی۔“ وہ انھی اور ڈیرینک ٹیبل کے سامنے بیٹھ کر ایک، ایک زیور اپنے بدن سے جدا

کیے اور پھر بال کھول کر ہاتھ روم میں گھس گئی۔ ٹھنڈے، ٹھنڈے پانی کی پھواروں نے اس کے

کتے تپتے ہوئے دماغ کو قدرے سکون بخشا اور نہ معلوم کب تک وہ شاہ کے پانی اور آنسوؤں کے ریلوں کو

گڈمڈ کرتی رہی۔ اس کا دل پھٹ پڑنے کو تھا۔ سارا وقت اس کی

بہنیں، اس کی سہیلیاں اور شادی میں شریک لوگ ان دونوں کی کس قدر تعریفیں کرتے رہے تھے۔ اس کے

ذہن سے ٹکرانے والا ایک، ایک جملہ اسے رونے پر مجبور کر رہا تھا تب وہ خود کو کتنا خوش قسمت سمجھ بیٹھی تھی۔

”آہ کس قدر خوش ہوں گے میرے بہن، بھائی کہ میں اتنی اچھی جگہ پایا بی گئی ہوں لیکن کوئی نہیں جانتا

کہ میں کس جہنم میں جھونکی گئی ہوں۔“ اوپر سے پُر اعتماد مگر اندر سے وہ ٹوٹ رہی تھی۔ کافی دیر بعد سادہ...

سے نائٹ سوٹ میں باہر آئی تو وہ جوں کا توں صوفے پر بیٹھا سوچوں میں گم تھا۔ اسے دیکھا تو چونک پڑا۔

اس کا حسن مکمل تھا۔ وہ کسی زیور یا سجاوٹ کی محتاج نہیں تھی۔ بڑی، بڑی آنکھیں جھلکی ہوئی تھیں اور

سے کہا۔ ”کیا میں پوچھ سکتی ہوں کہ اس دھوکے بازی کی اصل وجہ کیا ہے اور پھر اگر ڈراما ہی کرنا تھا تو اس مقصد کے لیے کسی کہنے والی کو کرایے پر لے آتے کسی معزز اور شریف گھرانے کی لڑکی کو پریشان کرنے کی کیا ضرورت تھی۔“

”میں ہر قیمت پر اپنی ماں کو بچانا چاہتا تھا۔“

”اب میں کیا خدمت سرانجام دے سکتی ہوں۔“ وہ غصے سے کانپتے ہوئے بولی۔

”اس وقت تک جب تک ماں اپنی آخری سانس پوری نہیں کر لیتی مجھ سے تعاون.....“ اس نے

چبا، چبا کر کہا۔

”اور اس کے بعد؟“ اس کا لہجہ ہر آلود تھا۔

”ہم دونوں کے راستے جدا ہوں گے۔“

”لیکن اس کی وجہ.....؟“

”عورت سے انتقام جس نے مجھے لوٹ کر یہ ثابت کر دیا کہ دنیا کی ساری عورتیں ایک ہی طرح کی

ہوتی ہیں۔ اور ان سے یہی سلوک کیا جاتا چاہیے۔“

”مسٹر شاہ میر تم سے ہرگز نہیں ڈروں گی، میں تمہیں وہ سبق دوں گی کہ تم ساری زندگی یاد رکھو گے۔

تم ایک بزدل انسان ہو جو ایک طرف اپنی ماں کو اذیت سے مرتا نہیں دیکھ سکتا اور دوسری طرف اس اذیت کو کم

کرنے کے لیے اسی جیسی عورت کا سہارا لینا چاہتا ہے۔“

اس نے دکھ سے سوچا۔

”یہ تکلیف وہ سفر جو نامعلوم عرصے تک میں تمہاری ہمراہی میں کاٹوں گی۔ اس میں، میں تمہاری کسی شرط کی پابند نہیں رہوں گی۔ میں کیا کرتی ہوں، کب جانی ہوں کب آتی ہوں یہ میرا ذاتی معاملہ ہوگا۔ تم صرف اپنے یا میرے رشتے داروں تک میرا ساتھ دو گے۔ بیٹیوں والے مجبور ہی لیکن اس قدر بھی مجبور نہیں ہوتے کہ شاہ میر جیسے لوگوں کے کھوتوں کو قبول کر لیں۔“ وہ بہت ثابت قدمی سے بولی تھی۔

”دوا جنسی مسافر گاڑی کے ڈبے میں کچھ وقت تو خاموش رہ سکتے ہیں لیکن زیادہ عرصہ نہیں اس لیے دنیا

کر کے سو جائیں گی اور آپ باہر چل کر انتظامات سنبھالیے، آج آپ کا ولیمہ ہے۔“

”تو پھر جلدی سے ناشتے آؤ، میں تیار ہو کر آتا ہوں۔“ اس نے پیار بھری نظروں سے صائمہ کو دیکھا اور ہاتھ کا سگریٹ ایش ٹرے میں بچھاتے ہوئے کہا۔

وہ ہاتھ روم سے نکلا تو حیرت کے مارے اس کی سانس بند ہونے لگی۔ وہ فیروزی اور جامنی استراج کے گولڈن کام والے سوٹ کے ساتھ بھاری بھر کم جیولری پہنے گھرے میک اپ کے ساتھ تیار تھی۔

”میں ناشتا نیچے کے کمرے میں کروں گی۔“ مختصر سے اس جملے کے ساتھ ہی سلسلہ کلام ختم ہو چکا تھا۔

صائمہ کے ہاتھ سے ٹرے لیتے ہوئے اس نے کمال محبت سے کہا۔

”صائمہ انہوں نے تمہیں روکا نہیں کہ تمہیں ناشتا لانے کی زحمت اٹھانی پڑی حالانکہ میں نے رات ہی کہہ دیا تھا کہ ناشتا ہم ای کے ساتھ کریں گے۔“

”اوہ بھائی.....“ صائمہ کی آنکھیں بارشگر سے لبریز ہو گئیں۔ کل تک ان کو گمان تک نہیں تھا کہ آنے والی ان کے حق میں کیسی ثابت ہوگی۔ مگر آنے والی نے تو ایک دن کا دلہنا بھی نہ کروایا اور محبتیں بانٹنے لگی۔

ماں نے کانپتے ہوئے ہاتھوں سے اس کا چہرہ اپنے ہاتھوں میں لیا اور آنکھوں سے بلائیں لینے لگیں۔

”ان کا علاج کون سے ڈاکٹر سے ہو رہا ہے؟“ اس نے صائمہ سے پوچھا۔

”ڈاکٹر رفیع سے۔“ صائمہ نے دکھے لہجہ میں کہا۔

”میرے چچا کی بیبی کیفیت تھی۔ مینوبوں ڈاکٹر رفیع کا علاج ہوا لیکن کوئی افادہ نہیں تھا۔ پھر دوسرے ڈاکٹر کا علاج شروع ہوا خیراب تو وہ اچھا خاصا چل پھر سکتے ہیں۔ میں جاؤں گی تو چچا جان سے مکمل معلومات لے کر آؤں گی۔“

”بھائی آپ رات کو چلی جائیں گی اپنے گھر والوں کے ساتھ؟“ صائمہ نے حیرت سے کہا۔

”ہاں گڑیا دستور یہی ہے ورنہ میرا دل تو نہیں

چاہ رہا۔“ اس نے کن آنکھوں سے شاہ میر کو دیکھا۔ وہ چپ چاپ بیٹھا تھا۔ ناشتے کے بعد وہ اپنے کمرے میں آگئی۔

ولیمہ بہت کدو فر سے ہوا۔ شہر کی نامور شخصیات مدعو تھیں وہ کبھی، کبھی نظر اٹھا کر جب بہن، بھائیوں اور ماں، باپ کے مطمئن چہروں کی طرف دیکھتی تو اس کے دل پر قیامت سی گزر جاتی اس کا جی چاہتا پھوٹ، پھوٹ کر روئے اور آنے والے سارے مہمانوں سے کہے۔

”آؤ! میرے دل کی حالت زار کو دیکھو، کیسے الاؤ روشن ہیں، کس جہنم میں جل رہی ہوں۔“

لیکن وہ کسی سے کچھ نہیں کہہ سکتی تھی۔ اس نے سوچ لیا تھا کہ وہ اس شخص کو ایسا سبق سکھائے گی کہ وہ رہتی دنیا تک خود کو معاف نہ کر سکے گا۔

وہی گھر تھا، وہی لوگ تھے، وہی درود پوار تھے۔ وہی اس کا کمر تھا جس کی ایک دیوار میں بے فیلفوں میں اس کی کتاب جچی تھیں۔ ڈیرینک ٹیبل پر اس کی سب چیزیں ویسے ہی جچی تھیں۔ ہاتھ روم میں اس کے کپڑے منگے تھے اور اس کی الماری کی چابی اب بھی پھولوں والی لکٹ باسکٹ کے ساتھ لٹک رہی تھی۔ لیکن وہ خود بدیل گئی تھی۔ سر سے پیر تک اس گھر کے لیے اجنبی بن چکی تھی۔

اس کے بہن، بھائی اس کے ارد گرد بیٹھے اس کے کپڑوں کو زیوروں کو آنکھوں والے مہندی سے سجے ہاتھوں کو دیکھ، دیکھ کر خوش ہو رہے تھے۔ چھوٹے، چھوٹے جملے، مسکرائشیں، ہنسی، مذاق ہو رہا تھا اور وہ ان کا ساتھ دے رہی تھی۔ پھر اس نے ایک بھر پورا انگڑائی لی۔ ”چلو بس اب سوتے ہیں۔“

”پچھو میں آپ کے پاس سوؤں گی۔“ اس کی بہت جی سیرا چل گئی۔

”آؤ!“ اس نے اسے ہانپوں میں بھر لیا اور اپنے میں آگئی۔ اور اسے لیے یونی اپنے بستر پر لیٹ گئی..... کمرے میں چاندنی، در سے سجے چھن، چھن کر آرہی تھی۔

”سیسا سوگنی کیا؟“ چھوٹی بھابی نے اندر آتے ہوئے پوچھا۔

”ہاں ایک دم گہری نیند میں ہے۔ وہ تو اندر آتے ہی سوگنی تھی۔“ اس نے ایک گہری سانس لی جو سانس کم اور آہ زیادہ تھی۔ بھابی نے چونک کر اسے دیکھا اور اس نے فوراً انس کر کہا۔

”تو بہ، تو بہتی واپیات رسوں سے سابقہ پڑتا ہے، شادی کرنا آسان بات نہیں بھابی! تو یہیں تو تھک گئی۔“ اس نے کانوں کو ہاتھ لگاتے ہوئے کہا۔

”بھابی ذرا پردے برابر کرتی جائیں۔“ اس نے جاتی ہوئی بھابی سے کہا۔ وہ شاید اس سے باتیں کرنے آتی تھیں لیکن اس نے یہی تاثر دیا کہ وہ سونے لگی ہے۔

”خیریت، پہلے تو چاندنی کی دیوانی تھیں، اب کیا ہوا؟“ وہ ہنس کر بولیں۔ ”بڑی جلدی تبدیلی آئی ہے کچھ دیر تو مبر کرو۔“

”اوہو نہیں بھابی! اس دھندلی چاندنی سے تو خوف آتا ہے۔“ بھابی نے اسے حیران ہو کر دیکھا اور پھر کندھے اچکا کر باہر نکل گئیں۔

☆☆☆

”بھائی مجھے گھر چھوڑ آؤ۔“ دوسرے دن ناشتے کے بعد اس نے بھائی ندیم سے کہا۔

”ابھی سے؟“ مارے حیرت کے سب براؤمڈے میں آن کھڑے ہوئے۔

”ممی پچھو پھر جاری ہیں۔“ سیزا زور سے چیخی۔ وہ اس کی ٹانگوں سے لپٹ گئی۔ ”پچھو ابھی نہ جاؤ۔“

ای گم کم کھڑی تھیں۔ جیسے اب وہ پرانی تھی کچھ کہنے کا حق ہی نہیں رہا تھا۔

”بی ہو کا دل نہیں لگ رہا۔“ بھابیاں مسکرا رہی تھیں۔ تب چھوٹی بھابی جو اس کی دوست بھی تھیں اور ہم راز بھی لیکن شاید اب وہ بھی صرف بھابی تھیں۔ دوست یا ہم راز ہوتیں تو اس کے ساتھ ہونے دنیا کے سب سے بڑے ظلم پر وہ انہی کے کندھے پر سر رکھ کر جل تھل چلا دیتی۔

## نشد گل میں تمنا ببار کی

”بے شرم کچھ تو شرم کرو، سب، پچھو، آپ کی رٹ لگا رہے ہیں اور تو بے کہ طوطے کی طرح دیدے ہی پھیر لیے۔“ بھابی نے آگے بڑھ کر کہا تھا۔

”یہ بات نہیں بھابی دراصل وہ جس کی خوشی کے لیے میں اس گھر میں ہوں وہ لب دم ہیں ایسا نہ ہو کہ.....“ اس نے گردن جھکا لی۔

”بہانے نہ بنا.....“ چھوٹی بھابی نے پھر بھی نہ مانا کہ وہ ساس کی وجہ سے جاری ہے۔

”اللہ کی قسم بھابی جو جھوٹ بولوں بس صرف اور صرف ساس کی خاطر..... دیکھو ناں بھابی! آپ کو میری ماں اچھی لگتی ہے ناں۔“

”ہاں کیوں نہیں، ہمیں تو اپنی امی سے بڑھ کر عزیز ہیں۔“ تینوں بھابیوں نے کہا تو وہ حسرت سے بولی۔

”بھابی! یہ سب آپ لوگوں کی تربیت کا نتیجہ ہے اگر میں ابھی سے ان سے محبت کروں گی تو وہ بھی میری قدر کریں گے اور آئندہ مشکلات کا سامنا نہیں ہوگا۔“

اماں نے ستائش بھری نظروں سے اسے دیکھا ان کا سر فخر سے بلند ہو گیا۔ وہ خوش ہو کر بولیں۔

”سدا کھی رہو، جاؤ بہن کو چھوڑ آؤ، سدا سہاگن رہو پھر آجانا۔“ ان کے خیال میں وہ بے انتہا فرمانبردار بہن چکی تھی۔

اس کے آنسو کہیں اندر ہی اندر گر رہے تھے۔ یہ کیسا انوکھا دور تھا۔ محبت کی عجیب تقسیم تھی۔ جس کے لیے اپنے رشتے چھوڑ دیے۔ گھر چھوڑا..... جسے سیکڑوں لوگوں کی موجودگی میں جسم و جاں کا مالک تسلیم کیا وہی منافقت کر رہا تھا۔

ارم کے لیے اس کی سب سے بڑی خوبی یا خافی اس کی فطری جرات تھی۔ جس کی موجودگی میں وہ بڑے، بڑے فیصلے بہت بہادری سے بہت کم وقت میں بڑی منصوبہ بندی سے کر لیتی تھی اور یہ قدرتی امر تھا کہ ان فیصلوں پر کار بندہ کر وہ بڑی ثابت قدمی اور حوصلے سے وقت کا انتظار کرتی تھی لیکن یہاں وہ تھک سی گئی تھی۔

اس نے انکساری سے کہا تو صائمہ ابدیدہ ہو گئی۔  
”ایسا تو نہ کہیں بھائی، رات اماں بھیا سے کہہ رہی تھیں۔“ اپنی بیوی کے پاؤں دھو، دھو کر پیو۔ تو کم ہے نہ معلوم کون سی نیکی تھی جس کے طفیل ارم کو قدرت نے میری بہو بنا دیا۔“

اس رات اسے دیر تک نیند نہیں آئی۔ کروٹیں بدل، بدل کر وہ تھک چکی تھی۔

اداس اور میلی چاندنی درپے سے اندر آرہی تھی۔ شاید آج چاند بھی اس طرح اداس تھا۔ وہ ابھی اور دروازہ کھول کر باہر آ گئی۔

لیکن یہ دیکھ کر وہ حیران رہ گئی اس سے پہلے ہی ٹیس کی ریٹنگ پر شاہ میر جھکا کھڑا تھا قدموں کی آہٹ پر مڑا اس نے واپسی کے لیے قدم آگے بڑھالیے۔

”ارم.....“ اس نے وہیں سے آواز دی۔  
”کیسے۔“

”واپس کیوں جانے لگیں، میں چلا جاتا ہوں۔“ اس کا لہجہ دکھ سے چور تھا۔

”نہیں، میں کمرے کی گھٹن سے پریشان ہو گئی تھی ویسے میں کل واپس چلی جاؤں گی۔“

”کہاں؟“ بے اختیار اس کے منہ سے نکلا۔

”اپنے گھر.....“ اس کا لہجہ زہرا لود تھا۔

”اور یہ کس کا گھر ہے؟“

”اس گھر سے میرا کوئی تعلق، کوئی رشتہ، کوئی واسطہ نہیں۔ وہ ایک فرض تھا۔ اس انسانیت کے ناتے جسے میں نے بہ احسن نبھادیا۔ اسی انسانیت سے میرا اعتبار اٹھ چکا ہے۔ اس سات ماہ کے عرصے میں، میں نے اس گھر کی کسی چیز یا کسی شخص سے کوئی جذباتی تعلق پیدا نہیں کیا۔ اس گھر کی کسی چیز پر اپنا حق نہیں جتایا۔ اس لیے بہر حال مجھے جلد یا بدیر اس گھر کو چھوڑنا تھا۔ آپ کی امی اب بالکل تندرست بلکہ صحت مند ہو چکی ہیں اب اس گھر کو میری قطعاً ضرورت نہیں۔ میں نے ان ڈاکٹروں کو بھی جو حیرت کر دیا ہے جنہوں نے ان کی سانسوں کو گنتی کی سانسیں بتا کر آپ کو اس

جذبات سے خود دست و گریباں ہوتی جب اس کی پڑوسن اس کے سامنے اپنے، اپنے شوہروں کی باتیں کرتیں۔

”اللہ نہیں، وہ تو میرے بغیر کہیں جانے کا تصور بھی نہیں کرتے۔“

”نہیں ابھی آج کہاں؟ چھٹی کے دن تو بیویاں بالکل پابند ہوتی ہیں..... ہفتے میں ایک روز تو وہ گھر پر ہوتے ہیں، بھلا کہیں جانے دیتے ہیں۔ وہ تو کہتے ہیں بس اس روز تم مجھ سے باتیں کرنی رہا کرو۔“

”ہائیں۔“ وہ چونک پڑتی دیکھا باتیں کرتی ہوں گی یہ عورتیں۔“ اس کے مقدر میں تو وہ ہی پہلے روز کی باتیں آئی تھیں۔ جنہوں نے اسے جہنم میں دھکیل دیا تھا۔ اب تو صرف یہ ہوتا ہے۔ ”میرا رومال کہاں ہے؟“ فضا ہموار پا کر سوال ہوتا۔

”وہیں جہاں سارے رومال ہیں۔“ منہ ادھر اور جواب ادھر۔

”کھانا لگاؤں؟“

”کھالیا ہے۔“

”میں ای کی طرف جاؤں گی چار بجے نو بجے واپس آ جاؤں گی۔ اماں کی دوائیاں ختم ہیں۔ بجلی کا بل پڑا ہے۔“ وغیرہ، وغیرہ.....

اور اب اس ڈرامے کے ڈراپ سین کا وقت آچکا تھا۔ اماں بالکل صحت مند تھیں۔ ڈاکٹرز نے طاقت کے علاوہ ساری دوائیاں بند کر دی تھیں۔

صائمہ امتحان دے کر لمبے عرصے تک فری ہو چکی تھی اور گھر کی دیکھ بھال کے لیے دو عورتیں بہت تھیں۔

اس رات وہ سارے کام نمٹا چکی تھی بچی کے ڈبے تک دھو ڈالے تھے، مسالے واپس شیشے کی بوتلوں میں ڈال چکی تو صائمہ نے آکر کہا۔

”بس کریں بھائی، آپ تو اپنی ہمت سے بھی بڑھ کر کام کرتی ہیں، سچی اماں کی جتنی دعائیں آپ کے حصے میں آئی ہیں اتنی تو ان کی پوری اولاد نہ لے سکی۔ آپ بہت اچھی ہیں بھائی۔“

”محبت ہے اماں کی ورنہ میں نے کیا ہی کیا ہے۔“

اور جسم کے ہر حصے میں درد کی باڑ سی آگ آتیں۔ وہ جس کے لیے خود کو لوہے اور پتھر میں ڈھال رہی تھی کبھی، کبھی اس پر نظر پڑتی تو دل درد کا گھر بن جاتا۔

رہ، رہ کر بوجی ”کون تھی وہ جس نے عشق اس سے کیا اور بیاہ کسی اور سے رچا بیٹھی۔ کاش میں، میں اسے ایک بار دیکھ پاتی۔“ پھر بہت جلد اسے موقع بھی مل گیا تھا۔

وہ آفس میں تھا۔ صائمہ تقریباً بھاگتی ہوئی آئی۔

”بھائی! بھائی نے فون کیا ہے، ان کے کالے کوٹ میں ان کا آئی ڈی کارڈ پڑا ہے۔ وہ نکال دیں ابھی دفتر سے آ دی آ رہا ہے اس کو دینا ہے۔“

اس نے بچپاتے ہوئے سارے کوٹ دیکھ ڈالے کارڈ تو نہ ملا ایک لفافہ بندل گیا۔ جس میں بہت ساری تصویریں تھیں۔ چند منٹ بعد پھر فون آیا کہ

”کارڈ اس کی اپنی جیب سے نکل آیا ہے۔ لہذا تلاش نہ کریں.....“ اس نے جلدی سے دروازہ اندر سے بند کیا اور لفافہ احتیاط سے کھولا۔ یہ سارے فوٹو گرافس یقیناً اسی لڑکی کے تھے۔ وہ غور سے دیکھتی رہی۔

کہیں کوٹ کو ہاتھوں پر ڈالے اس نے سکرارتے ہوئے تصویر کھنچوائی ہوئی تھی تو کہیں پتوں سے جھانکتے ہوئے کہیں چوٹی آگے ڈال رکھی تھی تو کہیں بال بکھیرے ہوئے اور کہیں اپنا سر شاہ میر کے کندھے پر..... دکا رکھا تھا۔ باغوں، بلبوں اور درختوں میں کھینچی گئی تصویروں کا پلندا دیکھ کر اسے سخت افسوس ہوا۔

کس ڈھٹائی سے اس لڑکی نے کوئی اور گھر آباد کیا ہوگا، اسے پہلی بار شاہ میر پر حرم آیا اور اس لڑکی سے نفرت محسوس ہوئی۔ یقیناً اس کے اندر شرافت ہے کہ وہ اس فتنے کو بھلا نہیں پایا۔ مرد ہو کر اس نے تو کچھ خیال بھی رکھا۔ جبکہ اس نے عورت ہو کر ساری حدیں ختم کر ڈالیں۔ اس نے پھر لفافہ بند کیا اور اسی کوٹ کی اندرونی جیب میں ڈال دیا لیکن اس دن اسے واقعی بہت زیادہ دکھ ہوا۔

☆☆☆

وقت آہستہ خرامی سے گزر رہا تھا، کبھی، کبھی تو وہ اپنے

وقت دے پاؤں گزر رہا تھا۔ آہستہ، آہستہ اس نے گھر کو اپنا کچھ اس طرح گرویدہ کر لیا تھا کہ گھر کا ہر فرد اس کی لمحے بھر کی جدائی کو بھی محسوس کرنے لگتا تھا۔ وہی اماں جن کے لیے اس نے سودے بازی اور منافقت کی تھی ارم کی محنتوں، خدمتوں اور سچی رفاقت اور لگن سے صحت یاب ہو چکی تھیں۔ وہ ڈاکٹر جو ان کی زندگی سے مایوس تھے وہی اب حیرت زدہ تھے۔ وہ اولاد جو ان کی سانسیں گنتی تھی اور جس کا خیال تھا کہ وہ جانبر نہ ہو سکیں گی وہ اب بہتر علاج، اچھی خوراک اور تندرستی سے کی گئی دیکھ بھال سے اپنے عیروں پر چلنے لگی تھیں اور یہ سب اس کی محنتوں کا ثمر تھا۔

ارم ہر روز بلاتا تھا ان کی مالش کرتی تھی، ان کو وقت پر دوا اور غذا دیتی تھی، ان کو ورزش کرائی تھی اور صلے میں ان کا روال، روائ اسے دعائیں بخشا تھا۔

چھوٹی تندر کے لیے وہ سہارا رحمت تھی۔ اس کے حصے کے سارے کام سرانجام دیتی اور اسے صرف پڑھائی پر توجہ دینے کے علاوہ کبھی، کبھی اس کی پڑھائی میں مدد کر دیتی تھی۔

اور وہ اس سے بے خبر نہ تھی جو اس کے لیے چیلنج بن چکا تھا۔ جس کو شکست فاش دینے کے لیے اس نے یہ راہ چنی تھی۔

وہ اس کی چھوٹی سے چھوٹی چیز کا خیال رکھتی رات کو اس کے لیے صبح کے لیے جو کچرے نکالتی تو جوتے کے ساتھ جراب تک بیچ کر کے رکھتی۔ رومال، ٹائی، گھڑی، سگریٹ ایش ٹرے، شیوگ کٹ، جوتے پالش سے لے کر دانت میں غلال کرنے کی ٹوتھ پک تک اس کے سامنے رکھتی اور وہ حیرت کا مجسمہ بن کر سو جتا۔

”کیا چیز ہے یہ لڑکی..... کس طرح غیر محسوس طریقے سے چھا چکی ہے گھر بھر پر کیا جن ہے؟ جو بغیر آواز نکالے سارے کام کر گزرتی ہے۔ بھوت ہے، مشین ہے رو بوٹ ہے یا کوئی آسمانی مخلوق ہے، چھلتی بھی نہیں، خشوہ بھی نہیں کرتی۔“ لیکن یہ تو وہ جانتی تھی۔

جب تھک کر بستر پر پڑتی تو انگ، انگ ٹوٹ رہا ہوتا

بڑے مان سے کہا تھا۔

گاڑی گیٹ کے اندر بالکل ڈرائنگ روم کے دروازے کے پاس آن رکی۔

دونوں بھائیوں اور شاہ میر نے مل کر امی کو اتارا اور تمام کر آرام سے اندر لے آئے۔

ارم بھیا کے فون کرنے سے بے خبر تھی۔

اس نے اچانک انہیں یوں آتے دیکھا تو گھبرا کر ان کے پاس چلی آئی انہوں نے روتے ہوئے اسے سینے سے لگالیا اور پھر اپنے اوپر اوڑھی چادر اتار کر اس کے پیروں میں ڈال دی جبکہ دو پٹان کے سر پر ہی نکا ہوا تھا۔

”میری بیٹی! کوئی سوال جواب نہ کرنا مجھے زندگی دی پھر کیوں پتھن رہی ہو؟ شاہ میر تمہارا گناہ گار سہی لیکن وہ بہت نامد ہے بیٹی۔ وہ کہتا ہے میں ہیرے اور پتھر کی پچان میں مات کھا گیا، وہ تمہیں منانے اور لے جانے آیا ہے، مجھے زندگی دی ہے تو مزید جینے کی آس بھی دے، دے اب میرا گھر تیرے بغیر ویران ہے۔ وہاں میرا دل بند ہو جائے گا۔“ گھر کے ہر فرد کی نظریں اس کے فیصلے کی منتظر تھیں۔ اس نے چند لمحے کچھ سوچا پھر اس کی نظریں شاہ میر پر جا گئیں جو دونوں ہاتھ جوڑے اس کے سامنے کھڑا تھا۔

”اب اور شرمندہ نہ کریں۔“ اس نے امی، ابا کی جانب دیکھ کر کہا۔

”شاباش، بیٹی شاباش.....“ بڑے بھیا نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔

ابو نے آگے بڑھ کر اس کے سر پر ہاتھ پھیرا۔ ای نے اس کے ماتھے کو چوم۔ بھایاں بار، بار اپنے آنسو پونچھ رہی تھیں۔ وہ ساس کے قدموں سے قدم ملاتے اس کے لیے چوڑے وجود کی پناہ میں چلنے ہوئے یوں محسوس کر رہی تھی جیسے آج ہی اس گھر سے رخصت ہو رہی ہے اور واقعی اس کے دل پر انوکھی اور سنسنی خیز خوشیاں پر پھیلانے اس کے پورے وجود کا احاطہ کر رہی تھیں۔

تھے۔ اس نے کئی بار فون ملایا لیکن ہر بار یہ کہہ کر فون بند کر دیا جاتا کہ وہ گھر پر نہیں۔ اتفاق سے اگر وہ خود فون اٹھائی تو بغیر ایک لفظ کہے فون رکھ دیتی۔ اس کے گھر والے شروع کے چند روز تک تو گولمو کی حالت میں تھے کہاں تو وہ بھاگنے کی کرتی اور کہاں وہ اپنے ہونٹوں پر اس گھر کا ذکر لاتا تک پسند نہیں کرتی۔

پھر اس نے سب کچھ، ایک، ایک لفظ سب کے گوش گزار کر دیا۔ بڑے بھیا کا فیصلہ تھا کورٹ کے ذریعے طلاق حاصل کی جائے لیکن جب تک ان کی طرف سے کوئی پیش قدمی نہ ہو خاموش رہا جائے۔ جبکہ چھوٹے بھیا کا کہنا تھا۔ ”اس جیسے کہنے شخص کا بھروسہ نہیں کے عدالتوں میں گھیننے کے باوجود طلاق نہ دے۔“ بھایاں الگ، الگ رائے رکھتی تھیں۔ البتہ امی، ابو دونوں خاموش تھے ان کو اپنی تربیت پہنا تھا۔ وہ فیصلے کا حق صرف امی کو دینا چاہتے تھے اور اس مقصد کے لیے انہوں نے خاندان کے بزرگوں کو بھی بلانے کا فیصلہ کیا تاکہ بات عدالتوں تک نہ ہی پہنچے ان سے بھی مشورہ لے لیا جائے۔

اس روز بھیا بہت جذباتی ہو رہے تھے۔ انہوں نے سب سے پوچھ کر ٹیلی فون ملایا۔ ارم کو بھائی کمرے میں لے گئی تھیں۔ دوسری طرف فون پر وہ خود تھا۔

”میری امی سخت بیمار ہیں اور وہ ارم کے بغیر زندہ نہیں رہیں گی۔“ تھکی تھکی اور غمناک آواز میں اس نے بتایا۔

”اور تم؟“ بھیا طنز سے بولے۔

”میں اپنے کیے پر سخت شرمندہ ہوں، پلینز بڑے بھیا آپ بڑے بن کر فیصلہ کیجیے۔ اپنی کوتاہیوں پر میں شرمندہ ہوں۔“

”تمہاری والدہ آسکتی ہیں؟“ بڑے بھیا نے کچھ سوچا اور فون بند کرنے سے پہلے کہا۔

”مگر وہ تو سخت بیمار ہیں۔“ خلیں اچھا ٹھیک ہے میں ان کو لے آؤں گا.....“ وہ کچھ توقف کے بعد بولا۔

”مگر بھیا مجھے مایوس نہ کیجیے گا۔“ یہ جملہ اس نے

نکالیں جھکتی چلی گئیں۔

اس کی ہمت نہیں پڑ رہی تھی کہ امی کی طرف دیکھے، جھکے سر اور نظروں کے ساتھ وہ سیدھا اپنے کمرے میں چلا گیا۔ اجاڑ اور بیاباں کمر کا کھانے کو دوڑ رہا تھا۔ کوئی ایک گلاس پانی کی طلب مٹانے والا نہیں تھا۔ سامنے ڈریسنگ ٹیبل پر اس کی چھوٹی، چھوٹی چیزیں بکھری پڑی تھیں۔ بیکے پر وہ کتاب پڑی تھی جو شاید وہ لے جانا بھول گئی تھی۔ وہ بے تابی سے آگے بڑھا شاید اس کتاب میں اس نے کچھ لکھ چھوڑا ہو۔

اس نے ساری کتاب بکیر دی مگر وہ بڑی پریکٹیکل لڑکی تھی، ایسی کسی چھچھوری حرکت کی اس سے توقع نہ تھی۔ وہ سر ہٹا کر بکیر رہا۔ کپڑے بدلے نہ جوتے اتارے..... کسی کام میں دل ہی نہیں لگ رہا تھا۔ پھر وہ اٹھا اور گاڑی کی چابی اٹھا کر باہر نکل گیا۔ بلا مقصد سڑکوں پر گاڑی دوڑاتا رہا۔ اور جب تھک گیا تو گھر لوٹ آیا۔

امی اس کی منتظر تھیں چند لمحے اسے غور سے دیکھا پھر تڑپ کر بولیں۔

”مجھے شرطوں پر زندہ رکھنے والے، اس سے تو بہتر تھا میں مر گئی ہوتی۔ آخر وہ کون سی مجبوری تھی جس نے تجھے اتنا درندہ صفت ظالم بنا ڈالا۔ یاد رکھ اگر تو میری بہو کو جس طرح سے بھی ہو، واپس اس گھر میں نہ لایا تو میں اپنی زندگی اپنے ہاتھوں سے ہی ختم کر ڈالوں گی۔“

وہ چپ چاپ کم کم کھڑا تھا وہ کچھ کہتا جانتا تھا زبان اس کا ساتھ نہیں دے پاری تھی۔ گردن سے باہر نکلا ہوا حلقوم اوپر نیچے کھم کر کچھ نہ بول سکنے کی گواہی دے رہا تھا۔ جڑے، جڑے ہوئے اور زبان تالو سے لگی ہوئی تھی۔ اور بے بسی نظروں کی مجبوری اسے انتہائی مظلوم ثابت کر رہی تھی۔ ماں کی آنکھوں کے آنسو تھمتے نہیں تھے۔ وہ انہیں بار، بار پوچھتی وہ پھر آنکھوں میں بھرتے۔

”کچھ کرو۔“ اس کے اندر سے آواز آئی۔ لیکن واپسی کے سارے راستے تو اس نے خود ہی بند کیے

نا پسندیدہ فعل کے لیے مجبور کیا جسے شادی کہتے ہیں۔ ہم حال اب آپ مجبور نہیں ہیں۔“ وہ باوقار قدموں سے چلتی ہوئی بغیر اس کا جواب سنے کمرے میں لوٹ گئی۔

اب اس کا اپنے قدموں پر کھڑے رہنا محال تھا۔ وہ اپنے قول و فعل میں کتنی پختگی تھی اس نے جو کہا کر دکھایا۔ اب بھی جو کہہ گئی تھی کر دکھائے گی۔ کاش اس کے فیصلے میں ترمیم کی گنجائش ہوتی۔

کاش وہ اپنا فیصلہ بدل ڈالتی۔ اس سات ماہ کے عرصے میں اس نے گھر والوں کو بھی کانوں کان خبر نہیں ہونے دی کہ ان کے تعلقات کھٹ کھٹا دکھاوا ہیں۔ صائمہ جیسی تیز نظر لڑکی کو گمان تک نہیں گزرا کہ وہ دوسرے کمرے میں تنہا سوتی ہے۔

اس نے بھی کسی محسوس تک نہیں ہونے دیا کہ اس کی موجودگی میں چپک چپک کر بولنے والی لڑکی تنہائی میں اس سے ہم کلام ہوتا تک گوارا نہیں کرتی۔

اور سچ تو یہ تھا کہ وہ جو کچھ کہہ چکا تھا اس کی مہربانیوں کے عوض تلافی ممکن ہی نہیں تھی۔ اس کا دل چاہا بھاگ کر جائے اور اس کے سامنے دونوں ہاتھ جوڑ کر کہے۔

”اے پیاری لڑکی! اس گھر کو ہر لمحہ تری ضرورت ہے تو نے کیسے جان لیا کہ تیری ضرورتیں ختم ہو گئیں۔ اس گھر کے ہر فرد کو تمہاری عادت ہو گئی ہے۔ میں جو تمہارا کچھ نہیں..... لیکن جب دفتر سے گھر لوٹوں گا تو میری تلاش نظریں گھر کے ہر کونے میں تمہیں ڈھونڈیں گی۔ تم اپنا فیصلہ بدل ڈالو۔“

مگر وہ ایک لفظ نہ کہہ سکا۔ اور پہاڑ جیسی لمبی رات گزر گئی لیکن جانے کیوں اس کے اندر کہیں موبوم سی امید تھی کہ وہ نہیں جائے گی۔ شام جب وہ گھر آیا تو ساری امیدیں دم توڑ چکی تھیں۔ گھر اجاڑ اور سنسان پڑا تھا۔ کسی نے جھاڑو..... تک نہ دی تھی رات جو چیز جہاں تھی وہیں پڑی تھی۔ سامنے اس کی بہن صائمہ کھڑی تھی، اس نے رو کر اپنی آنکھیں سجائی تھیں اس کی شکوہ بھری نظروں کے جواب میں خود بخود اس کی



ناولٹ

## محبت لفظ ہے لیکن.....

”ماں باپ کے سامنے بہت سوچ سمجھ کے بولا کرو کیونکہ کبھی کبھی ان کے سامنے بولا گیا کوئی بھی برا یا اچھا کلام ہماری پوری قسمت پہ حاوی ہو جاتا ہے۔“

خوب صورت جذبوں کی باریکیاں بیان کرتی حیات بخاری کی ایک دل نشیں تحریر

یہ پہلی مرتبہ نہیں تھا کہ وہ رات کو یوں اچانک کمرے سے باہر نکل گئے ہوں۔ معمول کی بات تھی۔ پھر بھی نہ جانے کیوں انہیں کچھ غیر معمولی لگا، آہستگی سے پیر چہل میں مقید کیے بنا چادر لیے وہ دبے پاؤں دروازے کی طرف آئی تھیں۔ خان جی طویل صحن عبور کر کے بالکل آخری سرے پر بنی بیٹھک میں داخل ہو رہے تھے۔ وہ کسی رو بوٹ کی طرح اسی طرف چل دیں۔ نہ جانے ان میں اتنی جرأت کہاں سے آگئی

تھی۔ حویلی کے سرداروں کی یوں ٹوہ لینے کی جرات کوئی کر بھی لیتے۔ لیکن کم از کم صنوبر بی بی جیسی نرم و نازک، ڈرپوک سی عورت کبھی نہیں کر سکتی تھی پھر بھی نہ جانے کون سی ان دیکھی طاقت تھی جو ان کو یہ سب کرنے پر مجبور کر رہی تھی۔ بہت تیزی سے صحن عبور کرتیں۔ وہ اب دروازے کے قریب دیوار سے لگی کھڑی تھیں۔

”کیا خبر ہے دوراں؟“ خان کی بھاری آواز سنتے ہی ان کا مزہ دل یک بارگی ڈوب سا گیا تھا۔

”کام ہو گیا خان جی.....“ مؤدبانہ لہجے میں انہوں نے کسی کو کہتے سنا تھا۔

”کام پکا ہے ناں.....؟“ خان کے لہجے میں اس مرتبہ قہقہہ۔

”بالکل صفائی سے کام کیا ہے خان..... سب کو یہی لگے گا کہ بہن کی طرف سے لگے بدنامی کے داغ کو برداشت نہ کرتے ہوئے بڑے خان نے خود کشی کر لی۔“ سردی کی شدید لہر نے ان کی ریزہ کی ہڈی سنسنائی۔ بے ساختہ نکلتی چیخ کومنہ پہ ہاتھ رکھ کر انہوں نے یہ مشکل روکا تھا۔

”شاباش دوراں..... مجھے تم سے یہی امید تھی۔“ خان جی کے لہجے میں اطمینان بھر گیا تھا۔

”اب سارے گاؤں میں اس بے غیرت کے چرچوں پر بڑے خان کی موت کی خبر حاوی ہو جائے گی..... پھر کچھ دنوں میں ان دونوں کا بھی کوئی نہ کوئی بندوبست کرتا ہوں۔ تم ایسا کرو گاڑی نکالو۔ ہم ابھی لاش لے کر شہر روانہ ہوں گے۔ اور کسی کے ذمے لگا دو کہ گھر، گھر اطلاع دے، دے۔ آخر سب گاؤں والوں کا پیارا خان مر گیا ہے۔“ وہ شیطانی قہقہہ انہیں اپنے اعصاب پر تھوڑے کی طرح محسوس ہوا تھا۔ مزید ٹھہرنا خطرے سے خالی نہیں تھا۔ وہ تیزی سے کمرے میں واپس آ کے بیڈ پر لیٹ گئیں۔ دروازے کی طرف پشت کیے بند آنکھوں سے سیل رواں تھا۔ ان کے اتنے اچھے، بھائیوں جیسے جیٹھ اب اس دنیا میں نہیں

رہے تھے۔ وہ بہ مشکل ہچکیوں پر بند باندھنے میں کامیاب ہوئی تھیں۔

خان جی کمرے میں آئے اور چند لمحوں بعد ہی واپس نکل گئے۔

”کچھ دنوں بعد ان دونوں کا بھی بندوبست کرتا ہوں۔“ منہ پر ہاتھ رکھے چیخوں کا گلا گھونٹتے وہ اٹھ کر بیٹھ گئیں۔

”کون دونوں؟“ ذہن میں اٹھتے سوال نے آہستہ، آہستہ درد کم کرنا شروع کر دیا تھا۔

”اور کون ہے جسے خان اس طرح.....“ وہ ہاتھ کی پشت سے آنسو صاف کرتی اٹھ کھڑی ہوئیں۔

”میں.....“ خیال آیا فوراً ہی سرنگی میں بل گیا۔

”گھر سے بھاگ جانے والی بہن اور وہ لڑکا..... بھلا اور کون.....؟“ ذہن نے ایک اور راہ دکھائی۔

”نہیں..... ان دونوں کا تو کوئی اتنا پتا نہیں..... مشکل ہے۔ بہت مشکل.....“ دل مطمئن نہیں تھا۔

”تو پھر کون.....؟“ ننگے پیر ٹھنڈے فرش پر ٹپکتے ان کی ٹانگیں شل ہونے لگی تھیں..... سچی جاڑے کی خاموش تاریک رات میں گاڑی کا انجن اسٹارٹ ہونے کی گونج سنائی دی تھی۔ وہ چونک کر دروازے کی طرف آئیں۔ اور بے ارادہ ہی نگاہ ساٹنے پر آمدے میں نظر آنے والے دروازے پر جم سی گئی۔

”بی بی اور ولی.....؟“ لیوں نے خود بخود بول کے ان پر سب واضح کر دیا تھا۔ وہ ڈر کے دو قدم پیچھے ہٹ گئیں۔

”یا اللہ.....“ درد کی تیز لہر نے ان کے دل کو اپنے حصار میں لیا تھا..... اور پھر چند منٹ لگے تھے ان کو سوچنے میں..... الماری کھول کر ایک بڑا بیگ نکالا، جو بہ آسانی کمر پر لا دیا جاسکتا تھا۔ تیز بھاگنے کی صورت میں بھی اسے اٹھانا سہل تھا۔ خان شکار پر جاتے وقت ہمیشہ یہی بیگ ساتھ لے کر جاتے تھے۔ صنوبر کو یہ بیگ بہت پسند تھا۔

انہوں نے الماری کے نچلے حصے میں بنے سیف

میں سے چند بھاری زیورات اور نقدی کی چند ہری گڈیاں بیگ میں ڈال دیں۔ بیگ اب بھی کافی ہلکا تھا۔ انہوں نے احتیاط سے سیف واپس بند کیا اور بیگ اٹھائے سامنے والے کمرے کی طرف چلی آئیں۔

”بی بی.....“ انہوں نے تیز آواز میں پکارا تھا۔ اور ان کی توقع کے عین مطابق دوسری دستک پر ہی دروازہ کھل گیا تھا۔

”کیا ہوا صنوبر.....؟“ ان کے چہرے پر تشویش تھی۔

”بی بی اپنے زیور نکالیں۔“ وہ ان کا ہاتھ تھامے ان کو اندر لاتے ہوئے بولیں۔

”کیا مطلب؟“ وہ حیران ہوئیں۔

”جلدی کریں بی بی.....“ وہ بڑھ کر خود الماری کھولنے لگیں۔ اب بی بی انہیں حیرت سے دیکھتے ہوئے ذرا سی مکلی الماری میں موجود سیف کھولنے لگیں۔

”بتاؤ تو ہوا کیا ہے؟ کیوں چاہیں زیور.....؟“ وہ لاک کھولنے ہوئے ان کی طرف دیکھ رہی تھیں۔

”کہیں ملے گا تو پتا نہیں چل گیا۔“ ایک دم ہی انہیں خیال آیا تھا۔ ادھر صنوبر انہیں مکمل طور پر نظر انداز کر کے زیور اور نقدی بیگ میں ڈالنے لگی تھیں۔

”صنوبر کر کیا رہی ہو؟“ وہ بے بس ہو گئیں۔

”جلدی کریں بی بی.....“ ولی کو چگا گئیں.....

جلدی۔ “وہ تیزی سے ہاتھ چلاتے ہوئے بولیں۔

”لیکن کیوں؟“

”جلدی..... میں آپ کو سب کچھ بتا دوں گی.....“ ابھی تو جلدی سے ولی کو چگا گئیں۔ “وہ کام ختم کر چکی تھیں۔ سوتیزی سے بیگ بند کر کے خود ہی بیڈ پر گہری نیند سوئے بچے کی طرف لپکیں۔

”ولی..... ولی اٹھو.....“ ذرا سا کسمسا کے بچے نے اپنی پوری آنکھیں کھول دی تھیں۔ اس کی نیند میں ڈوبی آنکھوں میں بھی جھلملائی تیز روشنی اس کی ذہانت کا پتا دے رہی تھی۔

صنوبر نے جھٹ ولی کو خود سے لپٹا لیا۔ پھر اس کے دونوں گال کئی بار چوم لیے۔

## محبت لفظ ہے لیکن

”کیا ہو گیا ہے تمہیں صنوبر.....؟“ بی بی کو اب صبح معنوں میں پریشانی لاحق ہوئی تھی۔

”آپ دونوں کو ابھی، اسی وقت اس گھر، اس گاؤں سے کہیں دور جانا ہو گا بی بی، کہیں دور.....“ وہ ولی کو خود سے لپیٹ بیٹھے لہجے میں بولی تھیں۔

”دور..... لیکن کہاں اور کیوں.....؟“ وہ تاہجی سے صنوبر کا روشن چہرہ دیکھنے لگیں۔

”یہ تو میں بھی نہیں جانتی کہ کہاں..... لیکن یہ جانتی ہوں کہ کیوں.....“ وہ اٹھ کر ان کے پاس آ گئیں

”اس لیے کہ..... آپ اور.....“ وہ کہہ نہ سکیں۔ بی بی ان کی طرف دیکھتی رہیں۔

”آپ کی اور ولی کی جان کو خطرہ ہے بی بی.....“ ان کی آنکھیں پھر سے لگیں..... بی بی سرکرا دیں۔

”کوئی برا خواب دیکھ لیا ہے۔ تو بہ صنوبر تم بھی ناں.....“ وہ سوئے جاگے ولی کی طرف بڑھ گئیں جو اب اٹھ کر بیٹھا ہوا تھا۔

”سو جاؤ بچے.....“ وہ اسے واپس لٹانے لگیں۔

”نہیں، اٹھو ولی.....“ صنوبر تیزی سے ان کی طرف لپکیں اور لیٹے ہوئے ولی کو دوبارہ پکڑ کے بٹھادیا۔ پھر ادھر ادھر نگاہ کی۔ دور کوٹنے میں ولی کے جو گرز پڑے تھے اور ان سے کچھ دور بڑے خان کے جو گرز وہ جوتوں کے دونوں جوڑے اٹھا کر بیڈ کے قریب آ گئیں۔

”یہ ولی کو پہنا دیں۔“ انہوں نے جو گرز بیڈ پر رکھ کر خود بی بی کے قدموں میں بیٹھتے ہوئے کہا۔ اس بار بی بی نے خاموشی سے جوتے ولی کو پہنانا شروع کر دیے تھے۔ وہ خود بی بی کے چپل اتار کر انہیں خان کے جو گرز پہنانے لگیں۔

”صنوبر یہ کیا؟“ بی بی چلیں۔

”جلدی بی بی.....“ ہمارے پاس زیادہ وقت نہیں ہے۔“ صنوبر نے جھٹ کر مغبوطی سے ان کے پاؤں پکڑے اور انہوں میں جو گرز پہنا دیے۔ پھر ولی کو سونپ، دستانے اور اونی ٹوپی پہنانے کے بعد دوبارہ بی بی کی

طرف متوجہ ہو گئیں۔ تیاری مکمل تھی.....

”بی بی.....!“ ان کی خوب صورت نیلی، نیلی آنکھیں بھیجنے لگی تھیں۔

”کیا ہوا ہے صنوبر.....؟“ بی بی کا دل ڈوبنے لگا۔ انہوں نے صنوبر کے سر ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لیتے ہوئے تسلیتیں بھرے لہجے میں پوچھا۔

”وہ..... وہ.....“ صنوبر بول نہ سکیں..... کتنے ہی پل دے پاؤں گزر گئے۔

”کاکی.....“ ولی جو مسلسل خاموشی سے سب کا رروائی دیکھ رہا تھا نے صنوبر کو پکارا۔

”مجھے نیند آئی ہے کاکی.....“ اس کی پلکیں بھاری ہو رہی تھیں۔ صنوبر نے ایک نظر اسے دیکھا۔

پھر بی بی کو سنبھال لگیں۔

”خان آپ دونوں کو مار دے گا بی بی۔“ صنوبر کی زبان خشک ہونے لگی تھی۔

”کیا مذاق ہے صنوبر۔“ بی بی اب تک اچکی تھیں۔

”بڑے خان.....“ وہ بولتے، بولتے رکی نہ جانے کیوں بی بی کا دل ڈوب، ڈوب گیا۔

”انہوں نے بڑے خان کو مروا دیا ہے بی بی۔“ وہ رونے لگی تھیں۔ بی بی اس کی تسکین نہ کر سکتی رہیں۔

”وہ ولی کو بھی مارنا چاہتے ہیں بی بی..... اس جانداد کے لیے آپ، ولی سب کو مار دینا چاہتے ہیں وہ۔“

”خان جی.....“ صنوبر کو بی بی کی آواز کسی گہری کھائی سے آتی محسوس ہوئی اور تھا بھی ایسا ہی۔

وہ اچھی طرح جانتی تھیں کہ بی بی واقعی ایک گہری کھائی میں جا گری تھیں۔ اور مزید گہرائی میں گرنے والی تھیں..... وہ انہیں بچانے کی ایک کوشش کرنا چاہ رہی تھیں۔ آگے سب قدرت پہ تھا..... ان کی قسمت پہ تھا۔

وہ یہ سب نہیں جانتی تھیں۔ نہ ہی جانتا چاہتی تھیں۔ بس انہیں ولی اور بی بی کو فی الحال کہیں دور بھیجنا تھا۔ جہاں خان کے خونی ہاتھ ان کو تلاش نہ کر سکتے.....

”بی بی.....!“ صنوبر نے اس کی تسکین نہ کر سکی۔

ہلایا۔ وہ بے جان سی ان کو سنبھال گئیں۔

”ہوش کریں بی بی..... ولی کو بچالیں۔“

”یہ کیسے ہو سکتا ہے صنوبر.....؟“ بائیں آنکھ سے

ایک آنسو ٹوٹا ان کا گال چھو گیا۔

”میں اتنی رات کو یوں اچانک اتنا بڑا جھوٹ کیوں بولوں گی بی بی۔“ ان کی آنکھوں سے متواتر آنسو بہہ رہے تھے۔

”خان.....“ انہوں نے دونوں ہاتھ منہ پر رکھ کے جیسے خود کو چلانے سے روکا تھا۔ اور پھر پھوٹ، پھوٹ کر رونے لگی تھیں۔ صنوبر بھیگی آنکھوں سے ان کو آنسو بہاتا دیکھتی رہیں۔

”بی بی.....“ کچھ دیر بعد صنوبر نے دھیرے سے ان کا شانہ ہلاتے ہوئے ان کو پکارا تھا۔ وہ اب سک رہی تھیں۔

”ولی کو بچالیں بی بی۔“ وہ دوبارہ بولیں۔

”ابھی سارے گاؤں میں خبر پھیل جائے گی۔ گاؤں والے جاگ گئے تو مسئلہ ہو جائے گا۔ آپ ابھی ولی کو لے کر نکل جائیں اور کوشش کرنا کہ صبح کا اجالا پھیلنے تک آپ کسی بڑے شہر کی طرف نکل جائیں کیونکہ خان صبح تک واپس آ جائیں گے..... لالا کی لاش لے کر۔“ اس نے ہاتھ کی پشت سے اپنے آنسو صاف کرتے ہوئے کہا۔

”اٹھو بی بی دیر نہ کریں.....“ وہ دوبارہ سے ان کے کندھے سے لگ کر سوتے ولی کو چمکانے لگیں۔

”بی بی، ولی کو لے کر چلی جائیں.....“ اس نے اس بار ذرا تیز لہجے میں کہا تو بی بی چونک سی گئیں۔ پھر جلدی سے اٹھ کر بڑی گرم شال الماری سے نکالی۔

”یہ بیگ پہن لیں۔“ وہ ان کی مدد کرنے لگیں۔

بیگ لینے کے بعد انہوں نے چادر اپنے اوپر پھیلا دی۔

”ان جو گزر کی وجہ سے آپ کو بھاگنے میں آسانی رہے گی اگر خان کے کتوں کو خبر ہوئی انشاء اللہ میرے خیال میں صبح تک آپ آرام سے گاؤں سے نکل جائیں گی۔“ وہ سر ہلا گئیں۔ صنوبر جگ میں رکھے ٹھنڈے

پانی سے ولی کا منہ دھونے لگیں۔ وہ بیدار ہو گیا۔

”چلو بچے۔“ بی بی نے اس کا ہاتھ مضبوطی سے تھام لیا۔

”کہاں کا کی.....؟“ وہ معصومیت سے پوچھنے لگا۔

”شہر.....“ صنوبر اس کے قریب بیٹھے ہوئے بولیں۔

”تمہیں شہر جا کر پڑھنے کا شوق تھا نا..... یوں سمجھو وہ خواب پورا ہونے کا دن آ گیا۔“

”سچ میں کا کی.....“ اس کی آنکھیں لودینے لگیں۔

”بالکل سچ.....“ وہ نرم سی مسکراہٹ لبوں پر سجا گئیں۔

”جائیں بی بی..... اللہ کی امان میں۔“ انہوں نے بی بی کو گلے لگالیا۔

رات کی تاریکی اور سردی ایک ہی ڈھنگ سے بڑھتی چلی جا رہی تھی۔ صنوبر دروازے کی اوٹ سے سامنے دیکھ رہی تھیں۔

بی بی چادر تھامے، ولی کا ہاتھ پکڑے قدم بہ قدم دور جا رہی تھیں۔ پچھلے محسن کی طرف مڑنے والی تاریک تنگ گلی کی طرف..... جہاں دیوار کا ایک خستہ حصہ وہ آسانی سے عبور کر کے، اس خونخوار حویلی سے اپنے ولی کو بچا کر لے جاسکتی تھیں۔

ہاں شاید.....

☆☆☆

وہ کتنی دیر وادش میں مسلسل بہتے پانی کو دیکھتا رہا۔ پھر ہاتھ کا پیالہ بنا کر بھر، بھر کر خود کو بھگوایا۔ لیکن جتن تھی کہ بڑھتی جا رہی تھی۔ بھیجی اس کی نگاہ آئینے پہ پڑی تھی۔ ہاتھوں کا پیالہ بنا آواز کے ٹوٹ گیا تھا۔

یہ آئینے میں نظر آنے والا عکس اس کا اپنا تو نہیں تھا۔ تو پھر وہ کون تھی..... جو بار، بار اس کے سامنے آ جاتی تھی۔

اسے اس چہرے سے نفرت تھی۔ پھر اسی قدر وہ چہرہ کیوں اس کی آنکھوں میں سایا ہوا تھا۔

وہ پلٹ کر کمرے میں آ گیا۔ اتنے سرد موسم میں بنیان میں ملبوس بھی وہ پسینے سے تر ہونے لگا تھا۔ اس

محبت لفظ ہے لیکن

نے سائڈ نیبل پر دھری سگریٹ کی ڈبیا اٹھائی اور ایک سگریٹ نکال کر جلانے لگا۔ پھر ایک گہرا کش لیا، ذرا دیر سانس روکی اور پھر دھوئیں کے مرغولے کو ہوا کے سپرد کر دیا۔

اگلے ہی لمحے اس کے جسم میں کرنٹ سا گزرا تھا۔ وہ مرغولہ ہوا میں ہی ساکت ہوا تھا اور دھوئیں نے کسی بہت ہی خوب صورت چہرے کی شبیہ پکڑی تھی۔ وہی صورت ایک بار پھر اس کے سامنے تھی۔

”لالہ.....“ اس نے چلاتے ہوئے سائڈ نیبل پر دھرے سامان کو ہاتھ کی زوردار ٹھوکر سے دور پھینک دیا تھا۔ ایک دم شور سا مچا تھا۔

پھر مکمل خاموشی چھا گئی تھی.....

☆☆☆

رات جس قدر تاریک تھی، اسی قدر سرد بھی..... قمری مہینے کی آخری راتیں ہونے کی وجہ سے چاند بھی غائب تھا۔ سردی سے اس کا ننھا سا وجود کپکپا رہا تھا۔ مگر وہ ماں کا ہاتھ مضبوطی سے تھامے بھاگا چلا جا رہا تھا۔

اسے اپنے پیر شل ہوتے محسوس ہوئے تھے۔ سانس جیسے اکھڑی ہوئی تھی۔ مگر پھر بھی وہ تیز سے تیز دوڑنے کی کوشش کر رہا تھا۔ ماں کے قدم سے قدم ملا کر سب کچھ برداشت کیے کسی جنونی کی طرح دوڑتا چلا جا رہا تھا۔

رات کے خوفناک سناٹے میں اسے کئی بھاری دوڑتے قدموں کی آوازوں کے ساتھ لوگوں کی چیخ و پکار بھی سنائی دے رہی تھی۔ شکاری کتوں کے بھونکنے کی آوازوں نے ماحول مزید دہشت زدہ بنا دیا تھا۔ مگر پھر بھی وہ خوفزدہ نہیں تھا کیونکہ اس کی ماں اس کے ساتھ تھی..... اور وہ جانتا تھا کہ ماں کے ہوتے ہوئے اسے کوئی مصیبت چھو بھی نہیں سکتی تھی۔

بھاگتے، بھاگتے وہ اتنا فاصلہ طے کر چکا تھا کہ سخت سردی کے باوجود بھی اس کا وجود پسینے میں بھگ گیا تھا۔ شکاری کتوں کی آوازیں نزدیک سے نزدیک

## غزل

تمہارے خواب کی تعبیر ہو جاؤں اجازت ہے  
محبت کی میں اک تصویر ہو جاؤں اجازت ہے  
کہیں جانے نہ دوں تم کو اگر تم میرے ہو جاؤ  
تمہارے پاؤں کی زنجیر ہو جاؤں اجازت ہے

کسی کے ہو گئے ہو تم، مجھے شکوہ نہیں کوئی  
کسی کی میں بھی اب جاگیر ہو جاؤں اجازت ہے  
وہ اک تعویذ جو تم نے گلے میں ڈال رکھا ہے  
میں اس تعویذ کی تحریر ہو جاؤں اجازت ہے

زمانے کے میں ہر اک وار سے تجھ کو بچا لوں گی  
میں تیرے ہاتھ میں شمشیر ہو جاؤں اجازت ہے

تجھے یہ معجزہ بھی میں دکھا سکتی ہوں دنیا میں  
جو تو چاہے تری تقدیر ہو جاؤں اجازت ہے

خدا نے یہ کرشمہ چاہتوں کو سوئپ رکھا ہے  
میں اک پل میں تیری توقیر ہو جاؤں اجازت ہے

شاعرہ: شبنم سیف، کراچی

کی دینرتہ نے کمرے کی تاریکی بڑھا رکھی تھی۔ وہ کھڑکیوں  
کی طرف بڑھے تو کوئی سخت سی شے ان کے پاؤں سے  
ٹکرائی۔ انہوں نے بہ مشکل خود کو گرنے سے بچایا۔  
سچ، سچ کے قدم اٹھاتے بہت مشکل سے وہ  
کھڑکیوں تک پہنچنے میں کامیاب ہوئے تھے اور پھر  
دھیرے، دھیرے سے انہوں نے پردے ہٹا دیے۔  
سورج کی تیز چمکتی شعاعیں راستے ملتے ہی کمرے کو  
روشنی سے نہلا گئیں۔ بستر پر مگر ہر نیند میں غرق وجود  
اس در اندازی پر ذرا سا کسمایا اور چہرے پر تکیہ رکھ کر  
پھر سو خواب ہو گیا۔

انہوں نے ایک مسکراتی نظر اس وجود پر ڈالی اور  
پھر کمرے کا جائزہ لینے لگے۔ کولڈ ڈرنکس کے خالی کین  
کے علاوہ بچھے ہوئے سگریٹ کے ٹکڑوں کے انبار لگے  
تھے۔ بیڈ کے بالکل قریب بہت سی سی ڈیز زمین پر  
بکھری تھیں۔ سی ڈی پلیئر آن تھا اور مخصوص انگلش  
گانے بار، بارری پیٹ ہو رہے تھے۔ ایک مطمئن سی  
مسکراہٹ خان کے لبوں کو چھو گئی۔

وہ بالکل ویسا ہی تھا..... جیسا وہ اسے بنانا چاہتے  
تھے۔ آوارہ، من مہجوبی اور سب سے بڑھ کر.....  
بے پروا..... رشتوں، جذبات اور احساسات سے...  
ناکجھ..... خود پرستی کا شکار..... انہوں نے اس کی خاص  
تربیت کی تھی۔ اسے ہم جو بنایا تھا۔ اس کی شخصیت میں  
اس قدر ضد اور بے پروائی کا بیج بویا تھا کہ وہ کسی کو خاطر  
میں نہ لاتا۔ اپنی مرضی کرتا..... اسی لیے انہیں اپنے  
سپوت میں اپنا مقصد حیات نظر آتا..... وہ جس منزل  
کے متلاشی تھے وہ اب زیادہ دور نہیں تھی۔ محبت پاش  
نگاہوں سے اسے دیکھتے ہوئے دھیرے، دھیرے قدم  
اٹھاتے وہ اس کے پاس بیڈ پر بیٹھ گئے تھے۔

”فیا.....“ کالے کھٹے بالوں میں اٹھکیاں  
پھیرتے ہوئے انہوں نے نرمی سے اسے پکارا تھا۔ ان  
کی توقع کے عین مطابق اس نے ان کی پہلی آواز پر ہی  
آنکھیں کھول دیں۔ اور سیدھا لٹ گیا۔  
”با.....“ اس کی سرخ ہوئی آنکھوں میں حیرت جاگی۔

بھول جانے میں ہی بہتری ہوتی ہے بیٹا۔“  
”بہت کوشش کرتا ہوں دیدے..... لیکن کچھ بھی  
نہیں بھول پاتا۔ ماضی جیسے کسی عفریت کی طرح  
میرے دل و دماغ سے چٹ کر رہ گیا ہے۔“ وہ  
پریشان تھا۔ دونوں ہاتھوں سے سر کے بال جکڑتا وہ  
انہیں بے حد سڑب لگا۔ اور وہ بھی اپنے لخت جگر کے  
دکھ سے اچھی طرح واقف تھیں۔ غیروں سے دکھ ملیں تو  
ان کا مداوا بھی جاتا ہے۔ لیکن اپنوں کے ہاتھوں لگے  
زخم کبھی مندمل نہیں ہو پاتے بلکہ وقت کے ساتھ ساتھ  
ناسور بن جاتے ہیں۔ اس مسلح..... حقیقت سے وہ خود  
واقف تھیں۔ لیکن وہ اپنے بیٹے کو اس حالت میں نہیں  
دیکھ سکتی تھیں۔

”تم اگر وہ سب نہیں بھول پاتے۔ تو یہ صرف  
اس لیے بیٹا! کہ تم نے اپنے دل میں انتقام کو جگہ دے  
دی ہے۔ سب اللہ پر چھوڑ دو باری..... اللہ ہی سب  
سے بڑا منتقم ہے۔“ وہ اس کے بال سہلانے لگیں.....  
اور وہ ان کی طرف دیکھنے لگا۔

”سب کچھ اللہ ہی چھوڑ دینے میں ہی انسان کی  
بھلائی ہے بچے.....؟ تم بھی اپنا مقدمہ اللہ پر چھوڑ دو،  
تمہیں سکون مل جائے گا۔“ باری نے عقیدت سے ان  
کے دونوں ہاتھ تھام لیے۔

”آپ بہت بہادر ہیں دیدے.....“ باری نے  
ان کے ہاتھوں پر لب دھرتے ہوئے کہا۔

”تم بھی بہت بہادر ہو میرے بچے.....“ وہ  
مسکرائیں۔

”کیونکہ تم زریاب ولی خان کے بیٹے ہو۔“  
غریہ لہجہ میں کہتے ہوئے انہوں نے باریال کی پیشانی  
چوم لی۔ وہ بھی پرسکون ہو کر مسکرا دیا۔

☆☆☆

کمرے میں قدم رکھتے ہی عجیب سی بو ان کی  
ناک سے ٹکرائی۔ سہراب علی خان نے بے اختیار ہی  
ناک پر ہاتھ رکھا۔  
دن کے گیارہ بجنے والے تھے۔ لیکن موٹے پردوں

تر ہوتی محسوس ہو رہی تھیں۔ تبھی اس کا پاؤں کسی سخت  
چیز سے ٹکرایا۔ اسے بہت زور کی ٹھوک لگی۔ ماں کا  
مضبوط ہاتھ اس کے ہاتھ سے چھوٹ گیا۔  
”ماں.....“ وہ بہت زور سے چلایا تھا۔

☆☆☆

”باری، باری.....“ کوئی بہت دور سے اسے  
پکار رہا تھا۔

اس نے آنکھیں کھولنے کی کوشش کی تھی۔ لیکن تیز  
روشنی کی چھین نے اس کی یہ کوشش ناکام کر دی تھی۔

”باریال.....“ اس دفعہ آواز قریب محسوس ہوئی  
تھی۔ اس نے اس بار آنکھیں کھول دی تھیں۔

”دیدے.....“ خود پر جھکی ماں کو دیکھ کر وہ تیزی  
سے سیدھا ہو کر بیٹھ گیا تھا۔

”تم مجھے پکار رہے تھے.....“ وہ سائڈ ٹیبل پر  
دھرے جگ سے پانی گلاس میں اڈیلٹے ہوئے بولیں۔

”نہیں تو.....“ وہ صاف مگر گیا۔ انہوں نے  
مسکراتی نگاہ اس کی طرف کی۔

”وہم ہوا ہے آپ کو.....“ ان کے ہاتھ سے  
گلاس لیتے ہوئے وہ نظریں چڑا گیا تھا۔

”تم بھول رہے ہو۔“ وہ اس کے قریب ہی بیڈ  
پر بیٹھ گئیں۔ ”ماڈ کو وہم نہیں ہوا کرتے۔“ وہ ان کی  
طرف دیکھنے لگا۔

”ماڈ کو تو الہام ہو جاتے ہیں۔“ وہ  
مسکرائیں۔

”توبہ ہے دیدے..... آپ اب میری فکر کرنا  
چھوڑ دیں۔ میں اب بڑا ہو گیا ہوں.....“ وہ گلاس  
سائڈ ٹیبل پر رکھ کر ان کے ہاتھ تھامتے ہوئے محبت  
سے بولا۔

”بھول جاؤ باری.....“ وہ اس کی آنکھوں  
میں دیکھ رہی تھیں۔

وہ نظریں جھکا گیا۔

”سب بھول جاؤ..... کب تک ان خوفناک  
یادوں کو ساتھ لگائے رکھو گے۔ بعض اوقات ماضی کو

”اتنی صبح.....“ نیند سے جھل پکلیں لرز تیں،  
گر پڑتیں اور ضیاء نیند بھگا تا زبردستی انہیں دوبارہ کھلنے  
پر مجبور کر دیتا۔

”صبح کہاں یار.....؟ گیارہ بج رہے ہیں۔“ وہ  
مسکرائے تو ضیاء اچھل کر بیٹھ گیا۔

”گیارہ بج گئے؟“ وہ اب بھی حیران تھا۔ ”مجھے  
تو آج شہر کے لیے نکلنا تھا۔“ وہ شرمندہ ہوا۔

”بھئی تو تمہیں جگانے ہمیں خود آنا پڑا۔“ انہوں  
نے ہاتھ میں پکڑی بید کی چھڑی گھمائی۔

”بس با..... میں ابھی تیار ہوتا ہوں۔“ وہ کہہ کر  
نیچے اترنے لگا کہ سہراب علی خان نے اس کے کندھے

پر ہاتھ رکھ کر اسے رکنے پر مجبور کر دیا۔  
”ضیا۔“ ان کے پکارنے پر وہ ان کی طرف

دیکھنے لگا۔  
”میں نہیں چاہتا کہ تمہیں بار بار یاد دہانی کرائی

جائے مگر ایک بات یاد رکھنا نہ جانے کتنے برس میں نے  
اس دن کا انتظار کیا ہے۔ کتنی راتیں انتقام کی آگ میں

سلگ، سلگ کر گزری ہیں۔ مجھے مایوس نہ ہونے دینا  
ضیا..... تمہیں اس مقصد میں سو فیصد کامیابی حاصل کرنی

ہے۔ سو فیصد.....“ ان کے لہجے اور آنکھوں میں عجیب  
سی شدت پسندی اتر آئی۔

”مجھے یاد ہے با..... سر کے بدلے سر..... ناک  
کے بدلے ناک..... اور عزت کے بدلے صرف

عزت.....“ وہ بھی اسی لہجے میں بولا تھا۔ اور ان کے  
اندر تک سکون اتر گیا تھا۔

ہر فکر سے آزاد، اخلاق کی قیود سے تاملد، دنیا  
میں صرف اپنی اور باقی پروردگار کے والا ان کا واحد

سپوت ضیاء علی خان ان کا فخر تھا۔  
☆☆☆

آسمان کو زمین ہمارا عزم بناتا ہے۔  
انسان اگر ارادہ کر لے تو خلا تک میں قدموں

کے نشان چھوڑ سکتا ہے۔ اس دنیا میں کچھ بھی ایسا نہیں  
ہے جو انسان کے لیے ناممکن ہو۔ پختہ ارادہ اور مسلسل

محنت ناممکن تک کو ممکن بنا دیتے ہیں۔

یہی سب اس نے کر دکھایا تھا۔ نہ صرف پوزیشن  
لی تھی بلکہ اسکا لرشپ بھی حاصل کیا تھا اور سب سے

بڑی کامیابی تو یہ تھی کہ وہ بقول امی، خاندان کی پہلی  
لڑکی تھی جو یونیورسٹی پڑھنے جا رہی تھی۔ اس خوشی نے

اس کی نیندیں اڑادی تھیں۔ نکل یونیورسٹی میں اس کا  
پہلا دن تھا۔ آج وہ جلدی سونا چاہتی تھی لیکن نیند نہ

جانے کہاں کھو گئی تھی۔ کروٹ بدلتے، بدلتے تک آکر  
اس نے لائٹ آن کر دی اور سر ہانے رکھی کتابوں کی

ایک، ایک کر کے ورق گردانی کرنے لگی۔ کبھی ہلکا سا  
کھٹکا ہوا اور سین اندر آئیں۔

”ای آپ.....؟“ وہ حیران ہوئی۔  
”آپ ابھی تک جاگ رہی ہیں؟“ کتابیں رکھ

کر اس نے اٹھ کر بیٹھے ہوئے ماں کے لیے جگہ بنائی۔  
”تم بھی تو جاگ رہی ہو؟“ وہ مسکرائیں۔ اسے

ماں کی مسکراہٹ کھولتی سی لگی۔  
”کل یونیورسٹی جانا ہے نا..... تو بس شاید اسی

خوشی میں.....“ وہ کھل کر مسکرا دی تھی۔  
”لالہ.....!“ انہوں نے اس کا دایاں ہاتھ اپنے

ہاتھوں میں تھام لیا۔  
”میری مانو بیٹا..... یونیورسٹی مت جاؤ۔“ ان

کے لہجے میں منت بھر آئی۔  
”کیوں امی؟“ اس نے بیزار سے اپنا ہاتھ

کھینچ لیا۔  
”کیونکہ میں نہیں چاہتی بیٹا کہ میرے ماضی کا

کوئی بھی تاریک سایہ تمہارے حال یا مستقبل کو گہنا  
دے۔“ وہ متفکر تھیں۔ وہ چپ رہی۔

”میری مان لو..... بس حزمہ سے شادی کے لیے  
ہاں کر دو۔ بعد میں بھلے پڑھائی کرتی رہنا۔“

”پلیز امی.....!“ وہ بری طرح چڑ گئی۔  
”آپ اپنی غلطی بار بار ہم پر کیوں توہونا چاہتی

ہیں۔“ اس کے انداز میں بدتمیزی تھی۔ سین لب کاٹے لگیں۔  
”اور پھر پچھو کے مزاج سے آپ اچھی طرح

واقف ہیں۔ حزمہ کے رشتے کے لیے ہاں کہہ کر آپ  
ساری عمر مجھے پچھو کے طعنے سننے پر مجبور کرنا چاہتی

ہیں۔“ اس کی آواز بتدریج اونچی ہو رہی تھی۔  
”میری بات سمجھنے کی کوشش تو کرو بیٹا۔“ وہ اس

کا ہاتھ سہلاتے ہوئے بولیں۔  
”نہیں امی..... اس معاملے میں تو ہرگز نہیں.....

باقی رہی یونیورسٹی کی بات تو بے فکر رہیں۔ آپ کی  
زندگی میرے سامنے ہے۔ سو دفعہ سوچوں گی ایسا کوئی

بھی قدم اٹھاتے ہوئے۔“  
”لالہ.....“ اس کے طنزیہ کاٹ دار لہجے نے انہیں

اندر تک چھلنی کر دیا تھا۔ آنسو خود بخود پکپکوں کی باڑھ پار  
کرنے لگے۔

”اب جائیں امی، مجھے نیند آرہی ہے۔“ وہ  
نظریں چراتے ہوئے بولی۔

سین خاموشی سے اٹھ کر کمرے سے باہر چلی  
گئیں۔ وہ کچھ دیر یونی بیٹھی کڑھتی رہی۔ پھر لائٹ

آف کر کے سونے لیٹ گئی۔  
☆☆☆

”تم نے رات پھر امی کے ساتھ بدتمیزی کی۔“  
وہ جانے کے لیے تیار تھی جب شاہ ویز تیر لہجے میں کہتا

اس کے سر ہوا تھا۔  
”امی خود میرے کمرے میں آئی تھیں۔ اور

میں نے کوئی بدتمیزی نہیں کی۔ صرف یونیورسٹی نہ جانے  
سے منع کیا ہے۔“ وہ بال بناتے ہوئے بولی۔

”تو یہ بات تم آرام سے بھی تو کر سکتی تھیں۔“  
اس کے بے نیاز سے انداز پر وہ مزید بھڑک اٹھا تھا۔

”تم ان سے کیوں نہیں کہتے کہ وہ مجھے منع نہ  
کرتیں۔“ وہ اب اس کی طرف مڑ چکی تھی۔

”وہ ہماری ماں ہیں لالہ..... انہیں پورا حق  
حاصل ہے کہ جو چاہے بات کریں، جس چیز سے چاہیں

منع کریں۔“ وہ دو قدم اس کے قریب ہوا۔  
”لیکن انہیں یہ حق حاصل نہیں شاہ ویز کہ وہ ہم

سے ہماری خوشیاں چھین لیں..... ان سے جو غلطی سرزد  
ہوئی اس کی یادداشت میں وہ ہماری جھوٹی، جھوٹی

## محبت لفظ ہے لیکن

جھوٹی اس کی یادداشت میں وہ ہماری جھوٹی، جھوٹی  
خواہشات کا گلا گھونٹ دیں۔“ وہ بیک اٹھا کر چادر

اڑھنے لگی۔ شاہ ویز اس بار چپ چاپ اسے دیکھے گیا۔  
”بھئی، کبھی تم مجھے بالکل زریں پچھو کی کا پی لگتی

ہو۔ ان کی ہی طرح خود غرض اور بے رحم.....“ وہ  
ہونٹ چپاتے ہوئے بولا۔

”تھنکس فار دا کمپلیمنٹس.....“ وہ بے نیازی  
سے سر جھٹکتی باہر نکل گئی۔

”خدا تم پر رحم کرے لالہ.....“ وہ بڑبڑایا تھا۔  
وہ سین کا سا بیٹھا نہیں تھا۔ ان کی بڑی نند کا بیٹا تھا

جو اس کی پیدائش کے وقت ہی دم توڑ گئی تھیں۔ باپ  
نے دوسری بیوی کے ذریعے اسے ساتھ رکھنے سے

انکار کر دیا تھا۔ تب سین ہی تھیں جس نے اسے ایک ماں  
کا مکمل پیار دیا تھا۔ ان کی گود نے اسے پناہ دی

تھی۔ اور یہ بھی حقیقت تھی کہ شاہ ویز نے بھی ہمیشہ سکے  
بیٹے سے بڑھ کر دکھایا، وہ سین کا دایاں بازو تھا۔ ان کی

سگی اولاد انہیں اتنا نہ سمجھتی تھی جتنا کہ شاہ ویز..... شاہ  
ویز ہی تھا جس نے ان کی زندگی میں آنے والی ہر کی

پوری کی تھی۔ اور یہی وجہ تھی کہ اگر کوئی انہیں ہرٹ کرتا  
تو مطلب وہ شاہ ویز کو ہرٹ کرتا.....

☆☆☆  
”پاپا ہیں اندر؟“ جیونگم چپاتے ہوئے بڑی...

بے فکری سے اس نے ٹیبل بجا کر سیکرٹری کو اپنی طرف  
متوجہ کیا۔

”جی.....“ جواب سنتے ہی وہ آگے بڑھی تھی۔  
”میم.....“ وہ چونک کے رکی..... سیکرٹری ذرا

سا جھبکی۔  
”ایکچھ نیلی..... اندر کچھ انٹرویوز اشارت ہیں۔

آپ اگر کچھ دیر.....“  
”شٹ اپ.....“ اس نے منہ بناتے ہوئے کہا

اور سامنے موجود گلاس ڈور دھلیلی اندر چلی آئی۔ سکندر  
حیات نے متحیر نگاہ اس پڑائی اور ان کے لبوں پر خوب

صورت مسکان بھر گئی۔  
ماہنامہ پاکیزہ 69 دسمبر 2017ء

”مائی ڈول.....“ وہ کمرے میں موجود دوسرے فرد کو یکسر فراموش کر بیٹھے تھے۔

”یہ باہر کس کو بٹھا رکھا ہے پاپا..... you should dismiss her now“ وہ خفا، خفا انداز میں بولی۔ کرسی پر بیٹھا شخص پہلو بدل کے رہ گیا۔

”کیا ہوا؟“ وہ پریشان ہوئے۔  
”اس نے مجھے اندر آنے سے روکا۔“ وہ خفا تھی۔  
”اچھا چھوڑو یہاں بیٹھو.....“ انہوں نے بات بدل دی اور اسے کندھوں سے تھام کر اپنی چیئر پر بٹھا دیا۔ اور تبھی اس کی نظر سامنے بیٹھے شخص پر پڑی تھی۔ اس کی گہری ڈارک براؤن آنکھیں اسی کا طواف کرنے میں مصروف تھیں۔ نظر ملے ہی اس شخص نے فوراً نگاہوں کا رخ بدل لیا تھا مگر وہ نگاہیں نہ پھیر سکی تھی۔

”so young man! you can leave now“ انہوں نے مسکراتے ہوئے اس نوجوان سے کہا۔ وہ اٹھ کھڑا ہوا۔

”کل تک کامیاب امیدواروں کو ان کے فون نمبرز پر اطلاع کر دی جائے گی۔“ وہ یو بیسٹ آف لک۔“ انہوں نے مسکراتے ہوئے مصافحہ کے لیے ہاتھ بڑھایا تھا جو اس نے فوراً ہی تھام لیا۔ اور دروازے کی طرف مڑ گیا۔

”سنو.....“ تبھی کمرے میں اس لڑکی کی آواز گونجی۔ وہ مڑا۔ ”نام کیا ہے تمہارا؟“ اس کی آنکھوں میں اشتیاق تھا۔

”باریال.....“ باریال ولی خان.....“ اس نے مڑو بانہ انداز میں جواب دیا اور باہر نکل گیا۔  
”what happened Aman“ سکندر حیات نے پوچھا۔

”اسے جاب مل جانی چاہیے پاپا..... کافی کام کا آدمی لگ رہا ہے۔“ امن نے کھوئے، کھوئے لہجے میں کہا۔

”میرا بھی یہی خیال ہے۔“ انہوں نے اثبات

میں سر ہلایا۔

”اچھا کیا لوگی بیٹا؟“

”بلیک کافی.....“

”اوکے.....“ انہوں نے کہہ کر بیل کا بٹن دبا دیا تھا۔

☆☆☆

پانچ گھنٹوں کے طویل سفر نے اسے خاصا تھکا دیا تھا۔ ہانے اس کی رہائش کا انتظام شہر سے دور ایک سرسبز فارم پر کیا تھا۔ یونیورسٹی میں ایڈمیشن تک اسے یہیں رہنا تھا۔ جب تک باکوئی دوسرا بندوبست نہ کر لیتے۔ سرسبز کھیتوں کے درمیان بنی پکی سڑک پر آتے ہی اس نے سب شے اتار دیے تھے گاڑی کے..... تازہ ٹھنڈی ہوائے اس کے شل اعصاب کو کافی پرسکون کر دیا۔ اس نے گاڑی کی رفتار کم کر دی۔

سڑک کے دونوں طرف جوار کے سرسبز کھیت تھے۔ یہاں دھول نہ ہونے کے برابر تھی۔ پندرہ منٹ کی ڈرائیو کے بعد ان کی کار ان کے آبائی فارم ہاؤس کے بلند و بالا کٹڑی سے بنے گیٹ کے اندر داخل ہوئی۔ فارم کے گیٹ سے تین روپہ سڑکیں جاری تھیں۔ ایک دائیں، ایک بائیں اور ایک سیدھی سامنے کی طرف..... اس نے گاڑی سامنے والی سڑک پر ڈال دی۔ رہائشی حصے میں بنے بنگلے کے سامنے اوپن گیراج میں آتے ہی اسے بے پایاں خوشی کے احساس نے گھیرا تھا۔ ہانے اس کی پسند کے مطابق گھر کو کلر کر دیا تھا۔ اس کے اترتے ہی گھر کے بھی ملازم بھاگے چلے آئے تھے۔

”سلام سردار.....“ سبھی یک زبان بولے تو ضیا علی خان مسکرا دیا۔

”ولیکم السلام.....“ کیا حال ہے جمال چاچا.....“ وہ ادھیڑ عمر شخص سے مخاطب ہوا۔ وہ ہاتھ جوڑ کر سر جھکا گیا۔ وہ اندر کی طرف بڑھ گیا۔

”اور لی گل آپ کیسی ہیں؟“ سفید چادر میں ڈھکا وجود اس کے قریب آیا اور اس کے سر پر ہاتھ رکھ دیا۔  
”میں ٹھیک ہوں، سردار کیسے ہیں؟“ وہ مسکرائیں۔

”سردار نہ کہا کریں بی گل.....“ مجھے اچھا نہیں لگتا۔“ وہ صوفے پر بیٹھتے ہوئے بولا۔

”سردار کو سردار نہ کہوں تو اور کیا کہوں۔“ انہوں نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ”آپ نہالو تب تنک میں چائے بنا لیتی ہوں۔“

”ساتھ کچھ کھانے کے لیے بھی لے آئیے گا.....“ خان نے راستے میں کھانا نہیں کھایا تھا۔ قریب کھڑے پرانے ملازم دوران نے ہدایت کی۔  
”جی میں ابھی کچھ بنائے دیتی ہوں۔“ انہوں نے کہا اور کچن کی طرف چل دیں۔

”خان، فریش ہو لیں۔“ دوران نے ضیا کو مخاطب کیا جو سر کے نیچے ہاتھ رکھے صوفے پر تقریباً لیٹے آنکھیں موند گیا تھا۔  
”ہم.....“ وہ بھی فوراً اٹھ کھڑا ہوا تھا۔

☆☆☆

”حزہ آیا ہوا ہے؟“ وہ یونیورسٹی سے واپسی پر گھر کے اندر داخل ہوئی تو حزہ کی بائیک کھڑی تھی۔ شاویز اسی وقت سودا سلف لایا تھا۔ وہ بے اختیار ہی پوچھ پٹھی۔

”ہاں، زرینہ پچھو بھی ساتھ ہیں۔“ اس نے شاپر ز اٹھاتے ہوئے بتایا۔

”ہم.....“ وہ اندر جانے کے بجائے سیڑھیوں کی طرف بڑھ گئی۔

”پچھو سے تول لو۔“ وہ حیران ہوا۔

”تم لوگ مل لو.....“ مجھے کوئی شوق نہیں۔“ تنہی سے کہتی وہ اوپر بھاگ گئی۔ لاؤنج سے باہر آتے حزہ نے بھی اس کی بات سن لی تھی۔

”نہ جانے لالہ اتنی بدگمان کیوں رہنے لگی ہے۔“ وہ ادا اس ہوا۔

”تم ٹینشن نہ لو، اس کا تو مزاج ہی ایسا ہے۔“ شاہ ویز شاہر سنبھالنا ان کی طرف بڑھ گیا۔ حزہ کچھ دیر وہاں کھڑا سوچتا رہا پھر اوپر چلا آیا۔ سامنے برآمدے میں گھنٹوں پر سرریزے وہ ڈشیں جاں دکھائی دے گئی۔ وہ

مصبت لفظ ہے لیکن.....

اور لالہ بچپن سے جس قدر قریب تھے۔ زرینہ کے برتاؤ اور طرز یہ لہجے نے ان دونوں کے درمیان اچھی خاصی دوری پیدا کر دی تھی۔ وہ ماں کی ساری غلطیوں کا کفارہ ادا کرنے کی کوشش کرتا لیکن ناکام ٹھہرتا.....

”کیسی ہو.....؟“ وہ اس کے قریب ہی فرش پر بیٹھے ہوئے بولا تھا۔ لالہ نے سر نہیں اٹھایا۔

”یہ بدگمانی کب ختم کرو گی لالہ.....“ وہ اس کی طرف دیکھتے ہوئے پتلی لہجے میں بولا تھا۔

”بدگمانی نہ خود پیدا ہوتی ہے نہ خود ختم..... اور تم اچھی طرح جانتے ہو کہ میری بدگمانی کی وجہ کیا ہے؟“ وہ سر اٹھائے بغیر تنہی سے بولی۔

”میں سمجھتا ہوں لالہ.....“ تنہی کتنی کوشش کرتا ہوں اس خلیج کو پانے کی جوامی اپنے لفظوں سے ہمارے رشتوں میں بنا دیتی ہیں۔“ وہ اسے منارہا تھا۔ لالہ نے سر اٹھایا۔

”بعض زخم بہت گہرے ہوتے ہیں حزہ..... ان کا کوئی مرہم نہیں ہوتا۔“ وہ سچ ہوئی۔

”پھر میری تو سب سے بڑی بد قسمتی ہی یہی ہے کہ سارے زخموں کی وجہ میری ماں ہے۔“

”یہ صرف تمہاری سوچ ہے لالہ۔“ اسے افسوس ہوا۔

”حقیقت ہے یہ.....“ اور کوئی بھی اسے جھٹلا نہیں سکتا۔ پچھو کا رویہ، لوگوں کی باتیں، یہ سب امی کے ایک غلط قدم کی دین ہیں۔ کسی کو روکنا، کسی کا منہ بند کرنا ہمارے بس میں نہیں..... بس میں ہے تو صرف خود کو دھتکار کے لیے تیار رکھنا۔“

”وہم ہے تمہارا.....“ مامی نے تمہاری تربیت اتنی اچھی کی ہے کہ کوئی تمہیں دھتکار نہیں سکتا۔“ وہ اسے دلاسا دے رہا تھا۔ وہ تنہی سے مسکرا دی۔

”تم جانتے ہو تمہاری ماں آج یہاں کیوں آئی ہے؟“ وہ اسے کہتے بے حد تیز لگی لیکن وہ ضبط کیے بیٹھا رہا۔ لالہ وہ واحد سہیلی تھی، جس کی کوئی بھی بات وہ آرام سے سہہ سکتا تھا۔

”نہیں..... میں نہیں جانتا، تم بتاؤ۔“ وہ سامنے

رات کا نہ جانے کون سا پہر تھا، جب مانوس سے شور کی وجہ سے اس کی آنکھ کھل گئی۔ لائٹ نہیں تھی البتہ کھڑکی سے اندر آتی چاند کی کرنوں نے کمرے کو کچھ نہ کچھ روشنی بخش دی تھی۔ پھر بھی اس کا دل بری طرح گھبراہٹا۔ وہی مانوس سا شور رات کے سناٹے میں ایک مرتبہ پھر گونجنا تھا۔

”اورنگل.....“ وہ دھیرے سے بڑبڑائی۔ سیلبرز پاؤں میں پھن کر وہ کھڑکی کے پاس آکھڑی ہوئی۔ اور وہ نظروں کے سامنے تھی۔ سوئمنگ پول سے کچھ دور لگے اتنی جھولے پر سفید لباس میں لمبے سیاہ بال کھولے چاند کی چاندنی میں وہ کوئی مقدس روح لگ ہی تھی۔ اتنی دور سے بھی وہ اس کے چہرے پر نرم داسی بآسانی بڑھ سکتی تھی۔

”جب آنکھوں سے خواب دیکھنے کا حق چھین لیا جائے ناں تو ان آنکھوں میں بس تنہائی اور وحشت گھر کر لیتے ہیں۔“ اوزکل نے اسے بتایا تھا۔ اور آج سے واقعی یہ حقیقت لگ رہی تھی۔ لوہے کی کڑیوں کی واز پھر سنا چمک رہی تھی۔

تجی اس نے نیچے کسی کے چیخنے اور پھر اوز گل کو  
 ہڑی سے اٹھ کر ایک سمت دوڑتے ہوئے دیکھا تھا۔  
 کوئی بہت اونچی آواز میں چیخ رہا تھا۔ وہ ذرا  
 کمک کر نیچے برآمدے کی سمت دیکھنے لگی اور پھر اندر  
 سے چھین مارتا وجود اس کی نظروں کے سامنے تھا۔  
 وہ زگل اسے سنبھالنے لگی تھی لیکن وہ دو جود قابو میں نہیں  
 رہا تھا۔

”حد ختم ہونے کو ہے۔ حد ختم ہونے کو ہے۔“ وہ  
انہی مکی۔

”سب برباد ہو جائے گا۔“ اوز کل اسے پیار سے سہلاتے ہوئے اندر لے جانے لگی۔

”ہم پھر چلتے ہیں، تم اس کا خیال رکھنا۔“ زید نے کہا تو شاہد نے بھی اثبات میں سر ہلادیا۔

ابراہیم اسے ڈراپ کر کے ..... واپس  
 پھانسا گیا تو وہ بی گلی کو چاٹنے کا کہہ کر ادھر اپنے کمرے  
 میں آ گیا۔ اور بستر پر ڈھسے سا گیا۔ لیٹے، لیٹے اچانک  
 سے خیال سا آیا۔ اٹھ کر سائنمیل کی دروازے ایک  
 گھنٹہ سا بیک نکلا۔ یہ بیک اسے باجی نے دیا تھا۔ اور  
 طور خاص تاکید کی تھی کہ اس کے اندر موجود کاغذ پرزے۔  
 لکھی تمام ہدایات توجہ سے پڑھ کر ازبر کرے اور پھر  
 کاغذ ضائع کر دے لیکن وہ اسے دراز میں ڈال کر بھول  
 گیا تھا۔

کچھ سوچتے ہوئے اس نے بیک کی زپ کھولی  
 رکازِ نکال کر دیکھا۔ اوپر ایک نام لکھا تھا۔ نیچے کچھ  
 برید ہدایات تھیں، اس نے بے خیالی سے کاغذ پر  
 طرہیں دوڑائیں اور دوبارہ سے دراز کھول اس  
 کا ڈال دیا۔ ابھی وہ نسا بیک اس کی گود سے پھسل کر  
 نیچے جا گرا تھا۔ اور ایک پاپیوٹ ساز کی تصویر اس  
 سے نکل کر باہر آگئی۔ خیائے چیر کی مدد سے اسے قریب  
 لایا اور جھک کر تصویر اٹھالی۔

وہ کسی بے حد خوب صورت لڑکی کی تصویر تھی۔  
اس نے سفید رنگ کی شال سر پر لے رکھی تھی۔ اس  
لے شفاف چہرے پر ہلکا کی مصوویت تھی اور اس کی  
انکھیں..... جیسے سرمے سے بھرے کالے کورے،  
بے حد سیاہ اور چمکدار آنکھیں..... ایک پل کے لیے  
سے یوں لگا جیسے وہ بھی اسے ہی تک رہی ہیں.....  
رات سے منہ کھولے وہ ان کالی ساحر آنکھوں کو  
دیکھے جا رہا تھا۔ نہ سراسر درد رہا نہ کوئی اور خیال.....

”خان.....چائے۔“ کا کا کی آواز پر وہ بری طرح چونکا۔ کا کا چائے رکھ کر واپس جا چکے تھے اور فیا کی حالت پر حیران کہ اسے کیا ہو گیا تھا۔ اس نے سر تک کر دل ہی دل میں اپنے بابا سے عہد کی تجدید کی مین نکال کر تصویر کے پیچھے لکھنے لگا۔

”گل لالہ.....“ اس کے لبوں پر مسکراہٹ تھی۔

”ڈرو مت..... میں تمہیں بچا لوں گا۔“ باریال نے تسلی دی اور اسے اوپر کھینچنے لگا۔ منجی اچانک ہی اس کا ہاتھ بھیکنے لگا۔ اس کے ہاتھ سے بچے کا ہاتھ پھسلنے لگا۔ وہ اسے تیزی سے اوپر کھینچنے لگا۔ لیکن اس بچے کا ہاتھ اس کے ہاتھ سے پھسلتا چلا گیا۔ باریال نے زور دار جھج کے ساتھ آنکھیں بند کر لی تھیں۔

اور جیسی ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا تھا..... خود کو اپنے کمرے میں بستر پر پا کر وہ ٹھنڈی سانس بھر کر گیا تھا۔

”نہ جانے یہ بچہ کون ہے؟ جو بار بار خارباؤں میں آکر مجھے ڈراسا دیتا ہے۔“ وہ پیشانی پر مسئلہ لگا۔

جتنا وہ ان خوابوں سے دور بھاگنے کی کوشش کرتا تھا۔ وہ اسی قدر اسے تنگ کرنے چلے آتے تھے۔ وہ پانی پی کر سونے لیٹ گیا۔ یہ جانے ہوئے بھی کہ اب اسے ساری رات نیند نہیں آئی تھی۔

پشتو کے مشہور گلوکاروں کا لائیو کنسرٹ تھا۔ وہ بھی اپنے دوستوں کے ساتھ انجوائے کرنے چلا آیا تھا لیکن بے ہنگم شور اور لمبے سفر کی تھکن کی وجہ سے جلد ہی اس کے سر میں شدید درد اٹھتا تھا۔

”آریواو کے.....؟“ اسے پیشانی مسلتے دیکھ کر  
 زید نے پوچھا۔

”ناٹ فیلنگ وٹل مار.....“

”کیا ہوا تمہیں؟“ ابراہیم بھی پریشان ہو گیا۔  
 ”معمولی سردرد ہے۔ ڈونٹ وری.....“ وہ اٹھ  
 کھڑا ہوا۔

”باہر چلتے ہیں۔“ ابراہیم نے کہا تو سب نے  
س کی پیروی کی۔

باہر آ کر ضیا کو سکون سا محسوس ہوا۔  
 ”میرے خیال میں، میں تمہارے ساتھ چلتا ہوں۔“ ابراہیم نے پیش کش کی۔

”ہاں، میں شاید ڈرائیونگ نہ کر سکوں..... تم مجھے چھوڑ کر گاڑی خود لے جانا۔“ اس نے بھی دوست کے لیے سہولت کی۔

دیکھنے لگا۔

”دادی نے میرے اور تمہارے رشتے کی بات چھیڑی ہے۔ پھپھو نے اسی کو فون پر کھری، کھری سنا دیں۔ اب دادی کی باری ہے۔ وہ بھی لائیو جاؤ..... تمہا شاید کھو.....“ ننی سے کہہ کر وہ اٹھ کر اندر کمرے میں چلی گئی۔ دروازہ زوردار آواز کے ساتھ بند ہوا تو وہ بھی تیزی سے نیچے چلا آیا۔ کمرے سے آتے شور کی آوازیں لالہ کی بات کی گواہی دے رہی تھیں۔ وہ آگے نہ بڑھ سکا تھا۔

وہ کہتے ہی سیاہ پہاڑوں کے درمیان کھڑا تھا۔  
اس کے چاروں طرف سیاہ، سرمئی رنگ کے پہاڑ تھے۔  
اور اس قدر بلند کہ دن کے وقت بھی اس سے کام گمان  
ہو رہا تھا۔ وہ حیران تھا کہ وہ آیا تو یہاں آیا کیسے؟

اس نے ارد گرد گھوم، گھوم کر راستہ ڈھونڈنے کی کوشش کی لیکن بے سود..... تھک ہار کر اس نے ایک قدرے تراشیدہ پہاڑ پہ چڑھنا شروع کر دیا، اس پہاڑ پہ جبکہ، جبکہ ابھارتے، بھی وہ آسانی سے چڑھتا گیا تھا۔ کافی دیر کی تھک و دو کے بعد وہ بالآخر چوٹی پر پہنچنے میں کامیاب ہو گیا تھا۔ اس نے چوٹی کے عین اوپر ذرا جھکے بڑے سے پتھر کو مضبوطی سے پکڑا اور جست لگا کر اوپر آگیا۔ اور اگلے لمحے اسے حرمت کا شہید جھکنا سا لگا تھا۔ دس بارہ سالہ کا ایک خوب صورت سائز کا چوٹی پر کھڑا تھا۔ اسے دیکھ کر وہ ذرا سا چونکا۔ پھر دو قدم پیچھے ہٹا تھا۔ بارہا اس نے دیکھا پیچھے جبکہ بہت کم محسوس..... اور گہری کھائی تھی۔

”سنو..... پیچھے نہ ہو۔“ وہ خوفزدہ ہو کے چلا یا۔  
 بچہ مزید پیچھے گیا۔ باریال کی سانس رکنے لگی۔

”سنو لڑکے.....“ وہ تیزی سے آگے کو بڑھا اور وہ بچہ پیچھے اور تم بھی اس کے پیروں نے زمین چھوڑ دی تھی۔ باریال نے آگے بڑھ کر اس کا ایک ہاتھ تھام لیا تھا۔ اب وہ چوٹی پر گھٹنوں کے بل بیٹھا تھا۔ اور لڑکا نیچے لٹک رہا تھا۔ وہ جھنجھنے لگا تھا۔

## مصبت لفظ ہے لیکن

کرتے ہی شادیز کی کھلکھلائی آواز سنائی دی تھی۔

”آج شام تیری طرف آنے والا تھا۔ جاب مل گئی ہے مجھے۔ سوچا تھا مل کر ہی بتاؤں گا۔“ وہ مسکراتے ہوئے بولا۔

”ارے واہ یار۔ مبارک!۔۔۔۔۔“ وہ چمک اٹھا۔  
”خیر مبارک۔۔۔۔۔“

”ابھی آ جاؤ ناں۔۔۔۔۔“ شادیز نے کہا۔  
”نہیں ابھی تو آفس کے لیے نکل رہا ہوں۔“

## قارئین متوجہ ہوں

خبریں ملتا

کچھ عرصے سے بعض مقامات سے یہ شکایت مل رہی ہیں کہ ذرا بھی تاخیر کی صورت میں قارئین کو پرچہ نہیں ملتا۔ ایکٹو کی کارکردگی بہتر بنانے کے لیے ہماری گزارش ہے کہ پرچہ نہ ملنے کی صورت میں ادارے کو خط یا فون کے ذریعے مندرجہ ذیل معلومات ضرور فراہم کریں۔

☆ بک اسٹال کا نام جہاں پر چادرستیاب نہ ہو۔

☆ شہر اور علاقے کا نام۔

☆ ممکن ہو تو بک اسٹال کا PTCL یا موبائل نمبر۔

شمار عباس 0301-2454188

جاسوسی داستانیں

سپنس جاسوسی پایہ ذہن سرگزشت

0301-2454188

مندرجہ ذیل فون نمبروں پر بھی رابطہ کر سکتے ہیں

35802552-35386783-35804200

ای میل: jdpgroup@hotmail.com

ہا جسے بتائیں رہ سکی تھیں۔

”کچھ نہیں دیدے۔۔۔۔۔“ وہ چونکا پھر سیدھا ہو کے ہی بیٹھ گیا۔

”کچھ تو ہے بچے۔ کیا پھر سے وہی خواب تنگ کرنے لگا ہے۔“ انہوں نے اندازہ لگانے کی کوشش کی۔

”دیدے۔۔۔۔۔“ اس نے جیسے ان کی بات نہ سنی تھی۔ دھیرے سے پکارا تھا۔

”جی دیدے کی جان۔۔۔۔۔“ ان کے لہجے میں محبت درآئی۔

”کیا میرا کوئی چھوٹا بھائی تھا۔“ اس کے سوال پر ان کو حیرت کا شہید جھٹکا لگا تھا۔

”نہیں۔۔۔۔۔ میں تمہیں کئی دفعہ بتا چکی ہوں کہ تم زریاب خان کی اکلوتی اولاد ہو۔“

”پھر وہ لڑکا کون ہے؟“ وہ پیشانی مسلنے لگا۔  
”کون لڑکا؟“ وہ خود پریشان ہو گئیں۔

”وہ میرے خواب میں آتا ہے دیدے۔۔۔۔۔“

”میشہ کسی نہ کسی مصیبت میں۔۔۔۔۔ لیکن میں چاہنے کے باوجود اسے نہیں بچا پاتا۔“

وہ انہیں بے حد ڈسٹر لگا۔  
”اپنے خوابوں کو اپنے اوپر طاری مت کر لیا کرو، یہ سب خیال ہوتے ہیں۔ خالی خولی دھواں۔۔۔۔۔“ وہ اسے تسلی دینے لگیں۔

”اب ناشتا کرو اور خود کو رُسکون کرو۔۔۔۔۔ آج تمہارا پہلا دن ہے آفس میں۔ خوش، خوش جاؤ۔“

”ہم۔۔۔۔۔“ وہ اثبات میں سر ہلا گیا۔

اس کے جانے کے بعد البتہ دیدے خود کتنی ہی دیر تک اس کے خواب کے متعلق سوچتی رہی تھیں۔

☆☆☆

وہ باہر نکل کر جیسے ہی بینک اسٹارٹ کرنے لگا، اس کی سیل فون بج اٹھا۔ اسکرین پر شادیز کا نام دیکھتے ہی اس کے لبوں پر بہت پیاری مسکان چل گئی۔

”کہہ رہا تھا۔۔۔۔۔“ کال پک۔۔۔۔۔

”اچھی طرح جانتی ہیں پھپھو کی عادت کو پھر بھی باز نہیں آتیں۔“ وہ منہ بناتے ہوئے بولی۔ ”اب دیکھنا کتنے دن مانیگرین کی تکلیف میں مبتلا رہیں گی۔“ اس نے پیش گوئی بھی کر دی۔ شاہ ویز مسکرا دیا۔

”نانو نے بھی یہی سمجھا یا تھا ان کو۔۔۔۔۔ مگر تم جانتی ہو، امی کب کسی کی مانتی ہیں۔“ وہ ٹرے میں کھانا رکھتے ہوئے بولا اور باہر نکل آیا۔

”یہی من مانی ہی تو انہیں آج تک بھگتی پڑ رہی ہے۔“ وہ شادیز کے چہچہے آئی۔

”بری بات لالہ۔۔۔۔۔“

”کیا بری بات۔۔۔۔۔ اچھی طرح جانتی ہیں کہ سب لوگ بات، بات یہ ان کے ماضی کا تذکرہ چھیڑ دیتے ہیں۔۔۔۔۔ ہمیں بھی کئی دفعہ گھر سے بھاگی ہوئی عورت کی اولاد کا طعنہ سہنا پڑتا ہے۔۔۔۔۔ لیکن وہ۔۔۔۔۔ انہیں کچھ خیال ہی نہیں۔۔۔۔۔ مزہ آتا ہے جیسے ان کو یہ سب طعنے سننے میں۔۔۔۔۔ دوسروں کو خود موقع دیتی ہیں کہ وہ ان کو اور ان کی وجہ سے ہمارے کیریکٹر پر بھی بات کریں۔“ وہ اس موضوع سے کس قدر دھی ہوئی تھی وہ اچھی طرح سمجھ سکتا تھا۔

”اچھا یہ لو۔۔۔۔۔ موڈ صحیح کرو اپنا۔“ شادیز نے بات بدلی اور بھاپ اڑاتے کر ماگرم اسلے ہوئے چاول، رائیہ اور ویسی کھی کا اور رزکا لگی دال دیکھتے ہی شادیز نے اس کا چہرہ کھلتا دیکھا تھا۔

”ارے واہ۔۔۔۔۔ امی نے میری فیورٹ ڈش بنائی تھی۔ اور تم نے ایویں سارا نام مجھے باتوں میں لگائے رکھا۔“ حسب معمول وہ ساری واردات اس کے سر تھوپ کر خود بری الذمہ ہو چکی تھی۔ اور رغبت سے کھانا کھانے لگی۔ وہ مسکرا کر اسے دیکھ گیا۔

☆☆☆

”کیا ہوا ہے باری؟“ مجھے تم کچھ پریشان لگ رہے ہو؟“ صبح سے ہی وہ انہیں کھویا کھویا لگ رہا تھا۔ اور اب ناشتا بھی صحیح ڈھنگ سے نہیں کر رہا تھا تو وہ

”بھاگ جاتو بھی بھاگ جا۔۔۔۔۔ ورنہ سب برباد ہو جائے گا۔“ وہ اسے کمرے میں لے گئی تھی۔ آوازیں مدہم ہوتے ہوئے دم توڑ گئیں۔ وہ لمبی سانس لے کر دوبارہ بستر پر آ گئی۔

”لگتا ہے اللہ لوگ کو پھر دورہ پڑا ہے۔ مجھے بھی بمیا کی طرح جلد شہر میں کسی اچھے کالج میں داخل لینا ہوگا۔ ورنہ یہاں رہ کر میں بھی ان سب کی طرح پاگل ہو جاؤں گی۔“ بستر پر لیٹتے ہوئے اس نے جیسے خود کو یاد کر لیا لیٹتے ہی گل مینہ کی آنکھ لگ گئی تھی۔ وہ ایک مرتبہ پھر نیند کی گہری وادیوں میں ڈوب چلی تھی۔

☆☆☆

”آگئیں تم۔۔۔۔۔؟“ وہ گھر کے اندر داخل ہوئی تو شاہ ویز کی مسکراہٹ نے اس کا استقبال کیا۔

”اُف آج تو گرمی نے برا حال کر دیا، اوپر سے بس میں اتار ش۔۔۔۔۔“ وہ چادر اتار کر پیڈل شل فین کے سامنے کھڑی ہو گئی۔

”تو تمہاری اپنی چوائس ہے۔ کتنی مرتبہ آفری ہے کہ میں حاضر ہوں پک اینڈ ڈراپ سروں کے لیے۔۔۔۔۔ مگر نہ جی۔۔۔۔۔“ وہ تھا ہوتا چن کی طرف بڑھ گیا۔

”تمہاری جالب گننے کی دیر ہے۔ پھر دیکھتی ہوں کہاں رہتی ہے یہ آفریاتی۔۔۔۔۔“ وہ مسکراتے ہوئے بولی۔

”اچھا۔۔۔۔۔ فریش ہو لو۔۔۔۔۔ میں تمہارے لیے کھانا گرم کرتا ہوں۔“ اس نے کچن سے آواز دی۔

”کیوں، امی کہاں ہیں؟“ وہ حیران ہوئی۔

”وہ پھپھو کی طرف گئی ہیں۔۔۔۔۔ نا نا اندر سو رہی ہیں۔“ اس نے جواب دیا۔

”کیوں۔۔۔۔۔ وہاں کیوں گئی ہیں؟“ اس کے لہجے میں تنہی درآئی۔

”کہہ رہی تھیں کافی دن ہو گئے ان کی طرف گئے ہوئے پھر ناراض ہوں گی۔“ کچن سے کھٹ پٹ کی آوازیں آنا شروع ہو چکی تھیں، وہ اپنا کام شروع کر چکا تھا۔ وہ کچن کی کھڑکی میں آٹھ رہی۔

### قبولیت کا یقین رکھو

نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا۔ تم اللہ تعالیٰ سے ایسی حالت میں دعا کیا کرو کہ تم قبولیت کا یقین رکھا کرو اور یہ جان رکھو کہ اللہ تعالیٰ غفلت سے بھرے دل کی دعا قبول نہیں کرتا۔ (ترمذی)

مخلص: ورشیا طارق، ڈی جی خان

”تم تو بنا بولے، بنا کہے میری ہر بات سمجھ لیا کرتی تھیں لالہ۔“ وہ اس کا بازو تھام کر اسے جھٹکا دیتے ہوئے بولا۔ ”تو پھر اب یہ اجنبیت کیوں؟“ اس کی آنکھوں میں لالہ کو اپنا عکس صاف نظر آیا تھا، اس کے دل کو کچھ ہوا لیکن سختی سے خود کو کوئی بھی نرمی برتنے سے روکا تھا اور ایک جھٹکے سے اپنا ہاتھ چھڑوایا۔

”کیونکہ میں اپنی اور اپنی ماں کی اوقات اور تمہاری اور تمہاری ماں کی مجبوریوں سے اچھی طرح واقف ہوں۔“ وہ تلخ ہوئی تھی۔

”اور ہاں ایک بات یاد رکھنا علی حمزہ زیدی۔ کمزوری لڑکی ہونے کے باوجود میں تمہیں کسی معاملے میں کوئی رعایت نہیں دے سکتی۔ تمہاری ماں کے معاملے میں تو بالکل بھی نہیں۔۔۔۔۔۔ ویسے بھی میرا ماننا ہے جہاں عزت پر حرف آئے۔۔۔۔۔۔ وہاں سے ہٹ جانا ہی بہتر ہے۔“ وہ سخت لہجے میں بولی۔

حمزہ لب پکٹتا رہا۔

”اب چاہا۔۔۔۔۔۔ ورنہ تمہاری اماں کو شک ہو جائے گا۔“ سختی سے کہتی وہ سبز جھون کی طرف بڑھ گئی۔ حمزہ وہیں کھڑا اسے جاتا دیکھتا رہا۔

☆☆☆

گاڑی ایک قدرے تاریک لیکن کشادہ مکی میں داخل ہوئی تو وہ سیدھا ہو کر بیٹھ گیا۔ یہ تاریکی صرف چند قدم کے فاصلے تک محدود تھی۔ دورویہ دو منزلہ

”اے بتا کر وہ پھر اقرار کو اپنے ہاتھ کے بنے کپڑوں کے نمونے دکھانے لگیں۔ حمزہ کچھ دیر سوچتا رہا۔ پھر اٹھ کر سیڑھیاں پھلانگتا اوپر آ گیا۔ سامنے ہی لالہ بوتروں کو پکارتی دانہ ڈال رہی تھی۔ اس کی نظر حمزہ پہ پڑی۔ لیکن وہ فوراً ہی رخ پھیر گئی۔

”یہی ہو؟“ وہ دھیرے، دھیرے قدم اٹھاتا اس کے قریب آ گیا۔

”ٹھیک ہوں۔“ اس نے اس کی طرف دیکھ کر بغیر ہی جواب دیا۔

”آج کل کیا مجھ سے پردہ کرنے لگی ہو؟“ وہ اس کے سامنے آ گیا۔ ”اگر ایسا کچھ ہے تو مجھے متا دو۔۔۔۔۔۔ میں خود ہی تمہارے لیے آسانی کر دوں گا۔“ ”تمہیں پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔۔۔۔۔۔ میں خود اپنا آپ چھٹا تو لیتی ہوں۔“ وہ اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے بولی۔

”انسان تب چھپ سکتا ہے جب اسے کسی کی نظریں نہ پہنچ سکیں۔“ وہ اس کے قریب ہوا۔ ”تم تو میری نظروں میں اس قدر گہرا عکس پاگئی ہو کہ اور کچھ نظر ہی نہیں آتا۔“ اس کی نظروں کی سچائی پر وہ نظریں بدل گئی۔

”آج پچھو نے یہاں آنے کی اجازت کیسے دے دی؟“ وہ بات بھی بدل گئی۔

وہ ٹھنڈی سانس بھر کر رہ گیا۔

”اقرار کو کچھ شاپنگ کرنی تھی۔ سوچا تم سے بھی ملتا چلوں۔“ دونوں ہاتھ پینٹ کی جیب میں ڈالے وہ اسے دیکھ رہا تھا۔ سفید شیون کے سوٹ پر گلابی دوپٹے میں اس کی سفید رنگت مزید گہری تھی۔ وہ چاہ کر بھی اس کے چہرے سے نظریں نہیں ہٹا رہا تھا۔

”اوہ۔۔۔۔۔۔ مطلب گھر جا کے شاپنگ کا بہانہ بتانا ہے۔“ وہ ہنس دی۔

”میری مجبوری کا مذاق مت بنایا کرو۔“ وہ ٹھٹھا ہوا۔

”تم محبت جیسے خالص جذبے کا مذاق مت بنایا کرو۔“ وہ بھی تیز لہجے میں بولی۔

حمزہ بے بسی سے لب کاٹنے لگا۔

”کیونکہ مرد کی یہی شان ہے شہزادے۔۔۔۔۔۔ ضیا مڑ کر دو قدم آگے آیا۔“ لیکن ایک بات یاد رہے کہ یہ سب صرف یہاں تک۔۔۔۔۔۔ یونیورسٹی میں تم میں سے کوئی بھی نہ تو لڑکیوں کی طرف پھٹکے گا نہ ہی اوپاشوں کی طرح یوں بات کرے گا۔“ اس نے شہادت کی انگلی دکھاتے ہوئے ان سب کو وارن کیا۔

”یہ کیا بات ہوئی؟“ زید چڑ کر بولا۔

”میں نے کہہ دیا ناں۔۔۔۔۔۔ ضیا اس کی خفگی کو خاطر میں نہ لایا۔

”کیا مطلب ضیا۔۔۔۔۔۔“ براہیم حیران ہوا۔

”وقت آنے پر مطلب بھی سمجھا دوں گا۔“ اس نے جان چھڑائی۔

”اب چلو۔۔۔۔۔۔“ اس نے باہر کی طرف اشارہ کیا۔ سب نے سر ہلا دیا۔

☆☆☆

حمزہ اور اقرار کو وہاں آئے کافی وقت ہو چلا تھا۔ لیکن لالہ ابھی تک ان کے سامنے نہیں آئی تھی۔ حمزہ نے محسوس کیا تھا کہ ہر گزرتے دن کے ساتھ لالہ ان سب سے دور ہوتی جا رہی تھی۔ پہلے تو کبھی کبھار گفتگو ہو ہی جاتی تھی لیکن اب تو وہ سامنے آنے سے بھی کترانے لگی تھی۔ حمزہ کی تو گویا جان پر بن آئی تھی۔ اقرار تو نا تو، ماما کے ساتھ بھی کافی کمزور رہتی۔ لالہ کی سنجیدہ طبیعت کی وجہ سے وہ خود بھی اس سے فاصلے پر ہی رہتی۔ لیکن حمزہ کے لیے یہ فاصلے جاں گسل تھے۔

”مامی، شادویز کہاں ہے؟“ چائے ختم کر کے اس نے سین سے پوچھا تھا۔

”ایک دو جگہ انٹرویو تھے اس کے۔۔۔۔۔۔ آتا ہی ہوگا۔“ انہوں نے بتایا۔

”اور لالہ۔۔۔۔۔۔؟“ جھٹکے ہوئے اس نے پوچھ ہی لیا تھا۔

”آج جلدی آگئی تھی یونیورسٹی سے کہہ رہی تھی کہ بوتروں کا بنجرہ صاف کرے گی شاید اوپر ہی

شام کو ملتے ہیں۔“ اس نے بانیٹ پر بیٹھے ہوئے کہا۔

”اوکے، اوکے۔۔۔۔۔۔ ملتے ہیں پھر۔۔۔۔۔۔ اللہ حافظ۔۔۔۔۔۔“ شادویز نے فون بند کر دیا تھا اور مسکراتے ہوئے اس نے بانیٹ اشارت کی تھی۔

☆☆☆

”خان۔“ گہری نیند میں وہ کسماسیا ضرور مگر

کروٹ بدل کر فوراً ہی دوبارہ سو گیا۔

”چھوٹے خان جی۔۔۔۔۔۔! دوسری پکار یہ اس نے دھیرے سے آنکھیں کھولیں۔

”کیا ہے کا؟“ نیند میں ڈولی آواز میں پوچھا گیا۔

”خان! آپ کے دوست آپ کا پوچھ رہے ہیں۔“ دوراں نے مؤدب لہجے میں کہا۔

”کہہ دو میں سو رہا ہوں۔“ اس نے واپس جانے کا اشارہ کیا۔

”کہا ہے خان۔۔۔۔۔۔ مگر وہ کہہ رہے ہیں کہ آپ نے آج ان کے ساتھ کہیں جانے کا وعدہ کر رکھا ہے۔“

کا کانے مزید بتایا۔

”یاد ہے مجھے۔۔۔۔۔۔ مگر ابھی میرا بالکل بھی موڈ نہیں ہے کا۔“ اس نے انکار کیا۔

”جی خان جی۔۔۔۔۔۔“ مؤدب لہجے میں کہتا وہ مڑ گیا۔

”اچھا کہیں۔۔۔۔۔۔“ وہ ابھی دروازے کے قریب ہی تھے۔ جب وہ اٹھ بیٹھا، وہ مڑ کر اس کی طرف دیکھنے لگے۔

”آپ جائیں۔۔۔۔۔۔ میں آ رہا ہوں۔“ وہ انگڑائی لیتے ہوئے بولا۔ دوراں باہر نکل گیا۔

تھوڑی دیر بعد وہ تیار ہو کر باہر لاؤنج میں آیا تو وہ اس کے منتظر تھے۔

”چلو۔۔۔۔۔۔“ چابی گھماتا ان سب کو جیسے حکم دیتا وہ

باہر کی طرف بڑھا تھا۔

”بڑی جلدی ہے شہزادے کو۔“ زید خباثت سے ہنسا۔

”سچ یار۔۔۔۔۔۔ سنا تھا کہ دیکس زادے عاشق مزاج اور پیسہ پھینک ہوتے ہیں۔ آج اپنی آنکھوں سے بھی دیکھ لیا۔“ شاہد نے مسکراتے ہوئے کہا۔





موسم سرما کا دھیما دھیما

آغاز دسمبر کے شمارہ

کا خوب صورت انداز

### دوسری موت

باطن کی اچھائی اور ظہار کی برائی میں  
لتھنے کے کرداروں کے مصائب کی سنسنی خیز  
داستان... پروین زبیر کے قلم سے

### انگاریے

دشمنوں کے شکنجے میں آہنی اعصاب کے مالک چیمپین  
کا امتحان۔ محبت اور جنگ کی فضا میں آگے بڑھتا  
ظاہر جاوید مغل کے یادگار سلسلے کی ایک اور مرکزی

### آوارہ گرد

چلچلیاتی دھوپ میں ہر دم ایک نئی مصیبت  
سے برسر پر کارنو جوان کی سرگزشت  
عبدالرب بھٹی کی سلسلے دار کہانی

### سروں کے رنگ

روبینہ رشید..... جاسوسوں کے

نرغے میں پھنس جانے والے جاسوس کی پیتا

زویا اعجاز..... روز و شب کو تہہ بالا

کردینے والے خوفناک واقعات کی بازگشت

### ان کے علاوہ

تویر یاض، سلیم انور، محمد یاسر اعوان، عکس فاطمہ، تمکین

رضا اور سید زاہد علی شاہ کی طبع زاد و ترجمہ کہانیاں

### جینی نکتہ چینی

ایسا محروم جس کے گرد ان کی پوری فیملی گھوم رہی تھی۔  
شب و روز کا چکر پونہ چلا رہا اور بچے اسکول،  
کان کے دور سے نکل کر عملی زندگی میں داخل ہو گئے  
مہ انہوں نے عمر ان کے سر پر سہرا بجانے کا پروگرام  
بنا دیا۔ ہر ماں کے دل میں چاندی بھولانے کا ارمان تو  
شروع سے ہی ہوتا ہے اور اس سلسلے میں ان کا ارادہ  
ابھی حسین اور اعلیٰ تعلیم یافتہ بھانجی لانے کا تھا لیکن  
بھگت میں شادی کا سلسلہ شروع ہوا تو عمران نے  
مہمت سے اپنی کلاس فیلو کا نام لے دیا۔ ایسے میں  
اشفاق بھی بیٹے کے بھنوا بن گئے۔ کیونکہ بقول ان  
کے ”جب زندگی بچوں نے گزاری ہے تو پسند بھی ان  
کی ہونی چاہیے۔“

یوں صائمہ بھو کی صورت ان کے آنگن میں  
اتری۔ شادی کے اولین دن تو گھوٹے پھرنے اور  
موتوں میں ہنسی خوشی گزر گئے لیکن جب عمران نے  
ادوارہ ڈیوٹی جانا شروع کیا تو صائمہ نے اپنے کمرے کو  
اپنا مسکن بنالیا۔ وہ مجبوراً تاشے، کھانے کے لیے باہر  
آتی لیکن خاموشی سے ضروری کام پٹپٹا کر فوراً واپس چلی  
جاتی۔ شام کو عمران کی آمد پر وہ جھجھک کر اس کے ساتھ  
بٹلی جاتی پھر ان کی واپسی رات گئے ہی ہوتی۔ جب سحر  
لے بیٹے سے شکوہ کرنے کی کوشش کی تو اس کے انداز  
نے انہیں وہ پرانی کہاوت یاد دلادی۔ ”بیٹا جب تک  
آپ کا بیٹا ہے جب تک اس کی شادی نہیں ہو جاتی۔“  
پے میں اشفاق ان کا سہارا بنے ان کی دلجوئی سے وہ  
پہلی تمام پریشانیاں بھول جاتی تھیں۔

اچانک پرسکون انداز سے رواں دواں ان کی  
ندگی کی گاڑی ایک دم سے گہری کھائی میں جا گری۔  
مرد گہری اور تاریک..... تاریکی اس قدر تھی کہ ہاتھ  
لو ہاتھ بھائی نہیں دیتا تھا۔ آکسیجن کی کمی تھی کیونکہ  
مائل لینا بھی دو بھر تھا۔ دنوں بعد جب سکتہ ٹوٹا اور  
اس بجال ہوئے تو خاردار شاہراہ حیات پر تنہا رہ  
انے کا غم انہیں مینوز خون کے آئسور لٹاتا رہا۔ ہنسی  
اشفاق کو آندھی

والی ایک دلکش بچی پر بڑی جواہرے والد کی انگلی تھ  
جاری تھی۔ یکا یک انہیں یوں محسوس ہوا جیسے اگر  
کی وجہ وہ خود ہوں اور ساتھ ان کے والد ہیں۔  
کا در بچہ کیا دوا ہوا یا دونوں کے رتھ پر سوار ہو کر وہ  
کے جزیروں میں جا اتریں۔  
آہ..... بچپن..... زندگی کا خوب صورت  
دور..... آزادی..... بے فکری..... نہ غم زندگی،  
روزگار..... والدین کی بے لوث محبت اور  
بھائیوں کا پیار بھرا ساتھ چھینا جھپٹا، لڑائی جھگڑا،  
شکوے شکایت اور لڑکھٹوں میں سب کچھ بھلا کر گھر ان  
تہمتوں سے گونج رہا ہوتا۔ لیکن یہ حسین دور ملک ج  
بیت گیا اور وہ باہل کے آنگن کو سوتا کر کے پیاد  
سدا حار تھیں۔

وہ سحر حیات سے سحر اشفاق کیا ہوئیں جیسے  
انداز ہی بدل گئے۔ ایک پیار کرنے والے ہم سفر  
چاہت نے انہیں اندر تک سرشار کر دیا۔ اشفاق کے  
بھرپور التفات اور توجہ سے وہ خود پرنازاں ہو گئیں۔  
ان کے جیون ساٹھی نے پہلی ہی نظر میں اپنا دل ہار  
تھا تو سحر نے بھی ان کی محبت میں خود کو سرتا پاد دل ڈالا  
محبت کے خمار میں ڈوبے، تن من کا ہوش بھلا۔  
شادی کے یہ ابتدائی دن انہیں عمر بھر کے لیے انمو  
یادوں کا تختہ دے کر ہوا ہو گئے۔

اگلے سال عمران کی آمد نے جہاں ان کی ذار  
کی تکمیل کر دی وہیں انہیں مامتا کے جذبے  
شائستگی بھی بخشی۔ اس کے بعد کیے بعد دیگرے م  
اور علی کی صورت ان کے آنگن میں دو پھول اور یکا  
جنہوں نے نہ صرف ان کی زندگی کو بہار کے رنگوں  
سجا دیا بلکہ ان کی پرورش اور تعلیم و تربیت کی ذمہ  
داریوں کی صورت مصروفیات کا ایسا تختہ دیا جس میں کو  
کر وہ اپنی ذات کو بھی فراموش کر گئیں..... وہ دا  
رات ان کے کھانے، پینے، سونے، جاگنے اور پڑھ  
لکھنے کی فکروں میں ہلکان رہیں لیکن ان کی تمام نگاہ  
اپنے بچوں کی پیاری صورتیں دیکھ کر دور ہو جاتی وہ ایک

زندگی و جیل چیز کی محتاج ہوئی تھی جیون پر ایک ہی موسم  
طاری تھا جھوکا موسم..... سرد، تاریک، بے رنگ،  
تکلیف دہ.....

زندگی ان کے لیے بس ایک خاموش، طویل  
اور صبر آزمایہ جنگ تھی اور تدریجاً مقابل تھے۔ بیماری، تنہائی  
اور اپنوں کی بے بسی۔ فوج کے حملے کے بعد تمام تر  
قوت ارادی پروئے کار لا کر وہ اسی قابل ہوئی تھیں  
کہ وہمیل چیز کو دھکیل کر کمرے کی کھڑکی تک لے  
جاسکیں اور کراہی کیا تھا شخص ایک بستر اور الماری پر  
مشتمل ایک چھوٹی سی جائے پناہ..... ان کے اس  
پے رنگ و بوجیون میں بہار کا جھونکا، ان کی تنہائی کی  
سامی اور بیرونی دنیا سے رابطے کا واحد ذریعہ تھی یہ  
چار فٹ چوڑی اور چھ فٹ لمبی کھڑکی جس کے شیشے  
سے سر ٹکا کر وہ گھنٹوں باہر کا کر تھیں۔ دنیا کے  
ہنگامے، رونق، چہل پہل اور لوگوں کی گہما گہما انہیں  
زندگی کا احساس دلاتے۔ تیسری منزل پر واقع ان کا  
یہ خوب صورت فلیٹ ایک ڈبل روڈ پر واقع تھا جس  
پر صبح چار پانچ بجے سے جو دودھ اور ڈبل روٹی والی  
گاڑیوں سے ٹریفک کا آغاز ہوتا تو رات گئے تک یہ  
سلسلہ جاری و ساری رہتا۔

ان کا بیٹا اور بھو بچوں کے ساتھ نئے سال کی  
آمد کا جشن منانے اور آتش بازی دیکھنے گئے ہوئے  
تھے۔ نوبے ملازمہ ان کو کھانا کھلا کر دوانی دے کر، اپنا  
کام ختم کر کے ان کی اجازت سے اپنے کمرے  
میں سونے جا چکی تھی۔ کچھ دیر تو وہ ٹی وی سے دل  
بہلاتی رہیں پھر پور ہو کر اسے بھی بند کر دیا۔ آج باہر  
روشنی اور شور و غل معمول سے کہیں زیادہ تھا۔ گاڑیوں  
کے پارن، میوزک کا شور اور لوگوں کی آوازیں آخر  
کار انہیں متوجہ کرنے میں کامیاب ہو ہی گئیں۔  
دھیرے، دھیرے اپنے کمزور ہاتھوں سے وہمیل چیز  
چلا کر وہ کھڑکی تک پہنچ گئیں جہاں زندگی اپنی تمام تر  
خوب صورتیوں کے ساتھ جلوہ افروز تھی۔ اچانک ان  
کی نظر لال اوٹی فرا کی اور ٹی پی پنے پھلے، پھلے چہرے

طوفان کی طرح ان کی کار سے نکلنے والے آئل ٹینکر نے لحوں میں ان سے جھین لیا تھا۔ تنہا زندگی انہیں بوجھ محسوس ہو رہی تھی اور جیسے کو دل نہیں چاہتا تھا لیکن انسان اللہ کی رضا کے آگے بے بس ہے اور صبر کے سوا کوئی چارہ نہیں۔ وقت کے مرہم نے آہستہ آہستہ جدائی کے زخموں کو مندمل کرنا شروع کر دیا۔ باپ کی آنکھیں بند ہوتے ہی بیٹا ہر پابندی سے آزاد ہو گیا اور چند ماہ میں پہلے سسرال پھر بیرون ملک ٹھکانا کر لیا۔ ان پے درپے صدموں نے محروک پیاریوں کا شکار بنا دیا۔ اب انہیں اپنی زندگی کا بھروسہ نہیں رہا تھا اور ان کی خواہش تھی کہ وہ جلد از جلد اپنی ذلت دار یوں سے سبکدوش ہو جائیں اور پھر اللہ نے ان کی سن لی۔ فریبی عزیزوں سے موتا کے لیے اتنا بہترین رشتہ آگیا جس کا انہوں نے بھی تصور بھی نہیں کیا تھا۔ سہیل، ان کا داماد، دہلی میں ایک ملٹی نیشنل کمپنی میں ملازمت کرتا تھا۔ اگرچہ بیٹی کو خود سے اتنی دور بھیجے رکھے لیے ان کا ہرگز بیٹی نہیں چاہتا تھا لیکن اس کے روشن مستقبل کی خاطر انہیں دل پر بھاری پتھر رکھنا پڑا۔ ساتھ ہی انہوں نے اپنے لیے بہو بھی پسند کر لی تاکہ بیٹی کی رخصتی کے بعد گھر میں رونق ہو جائے۔ اور یوں ایک خوب صورت شام کو دھوم دھام سے حنا ان کے آنگن میں اتاری تو اگلے دن ویسے کی پروقار تقریب میں مونا پیا کے سنگ روانہ ہو گئی۔

موتا کے دہی روانہ ہونے اور علی کے اپنی زندگی میں مصروف ہونے کے بعد انہیں اپنی ذات ..... بے مصرف محسوس ہونے لگی۔ علی اپنی جاب اور حنا بچوں کی ذلت دار یوں میں الجھتی چلی گئی۔ مونا سال میں ایک دفعہ چکر لگاتی، جب تک صحت نے ساتھ دیا وہ ملنے ملائے اور حنا کی مدد کرنے میں اپنا دل بہلائے رکھتیں لیکن پھر فالج کے حملے نے انہیں بستر تک محدود کر دیا اور اب وہ تھیں ان کا کمر اور وہیل چیئر..... شروع میں تو بہو اور بیٹا ان کی دیکھ بھال کرتے رہے لیکن پھر ان کے لیے ایک کل وقتی ملازمہ کا بندوبست کر دیا گیا تھا

اور اب وہ تھیں اور جان لیوا تنہائی۔

سوچوں میں ڈوبے ہوئے انہیں اندازہ ہی نہیں ہوا کہ زندگی کے غم ان کے چہرے کی جھریوں میں راستہ بناتے جیتے چلے جا رہے تھے۔ پھر اچانک ہی ایک یاد ان کے لبوں پر مسکراہٹ بن کر چمکی جب بھی وہ بے حد پریشان ہوتیں یا کسی مسئلے میں الجھتی ہوتیں تو اشفاق ان کو (relase) کرنے کے لیے کہتے ”بیگم! آپ اکیلی کیوں پریشان ہو رہی تھیں آپ تین مرتبہ تالی بجائیں تو آپ کا یہ غلام حاضر ہو جاتا۔“ تو وہ ہنس دیتیں اور پھر نہ جانے ان کے من میں کیا سمائی انہوں نے دھیرے، دھیرے دونوں ہاتھ اٹھائے پھر ایک..... دو..... تین..... تین باری تالی بجائی اور پھر ایک معجزہ ہو گیا انہیں دیکھ کر بھی اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آ رہا تھا اشفاق ان کے بالکل پاس کھڑے تھے وہی چمکتی آنکھیں اور روشن چہرہ..... مسکراتے ہوئے جیسے ہی انہوں نے اپنا ہاتھ آگے بڑھایا سحر نے بے تذبذب ہو کر تمام لیا۔

آتش بازی بارہ بجے شروع ہوئی۔ رنگوں، روشنیوں اور خوشبوؤں سے سچے اس جشن میں وقت گزرنے کا احساس ہی نہیں ہو رہا تھا۔ یکا یک علی کو یوں محسوس ہوا جیسے ماں نے اسے پکارا ہو۔ ویسے ہی جیسے بچپن میں کبھی بہت پیار سے پکارا کرتی تھیں۔ ”ہلو! میری جان۔“ وہ یکا یک چونک گیا اور کھوٹی، کھوٹی نظروں سے ارد گرد دیکھنے لگا لیکن ہر طرف وہی منظر تھا۔ نہ جانے کیوں ایک عجیب سی بے چینی نے اس کے دل و دماغ کا احاطہ کر لیا۔ اس نے اس احساس کو اپنے ذہن سے جھٹکنے کی لاکھ کوشش کی لیکن ناکام رہا۔ دھیرے، دھیرے یہ احساس لاشعور سے نکل کر شعور پر پوری طرح قابض ہو گیا۔ علی کی اتنی بڑی کہ وہ سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر طوفانی رفتار سے ڈرائیونگ کرتا ہوا گھر واپس آ گیا۔ جیسے ہی وہ ماں کے کمرے میں داخل ہوا سانسے کا منظر دیکھ کر بے ساختہ اس کی چیخ نکل گئی۔ وہ بیہوشی کی حالت میں آدھی وہیل چیئر اور آدھی کھڑکی

میں پڑی تھیں۔

پہلا احساس ہر سو مکمل تاریکی کا تھا پھر ساعت نے دور سے آنے والی کچھ آوازوں کو قید کیا لیکن وہ اس قدر مدھم تھیں کہ ذہن انہیں کوئی بھی معنی پہنانے سے قاصر تھا حواس کی بیداری کا یہ دورانیہ بھی محض چند سیکنڈ کے لیے تھا اس کے بعد ذہن پھر مکمل تاریکی میں ڈوب گیا۔

یہ سلسلہ کئی روز تک چلتا رہا پھر ایک دن انہیں یوں محسوس ہوا جیسے دور سے انہیں کوئی بلا رہا ہے۔ انہوں نے آنکھیں کھول کر دیکھنے کی کوشش کی لیکن بالکوں پر منوں بوجھ دھرا تھا، یوں چاہا تو زبان اکڑی ہوئی اور گلا خشک ہو کر کاٹنے پڑے ہوئے تھے..... بدشکل وہ مدھم سی بے معنی آواز نکال پائیں تھی پاس کھڑی نرس ان کی جانب متوجہ ہوئی۔ ایک مہربان ہاتھ نے سہارا دے کر ان کا سر تھوڑا سا اونچا کیا اور پیچ کے ذریعے کچھ پانی ان کے منہ میں ڈالا۔ دو چار گھونٹ پانی پینے سے ان کی طاقت کچھ بحال ہوئی۔

دھیرے، دھیرے آنکھیں کھولنے پر سانسے کا منظر انہیں اپنی بصارت کا دھوکا محسوس ہوا۔ مونا اور عمران دائیں، بائیں ان کے ہاتھ تھامے بیٹھے تھے اور علی ان کی پانکھی بیٹھا تھا۔ ان کے بچوں کی سوچی آنکھیں، بکھرے بال اور شکستہ حالتیں ان کی دلی کیفیات کی غماز تھیں۔ خوشی ان کے امگ، امگ سے پھوٹنے لگی انہوں نے اپنے دونوں ہاتھ اٹھائے تو وہ سب ان کے بازوؤں میں آکر سکنے لگے۔ انہوں نے ہاری، باری ان کو پیار کیا اور پُرسکون ہو کر مسکراتے ہوئے آنکھیں موند لیں۔ یہی تو وہ انمول خوشی تھی جس کے لیے وہ کب سے ترس رہی تھیں، ان کی عمر بھر کی جمع فحش، ان کی کل کائنات ان کی بانہوں میں تھی۔ ان سے زیادہ خوش قسمت دنیا میں کون تھا؟

ان کو ایک ہفتے کے بعد ہوش آیا تھا۔ علی نے ان کو بیہوشی کی حالت میں فوری طور پر ایسویلیس میں اپنٹال پہنچایا تھا۔ بروقت طبی امداد مل جانے کی وجہ

## حیون کھانی

سے سیریس ہارٹ ایک کے باوجود ان کی جان بچ گئی ورنہ ڈاکٹرز کے مطابق تھوڑی سی بھی مزید تاخیر جان لیوا ثابت ہوتی۔ اطلاع ملنے ہی عمران اور مونا بھی پہلی فلائٹ سے پہنچ گئے۔ ہفتہ بھر ان کے بچے بھوک، پیاس اور نیند جیسے فطری تقاضوں سے بے خبر دن رات ان کی زندگی اور تندرستی کے لیے دعائیں کرتے رہے اور آخر کار اللہ تعالیٰ نے ان کی سن لی اور ان کی ماں موت کی سرحد کو چھو کر لوٹ آئیں۔ ”قدرِ نعمت بعدِ زوال“ کے مصداق وہ تو ماں کو کھونے کے تصور سے ہی لرز گئے۔ اپنی زندگی کی مصروفیات میں مگن خواب غفلت میں پڑی ان کی اولاد کو اس جھکے نے پوری طرح بیدار کر دیا تھا۔

دراصل یہ انسانی فطرت ہے کہ جب تک اسے کوئی نعمت میسر ہوتی ہے تو وہ اس کی قدر نہیں کرتا نہ ہی اس کی اہمیت کو محسوس کرتا ہے لیکن جیسے ہی وہ اس سے محروم ہوتا ہے تو اس پر پوری طرح اس کی قدر و قیمت واضح ہو جاتی ہے۔ اپنی بے پروائی، ماں کی بیماری، پریشانی اور تنہائی نے ان کو بجز ندامت میں غرق کر دیا تھا۔ عمران دیارِ غیر میں کافی مشکلات جمیل کر اب اپنی زندگی میں سیٹ ہو چکا تھا لہذا اس نے ماں کو اپنے ساتھ لے جانے کا فیصلہ کر لیا مونا بھی اس کے قریب ہی رہتی تھی اور اگلے سال علی بھی وہاں شفٹ ہو رہا تھا۔ اس لیے وہ بخوشی اس کے ساتھ جانے کے لیے آمادہ ہو گئیں۔ ان چند ہی دنوں میں تینوں نے اپنے بھرپور پیار اور توجہ سے ماضی کی غلطیوں کی کافی حد تک تلافی کر دی تھی۔ وہ اپنے گزشتہ رویے پر بے حد شرمندہ تھے اور بار بار ان سے معافی طلب کرتے اور وہ تو ماں تھیں! کیسے معاف نہ کرتیں۔ اللہ تعالیٰ کی عظیم اور بابرکت ذات کے بعد ماں ہی تو ہے جس کا ظرف اتنا وسیع ہوتا ہے کہ وہ اولاد کی ہر خطا کو نہ صرف کھلے دل سے معاف کر دیتی ہے بلکہ ہمیشہ اس کی خوشیوں کے لیے دعا گو بھی رہتی ہے۔



تخلیق کائنات سے لے کر اب تک... کئی ادوار بدلے مگر عورت کی کہانی پر دور میں لگ بھگ وہی رہی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ہمیں رشتوں کی دُور میں باندھا تو اس کا مقصد یہ تھا کہ ہم اپنی تخلیق کے مقصد کو اور بھی خوب صورت بنائیں مگر اس کے پیدا کردہ دل میں جذبے بھی اسی کے پیدا کردہ تھے۔ محبت، نفرت، رشک، حسد، رنج، غصہ اور خوشی... اب ہم پر منحصر ہوتا ہے کہ ہم کس جذبے کو خود پر حاوی کر لیتے ہیں، یہ ہماری خصلت بن جاتا ہے اور ہماری کل شخصیت کا خلاصہ... یہی ہمارے کردار کی تعمیر کرتا ہے اور ہم اسی کا تاثر دوسروں پر عمر بھر کے لیے چھوڑتے ہیں۔ ہماری عادات صرف ہم پر ہی نہیں بلکہ دوسروں کی زندگیوں پر بھی اثر انداز ہوتی ہیں۔ کسی کی زندگی کا سفر کس طرح سہل یا کٹھن ہوتا ہے اس کا انحصار ان لوگوں پر ہوتا ہے جو ان کی زندگی کے اہم کردار ہوتے ہیں اور جن کا ہونا یا نہ ہونا اہمیت رکھتا ہے۔ پیدائش سے لے کر اپنی موت تک رشتوں کی دُور سے بندھے ہوئے کردار زندگی کو پنس کر گزارتے ہیں یا رو کر، مشقت سے سانس لیتے ہیں یا خوشیوں کے پنڈولوں میں جھولتے ہوئے اس کا سارا دار و مدار ان سے وابستہ رشتوں پر ہوتا ہے۔ وقت بدل جاتا ہے مگر کہانی وہی رہتی ہے اور اپنی باری سے اس میں مختلف کردار شامل ہوتے رہتے ہیں۔

زندگی کے انہی پچھوخم اور شیب و فراز سے نبرد آزما ہوتی ایک چشم کشا تحریر.....

”ظاہری بات ہے کہ اس کا علاج سب سے اہم ہے..... کیا نوعیت ہے، کیا اسٹج ہے..... کتنا پھیلا ہوا ہے، یہ سب جاننا اہم ہے۔“ وہ رکیں۔ ”اس میں سب سے پہلے آپریشن کا فیصلہ کرنا ہوگا کیونکہ باقی سب سوالوں کے جوابات اس کے بعد ہی معلوم ہوں گے۔“

”تو اس میں رکاوٹ کیا ہے؟“

”تم جانتی ہو تاں کہ تم ماں بننے والی ہو اور اس دوران آپریشن کرنا اتنا آسان فیصلہ نہیں ہوتا..... مرلیضہ کو طویل بے ہوشی کے لیے دوا دی جانا ہوتی ہے اس کا بچے کو کسی بھی نوعیت کا نقصان ہو سکتا ہے.....“

”مثلاً بچے کو کیا ہو سکتا ہے؟“ میں نے بے چینی سے سوال کیا۔

”کم از کم کچھ اس کی زندگی کو نقصان ہو سکتا ہے یا کسی قسم کی معذوری..... ڈاکٹر کے انکشاف نے مجھے سن کر دیا۔“

”آپریشن بچے کی پیدائش کے بعد تو بھی کیا جاسکتا ہے نا؟“ میں نے ہولے سے پوچھا۔

”بہت زیادہ رسک والی بات ہے..... اس حد تک کہ بچہ اس سے متاثرہ پیدا ہو سکتا ہے۔“

”وہ تو اسے ہر صورت خطرہ ہے..... پیدا مرض کے ساتھ ہو یا مرض کے علاج کے لیے آپریشن سے اسے کچھ ہو جائے۔“

”ہاں.....!“

”ہا..... میری بد قسمتی کہ اسے میری کوکھ سے پیدا ہونا تھا..... پیدا ہونا بھی ہے کہ نہیں۔“ میری آنکھیں آنسوؤں سے لبریز ہو گئیں۔

”تم کیوں ہمت ہار رہی ہو پیاری.....“ سارہ نے مجھے اپنے ساتھ لگا لیا۔ ”دنیا میں ہزاروں لوگ اس بیماری کا مقابلہ کرتے اور اس سے جیت بھی جاتے ہیں، اللہ کرے گا کہ تم بھی ان میں سے ایک ہوگی اور تمہارے بچے کو بھی کچھ نہیں ہوگا۔“

”پتا نہیں سارہ..... میں ایک مسئلے سے ٹکاتی ہوں اور دوسرے میں پھنس جاتی ہوں۔“ میں سکتے لگی تھی۔

”تم اپنی دوست کو سنبھالو سارہ.....“ ڈاکٹر یاسمین کو دو دفعہ نرس بلانے آ چکی تھی۔ ”سوری..... میں نہیں یوں چھوڑ کر نہ جاتی مگر ایک مرلیضہ زندگی اور موت کی کشمکش میں ایمر جنسی میں لائی گئی ہے.....“ میرا کال تپتھا کر وہ باہر نکل گئیں..... مجھے زندگی اور موت کی کشمکش میں مبتلا کر کے۔

”آپ کو پانی لا کر دوں میڈم؟“ نرس نے سوال کیا۔

”ہاں لے آؤ.....“ پھر سارہ نے اس سے شکریہ کے ساتھ اس پانی کا گلاس لیا۔ ”پانی پیو امرت!“

”مجھے پیاس نہیں ہے.....“ میں نے منہ پھیرا۔

”پیاس کے بغیر پی لو!“ اس نے اصرار کیا تو میں نے ایک گھونٹ لیا، وہ میرے حلق میں ہی پھنس گیا تھا۔

”نہیں پیاجار ہا ہے سارہ!“ میں نے حلق میں اٹتے ہوئے آنسوؤں کے گولے کو پینے کی کوشش کی۔

”اچھا ٹھیک ہے.....“ اس نے گلاس ایک تپائی پر رکھ دیا۔

”چلیں سارہ.....“ مجھے بہت گھبراہٹ ہونے لگی تھی۔

”چلتے ہیں..... تم ذرا سنبھل جاؤ!“

”ہوں.....“ میں نے سینے کی گہرائی سے سانس کھینچی۔ ”سنبھل جاؤں گی وقت کے ساتھ!“

”اچھا میں تمہارے ڈرائیور کو دیکھتی ہوں۔“ وہ باہر نکلی تو جلد ہی واپس آ گئی۔

”کیا ہوا.....“

”باہر نرس بیٹھی ہے اس نے بتایا ہے کہ ہم ابھی نہیں جاسکتے..... ڈاکٹر یاسمین کو تم سے ملنا ہے ابھی۔“

دل سے اکثر ادا اس رہتا ہے  
”ڈرائیور لینے آیا ہے تمہیں امرت.....“ سارہ نے مجھے ہولے سے ہلا کر کہا، میں جیسے کسی خواب سے جگتی تھی۔

”کیوں؟“ میں نے حیرت سے سوال کیا، میں نے تو اسے واپس بھیج دیا تھا اور آنے کو تو نہیں کہا تھا۔

”پوچھتی ہوں میں اس سے.....“ سارہ کہہ کر باہر نکل گئی، میں نے اپنی ٹھوڑی اپنے گھٹنوں پر رکھی اور پرسوج انداز میں سامنے کی دیوار کو گھورنے لگی۔ میں وہاں کیوں بھی اس وقت؟

”وہ کہہ رہا ہے کہ تمہارا فون بند آ رہا تھا اور تم نے اتنی دیر بھی کر دی تو گھر والے پریشان ہو رہے ہیں.....“

سارہ نے واپس آ کر ڈرائیور کا پیغام دیا۔

”میرا فون کیوں بند تھا.....؟“ میں نے اپنے فون کی تلاش میں ادھر ادھر نظر دوڑائی، نظر نہیں آیا تو بیک میں چپک کیا، فون کی بیٹری ختم ہو گئی تھی۔ ”گھر والے کیوں پریشان ہونے لگے میرے بارے میں..... کون گھر والے؟“

چاچا اور ماما تو کل سے گاؤں گئے ہوئے ہیں۔“

”میں پھر پوچھ کر آئی ہوں ڈرائیور سے.....“ وہ کہہ کر مڑنے لگی۔

”نہیں، نہیں رگو پیاری.....“ میں نے ہاتھ سے اشارہ بھی کیا۔ ”تم کتنی بار اس سے پوچھنے جاؤ گی۔“

”تم ٹھیک ہونا؟“ سارہ کے لہجے میں تشویش تھی۔

”کیا وقت ہوا ہے سارہ.....؟“ فون بند تھا اور اس کے گھر میں مجھے سامنے کوئی گھڑی نظر بھی نہیں آ رہی تھی۔

”میں اپنے فون سے چپک کر کے بتاتی ہوں۔“ اس نے چھوٹے سے کچن کے کاؤنٹر پر پڑے فون کو اٹھایا۔

”شام کے چھن رہے ہیں امرت!“

”اوہو..... یقیناً زین گھر آیا ہوگا اور اسی نے ڈرائیور کو بھیجا ہوگا۔“ میں نے پریشانی سے کہا۔ ”جانے اس نے کیا کیا سوچا ہوگا..... اور یہ میں کیا اتنی دیر کے لیے سو گئی تھی جو مجھے وقت گزرنے کا اندازہ ہی نہیں ہوا..... تم جگا دیتیں مجھے سارہ!“ میں نے جوتے پہنتے ہوئے کہا۔

”اچھا ہوا تم ذرا دیر کو سو گئیں.....“ اس نے جیسے مجھ سے نظر چرائی۔ ”چلو تم اٹھ کر منہ پر پانی کے دو چھپاکے مار لو جلدی سے۔“

”اوکے پیاری.....“ غسل خانے کا شیشہ اتار دیا اور شفاف نہ تھا مگر میری روٹی اور سوچی ہوئی آنکھیں کیسے مجھ سے چھپی رہ سکتی تھیں، تو کیا میں اتار روٹی تھی..... میں نے خود سے سوال کیا، ساتھ ہی وہ ٹیچ یاد اپنی جزئیات سمیت مجھ پر وارد ہوئی۔ جانتے سارہ کس طرح مجھے گاڑی تک لے آئی تھی۔

ڈاکٹر یاسمین کے بھیا تک انکشاف نے میری ٹانگوں سے جان نکال دی تھی۔ ایسا کیسے ہو سکتا تھا، ہمارے خاندان میں تو یہ مرض کسی کو نہ تھا۔ پھر میں ہی کیوں؟ میرے وجود کے اندر اور باہر دھماکے ہو رہے تھے، سارہ نے مجھے تھام لیا تھا، وہ سمجھ رہی ہوگی کہ میں کرسی پر بیٹھ، بیٹھے ڈھے جاؤں گی اور ایسا ہی ہوتا جو وہ میرے ساتھ نہ ہوتی، مجھے تھام نہ لیتی۔

”اب.....“ یہ مشکل میرے لبوں سے یہ نامکمل سا سوال ادا ہوا تھا۔

”کیا اب؟“ ڈاکٹر یاسمین نے میرے چہرے پر اپنی نظریں گاڑیں۔

”اب کیا ہوگا؟“ میں نے اپنے خوف کو زبان دی۔

”ہوں.....“ انہوں نے کہہ کر میز پر اپنے سامنے پڑے پیپر ویٹ کو یونہی گھمایا۔ ”دیکھنا ہوگا، بہت سی چیزوں کو ذہن میں رکھنا پڑے گا، اس کے مطابق ہی فیصلہ کیا جاسکے گا۔“

”میں بھی نہیں..... کیا فیصلہ؟“ میں نے سوال کیا۔

اساتذہ سے زیادہ قابل تھی۔

میکے میں بچپن کو اس نے طرح، طرح سے ترستے اور چھوٹی، چھوٹی چیزوں سے محروم دیکھا مگر اُف تک نہ کی۔ اس کی بچیوں کی عمر بھی مگر انہیں چند گھنٹے دو دھ تک نہ پلا سکتی تھی، خود اماں اس گھر میں کسی فالٹو شے کی طرح تھیں تو اس کی کیا وقعت تھی۔ اس کے بڑے بھائیوں کے دل اس کے لیے اتنے چھوٹے ہو گئے تھے اور اس کی بھابھیاں اپنے بچوں کی اُترن اور کھلنے کو بڑے میں چھینک دیتیں یا ملازموں کو دے دیتیں مگر اس کی بیٹیوں کی حسرت بھری نگاہیں انہیں نظر نہ آتی تھیں۔ وہ وقت تو انتہائی مشکل اور آزارناک والا تھا جو اس نے گزرا لیا تھا، اب اس کے لیے بہتر وقت تھا، ملازمت بھی، بچیاں شہر کے بہترین سکول میں زیرِ تعلیم تھیں کیونکہ انہیں ماں کے اس سکول میں معطل ہونے کے باعث فیس معاف تھی۔

کیا رنگ ہیں اللہ کے بھی، وقت کیا نکلیا کروٹیں لیتا ہے۔ جن بیٹیوں کی پیدائش کو اس نے مشیتِ ایزدی نہ سمجھا اور سارہ کو دو بیٹیوں کے پیدا کرنے کے جرم میں اپنے گھر اور زندگی سے نکال کر ایک دوسری عورت کو شوہر نے اپنی زندگی میں وہ مقام دیا تھا جو سارہ کا تھا۔ اب اس سے کوئی اولاد زندہ نہ پیدا ہو رہی تھی تو اسے اندازہ ہوا ہوگا کہ وہ اس کے کسی عمل کی سزا بھی اور اب وہ اس کا مداوا کرنا چاہتا تھا یا پھر اپنے ہاتھ آئی ہوئی بیٹیوں کو ہی غنیمت سمجھتے ہوئے وہ انہیں حاصل کرنے کے لیے سارا زور لگا رہا تھا اور اس کے لیے سارہ کو کیا ایذا پہنچتی اس سے اسے کوئی غرض نہ تھی وہ صرف اپنی تسکین چاہتا تھا یا اپنے احساسِ جرم کو ختم کرنا چاہتا تھا۔

☆☆☆

”ہاں تو امرت..... ٹھیک ہو تم؟“ ڈاکٹر یاسمین نے کمرے میں داخل ہو کر اپنی نشست سنبھالتے ہوئے سوال کیا تھا۔ ”سوری مجھے بہت ابیرجی میں جانا پڑا، چونکہ ڈاکٹروں سے صورت حال سنبھل نہیں رہی تھی، مرلیفہ کو اسپتال تک لانے میں گھر والوں نے بہت دیر کر دی تھی، گھر پر ہی دانیوں نے کوشش کر کے مرلیفہ کو موت کے منہ تک پہنچا دیا تھا۔ ایک ماہ پہلے میں نے اس کی ساس کو بتا بھی دیا تھا کہ بچہ آپریشن سے پیدا ہوگا مگر اس کا کہنا تھا کہ ان کے خاندان میں کوئی بچہ آج تک آپریشن سے پیدا نہیں ہوا۔“

”اب تو سب ٹھیک ہو گیا ناں۔“ میں نے اس کی وضاحت پر سوال کیا۔

”جاہل لوگ ہیں.....“ اس نے غصے سے کہا۔ ”بھوؤں کی زندگی انہیں مذاق لگتی ہے، اپنی بیٹی ہوتی تو میں دیکھتی۔“ ان کا غصہ کم ہی نہیں ہو رہا تھا۔ ”بلکہ پڑھے لکھے لوگوں میں کون سا کم جاہل ہیں، تم اپنی ساس کو ہی دیکھ لو پہلی بار تمہارے ساتھ آئیں کیونکہ انہیں یہ بچہ ضائع کر دانا تھا، اس سے تمہاری زندگی کو کیا خطرہ ہو سکتا تھا اس کا انہیں اندازہ نہیں تھا کیا اور یوں بھی میں ایسے کام نہیں کرتی۔ اس کے بعد سے دیکھ لو کہ تم ہر بار تنہا آتی ہو، وہ دوبارہ تمہارے ساتھ آئی ہی نہیں۔“

”نہیں وہ پچھل بار آئی تھیں مگر اس روز میرے شٹ کی رپورٹ نہیں ملی تو انہوں نے آپ سے فون کر کے پوچھا بھی تھا کہ ہمارے آنے کی ضرورت ہے یا نہیں اور آپ نے کہا تھا کہ نہیں۔“

”تم اتنی اچھی ہو کہ ان کے خلاف کچھ سنوئی ہی نہیں..... میں جانتی ہوں تمہیں پیاری لڑکی!“ اس نے مسکرا کر کہا۔

”وہ مرلیفہ اور اس کا بچہ دونوں ٹھیک ہیں ناں؟“ میں پوچھنے بنا نہ ہو سکی تھی۔

”ہوں.....“ ڈاکٹر یاسمین نے گہری سانس لی۔ ”بہت فنی صورت حال تھی، ماں اور بچے میں سے ایک کو بچایا جاسکتا تھا، اس کی ساس کہنے لگی کہ لڑکا ساؤنڈ کر کے بتائیں کہ بیٹا ہے یا بیٹی تو تب فیصلہ کریں گے کہ ماں کو بچائیں یا بچہ کو..... یار کوئی عورت اتنی ظالم کیسے ہو سکتی ہے چاہے وہ بدترین ساس ہی کیوں نہ ہو۔“ دانت پیس کر اس نے کہا۔ ”مجھے تو اتنا غصہ آیا کہ کیا بتاؤں، میں نے کہا کہ میں ہر صورت میں ماں کو بچانے کی کوشش کروں گی حالانکہ

”میں پھر آ جاؤں گی۔“ گھبراہٹ میں اضافہ ہو رہا تھا، بس میں وہاں سے نکلنا چاہ رہی تھی۔

”ڈاکٹر یاسمین نے خاص طور پر تاکید کی ہے میڈم کہ آپ کو جانے نہیں دینا..... وہ جو نبی فارغ ہوتی ہیں انہوں نے آپ کو کچھ مزید نشٹ وغیرہ لکھ کر دیتے ہیں۔“ نرس، سارہ کے پیچھے پیچھے ہی کمرے میں آ گئی تھی۔

”ٹھیک ہے..... ہم انتظار کر رہے ہیں۔“ سارہ نے کہا تو وہ مطمئن ہو کر باہر نکل گئی۔

”مجھے اپنے گھر لے چلو سارہ..... میں شدتِ برداشت سے پھٹ جاؤں گی، میں ابھی اپنے گھر نہیں جانا چاہتی۔“

”ٹھیک ہے..... وہیں چلیں گے۔“ سارہ نے میرے ہاتھ کی پشت تھپتھپائی، مجھے لگا کہ اس کا ہاتھ کانپ رہا تھا۔

”سوری سارہ.....“ میں رو پڑی۔ ”تمہیں خواہ خواہ میں نے اپنے ساتھ تنگ کیا..... جانے تم نے مجھ سے کیا بات کرنے کے لیے مجھے بلایا تھا۔“ مجھے اچانک یاد آ گیا۔

”کوئی مسئلہ نہیں ہے پیاری، اس وقت جو کچھ ہو رہا ہے اور جو کچھ ہم کر رہے ہیں یہی سب سے اہم ہے۔“ اس نے بھد کوکشل ایک مسکراہٹ اپنے ہونٹوں پر سجائی تھی۔

”چلو کچھ وقت تو کئے گا..... تم بتاؤ کہ کیا بات بتانا تھی تم نے مجھے؟“ میں نے سوچا کہ دھیان اسی بہانے کہیں بنے گا۔

”کہاناں کہ وہ بات اتنی اہم نہیں ہے امرت!“ اس نے زور دے کر کہا۔ یقیناً اس کے سابقہ سسرال یا شوہر کی طرف سے کوئی مسئلہ کھڑا کیا گیا ہوگا، میں نے دل ہی دل میں سوچا۔

”کیا تم اپنے سابقہ شوہر کو دیکھ کر پریشان ہو گئی ہو..... اس سے کوئی بات تو نہیں ہوئی تمہاری؟“ میں نے اپنے اندازے کی تصدیق کرنا چاہی۔

”ہوں.....“ اس نے گہری سانس لی۔ ”نہیں ایسی کوئی بات نہیں، جو کچھ بھی ہے اس مسئلے سے اہم نہیں ہے جس کا ہمیں مقابلہ کرنا ہے.....“ اس نے میری پیاری کے مسئلے کو ہمارا مسئلہ کہہ کر مجھے اپنے ساتھ کا یقین دلایا تھا کہ وہ ہر مشکل میں میرے ساتھ ہے۔

سارہ نے بتایا تھا کہ اس کا سابقہ شوہر اس سے اپنی بیٹیوں کو اس کے حوالے کرنے کا مطالبہ کر رہا تھا، مجھے بتاتے ہوئے وہ پُرسوج انداز میں کہہ رہی تھی کہ جانے کیوں اس کی بیٹیوں کے باپ کے دل میں اب ان کی محبت جاگ گئی تھی۔ اس کے پیچھے یقیناً اس کی کوئی غرض ہوگی مگر کیا غرض ہوگی اس کا اندازہ ہمیں نہیں ہوا تھا جب تک کہ ڈاکٹر یاسمین کی زبانی علم ہوا تھا کہ اس کے سابقہ شوہر کی دوسری بیوی کے ہاں کوئی اولاد زندہ پیدا نہیں ہوئی تھی۔ وہ اسے پیغام بھجو رہا تھا کہ قانونی چارہ جو جی سے بچنے کے لیے وہ خود بچیاں اس کے حوالے کر دے، دونوں نہ سبکی تو ایک ہی دے دے ورنہ عدالت کے ذریعے اپنی بیٹیاں حاصل کر لے گا.....

کیا مضحکہ خیز مطالبہ تھا، جیسے سارہ کے لیے ان میں سے کسی ایک بچی سے دستبردار ہونا اتنا ہی آسان تھا۔ جو وقت زیادہ مشکل تھا وہ تو اس نے گزرا لیا تھا۔ شیر خوار اور پاؤں، پاؤں چلتی ہوئی دو بیٹیوں کے ساتھ وہ میکے کی دہلیز پر آ پڑی تھی، باپ تھا نہیں..... ماں کا اپنا وجود بھی بیٹوں اور بھائیوں پر بوجھ تھا تو اس کا وجود اور بھی مانعِ خارا سمجھوں میں کھٹکتا تھا۔ ماں کی بے بسی کو محسوس کر کے، اپنی عزت نفس کو اپنے ہی وجود میں دفن کر کے وہ اس در پر تاپا پندیدہ ہونے کے باوصف بھی پڑی رہی کہ اور کچھ نہیں تو ایک خستہ سے کمرے کی چھت تو میسر تھی۔ اپنی بچیوں کی ضروریات کو پورا کرنے کے لیے ملازمت شروع کر دی اور سر دی، گرمی میں دو تاتواں وجود اپنے ساتھ لیے وہ کس طرح پر پھیل سے بھی سو باتیں سنتی مگر برداشت کرتی۔ اس کی تعلیم اور اچھے وقتوں میں اپنے ابا کے کہنے پر کیے گئے میچنگ سے متعلقہ کورسز کے باعث وہ اپنی فیلڈ میں اس سکول کی دیگر

خطرہ ٹل جائے۔“

”لیکن بچے کی اس وقت پیدائش سے اس کی زندگی کو اور بھی خطرہ ہے۔“ سارہ نے فوراً کہا۔  
”خطرہ تو اسے ہر دوسو توں میں ہے۔۔۔۔۔ رسک تو لینا پڑے گا، ہم ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر نہیں بیٹھ سکتے، تم گھر جاؤ، سوچو، اسے شوہر اور ساس سے بات کرو اور مجھے فون کر کے بتا دو تو میں آپریشن کے لیے وقت دے دوں گی نہیں۔“ ڈاکٹر نے کاغذ پر چند نوٹس بنائے اور میرے حوالے کیے۔ ”میں تو تمہیں بہت بہادور اور سمجھدار سمجھتی تھی امرت!“ وہ ڈھکے چھپے الفاظ میں مجھے بددل اور بے وقوف کہہ رہی تھیں۔

☆☆☆

”چلتی ہوں میں سارہ۔۔۔۔۔“ میں نے اپنے ٹمکن آلود لباس کو ہاتھوں سے جھاڑ کر درست کیا۔  
”تم ریمیکس رہنا پیاری۔۔۔۔۔“ سارہ نے مجھے اپنے ساتھ لگا کر کہا۔ ”میں جانتی ہوں کہ کہنا آسان ہے اور کرنا مشکل مگر تم فقط یہ سوچو کہ اس سے کچھ برا بھی ہو سکتا تھا۔“

”مثلاً۔۔۔۔۔ اس سے برا اور کیا ہو سکتا تھا؟“ میں نے حیرت سے پوچھا۔

”دکھی بیماری کی بروقت تشخیص ہو جانا، اس کے علاج کی سکت ہونا اور اس کے لیے آپ کو بہترین ڈاکٹر کا میسر ہونا۔۔۔۔۔ سب اچھا ہی تو ہے امرت!“ اس نے رمان سے کہا۔ ”کیا ہوتا اگر کبھی تمہیں کوئی درد نہ ہوتا یا ہوتا اور کوئی عام ڈاکٹر تمہیں صرف درد دور کرنے کی دوائیں دے دیتی۔۔۔۔۔ جس طرح ڈاکٹر یا سیمین کو ایک شبہ ہو اور انہوں نے اس کی جانچ کے لیے تمہیں ٹسٹ لکھ کر دیے اور ہمیں بروقت علم ہو گیا کہ کیا بیماری ہے۔۔۔۔۔ اس سے بچے کو کیا خطرات ہیں اور یہ کہ اس کو deliver کروانے کا آپشن بھی ہے۔“

”یہ سب کچھ اتنا ہی آسان ہے ناں جیسے سارہ۔۔۔۔۔“ میں نے یاسیت سے کہا۔ ”یہ گارنٹی تو کوئی بھی نہیں دے سکتا کہ وہ بچہ زندہ پیدا ہوگا۔۔۔۔۔“ میں نے دل کی گہرائی میں درد کو اٹھتے ہوئے محسوس کیا۔ ”اگر وہ زندہ پیدا ہوا تو وہ اس موڈی مرض سے متاثر ہو گا یا نہیں۔“

”سب ٹھیک ہو جائے گا۔۔۔۔۔“ اس نے مجھے اپنے ساتھ سمیٹنا۔ ”اللہ سے ہم اچھا گمان کریں تو وہ سب اچھا ہی کرتا ہے۔“

”اللہ تمہاری زبان مبارک کرے۔۔۔۔۔“ میں نے مسکرانے کی ناکام سعی کی۔

”بس اب اپنا چہرہ ٹھیک کرو اور جاؤ!“ اس نے میرے گال تھپتھپائے۔

”ایک کام میرے ساتھ بہت اچھا ہوا ہے سارہ۔۔۔۔۔“ میں نے جواباً اس کے ہاتھ کو دبایا۔

”وہ کیا؟“ اس نے حیرت سے پوچھا۔

”میری زندگی میں تمہارے جیسی پیاری دوست کا ہونا!“ میں نے پوری سچائی سے کہا۔

”میرے ساتھ بھی یہی اچھا ہے بس امرت!“ اس نے ہنس کر کہا تو میں بھی ہنس دی۔

☆☆☆

گھر پہنچی تو چاچو اور ماما لاؤنج میں بیٹھے تھے، میں نے سلام کیا تو چاچو نے کہا کہ میں وہیں آ جاؤں۔ میں ان دونوں کے پاس بیٹھی تھی، میں نے گاؤں کے حالات پوچھے اور اموجان کی خیریت خاص طور پر پوچھی، دل اندر سے تکلیف میں تھا تو میں انہیں یاد کر رہی تھی۔ ایسے وقت میں بیٹی کو ماں سے زیادہ ہمدرد اور کون نظر آتا تھا۔  
”بھئی لگتا ہے کہ تم عائشہ بھابی سے بہت اداس ہو؟“ چاچو نے سوال کیا۔  
”ہوں تو۔۔۔۔۔“

”تو تم ساتھ چلی جاتیں۔“ انہوں نے بے نیازی سے کہا۔

اسے بھی تم لوگ نیم مردہ ہی لائے ہو مگر میرا اللہ بڑا بے نیاز ہے۔۔۔۔۔ اور میں آپریشن کے دوران مسلسل اس کی زندگی کے لیے دعا کرتی رہی اور میرے اللہ نے اس بیماری کو زندگی بخش کر کے بڑا کرم کیا، بڑی کمزور ہے اور اسے کافی عرصہ لگے گا دوبارہ اپنے پیروں پر کھڑے ہونے میں بھی۔۔۔۔۔“

”اور بچہ۔۔۔۔۔“

”جب اسے لایا گیا تو ہم جی جان گئے تھے کہ بچہ دیر ہو جانے کے باعث مر چکا تھا۔“

”ہاہ!“ میں اور سارہ بیک وقت سکیں۔

”اب تم جانتا چاہو گی کہ وہ تھا کیا؟“ ڈاکٹر نے مسکرا کر میری طرف دیکھا، میں کیوں جانتا چاہتی کسی اور کے بچے کے بارے میں، میں نے تو آج تک ان سے اپنے بچے کے بارے میں بھی سوال نہ کیا تھا۔ ”جب وہ ایک ماہ پہلے میرے پاس آئی تھی میں تب سے جانتی تھی کہ اس کے ہاں بیٹا ہونے والا ہے مگر میں نے خود ہی انہیں نہیں بتایا۔“ وہ رکیں، اس کا مطلب ہے کہ انہیں میرے بچے کی جنس کا بھی علم ہوگا، میرا پیلا بچکا ہوتا ہوا چہرہ انہوں نے دیکھا ہوگا۔ ”تم ٹھیک تو ہونا امرت؟“

”ہوں۔۔۔۔۔“ مری ہوئی آواز سے میں نے کہا، وہ میرے ٹھیک ہونے کی توقع کر رہی تھیں۔

”اچھا چھوڑو اس قصے کو!“ سارا قصہ تفصیل سے سنا کر وہ اب قصہ چھوڑنے کی بات کر رہی تھیں۔ ”تو کب ہم تمہارا آپریشن کر سکتے ہیں؟“ ڈاکٹر یا سیمین نے سوال کیا۔

”کیا اس کے سوا کوئی چارہ نہیں ہے؟“ میں نے پرامید نظروں سے انہیں دیکھا۔

”کیا مطلب؟“ انہوں نے حیرت سے سوال کیا۔ ”کیا تم سمجھتی ہو کہ آپریشن کے بغیر تم ٹھیک ہو جاؤ گی؟“

”ابھی ٹھوڑی دیر پہلے ہی تو آپ نے کہا ہے کہ اللہ بڑا بے نیاز ہے!“ میں نے انہیں یاد دلایا۔ ”اس لیے میں آپریشن کروانے کے بجائے۔۔۔۔۔“

”میں نے تمہیں ٹھوڑی دیر پہلے یہ بھی بتایا ہے کہ ان لوگوں کی بے جا ضد کی وجہ سے اس بچے کی جان کو خطرہ لاحق ہو گیا تھا۔“

”اس بچے کی زندگی ہی اتنی تھی۔“ میں نے توجہ بہ پیش کی۔

”وہ سب باتیں اپنی جگہ درست مگر تم کیا سمجھتی ہو کہ ان لوگوں کے دماغوں پر عمر بھر یہ بوجھ نہیں رہے گا کہ اگر وہ میری رائے مان لیتے تو شاید۔۔۔۔۔“

”ایسا سوچنا تو غلط ہے، شرک ہے۔۔۔۔۔“ میں نے جیسے انہیں سمجھانے کی کوشش کی۔

”تم سب کچھ درست کہہ رہی ہو امرت مگر پھر بھی تم بے مقصد ضد کر رہی ہو۔۔۔۔۔ ہو سکتا ہے کہ تمہارے بچے کی جان کو خطرہ ہو اور آپریشن کر کے ہم اسے بچا سکیں۔۔۔۔۔ یہ بھی تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے لکھا ہوگا کہ اگر بروقت اس کی جان بچانے کی کوشش کر لی جائے تو وہ بچ سکتا ہے۔۔۔۔۔“

”اللہ نہ چاہے تو کوئی انسان کسی کو زندگی نہیں دے سکتا اور اگر اس کی زندگی لکھی ہے تو کوئی اسے چھین نہیں سکتا۔“ میں اپنی ضد پر قائم تھی۔

”میں یقیناً مجبور کر کے تمہارا آپریشن نہیں کر سکتی مگر تمہیں یہ ضرور سمجھانا چاہی ہو کہ آپریشن کرنے کی غرض کیا ہے اور اس کے فوائد کیا ہیں۔۔۔۔۔“ میں ان کا چہرہ دیکھ رہی تھی، سارہ اس سارے وقت میں خاموش تماشائی بنی رہی تھی۔ ”ممکن ہے کہ آپریشن کر کے ہم اس عفریت کو نکال لیں اور اس کا ٹسٹ کروائیں تو علم ہو کہ وہ کیسے ہے ہی نہیں۔ اگر وہ کیسے ہے بھی تو اسے نکال دینے سے نہیں اور بچے کو اس سے محفوظ کیا جاسکتا ہے، اگر یہ کسی ایسی جگہ پر ہے جہاں بچہ محفوظ ہے تو ہم بچہ deliver کر لیں گے تاکہ اگلے چند ماہ میں بھی اسے اس سے متاثر ہونے کا

”میں آپ کو بہت یاد کر رہی تھی اموجان!“ رات سونے کے لیے ہم اپنے کمرے میں آئے تو میں نے ان سے لپٹ کر کہا۔

”میں بھی ہر وقت تمہیں یاد کرتی ہوں بیٹا..... تم میری ہر وقت کی دعاؤں میں ہو۔“ انہوں نے میرے بالوں پر بوسہ دیا۔ ”اللہ تمہاری ساری مشکلات آسان کرے اور پریشانی سے بچائے۔“

”شکریہ اموجان!“ میں نے کہا۔

”تمہاری طرف سے بہت پریشانی ہوتی ہے.....“

”کیوں اموجان؟“ میں نے ان کا چہرہ کھوجا۔

”چنانچہ کیوں..... دل میں عجیب، عجیب سے وہم آتے ہیں تمہاری طرف سے۔“ انہوں نے کھوئے، کھوئے انداز میں کہا۔

”کیا عجیب وہم اموجان؟“

”سب ٹھیک ہے ناں تمہارے ساتھ..... ڈاکٹر کیا بتاتی ہے؟“ انہوں نے بات بدلی۔

”سب ٹھیک ہے اموجان!“ میرے حلق میں کچھ پھنسا۔ سن میں آیا کہ انہیں بتاؤں مگر وہ اسی روز تو پہنچی تھیں میں فوری طور پر انہیں پریشان نہ کرنا چاہتی تھی۔ جس پریشانی کی کیفیت سے میں دوچار ہونی تھی اسے وہ برداشت نہ کر پاتیں شاید۔ ”آپ مجھے سنائیں مکمل کی نئی شرائطوں کے بارے میں، فاطمہ کیسی ہے، شامیر کا کوئی اتا پتا!“

”سب ٹھیک ہیں بیماری..... مکمل تو اب بہت تیز ہو گیا ہے، شرارتی بھی!“ انہوں نے تصور میں اسے دیکھ کر مسکرا کر کہا۔ ”فاطمہ بھی ٹھیک ہے، مکمل کے ساتھ بلکان ہوئی رہتی ہے، دھان پان سی تو ہے وہ خود بھی!“ انہوں نے بتایا۔ ”شامیر سے بہت کم رابطہ ہے، جب بھی اس کے پاس وقت اور فون ہو تو بات ہو جاتی ہے، ہمارے پاس کوئی طریقہ اس سے رابطہ کا نہیں ہے۔“

”اللہ اسے اپنی امان میں رکھے اموجان.....“ میں نے ان کا ہاتھ تھاما۔ ”میں اس کی طرف سے شکر رہتی ہوں۔“ ”دعا کیا کرو تم اس کے لیے..... بہن ہو اس کی اور اس حالت میں تو عورت کی دعائیں اور بھی زیادہ قبول ہوتی ہیں۔“

”تمنا نے چکر نہیں لگایا گاؤں کا؟“ ان کے کہنے پر مجھے خیال آیا۔ ”امید ہے کہ وہ خوش ہوگی اپنے گھر میں..... نہ کوئی دیور نہ نند، اکلوی نند بھابی بن گئی ہے..... راوی چین ہی چین لکھتا ہے۔“

”کیوں بیٹا..... دیور اور نندیں کیا مسئلہ ہوتی ہیں؟“ انہوں نے حیرت سے پوچھا۔ ”ہم نے تو عمر بھر انہیں اپنے بہن بھائیوں کی طرح سمجھا، تم اپنے دیوروں کو دیکھ لو، کیسے بے ضرر ہیں اور ایک نند تمہاری بی بی ہوئی اور اپنے گھر کی ہے، اس کی کوئی دخل اندازی نہ مسئلہ اور حسد اس سے بڑھ کر پیار کرنے والی کتنی ہے، زبیا کی کایا کلب پر بھی میں حیران ہوں کہ کس طرح بدل گئی ہے۔“

”ان کے بدلنے پر تو میں بھی حیران ہوں.....“ میں نے کہا، دل میں آیا کہ انہیں زائدہ کے بارے میں بتاؤں اور اپنے خدشے کا اظہار کروں کہ ماما اور حسد کا بدلا بوارو یہ کی خطرے کا پیش خیمہ نہ ہو مگر خاموش رہی کہ انہیں پریشان نہ کروں۔

”تم بتاؤ سب ٹھیک ہے ناں؟“

”جی اموجان..... آپ بتائیں، آپ کی اپنی صحت کیسی ہے؟“

”ہاں میں بھی بالکل ٹھیک ہوں..... یہ کچھ رقم کبیر نے تمہارے لیے بھیجی ہے۔“ انہوں نے اپنے پرس میں

”وہ چاچو سفر سے تھکاوٹ ہو جاتی ہے.....“ جی میں آیا کہ ان سے کہوں کہ میرا دل تو چلا تھا مگر کسی نے پوچھا ہی نہیں۔

”بھابی بھی تمہیں بہت یاد کر رہی تھیں.....“ ماما نے بتایا، ان کے کہنے سے آنسو آنکھوں کے کناروں میں تیرنے لگے۔ ”تو ہمارے ذہن میں ایک خیال آیا کہ کیوں ناں ماں بیٹی کی ملاقات کروادی جائے۔“ یقیناً وہ سوچ رہی ہوں گی کہ وہ مجھے گاؤں بھجوا دیں۔

”میں ٹھیک ہوں ماما.....“ میں نے خود کو سنبھالا۔

”کیوں تم اپنی اموجان سے نہیں ملنا چاہتیں؟“ انہوں نے حیرت سے سوال کیا۔

”کوئی بات نہیں ماما..... جب وہ آئیں گی تو.....“ میں ہچکچائی۔ اندازہ نہیں ہوتا تھا کہ ان کی کس ادا میں کیا راز ہو تھا۔

”وہ تو جانے کب.....“ وہ رکیں۔ ”تم بتاؤ تم ان سے ملنا چاہتی ہو کہ نہیں؟“ ماما کے لہجے میں شرارت تھی، میں ان کی حس مزاح کو سمجھ نہ سکی تھی کیونکہ میرا اور ان کا رشتہ ایسا نہ تھا۔

”تو ہم نے سوچا کہ ہماری بیٹی تو ہمیں بھی نہیں بتائے گی کہ وہ اپنی اموجان سے اداس ہے.....“ چاچو نے مداخلت کی۔ ”ہم اپنی بیٹی کی اداسی کا سوچ کر.....“ ان کی بات ادھوری ہی تھی کہ میں ”اموجان“ کہتے ہوئے چیخ کر اٹھی تھی۔ اموجان ڈانٹنگ کی طرف سے برا مد ہوئی تھیں، انہیں ماما نے وہاں چھپا رکھا تھا اور اب شاید ان سے بھی اس سے زیادہ صبر نہ ہوا تھا۔

”آپ کیسے آگئیں؟“ میں ان سے لپٹ گئی۔ میرے اللہ نے کیسے اس وقت میرے دل کی کن لی تھی کہ مجھے اس وقت ان کی ضرورت تھی۔ وہ تو سب جانتا تھا یقیناً۔

”تمہیں تو معلوم ہے کہ میرے لیے گھر سے نکلنا کتنا مشکل ہے مگر میں زبیا اور خاص طور پر حسد کے اصرار کے سامنے انکار نہ کر سکی..... میں نے کہا بھی کہ ایک ہی دفعہ آؤں گی مگر ان دونوں کی رٹ تھی کہ اس میں ابھی بہت وقت ہے۔“

”آپ نے بہت اچھا کیا اموجان!“ میں نے ان سے لپٹے، لپٹے کہا۔ ”بلکہ ماما اور حسد نے بہت اچھا کیا کہ ضد کر کے آپ کو ساتھ لے کر آگئیں.....“ مجھے فوراً احساس ہوا کہ اس کا کریڈٹ ماما اور حسد کو دینا ضروری تھا، حالانکہ مجھے خود یہ بات اتنی آسانی سے منقسم نہیں ہوئی تھی کہ وہ دونوں اصرار کرے اموجان کو ساتھ لے کر آئی تھیں۔

”چلو بھئی..... سب نے کریڈٹ لے لیا، ہمارا کوئی ذکر ہی نہیں۔“ چاچو نے مصنوعی خشکی سے کہا تھا۔

”آپ کو کس بات کا کریڈٹ دیں بھئی؟“ ماما نے ابرو اچکائے۔

”گاڑی میں چلا کر لے کر گیا تھا..... بھابی کو میں نے منایا!“ چاچو نے فخر سے کہا۔

”ہاں بھئی آپ ہی کی بھابی ہیں تو آپ ہی کہنے سے مانیتیں ناں! ماما نے اسی انداز سے کہا جو ان کا خاصہ تھا۔

چاچو جھپٹ گئے۔

”میں تو اپنی بیٹی کے کہنے پر آئی ہوں۔“ ماما نے سب کو شرمندگی سے بچایا۔ حسد اتر آگئی جو کہ ابھی ابھی لاؤنج میں داخل ہوئی تھی اور اموجان کے ساتھ جڑ کر بیٹھ گئی تھی۔ میں اموجان سے اس کی اس محبت کے مظاہرے پر.....

بے ہوش ہوتے، ہوتے بچی۔

”سب ٹھیک ہیں گاؤں میں اموجان؟“ میں نے ان سے سوال کیا۔

”سب ٹھیک ہیں بیٹا..... سرمد نے اپنے بیٹے کا نام اچھو رکھا ہے۔“

”اچھا..... بہت کیوت ہو گا ناں!“ میں نے بے ساختگی سے سوال کیا تو سب نے بلند آواز سے ہنسنے لگایا۔

سے ایک لفاظ نکال کر مجھے تھمایا۔

”یہ تو بہت بھاری ہے اموجان!“ میں نے لفاظ ہاتھ میں پکڑتے ہوئے اس کے اندر جھانکا، سارے براؤن نوٹ تھے ”یہ تو بہت بڑی رقم ہے۔“ میں تقریباً چلائی۔

”کوئی بڑی رقم نہیں ہے، بیٹیوں کا حق ہوتا ہے..... اس سے تم اپنے بچے کی شاپنگ کرلو۔“

”شاپنگ تو مانے کر بھی لی ہے اموجان!“

”کیا؟“ میری بات پر وہ بے ہوش ہوتے ہوئے پچھیں۔

”جی!“ میں نے ہنس کر کہا۔

”بچہ تو ٹھیک ہے نا؟“

”کون سا بچہ؟“ میں نے بے ساختہ پوچھا۔

”تمہارا بچہ امرت..... اور کون سا بچہ؟“ ان کے یوں کہنے پر میری ہنسی نکل گئی، آنکھیں لبریز ہو گئیں۔ اموجان مجھے حیرت سے دیکھ رہی تھیں۔

”تم رورہی ہو؟“ ماں تھیں کیونکہ نہ میری آنکھوں میں نمی دیکھ پاتیں۔

”ارے نہیں اموجان..... ہنس، ہنس کر آنکھوں میں آنسو آگئے!“ میں نے بازو سے رگڑ کر آنکھیں صاف کیں۔

”امرت کسے بے وقوف بنا رہی ہو تم!“ انہوں نے میری آنکھوں میں جھانکا۔

”تمنا کہہ رہی تھی کہ وہ میرے بچے کی پیدائش پر آ کر کچھ دن میرے پاس رہے گی۔“ میں نے ان کی بات کا

نوشہ ہی نہ لیا تھا۔

”زین کا رویہ اب کیسا ہے؟“ انہوں نے بھی میری بات کو نظر انداز کیا۔ ”وہ ہے کہاں، اس سے تو آج

ملاقات ہی نہیں ہوئی۔“

”آپ کو نیند نہیں آ رہی اموجان!“ میں نے ان کی بات ان ہی کر دی۔

”چلو تم بھی اب سو جاؤ!“ انہوں نے لیٹ کر کروٹ بدل لی، میں ان کے پاؤں کی طرف ہنکے رکھ کر آہستگی

سے لیٹ گئی۔ ہم دونوں جانتی تھیں کہ ہم سوئیں رہی تھیں، کمرے میں ایسی خاموشی تھی کہ کلاک کی سوئی کی حرکت کی

آواز بھی تیز لگ رہی تھی۔ نیند میری آنکھوں سے کوسوں دور تھی، اموجان بھی نہیں سو پارہی ہوں گی۔

”آپ کو کیا لگتا ہے اموجان..... ماما کا رویہ کیوں تبدیل ہو گیا ہے..... یوں چند ہفتوں سے کہ یقین ہی نہیں

آ رہا۔“

”زندگی میں آنے والی اچھی چیزوں کو اللہ تعالیٰ کی نعمت سمجھ کر قبول کرنا چاہیے..... ان پر خواہ مخواہ میں گمان

کرنا ٹھیک نہیں۔“ ان کی طرف سے جواب آیا۔ ”سو جاؤ تم اور دعا کیا کرو کہ جس طرح اس نے اس گھر کے باقی

لوگوں کے دلوں میں تمہارے لیے نری پیدا کی ہے اسی طرح زین.....“ انہوں نے بات ادھوری چھوڑ دی۔

”سو جاؤ اب تم، رات کافی ہو گئی ہے!“ اب ان کی خاموشی سے اندازہ ہوا کہ وہ واقعی سونے کی کوشش کر رہی ہیں۔

☆☆☆

کمیل سوتے میں اپنے بیڈ پر سے گر گیا تھا..... سویرے، سویرے اموجان کو خبر ہوئی تو وہ بہت پریشان ہو

گئیں، ان کے تو ہاتھ پاؤں پھول گئے۔ وہ کبیر بھائی اور فاطمہ کو بلے پروا کہہ رہی تھیں۔ کبیر بھائی اور فاطمہ نے خود تو

انہیں بتایا بھی نہیں تھا۔ وہ تو تمننا نے اموجان کو کال کی تو اس نے یہ جانے بغیر کہ امو کہاں ہیں، ان سے سوال کیا کہ

کمیل کے ٹائٹلوں کا کیا حال تھا اور اس کا بخار کیسا تھا۔ وہ لاعلم تھی کہ اموجان اچانک اسلام آباد آ گئی تھیں اور انہیں

اس حادثے کے بارے میں علم ہی نہ تھا۔ اموجان کے تو پیروں کے نیچے سے زمین نکل گئی اور وہ واپس جانے کو.....

# جدید صحافت کے بانی جناب ذیاب شاہ چیف ایگزیکٹو آفیسر گروپ کی تہہ نگارگریز کتاب



- (1): ”امی جان“ (قیمت 500)
- (2): ”باتیں سیاست دانوں کی“ (قیمت 1,200)
- (3): ”پاکستان کے خلاف سازش“ (قیمت 800)
- (4): ”گاندھی کے چیلے“ (قیمت 800)
- (5): ”ہنستا کھیلتا عدنان“ (قیمت 1,000)

زیر طبع - جلد آنے والی کتابیں

● قلم چہرے (صحافیوں کے تذکرے) ● نور جہاں اور دلپ کمار

ہر اچھے بک شال پر موجود ہیں۔ ہا کر یا فریبی لائبریری سے حاصل کریں۔

نہ ملنے کی صورت میں قلم فاؤنڈیشن انٹرنیشنل، والٹن روڈ لاہور کینٹ سے حاصل کریں۔

0300-0515101/0333-4393422/03008422518/0321-4552371  
qalamfoundation3@gmail.com

● خزانہ علم لاہور، اردو بازار لاہور 042-57314166

● بک کارڈز، لاہور 0321-5440882

آنے دیا تھا۔ شاید میں ان کی اپنے بیٹے اور پوتے سے محبت سے جل رہی تھی۔

☆☆☆

اپنے بستر پر تنہا کروٹیں بدلتے ہوئے میں سوچ رہی تھی کہ کیا میں جلد مرنے والی ہوں۔ زین شام کی چائے کے بعد دوستوں کی طرف جانے کا کہہ کر نکلا تھا اور ابھی تک نہیں لوٹا تھا، اسے علم نہ تھا کہ میں تنہا تھی کیونکہ اس کے سامنے تو اموجان تھیں۔ گھر والوں کو بھی شاید علم نہ ہوگا کہ میں مہمان خانے میں تنہا ہوں، جو میں یہاں درد سے ترپتے ہوئے تنہا مگر جاؤں تو ان سب کو تو سویرے ہی علم ہوگا ناں! میں سوچ کر سسکی۔ اپنا فون چیک کیا کہ شاید زین نے کال کی ہو کہ وہ لیٹ آئے گا اور میں نے کال مں کر دی ہو مگر کوئی کال تھی نہ پیغام۔ فاطمہ کو مکمل کے بارے میں پوچھنے کے لیے پیغام بھیجا۔ کوئی جواب نہ آیا، وہ غالباً سو گئی ہوگی۔ گاؤں میں تو رات جلد اترتی ہے۔

تمنا کو خیریت نہ دیا۔ یہ بات کرنے کا پیغام بھیجا تو جواب میں اس نے کال کر دی۔ میں نے اس کی کال انینڈ نہیں کی، وہ میری بیٹی کی آواز سے جان جاتی کہ میں رورہی ہوں۔ ”تم ٹھیک تو ہونا میری جان؟“ اس کا تشویش بھرا سوال آیا۔

”ہاں..... کیوں؟“ میں نے جواب بھیجا۔

”اپ سیٹ لگ رہی ہو؟“ واہ میری پیاری..... وہ تو یوں جیسے میرے دل میں جھانک رہی تھی۔ اموجان کی نظر نے میرے چہرے میں وہ کیوں نہیں دیکھا جو تمنا نے میرے کال نہ اٹھانے پر محسوس کر لیا تھا۔

”اپ سیٹ ادا کیوں، اپ سیٹ کیوں ہوں گی بھلا میں؟“

”جانتی نہیں کیوں..... رات کے اس پہر پیغام بھیجا، ایسا عموماً ہوتا تو نہیں!“ اس کا جواب آیا، میں نے فون پر ہی وقت دیکھا، رات کے دو بج رہے تھے۔

”ادہ سوری تمنا..... نیند نہیں آ رہی تھی اور میں نے وقت دیکھے بغیر تمہیں پیغام بھیج دیا!“

”زین بھائی کہاں ہیں؟“

”سورہے ہیں۔“ میں نے جھوٹ لکھا۔

”نیند نہیں آ رہی تو انہیں اپنے انہیں ساتھ چکاؤ ناں!“ اس نے پیغام کے آخر میں ہانپتی کی تصویر بھیجی۔

”وہ بے طبیعت ٹھیک ہے تمہاری، کہیں درد تو شروع نہیں ہو گیا..... مگر اس میں تو بہت وقت ہے ابھی۔“ وہ کیے بعد دیکھے پیغام بھیجے جا رہی تھی۔

”میں ٹھیک ہوں، سو جاؤ تم!“ میں نے اسے آخری پیغام بھیجا۔ سارہ کو پیغام بھیجنے کا سوچا مگر پھر رک گئی کہ وہ بھی سوری ہوگی۔

گاڑی کے رکنے کی آواز آئی اور پھر مہمان خانے کی طرف آتے ہوئے قدموں کی آواز۔ میں نے فون کو باورڈ آف کیا اور کروٹ بدل کر سونی بن گئی، دل کی دھڑکنیں تیز ہونے لگیں۔ میں کبھی بھی اچھی اداکارہ نہیں رہی۔ اگر زین میرے چہرے کی طرف آ کر دیکھ لیتا تو فوراً جان لیتا کہ میں سونے کی ناکام اداکارہ کی کر رہی تھی۔

کمراندر سے لاکھ تھا مگر اس کی ایک چابی زین کے پاس تھی، کمرے کے لاک میں چابی گھمانے کی آواز آئی پھر دوازہ عقب میں بند کر کے کمرے میں زین کے چلنے کی، کمرے میں ہلکی روشنی کا بلب آن رہتا تھا، زین قدم کھینٹ کر چل رہا تھا، ہینڈ پر وہ دھپ کر کے یوں بیٹھا جیسے گرا ہو۔

”سوری ہو یا سونی بن گئی ہو؟“ اس کی آواز معتدل نہ تھی، وہ جیسے ہوئے لگ رہا تھا تو پھر وہ اس حالت میں گاڑی کیسے چلا کر گھر پہنچا تھا؟ میں نے سوچا۔ ”اگر جاگ رہی ہو تو اس طرف منہ کرو، مجھے تم سے کوئی بہت ضروری

بے تاب ہو گئیں۔ چند گھنٹے پہلے ہی تو وہ پہنچی تھیں اور انہیں دیکھ کر میں نے دل میں شکر کی سانس لی تھا کہ کوئی تو ہمدرد اور غم گسار اس مشکل وقت میں ملا۔ میں نے فوراً کیر بھائی کو کال کی، مکمل کی خیریت پوچھی اور انہیں بتایا کہ اموجان فوراً واپس آتا جا رہی تھیں۔ انہوں نے فون کر کے اموجان سے بات کی اور تسلی دی اور ان سے چند دن ٹھہرنے کو کہا، اموجان گھبراہٹ میں جانے لگا، کیا کہہ رہی تھیں۔

”اموجان کیا ہم میں سے کسی کے ساتھ کوئی حادثہ نہیں ہوا کبھی؟“ میں نے اس وقت ان کی کال میں مداخلت کی جب وہ کیر بھائی اور فاطمہ کو سخت ست اور جانے لگا، کیا کہہ رہی تھیں۔

”تم فوراً مجھے گاڑی بھیجو بیٹا.....“ انہوں نے جھنجھلا کر کہا۔ ”امرت سے مل لیا، اب دوبارہ آ جاؤں گی جب وقت آئے گا!“ انہوں نے جانے جواب میں کیا کہا تھا۔ ”بس کہہ دیا ناں ایک بار کہ مجھے گاڑی بھیجو، میں جمال یا اس کے گھر میں سے کسی کو تکلیف نہیں دیتا چاہتی اس لیے کہہ رہی ہوں۔“ وہ رکیں۔ ”وہ نہ میں خود گاڑی کرایے پر لے کر آ جاؤں گی۔“ کہہ کر انہوں نے فون بند کر دیا۔ اموجان کا وہ لہجہ جس سے ہم سب کی جان فنا ہوتی تھی تو کیر بھائی کیوں نہ چنچتے۔ انہیں چنچنے میں اتنا ہی وقت لگا تھا جتنا سفر میں لگ سکتا تھا۔

☆☆☆

”ارے بھائی!“ ماما نے اموجان کو مضبوطی سے پکڑ لیا۔ ”ایسے کیسے جا سکتی ہیں آپ؟“

”کوئی اتنا بڑا مسئلہ نہیں ہے بھائی!“ چاچو نے بھی اصرار کیا۔ ”اس بچے کے والدین اس کے پاس ہیں، اس سے زیادہ آپ کیوں فکر کرتی ہیں؟“

”یہ تو جس پر ہنستی ہے جمال، اسی کو غم ہوتا ہے..... میری تو جان ہے اس بچے میں، میں تم لوگوں سے تب پوچھوں گی جب تم لوگوں کا کوئی پوتا یا نواسہ.....“ وہ رکیں، بدحواسی میں ان کے منہ سے ایسی بات نکل گئی جو وہ بھی نہ کہتیں۔

”چلیں بھائی، جیسی آپ کی خوشی، اللہ اسے جلد صحت یاب کرے اور ہم دوبارہ آپ کو لینے آ جائیں گے۔“ عام حالات میں اموجان کی طرف سے ایسی سخت بات کے جواب میں ماما سے ایسے نرم لہجے کی توقع نہ تھی، ایسی بات پر تو وہ بھڑکتی مگر انہوں نے تو جیسے ان دنوں مجھے حیران کرنے کا ٹھیک لپا ہوا تھا۔

”میں آ جاؤں گی خود جب ضرورت ہوگی۔“ اموجان کا لہجہ پریشانی کی وجہ سے روکھا سا ہو گیا تھا۔

”آپ کا واپس جانا اتنا ضروری تھا تو آپ نے وہاں سے کیر کو کیوں بلوایا، میں یا ڈرائیور آپ کو چھوڑ آتے۔“ چاچو نے بھی ناراضی سے کہا۔

”مجھ سے رہا نہیں گیا..... مجھے واپس لازمی جا کر بچے کو دیکھنا ہے۔“

”آپ ڈاکٹر ہیں کیا جو آپ کا بچہ کو دیکھنا اتنا ہی لازمی ہے؟“ چاچو کے یوں کہنے پر ہر کسی کی ہنسی نکل گئی۔

”ہاں ہوں میں ڈاکٹر!“ انہوں نے غصے سے تپتے ہوئے کہا۔ نکلے ہوئے وہ مجھے ملنے لگیں تو میری آنکھیں جھٹک اٹھیں۔

”اوہو..... یوں نہیں روتے کسی کو رخصت کرتے وقت، ہنسی خوشی الوداع کہو!“ ماما نے میرا سر تھکا تو میرا دل چاہا کہ میں ان سے لپٹ کر رو دوں۔ پوتے کی محبت میں اموجان کو میری آنکھوں میں دکھ اور تکلیف کی تحریر نظر ہی نہیں آ رہی تھی۔

”جلد آ جاؤں گی میری جان!“ انہوں نے مجھے اپنے ساتھ لپٹاتے ہوئے کہا۔ ”تم اداس یا پریشان نہ ہونا، اللہ سب خیر کرے گا۔“

”میں مر رہی رہی ہوتی تو آپ مکمل کاسن کر یونی چل دیتیں۔“ میں نے دل میں آنے والی سوچ کو زبان پر نہ

بات کرتی ہے۔“ میں بے حرکت اسی کروٹ لیٹی رہی۔ ”لگتا ہے سوری ہی ہے سالی!“ میرے وجود میں ایک جوار بھٹا اٹھا، بہت برداشت کر لیا۔ میں نے فون ہاتھ میں لیا اور بند کے نیچے بازو لٹکا کر اسے آن کیا، اس کی روشنی سے وہ جان جاتا کہ میں جاگ رہی ہوں، اس لیے میں نے اسے قائلین پر لٹا رکھ دیا۔

”چل بھئی زین اٹھ کر کپڑے بدل لے، یہ تو ہا نہیں سوری ہے یا مر مرانی ہے!“ وہ لڑکھڑاتے قدموں سے ڈریٹنگ روم میں گیا تو میں نے فوراً ماما کا نمبر ملایا۔

”تم ٹھیک ہو امرت؟“ ان کے لہجے میں گھبراہٹ اور آواز میں ہکلاہٹ تھی، جو نیند سے جاگنے کے باعث خاصی نمایاں تھی۔

”آپ فوراً آئیں.....“ میں نے ہولے سے کہا اور فون بند کر دیا۔ چند منٹوں میں وہ ہانپتی ہوئی پہنچیں۔ انہوں نے اپنے نائٹ سوٹ کے اوپر ہی ریٹھی گاؤں پہن رکھا تھا۔

”کیا ہوا امرت.....؟“ میں نے اٹھ کر دروازہ کھول دیا تھا۔ وہ اپنے کپڑے ڈریسر سے لے کر غسل خانے چلا گیا تھا اور اندر سے اس کے اونچا، اونچا بولنے کی آوازیں آرہی تھیں۔

”سن لیں آپ!“ میں نے غسل خانے کی طرف اشارہ کیا۔

”کیا ہوا..... نہار ہا ہوگا۔“

”ماما وقت دیکھیں..... یہ ابھی گھر آیا ہے اور اس نے پی رکھی ہے، جانے گاڑی بھی کس طرح چلا کر آیا ہے جو راستے میں کوئی حادثہ ہو جاتا تو۔“

”تم نے تو میری جان ہی نکال دی ہے امرت..... میں سمجھی کہ تمہیں اسپتال جانا ہے اس لیے تم نے مجھے رات کے اس پہر کال کی ہے..... تمہارا خاوند ہے اسے تم نے ہی سنبھالنا ہے۔ اچھی بیویاں اپنے شوہروں کی بات بات پر شکایت نہیں کرتیں۔ تمہیں کوئی کمی ہے کیا اس گھر میں؟ پی کر آیا ہے بے وقوف، میں صبح اس سے بات کروں گی کہ ایسی حالت میں گاڑی نہ چلایا کرے۔“ ان کی اس بات کے دوران ہی وہ ہار ہکا، تولیے سے بال رگڑتا ہوا۔

”آپ اس وقت اس کمرے میں کیا کر رہی ہیں؟“ اس نے ماما کو دیکھ کر حیرت سے سوال کیا۔

”کس وقت آئے ہو تم؟“ اس کا سوال نظر انداز کر کے انہوں نے اس سے پوچھا۔ ”شراب پی کر گھر لوٹے ہو تم؟“

”ہوں..... تو اس نے آپ سے شکایت کی ہے میری، میں پہلے ہی جانتا تھا کہ جاگ رہی ہے، سونے کی اداکاری کر رہی ہے۔“

”جو بات میں پوچھ رہی ہوں، اس کا جواب دو!“ ماما نے غصے سے سوال کیا۔

”آپ پوچھنا چاہ رہی ہیں کہ میں گھر کیوں آ گیا، شراب پی کر مجھے وہیں رہنا چاہیے؟“

”میرا دل چاہ رہا ہے کہ ایک تھمر کس کرگاؤں تمہیں اور تمہارے ہوش ٹھکانے آ جائیں۔“ ماما نے کہا۔

”یہ تھمر تم نے پہلی بار یہ جان کر لگایا ہوتا کہ یہ شراب پیتا ہے تو دوسری بار۔“ اس کی جرات نہ ہوئی۔ ”چاچو جانے کب سے کھڑے ساری گفتگوں کر رہے تھے۔ ماما اور زین کے رنگ فق ہو گئے۔“

”وہ..... وہ، میں!“ ماما کی نکتہ بے ربط تھی۔

”میں پیاس کی وجہ سے جاگا تو تمہیں بستر پر نہ پایا، تمہارا فون بیڈ پر پڑا تھا، اسے دیکھا تو رات کے اس پہر امرت کی کال دیکھ کر میں سمجھا کہ اس نے تمہیں کسی ایمر جنسی کی وجہ سے بلایا ہے، میں تو یہ سوچ کر آ گیا کہ شاید اسپتال جانا ہوگا اور یہاں یہ قصہ چل رہا ہے۔“

”کہاں سے آرہے ہو تم رات کے اس پہر آوارہ گردی کر کے، کون سے دوست ہیں تمہارے جو نشے میں

امرت

دھت کر کے رات کے اس وقت تنہا گاڑی چلا کر لوٹنے کو کہتے ہیں، جن کا اپنا کوئی دین ایمان ہے نہ انہوں نے تمہیں کسی قابل چھوڑا ہے۔“ چاچو نے باقاعدہ اس کا گریبان پکڑ کر سوال کیا تھا۔

”کیا کر رہے ہیں..... جو ان اولاد کو یوں.....“ ماما نے چاچو سے اس کا گریبان چھڑوانے کی کوشش کی، وہ خود تو شاید شک میں تھا۔ نہ کہ اس کا نفرتورن ہو گیا تھا مگر چاچو کی یوں انٹری نے اس کے حواس کم کر دیے تھے۔

”کیا جو ان اولاد کو؟“ چاچو نے اس کا گریبان چھوڑنے کے بجائے اسے مزید جھنجھوڑا۔ ”اور تم یہ سب ہمیشہ سے جانتی ہو..... تم نے بھی اس کے اعمال پر چشم پوشی کی، مجھے بتایا تک نہیں امرت!“

”میں نے ماما کو بتایا تھا چاچو!“ اب مجھ میں ہمت آ گئی تھی، زندگی اور موت کا خوف تو یونہی ختم ہو گیا تھا۔

”نہنہ..... ایسی ماں تو شاید ہی دنیا میں کوئی ہوگی جو اپنی اولاد کو برائی کی دلدل میں اترتے دیکھ کر خوش ہوتی ہوگی، اس کی برائیوں اور عیوب سے چشم پوشی کرنی ہوگی۔“

”میں اسے سمجھاتی ہوں جمال.....“ ماما گلگیاں تھیں۔

”میں نے تو اپنے بھائی اور اپنے خاندان کی محبت میں اسے دھمکی دی تھی کہ اگر اس نے خاندان میں شادی نہ کی تو میں اسے عاق کر دوں گا۔ مگر جو مجھے اس کا علم ہوتا تو میں خاندان کی کسی لڑکی کو برباد نہ کرتا۔ بخدا!“ چاچو کے

”تھے۔“ تم جانتی تھیں تو تم مجھے روک لیتیں؟“

”مجھے پہلے علم نہیں تھا، شادی کے بعد امرت نے ہی بتایا تھا۔“ ماما صاف جھوٹ بول رہی تھیں۔

”میں اپنے مرے ہوئے بھائی کو کیا منہ دکھاؤں گا، میں نے اپنا شرابی اور بدکردار بیٹا ان کی خوب صورت، ذہین اور انتہائی سچی ہوئی بیٹی کے سر منڈھ دیا۔“

”کیا ہو گیا ہے جمال..... آپ اپنی طبیعت یوں سوچ سوچ کر خراب نہ کریں، امرت خوش ہے، دیکھیں اللہ انہیں اولاد سے بھی نوازنے والا ہے۔“ بچے آتے ہیں تو میاں بیوی کے تعلقات بھی مضبوط ہوتے ہیں اور مرد اپنی خراب عادتیں بھی چھوڑ دیتے ہیں۔“ ماما نے انہیں بازوؤں سے تھام کر زین کو ان سے چھڑوایا تھا۔

”کیا نام تھا اس لڑکی کا جس کے ساتھ تم شادی کرنا چاہتے تھے..... اس کی شادی ہو گئی ہے کہ نہیں؟“ چاچو نے زین کی طرف گھورتے ہوئے سوال کیا۔

”ابھی نہیں ہوئی.....“ اس نے ڈرے، ڈرے لہجے میں جواب دیا۔

”ہوگی بھی نہیں..... بیٹھی ہوگی وہ اب بھی تمہاری آس پر!“ وہ غصے سے بولے۔ ”ملے ہو تم اب بھی اس سے؟“

”وہ پاپا.....“ زین منمنایا۔ ”وہ!“

”وہ پاپا وہ کیا؟“ وہ چیخے..... ”اب بھی تم اسی بے حیا لڑکی کے پاس سے آرہے ہو گے ذلیل انسان!“ چاچو کا یہ لہجہ میں نے کب سنا تھا اور ان کا یوں غصے سے لال ہوتا چہرہ۔

”جانے دیں ناں اس وقت جمال..... امرت سوؤ تم لوگ بیٹا۔“ ماما نے بات کا رخ موڑنے کی کوشش کی۔

”اب میں تمہیں بتاؤں گا کہ میں تمہارا باپ ہوں..... تم میرے باپ نہیں ہو، بے شرم!“ کہہ کر وہ پیر پختے ہوئے چلے گئے۔

☆☆☆

”آپ سے بات کرنا تھی بھائی!“ یوسف میرے پاس آیا تھا۔ میں نے دوپٹے کو نماز کے بعد اسی طرح پلٹ رکھا تھا۔

”آؤ بیٹھو!“ میں نے مہمان خانے کے ٹی لاؤنج میں اسے بٹھایا، اسی میں ایک طرف چھوٹا سا کچن تھا۔

”میں چائے بنانے والی تھی، پیو گے؟“

واپس لوٹ آیا، میں اپنے صوفے سے اٹھنے کی ہمت ہی جمع کرتی رہ گئی۔  
 ”یہ کس نے کہا کہ یہ مردوں کے کرنے کے کام نہیں ہیں؟“ وہ واپس بیٹھتے ہوئے بولا۔ یقیناً اسے اپنے دل کی بات چا چونک پہنچانی ہے اور یہ مجھے استعمال کرنا چاہتا ہے۔ ”ہمارے نبی پاک ﷺ نے زیادہ کون اچھا استاد ہے جس نے معاشرتی زندگی کے سارے اصول و قواعد ہمیں بتائے ہیں، وہ اپنا ہر کام اپنے دست مبارک سے کرتے تھے اور کسی کو اپنے کام کے لیے تکلیف نہیں دیتے تھے..... اپنے علاوہ وہ دوسروں کے کام بھی کر دیا کرتے تھے، کمزوروں اور ضرورت مندوں کی مدد کر دیا کرتے تھے!“  
 ”بہت اچھی سوچ ہے تمہاری یوسف!“ میں دل سے اس کی سوچ کی معترف ہوئی۔  
 ”میں اصل میں آپ کے پاس جو بات کرنے آیا ہوں وہ بہت اہم ہے، رازداری بھی شرط ہے اس لیے مجھے تمہا یہاں آنا پڑا اور نہ میں جانتا ہوں کہ مجھے یوں آپ کے پاس تنہا نہیں آنا چاہیے تھا۔“  
 ”کیوں بھی؟“ میں نے حیرت سے سوال کیا۔  
 ”کیونکہ میں آپ کا نا محرم ہوں ناں۔“ وہ سر جھکائے اور نیچی نظر سے بات کر رہا تھا۔  
 ”وہ تو ہے مگر تم تو میرے چھوٹے بھائی ہو۔“  
 ”کہنے میں ایسا ہی ہے مگر حقیقت تو حقیقت ہی ہے ناں۔“ اس نے کہا تو میں لا جواب ہو گئی۔  
 ”اچھا بھی کیا بات کرنا تھی تم نے؟“  
 ”ہم سب اپنے والد کے فرمانبردار اور تابعدار بنے ہیں بھابی، زین بھائی میں اکھڑ پین ہے اور زائید آبی اپنی شادی کے بعد زارمند زور اور زبان دراز ہو گئی ہیں..... حسنہ آبی بابا سے ڈرتی تو ہیں مگر ماما کا انہیں کوئی خوف نہیں اور یہ ماما کے ہی بے جلاؤ پار کا نتیجہ ہے۔ میں اپنے والدین کی نافرمانی کرنے کا سوچ بھی نہیں سکتا نہ ہی ان سے کسی بات میں بحث مباحثہ کر سکتا ہوں، دیکھ لیں سے زبیر دیکھ لیں!“ اس نے طویل تمہید باندھی۔  
 ”ہوں؟“ میں نے اس کے رکنے پر سوالیہ انداز میں ہوں کیا کہ میں اس کی بات سن رہی تھی۔  
 ”جو بات میں پاپا سے کرنا چاہتا ہوں، اس کے بارے میں جانتا ہوں کہ وہ پاپا کو ناراض اور خفا کر دے گی، اس لیے سوچا کہ اس بات کو میں کسی ایسے شخص کے ذریعے پاپا تک پہنچاؤں کہ جس سے پاپا کو بے انتہا محبت ہو، اس کی بات کو پاپا سنیں بھی، سمجھیں بھی، یقین بھی کریں اور اس پر عمل بھی کریں..... چاہے وہ بات جیسی بھی ہو۔“  
 ”تو؟“ میں نے حیرت سے اس کا چہرہ دیکھا۔  
 ”اس گھر میں فقط آپ ایک ایسی شخصیت ہیں کہ جو ان تمام خصوصیات پر پوری اترتی ہیں۔“ وہ رکا۔ ”اس لیے میں نے اپنا مقدمہ آپ کو وکیل کر کے لڑنے کا سوچا ہے۔“ اس کے یوں کہنے پر میرے ہاتھوں اور پیروں میں سنسناہٹ ہونے لگی، بلاشبہ وہ بھی زین کی طرح کسی کے چکر میں مبتلا ہو گیا تھا۔  
 ”تم غلط سمجھ رہے ہو یوسف..... ایسا نہیں ہے، چاچو تم سب لوگوں کی بات سننے اور سمجھتے ہیں، یقین کرتے ہیں اور ماننے بھی ہیں۔“ آخر تو تمہارے باپ ہیں وہ میں نے چاچو کی طرف سے صفائی پیش کی۔  
 ”ایسا نہیں ہے بھابی!“ اس نے سر نہبوڑائے ہوئے کہا۔ ”میں نے جب سے ہوش سنبھالا ہے میں نے پاپا کو کسی کو اتنی محبت اور عزت دیتے ہوئے نہیں دیکھا جتنی وہ آپ کی کرتے ہیں۔“ اس کے کہنے سے میری اتانگے ہمارے میں ہوا بھر گئی۔ ہوں..... تو یہ بات ہے، ممکن ہے کہ ایسا ہی ہو اور یوسف کو ماما نے اس کام پر لگایا ہو کہ ہو میرے ذریعے کوئی ایسی منفی بات چاچو تک پہنچانا چاہتی ہوں جس کے باعث چاچو مجھ سے بدگمان ہوں۔“ میں نے سوچا، یقیناً ایسا ہی ہے۔ تو پھر ملی تھیلے سے نکلوا کر دیکھنا پڑے گی کہ میرے خلاف کیا سازش تیار کی گئی ہے۔  
 ”کہو..... کیا کہنا چاہتے ہو تم؟“ میں نے جی کڑا کر کے پوچھا۔

”میں چائے نہیں پیتا..... البتہ اگر دودھ ہے تو وہ پی لوں گا!“ اس نے ہولے سے کہا۔  
 ”یہ تو بہت اچھی بات ہے ورنہ آج کل کے نوجوان کہاں دودھ پیتے ہیں، کچھ وزن کم کرنے کا شوق اور کچھ یہ کہ دودھ پینا شاید پینڈو پن کی علامت ہے۔“  
 ”دودھ پینا تو سنت نبوی ﷺ ہے بھابی!“ اس نے فوراً میری بات کاٹی۔  
 ”ہاں بھی وہ تو ہے..... تو تم سنت نبوی ﷺ کی تقلید میں دودھ پیتے ہو، یہ تو اور بھی اچھی بات ہے۔“ میں نے اس کے لیے دودھ گرم کرنے کے لیے رکھا، پلیٹ میں چند بسکٹ رکھے اور اپنی چائے بھی کپ میں انڈیل کر ٹرے میں رکھی اور اسے اٹھانے ہی لگی تھی کہ وہ لپک کر آیا اور ٹرے مجھ سے لے لی۔  
 ”آپ بیٹھیں، میں لے کر آتا ہوں۔“  
 ”سنت کی تقلید تو کرتے ہو اچھی بات ہے مگر فرانس بھی پورے کرتے ہو یا نہیں؟“ میں نے سوال پوچھا۔  
 ”میں نے اس گھر میں کسی کو نماز پڑھتے ہوئے نہیں دیکھا تھا۔“  
 ”نہیلے نہیں پڑھتا تھا، اب پوری کوشش کرتا ہوں۔“ اس نے سچائی سے کہا۔  
 ”اچھی بات ہے..... کوشش کرو اور ہر نماز کے ساتھ قضا نمازیں اور نوافل وغیرہ پڑھ کر اپنی نہ پڑھی ہوئی نمازوں کا ازالہ کرنے کی کوشش بھی کیا کرو۔“  
 ”جی وہ بھی کرتا ہوں۔“  
 ”یہ سن کر مجھے بہت خوشی ہوئی ہے یوسف!“ میں نے اس کے جھپٹے ہوئے چہرے کو دیکھا تو مجھے احساس ہوا کہ اس کے چہرے پر بھورے بالوں کی دائرہ بھی تھی، جو ابھی ہلکی سی مگر لگ رہا تھا کہ اس نے عرصے سے شیو نہیں کی تھی۔ ”دائرہ بھی رکھ لی ہے تم نے؟“  
 ”رکھی تو ہے مگر پاپا اس کے پیچھے ہیں، ہر وقت ٹوکتے ہیں کہ کیا میں مولویوں والا حلیہ بنا کر پھرتا ہوں۔“ اس نے شکایت کی۔  
 ”اتنا اچانک انسان تبدیل ہو جائے تو دیکھنے والے یونہی محسوس کرتے ہیں۔“ میں نے اسے تسفی دی۔ ”تم سناؤ پڑھائی کیسی جارہی ہے، امتحان کب ہیں اور اب تمہیں مہس سمجھ میں آتا ہے کہ نہیں؟“ وہ مہس میں کمزور تھا اور گزشتہ برس ٹیل ہو جانے کے باعث ایک سال ضائع کر کے سارے مضامین کا دوبارہ اس سال امتحان دینے کی تیاری کر رہا تھا۔  
 ”میرا تو اب پڑھائی میں دل ہی نہیں لگتا بھابی!“ اس نے دبے سے لہجے میں کہا۔  
 ”تمہیں مجھ سے کیا بات کرنا تھی یوسف؟“ میں نے کچھ یاد آنے پر اس سے سوال کیا۔ اس کا یہ کہنا کہ اس کا پڑھائی میں دل نہیں لگتا تھا، ایک ایسی صورت حال تھی جس سے میں کئی کترانا چاہتی تھی، جانے وہ بھی کسی ایسی سرگرمی میں تھا کہ پڑھائی سے اس کا دل اچاٹ ہو گیا تھا۔ کسی لڑکی وڈی کا چکر ہو سکتا تھا اور میں وہ جان کر اس میں فریق نہیں بننا چاہتی تھی۔  
 ”میں اسی سلسلے میں آپ سے بات کرنا چاہ رہا تھا بھابی!“ اس نے رک کر گہری سانس لی۔ دودھ کا گلاس خالی ہو گیا تھا اور میری چائے کا گلاس بھی، اس نے دونوں برتن ٹرے میں رکھے اور ٹرے اٹھا کر چن کے سنک کی طرف گیا، کپ اور گلاس نکال کر انہیں دھوئے لگا۔  
 ”کیا کر رہے ہو یوسف؟“ میں نے اٹھنے کی کوشش کی۔  
 ”آپ بیٹھی رہیں، میں دھو دیتا ہوں، کوئی بات نہیں۔“  
 ”تم چھوڑ دو یوسف میں دھولوں گی بعد میں، یہ مردوں کے کرنے کے کام نہیں ہیں۔“ دونوں برتن دھو کر وہ

”یوسف کے چہرے پر داڑھی کتنی پیاری لگ رہی ہے ناں چاچو!“ میں نے بات بدلی۔  
”تمہیں لگ رہی ہو گی۔“ چاچو نے کہا۔ ”مجھے تو یہ باتوں اور حیلے سے مولوی لگنا شروع ہو گیا ہے۔ پڑھائی سے جان چھڑوانے کو یا روپ نکال لیا ہے اس نے، مذہب کی راہ اختیار کی ہے۔ بھی پڑھ لکھ کر بھی تم مذہب کی طرف مائل ہو سکتے ہو۔ مگر جو نکا جاہل ہے وہ پڑھائی چھوڑتا دیتا ہے اور مذہب کا ٹھیکیدار بن جاتا ہے اسی لیے مذہب کو سمجھنا مشکل ہو گیا ہے۔“

”تو اس میں برا کیا ہے؟“ یوسف نے کہا۔ ”نماز اور قرآن پڑھنے میں کوئی برائی ہے کیا؟“ یوسف کی آواز بلند ہوئی تھی۔ ”بھائی نماز اور قرآن پڑھتی ہیں تو آپ نے کبھی کوئی اعتراض کیا؟“  
”امرت کے گھر کا ماحول ہی ایسا ہے یوسف۔“ چاچو نے جواب دیا۔ ”ہمارے گھر میں کوئی نماز پڑھے تو وہ انوکھی بات لگتی ہے کیونکہ تمہاری ماں نے تمہاری تربیت میں ان چیزوں کا خیال نہیں رکھا۔۔۔۔۔۔“  
”تو آپ خیال رکھ لیتے ناں پاپا!“ یوسف نے آہستہ سے کہا۔

”میں خود اس ماحول سے آیا تھا اور بچ وقت نمازی تھا مگر تمہاری ماں نے مجھ سے بھی نماز کی پابندی چھڑوا دی کیونکہ ان کے گھر میں نماز پڑھنے والوں کو قدامت پسند اور فرسودہ کہا جاتا تھا۔“  
”نعوذ باللہ!“ یوسف نے یہ آواز بلند کہا۔ ”ہمارے گھر میں تو کوئی بھی نماز نہیں پڑھتا تھا پھر بھی میں نے بھائی کو کبھی نماز چھوڑتے ہوئے نہیں دیکھا۔۔۔۔۔۔ وہ ہر نماز پابندی وقت اور باقاعدگی کے ساتھ پڑھتی ہیں۔“  
”اس نے تو اولاد کو گناہ اور ثواب کا فرق بھی نہیں سمجھایا۔“ چاچو نے ماما کے بارے میں ایک اور شکوہ کیا، یقیناً ان کا اشارہ زین کی طرف تھا۔

”گھر مردوں کی طاقت سے چلتے ہیں پاپا۔۔۔۔۔۔ عورتوں کی کمزوریوں پر نہیں۔“ وہ اتنا سنا جو ان جیسے ہم اس لمحے سے پہلے تک ایک بچہ سمجھتے تھے۔ وہ کیا کہہ گیا تھا، ہم سب ایک دوسرے سے نظر چرا رہے تھے۔  
”تم کب شروع کر رہے ہو بھی نماز؟“ چاچو نے اپنا غصہ عارب پر نکالا۔  
”جب آپ کہیں گے پاپا۔۔۔۔۔۔ بلکہ جب آپ خود شروع کر دیں گے، میں تو ہمیشہ آپ کو ہی مانتا ہوں اور وہی کرتا ہوں جو آپ کہتے ہیں یا کرتے ہیں۔“ اپنی طرف سے اس نے بات مزاح کے انداز میں کہی تھی مگر وہ یوسف کی طرح کرسی کو زور سے ٹھیک کر اٹھ کر گیا نہیں بلکہ وہ بیٹھا خاموشی سے کھانا کھاتا رہا۔ کسی نے سر اٹھا کر نہیں دیکھا تھا شاید۔

☆☆☆

”کیسی ہو امرت؟“ سارہ کا پیغام تھا۔

”کیسا ہوتا چہیے؟“ میں نے سوال کے جواب میں سوال بھیجا۔

”اپنی امو جان کو بتاتا تم نے؟“

”نہیں۔۔۔۔۔۔“ میں نے لکھ کر جواب بھیجا ہی تھا کہ اس کی کال آ گئی۔

”کیوں؟ ابھی تک کیوں نہیں بتایا تم نے؟“ اس نے پوچھا۔ ”انہیں بتا دیتیں تو کم از کم تمہارے دماغ کا بوجھ کچھ کم ہو جاتا۔۔۔۔۔۔ زین کو بتایا؟“ وہ کیے بعد دیگرے کئی سوال کر گئی۔

”میں نے کسی کو نہیں بتایا سارہ۔۔۔۔۔۔ امو جان کو اگلی صبح واپس جانا پڑ گیا تھا۔ کمیل گر گیا تھا، اسے چوٹ لگ گئی تھی اور امو جان بہت بے چین ہو گئیں اور اچانک چلی گئیں۔“

”یعنی تمہیں رات بھر میں اتنا موقع ہی نہیں ملا کہ تم ان سے بات کرتیں۔۔۔۔۔۔ جب وہ جا رہی تھیں تو تم جب ہی نہیں بتا دیتیں۔“

☆☆☆

”تمہارے گال پر کیا ہوا ہے امرت؟“ ماما نے جانے کیسے نوٹ کیا تھا۔ میں ایسے رخ پر بیٹھی تھی کہ میرے چہرے پر زیادہ روشنی نہ پڑے۔ دوپٹا بھی میں نے نماز کی طرح لپیٹ رکھا تھا۔

”گال پر نشان؟“ میں نے یوں کہا جیسے میں جانتی ہی نہ تھی۔ ”کون سے گال پر؟“

”یہ تمہارا بابا یاں گال لال لگ رہا ہے۔“ ان کے کہنے پر میں نے یوں اپنا گال سہلایا جیسے اس نشان کو چھو کر محسوس کرنا چاہتی ہوں۔

”کوئی ریش ہے یا کچھ لگا ہے۔۔۔۔۔۔ کہیں گری وری تو نہیں تم؟“ انہوں نے تشویش سے پوچھا۔

”نہیں ماما۔۔۔۔۔۔“ میں نے انہیں کہا۔ ”کل ڈریسر کی الماری کھول کر کپڑے نکالتے ہوئے الماری میرے دوسرے ہاتھ سے بند ہو گئی اور اس کا پٹ میرے گال پر لگا تھا مگر نہ تو مجھے کوئی درد ہوا اور نہ ہی میں نے نشان نوٹ کیا۔“

”اس طرح بے پروائی نہ کیا کرو بیٹا!“ انہوں نے کہا۔

”اس طرف منہ کرو۔۔۔۔۔۔ مجھے دکھاؤ بیٹا!“ چاچو نے کہا تو باقی لوگوں نے بھی سر اٹھا کر دیکھا۔ دن بھر تو میں مہمان خانے میں ہی ہوتی تھی، جو کچھ کھانا ہوتا تھا وہیں پر خود بنا لیتی تھی مگر رات کا کھانا گھر کے سب افراد میز پر اکٹھے کھاتے تھے۔ میں نے اس روز بہانہ بھی کیا کہ میری طبیعت ٹھیک نہیں مگر ماما نے کال کر کے کہا کہ میں نہ آئی تو چاچو کو تشویش ہو گی اور وہ سب لوگوں کو کھانے سیت لے کر مہمان خانے پہنچ جائیں گے۔

”کچھ بھی نہیں ہے چاچو۔۔۔۔۔۔ آپ فکر نہ کریں۔“ میں نے انہیں تسلی دی۔

”تم جھوٹ تو نہیں بول رہی؟“ انہوں نے میری نظر سے میرے دل کا چور پکڑا تھا۔

”آپ سے جھوٹ کیوں بولوں گی چاچو!“ میں نے انہیں تسلی دی۔

”میں تو سوچ رہا ہوں کہ تمہیں مہمان خانے کے بجائے زائندہ والے کمرے میں شفٹ کر دیا جائے۔۔۔۔۔۔ کم از کم تم گھر کے اندر تو ہو گی اور پھر کون کس وقت آتا ہے اور جاتا ہے، اس کا علم ہوتا رہے گا۔“

”مہمان خانہ بھی تو گھر کی چار دیواری میں ہی ہے جمال!“ زین نے اپنی کرسی پر پہلو بدلاتھا اور ماما نے فوراً تاویل پیش کی تھی۔

”تم ہر بات میں کوئی نہ کوئی پہلو نکال لیتی ہو۔“ چاچو نے ناراضی سے کہا۔

”زائندہ بھی تو چند دن تک آ جائے گی ڈیوری کے لیے۔ پھر امرت کو اس کا کمر اگلی کرنا پڑے گا!“ ماما نے کہا۔

”امرت اس گھر کا فرد ہے اور زائندہ اب یہاں مہمان۔۔۔۔۔۔“

”ہاں وہ تو ہے۔“ ماما نے مصالحت سے کہا۔

”ویسے زائندہ کیوں یہاں آئے گی ڈیوری کے لیے؟“ چاچو نے حیرت سے پوچھا۔ ”کیا امرت گاؤں جائے گی؟“

”میرا چہرہ شرم سے لال ہو گیا۔

”نہیں امرت یہیں رہے گی۔“ ماما نے فوراً کہا۔

”زائندہ بھی اپنی سسرال میں رہے گی۔“ چاچو نے جواب کہا۔ ”میں اس کے سر سے خود بات کروں گا۔“

”وہ لوگ جانے کیسا سوچیں۔“ ماما بکلا میں۔ ”آپ کا بات کرنا برا لگ سکتا ہے ان کو۔“

”اگر ہر گھٹے گا تو میں کہوں گا کہ زائندہ کو بھیج دیں میکے۔۔۔۔۔۔ اور اس صورت میں امرت بھی گاؤں جائے گی۔“

”گھاؤں میں ایسی سہولیات کہاں ہیں۔“

”میں گاؤں میں ہی پیدا ہوا تھا زین بیگم!“ چاچو نے دانت کچکا کر کہا۔ ”کل صبح اپنا سامان زائندہ والے کمرے میں منتقل کرواؤ امرت اور اس کے بعد مجھے اپنی بات دہرائی نہ پڑے۔“

”میں تم جیسی ہوتی تو ہوتا کوئی نہ کوئی.....“ میں نے دو بدو کہا، میرے وجود کے اندر بھانپ کر رہے تھے۔ ایک تو اس کی جرأت کہ مجھ پر ہاتھ اٹھایا، اس پر مجھ پر فحاشی کا الزام لگایا اور اپنے بچے کی ولدیت سے بھی انکار کر دیا اور اس پر مستزاد وہ مجھے اپنے جیسا بدکردار سمجھ رہا تھا۔ اس نے پھر ہاتھ اٹھایا مگر میں نے انتہائی غیر ارادی طور پر اپنا دفاع کرنے کے لیے اپنی ہتھی اپنے چہرے کے سامنے کر لی۔ پہلے پھٹنے کے وقت مجھے اس کا موقع نہ ملا تھا کیونکہ وہ بہت غیر متوقع تھا۔ اس نے کندھے سے مجھے دھکا دیا، میں ہلکی سی کوشش سے سنبھل گئی، اگر زوردار دھکا ہوتا تو میں گر سکتی تھی۔

اگلے روز جب چاچو نے کہا کہ میں گھر کے اندر منتقل ہو جاؤں تو بلکے سے انکار کے بعد میں راضی ہو گئی، میں خود بھی یہی چاہ رہی تھی۔ زین کو تو اس نئی صورت حال سے مشکل ہوتی مگر مجھے سوچ آئی کہ وہاں مہمان خانے میں وہ مجھے جان سے بھی مار کر چلا جاتا تو گھر والوں کو کلم ہونے میں کئی گھنٹے لگتے جاتے۔ یہاں گھر کے اندر ذرا سا پیچھے گا تو پہلے سوچے گا کہ آواز کہاں کہاں جا رہی ہے۔

☆☆☆

”کتنی بے مروت ہو امرت..... اپنی بہن کے پاس نہیں آتی بلکہ اسے اس کے گھر میں رہتے ہوئے دیکھو۔“ تمنا کو کال کی تھی تو اس کا شکایات کا دفتر کھل گیا۔ دل و دماغ پر بوجھ بڑھ گیا تھا، سوچا کہ اسے کال کر کے شریک راز کروں، اس سے پوچھوں کہ آگے کیا کروں۔ اموجان تو آئیں اور ہوا کے جھونکے کی طرح ان کی آمد کا احساس بھی نہ ہوا تھا کہ وہ چلی گئیں۔ وہ جو رشتیں تو ابھی کو شریک راز کرتی کہ ماما سے بات کرنے کی جرأت ہی نہ ہوتی تھی اور زین سے اس دن سے سوائے انتہائی ضرورت کے کوئی بات نہ ہوتی تھی، نہ تنہائی میں نہ کسی کے سامنے۔ کسی کو محسوس بھی نہ ہوا تھا کہ ہم معمول میں بھی تو ویسے ہی میاں بیوی تھے۔

”میری طبیعت کچھ ٹھیک نہیں رہتی تمنا.....“ کہتے ہوئے میرے حلق میں آنسوؤں کا گولہ سا پھنسا۔ ”ایسے تو طبیعت خراب رہتی ہی ہے امرت! یہ تو خوشخبری ہے اور ماں بنا کوئی اتنا آسان نہیں ہوتا..... تمہیں کوئی بیماری ٹھوڑی ہی ہے۔“ وہ تو یوں کہہ رہی تھی جیسے مجھ سے پہلے وہ ان مراحل سے گزر چکی ہو۔ ”ہاں جیسے تم نے تو کئی بچے پیدا کر رکھے ہیں۔“ میں نے ہنسنے کی کوشش کی۔ ”ابھی تو ہم خود بچے ہیں جی!“ وہ کھل کر ہنسی۔ ”دور، دور تک ہمارے بچوں کی آمد کے کوئی امکانات نہیں ہیں اور نہ ہی تمہاری طرح لائق میں پر یگنٹ ہو جانے کا کوئی ارادہ ہے، ہمارے بچے ہمارے پلان کے مطابق آئیں گے۔“

”ہر بچہ اللہ تعالیٰ کی پلاننگ کے تحت پیدا ہوتا ہے تمنا..... یوں بڑے بول نہ بولا کرو۔“ ”مذاق کر رہی ہوں یارا!“ اس نے فوراً کہا۔ ”اچھا بتاؤ تمہاری طبیعت ٹھیک کیوں نہیں رہتی؟“ ”وہ.....“ میں اپنے آنسوؤں کو روک نہ سکی تھی۔ ”کچھ اور بولتی تو وہ سمجھ جاتی کہ میں رورہی تھی۔“ ”تم رورہی ہو امرت؟“ اب اس کے لہجے میں شرارت نہیں بلکہ تشویش تھی۔ ”اوہو!“ میں نے خود پر ضبط کیا۔

”تم نے جھوٹ بھی بولنا شروع کر دیا ہے میرے ساتھ امرت؟“ ”تمہیں مس کر رہی ہوں پیاری!“ میں نے اپنے لہجے کو سنبھالا۔ ”جانتی ہوں..... کیونکہ میں بھی تمہیں بہت مس کرتی ہوں۔“ اس نے پیار بھرے لہجے میں کہا۔ ”زندگی میں یہ سب تو ہوتا ہے، ایک گھر میں پیدا ہونے اور پلنے بڑھنے والے بچے..... بڑے ہوتے ہیں تو اڑائیں بھر لیتے ہیں، اس گھر آٹکن کو چھوڑ دیتے ہیں جہاں ان کا بچپن بیتا۔ ہم ایک ماں باپ کی اولاد نہیں تھے امرت

”رات کو سوچا کہ سفر کر کے تھکی ہوئی آئی ہیں، ایک دن انہیں آرام سے رہنے دوں اور پھر وہ اس قدر پریشان ہو گئی تھیں کہ کچھ سی جھپٹ سی چوٹ کا سر..... میں اتنی بڑی بات انہیں کیسے بتاتی؟“

”تو زین..... ماما اپنے چاچو کو کیوں نہیں بتایا؟“ ”سمجھ میں ہی نہیں آ رہا سارہ کہ کس طرح کس کو بتاؤں..... گھر پر بھی ہر وقت کسی نہ کسی بات کی وجہ سے عجیب سی صورت حال رہتی ہے، سوچتی بھی ہوں تو بات کرنے کا موقع نہیں ملتا۔“ ”ہم کہیں ملیں آج شام کو؟“ اس نے بے تابی سے کہا۔

”آج تو نہیں سارہ.....“ میں نے اسے ٹالا۔ ”کسی اور دن دیکھیں گے۔“ ”ہم مام..... میں تو جلد سے جلد تم سے ملنا چاہ رہی تھی امرت!“ میں جانتی تھی کہ ایسے میری پریشانی بھی تھی اور وہ میری واحد دوست بھی تھی۔ اس کے ساتھ میں اس طرح اپنے دل کی بات کر لیتی تھی جس طرح تمنا کے ساتھ۔ جونہی میرے گال کا نشان ہلکا ہوتا میں اس سے ملنے کو چلی جاتی۔

میں نے اس روز اسے اپنے چہرے پر اس لال نشان کی وجہ سے ٹالا تھا جس پر گھر کے باقی لوگ تو میرے جواب سے مطمئن ہو گئے تھے مگر سارہ بھی نہ ہوتی۔ ماما کی دانست میں وہ لاکھ لاکھ محفل عورت سہی مگر جتنا وہ مجھے جانتی اور سمجھتی تھی وہ کبھی یقین نہ کرتی کہ الماری کا پٹ میرے چہرے پر ایسا نشان بنا سکتا تھا۔ میں نے گھر والوں کے سامنے تو دپٹا لپیٹ کر اپنا بھرم رکھ لیا تھا مگر وہ اتنی آسانی سے پہننے والی نہ تھی۔ اسے معلوم تھا کہ ایک مرد کا طاقت سے بھرپور پھیر جب پہلی بار عورت کے نازک گال پر پڑتا ہے تو حیرت، صدمہ اور کرب کا کیا عالم ہوتا ہے۔ اس نے یہ سب سہا تھا جو میں اب سہنا شروع ہوئی تھی۔ زین کا وہ پھیر پہلا سہی مگر آخری ثابت ہونے والا بہر حال نہ تھا۔

☆☆☆

”تم نے..... تم نے کال کر کے ماما اور بابا کو مجھے رکنے ہاتھوں پکڑوانے کے لیے بلوایا تھا؟“ اس نے پوری طاقت سے چیخنے ہوئے مجھے پھڑپھڑا رہا تھا۔ میں سسکتی تک نہیں، صدمہ نے میرے حواس ہی چھین لیے تھے، میں سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ کوئی مجھ پر یوں ہاتھ اٹھا سکتا تھا۔ میں نے بھی کسی سے پوری زندگی میں پھٹ نہ کھایا تھا۔ میرے گال پر سونیاں سی چبھ رہی تھیں، کچھ چل رہا تھا، میں بھی کہہ رہی تھی کہ ہاتھ پھیر کر محسوس کیا تو ایسا نہ تھا مگر اپنے ہی ہاتھ کے نرم سے لمس سے بھی تکلیف ہوئی۔ یقیناً میری نازک جلد جلنے کی وجہ سے حساس ہو رہی تھی۔

”مم..... میں نے.....“ میں ہلکا کر رہی۔ ”تم نے صرف میرا اچھا والا روپ دیکھا ہے آج تک امرت۔“ وہ چلا یا۔ میں سوچ کر رہ گئی کہ اس کا کون سا اچھا روپ میں نے دیکھا تھا اس وقت تک۔ ”میں براہین تو تم سوچ بھی نہیں سکتیں کہ میں کیا کر سکتا ہوں۔“ اس کے منہ سے جھگ اڑ رہی تھی۔ ”یہ نہ سمجھنا کہ میں تمہیں طلاق دے کر آزاد کر دوں گا تا کہ تم آسانی سے بے حیالی کر سکو اور جانے کن، کن کے بچے میرے نام سے اپنے پیٹ میں اٹھا کر گھومو.....“ وہ پھڑ سے زیادہ تکلیف دہ باتیں کر رہا تھا۔ ”میں بھی اس دن اپنے باپ کو بلاتا اور دکھاتا جس دن تم ارسل کے ساتھ میری ماں اور بہن کے ہاتھوں رکنے ہاتھ پکڑی گئی تھیں تو میں دیکھتا کہ آج تم کہاں ہوتیں۔“

”میری بد قسمتی ہے زین..... یہ بچہ تمہارا ہی ہے۔“ میں سسکی۔ ”وقت اس بات کو ثابت کر دے گا۔“ ”اچھا..... تمہاری بد قسمتی!“ اس نے مضحکہ خیز انداز میں کہا۔ ”تو تم کسی اور کا بچہ پیدا کرنا چاہتی تھیں؟“ ”کاش میں نے تم سے شادی سے انکار کر دیا ہوتا تو آج یہ دن دیکھنے کو نہ ملتا۔“ میرے آنسو بہے جا رہے تھے۔ ”کون تھا وہ؟“ اس نے میری ٹھوڑی کے نیچے انگلی رکھ کر میرا چہرہ اوپر کیا۔

نے چاچو کو ہی شامل راز کیا تھا اور صبح کی پرواز سے پہنچ گئی تھی۔ میں بے اختیار بھاگ کر اس سے لپٹ گئی اور اُسوں کا تو کوئی کچھ نہ پوچھے۔

☆☆☆

”کیسی ہیں آپ؟“ ڈاکٹر یا سکین نے ماما سے سوال کیا تھا۔  
”میں تو بالکل ٹھیک ہوں..... آپ اپنے مریض کا حال پوچھیں۔“ ماما نے بشارت سے کہا تھا۔  
”اسے بھی پوچھ لیتے ہیں۔“ انہوں نے دراز کھولی اور اس کے اندر خواہ خواہ کچھ ڈھونڈنا شروع کر دیا تھا شاید۔ ”اس کی طرف سے تو مجھے بہت پریشانی ہے، اسی لیے تو آپ کو بلوایا ہے۔“ میں نے جب ڈاکٹر یا سکین سے یہ کہا تھا کہ وہ ماما کو خود فون کر کے بتا دیں تو انہوں نے کہا تھا کہ ایسی بڑی بات انہیں فون پر بتانا مناسب نہیں، انہیں ساتھ لے کر آؤں تو وہ بات کریں گی۔ میں نے درخواست کی تھی کہ وہ بات اس طرح بتا میں جیسے کہ میں بھی اس بات کو پہلے سے نہیں جانتی۔ شاید انہیں حالات کا کچھ اندازہ تھا اس لیے اس پر انہیں کوئی اعتراض نہ تھا، اب انہیں اداکاری کرنا بھی جو شاید ان کی فیلڈ نہیں تھی۔

”سب خیر تو ہے ناں ڈاکٹر یا سکین؟“ ماما نے تشویش سے کہا اس پر ڈاکٹر یا سکین کو حیرت ہونا لازمی تھی کہ وہ ساس جو پہلے دن اپنی بہو کو اس کے پاس لائی تھی اور کہا تھا کہ انہیں اس کا بچہ ضائع کرنا ہے وہ اب اس کے ہارے میں ڈاکٹر کے منہ سے ایک فقرہ سن کر تشویش میں مبتلا ہو گئی تھیں۔ ”بدلتا ہے رنگ آسمان کیسے کیسے! انہوں نے دل میں سوچا ہوگا۔

”کوئی مسئلہ ہے کیا؟“ تننا نے سوال کیا تو ڈاکٹر یا سکین نے میری طرف سوالیہ نظر سے دیکھا۔

”بہن ہے میری۔“ میں نے اس کا تعارف کروایا۔ ”تننا!“

”ایسا ہے سبز جمال کہ بچے کی پیدائش کا عمل از خود ایک انتہائی دشوار مرحلہ ہے..... اگر کوئی مسئلہ نہ ہو، حمل نارمل ہو اور بچے کی نشوونما ٹھیک ہو رہی ہو تو کوئی پریشانی نہیں ہوتی۔“

”تو کیا پچھرا پریشان سے پیدا ہوگا؟“ ماما نے اس کی بات کا ٹی، غالباً وہ طویل تمہید سے بور ہو رہی تھیں۔

”پچھرا پریشان سے ہی پیدا کرنا ہوگا سبز جمال!“ ڈاکٹر نے رساں سے کہا۔ ”آپ میری پوری بات تو سنیں!“

”جی کیسے..... ویسے حیرت ہے کہ سب ٹھیک ہے پھر بھی پچھرا پریشان سے.....“ وہ بڑبڑانے سے باز نہ آئیں۔ ”آج کل کی بچوں کے خڑے بھی تو بہت ہو گئے ہیں، نارمل طریقے سے بچہ پیدا ہی نہیں کرنا چاہئیں۔“ وہ ہنسا بھی اچھا بننے کی کوشش کرتیں، ان کے اندر کی شخصیت اپنا چلا اتار کر کسی نہ کسی طرح ضرور سامنے آ جاتی تھی۔

”نہ صرف یہ کہ پچھرا پریشان سے پیدا کرنا ہوگا بلکہ فوری طور پر۔“

”وہ کیوں..... اچھی تو بہت وقت باقی ہے میرے حساب سے؟“ ماما نے ابرو اچکا کر سوال کیا۔

”سب ٹھیک تو ہے ناں ڈاکٹر؟“ تننا نے تشویش سے کہا۔ ”پچھرا پریشان سے کیا؟“

”آپ؟“

”دیکھیے مجھے کوئی ایسا شوق نہیں ہے مگر حالات ہی ایسے بن گئے ہیں۔“ ڈاکٹر یا سکین یہ مشکل اپنے لہجے کو نرم رکھ پارہی تھیں۔ ”اگر آپ دونوں اپنے سوالاوت کا سلسلہ سچ میں بند کر دیں اور مجھے اپنے تئیں صورت حال واضح کرنے دیں تو بہتر ہوگا۔“

”مجھے تو گہرا ہمت شروع ہو گئی ہے امرت!“ تننا نے میرا ہاتھ تھام کر میرے کان کے پاس ہو لے کہا۔

”تمہاری ڈاکٹر تو کچھ زیادہ ہی ڈراما کر رہی ہے۔“ اس کی آواز بہت آہستہ تھی۔ میں نے کافی کوشش کی کہ میں بھی گہرائی ہوئی اور خوفزدہ نظر آؤں مگر جانے مجھ سے ایسا کیوں نہیں ہو سکا تھا۔ چند دنوں میں میں نے خود کو اتنا

مگر مجھے آج تک اس بات کا احساس نہیں ہوا۔ مجھے یہی لگتا ہے کہ میں اور تم جڑواں بہنیں ہیں۔“ وہ سادگی سے کہہ رہی تھی۔

جانتی ہی نہ تھی کہ ہم مختلف ماؤں کے لپٹن سے پیدا ہونے والی جڑواں جیسی ہی تھیں، ہم دونوں کا باپ تو ایک ہی تھا۔ وہ ایسی ہی سادہ تھی۔ مجھے تو خیردادی جان کی زبانی علم ہو گیا تھا کہ ہاجرہ پھپھو سے ابو جان نے ہی نکاح کیا تھا اور اس بات کو صیغہ راز میں رکھا گیا تھا مگر تننا یہی سمجھتی تھی کہ اس کے ماں اور باپ دونوں مر چکے تھے اور قابل تیا اور تانی نے اسے اپنی بیٹی بنالیا تھا کیونکہ وہ بے اولاد تھے، انہوں نے ہی اسے پالا ہوسا تھا۔

ان کے ہاں وہ اگرچہ کم ہی رہتی تھی، پڑھائی کے سارے دور میں ہمارا ساتھ رہا، امتحانوں کے اریب قریب بھی ہم رات رات بھر اکٹھے ہی پڑھتیں اور پختیوں میں گھر آتیں تو بھی ہم ہماری ساری مصروفیات اسی نوعیت کی ہوتیں کہ ہمارا دن رات کا ساتھ ہوتا۔

”میں تو سفر بھی نہیں کر سکتی اور تم سے دل بہت اداس ہے.....“ میں نے خود کو سنبھال لیا تھا۔

”جو بھی تمہاری ڈیوری ہوتی ہے میں آ جاؤں گی۔“ اس نے مجھے یقین دلایا۔

”تم آج آ آنے کا کہو تو میں آج ہی ڈیوری کروا لیتی ہوں۔“ میں نے دل کے درد کو لہجہ کی بشارت سے چھپایا۔

”تم بتا دیتیں کہ میرا بھانجا ہے یا بھانجی تو میں اس حساب سے تیاری تو کر لیتی۔“ وہ ہنسی۔ ”امو جان کہتی ہیں کہ تم نے سر پر اتر رکھا ہوا ہے۔“

”میں نے خود بھی چیک نہیں کروایا تمنا..... میرا یقین کرو۔“

”تم بہت بورنگ ہو یا!“ اس نے کہا۔ ”تمہارا دل نہیں کرتا کہ تم اپنے بچے کی جنس کو جانو، اسے بیٹا یا بیٹی ہونے کی حیثیت سے محسوس کرو؟“ اس نے سوال کیا۔ ”میں تمہاری جگہ ہوتی تو میں نے اس بچے کا نام بھی رکھ لیا ہوتا اور جب میں تنہا ہوتی تو اسے اس کے نام سے پکار کر اس سے باتیں کرتی، اپنے شوہر کے ساتھ تھمتھن کی منصوبہ بندی کرتی تو یہ نہ کہتی کہ ہمارا آنے والا بچہ بلکہ اس کے نام سے ہم اس کی باتیں کرتے..... آج کل ایسا ہی ہو رہا ہے پیاری۔“

وہ تو جانتی ہی نہ تھی کہ میرے اور زین کے بیچ ایسی محبت نہ تھی جیسی وہ سوچ رہی تھی۔ مجھے پہلے بھی اس بچے کی جنس جاننے کا تجسس نہ تھا اور اب جب ڈاکٹر یا سکین نے یہ کہہ دیا تھا کہ اس بچے کے بچنے کے امکانات ہی کم تھے تو میں اور بھی مایوس ہو گئی تھی اور یہ جاننا بے معانی ہو گیا تھا کہ وہ بیٹا تھا یا بیٹی۔ ڈاکٹر جلد از جلد اس بچے کی پیدائش چاہ رہی تھی اور میں وقت گزرا رہی تھی، بچے کی قبل از وقت پیدائش میں بھی کچھ باتیں تھیں۔ اس میں کچھ ایثار بھی ہو سکتا تھا، اس کے دماغ کو کچھ اثرات ہو سکتے تھے..... کوئی معذوری وغیرہ۔ اس لیے میں اس کی قبل از وقت پیدائش کو ٹال رہی تھی تاکہ بچے کو مزید میرے ساتھ رہنے کا وقت مل سکے۔ حالانکہ اس کا مزید میرے وجود میں رہنا اس بات کے امکانات کو بڑھا رہا تھا کہ وہ میری بیماری سے متاثر ہو سکتا تھا۔

ماما کو بتانا ضروری ہو گیا تھا، اس کے لیے بھی مجھے حوصلہ چاہیے تھا، تننا یا امو جان کا ہونا مجھے ہمت دیتا۔ چاچو کے سامنے ایسی بات کہنے میں جھجک تھی۔ چلو..... ڈاکٹر یا سکین سے کہوں گی کہ وہ ماما کو فون کر کے بتا دیں۔ میں نے تننا کو غریب پریشان کرنے کے بجائے سوچا اور اسے خدا حافظ کہہ کر فون بند کر دیا۔ میں نے تو یہ سوچ کر فون بند کیا تھا کہ وہ مزید پریشان نہ ہو اس کی پھٹی حس نے اسے بتا دیا کہ امرت یوں رو دینے والی نہیں..... اسی لیے اگلے دن جس وقت میں ڈاکٹر یا سکین کے پاس جانے کو تیار ہو رہی تھی اور ماما سے کہہ رکھا تھا کہ وہ بھی تیار ہو جائیں۔ تیار ہو کر لاؤنج میں بیٹھی تو میری آنکھوں کو یقین ہی نہ آیا۔ تننا وہاں بیٹھی مرنے سے چاچو کے ساتھ کپ شپ کر رہی تھی، اس

سنبھال لیا تھا۔

”اصل میں مسز جمال..... صورت حال آپ کی سوچ سے بڑھ کر پریشان کن ہے..... نہ آپ کی بہو اک پریشن سے بچہ پیدا کروانے کا کوئی فائدہ ہے اور نہ ہی ہر ڈاکٹر کو آپ پریشن کر کے مریضوں سے زیادہ فیس بڑھانے کا شوق ہوتے ہوں گے کچھ ایسے ڈاکٹر جو آئے میں تمک کے برابر ہوں گے، وہ اپنے پیسے سے بددیانتی کر کے اپنی پوری برادری کے نام پر دھبا لگا دیتے ہیں۔ امرت کا بچہ جلدی پیدا کروانے کی وجہ یہ ہے کہ دیر کی صورت میں ماں اور بچے دونوں کی جان کو خطرہ ہے..... اگر چہ ابھی پیدا کروانے میں بھی خطرہ ہے مگر اس میں نقصان کی شرح کم ہوگی۔ اس صورت میں بچہ مکمل صحت یاب یا نارتل ہو..... اس کی ضمانت نہیں دی جاسکتی۔“

”یہ کیا بات ہوئی..... ایسی کیا صورت حال ہے کہ جلد پیدا کرو تو بچہ اپنا رتل بھی ہو سکتا ہے اور دیر کرو تو جان کو خطرہ..... تو پھر دیر ہی کر لیں، جان دینا اور لینا تو اللہ کے ہاتھ میں ہے مگر کم از کم جلد پیدا کروا کر جو امکانات ہیں وہ تو عمر بھر کے لیے ایک.....“ وہ کوئی سخت لفظ کہتے، کہتے رکیں۔ میرا دماغ گھوم گیا تھا، ماں نے تو یوں لمحوں میں فیصلہ سوچ بھی لیا تھا اور دھڑلے سے اس کا اعلان بھی کر دیا تھا، میں اتنے دنوں سے اس چھوٹے سے وجود کو تکلیف میں ہونے کا سوچ سوچ کر ہلکان ہو رہی تھی۔ یہ فرق ہوتا ہے ایک ماں میں ادا داری میں۔

”کیا میں وجہ جان سکتی ہوں ڈاکٹر یا سبین؟“ میں نے تھوک نکل کر سوال کیا۔ جانتی تھی کہ اس کے انکشاف سے ہم بچھنے والا تھا..... کم از کم مجھے تو اداکاری کرنا تھی ایسی نوعیت کی اور میں بہت بری اداکارہ رہی ہوں۔ ”ہمیں شہر ہے کہ.....“ ڈاکٹر یا سبین نے جو بات پہلے مجھے ہمت کر کے بتادی تھی، وہی بات انہیں ماما سامنے کہنے میں مشکل ہو رہی تھی۔ یقیناً وہ بھی ماما کے الفاظ کی سختی اور لہجے کی بے حسی سے متاثر ہوئی تھیں۔ ”امرا کی پچہ دانی میں رسولی ہے۔“ انہوں نے تھوک نکل کر کہا۔

”کیا؟“ ماما نے حیرت سے پوچھا، میں ساکت بیٹھی تھی، تمنانے مجھے دیکھا اور میرا ہاتھ تھام لیا۔

”بلکہ..... کینسر.....“

”ٹھک!“ کی آواز آئی، تمنانہ میری کرسی کے ساتھ جوتے پر بیٹھی ہوئی تھی، وہ اچانک گرمی تھی اسٹول الٹ گیا تھا غالباً، مگر نہیں اس کی آنکھیں اوپر کو پڑھ رہی تھیں، اس کے ہاتھ مڑے ہوئے تھے۔

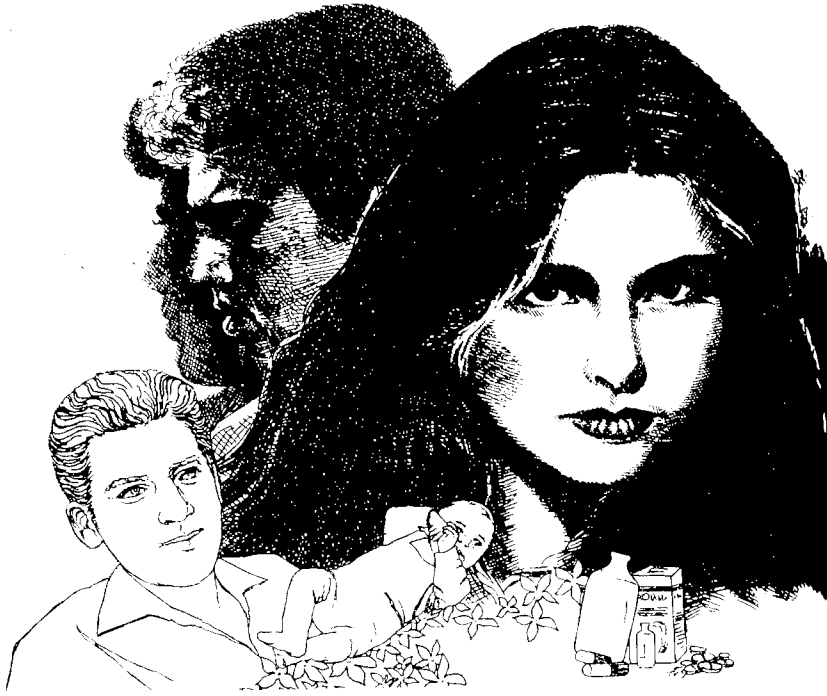
”میری بہن کو دیکھیں ڈاکٹر.....“ میں چیختی۔

”نرس.....“ ڈاکٹر نے اپنی نشست سے اٹھتے ہوئے میز پر رکھی ہوئی کھنٹی بھی بجائی اور بے اختیاری سے آواز بھی دی۔ زمین پر ہی کھنٹوں کے بل بیٹھ کر انہوں نے تمنانہ کی نبض تھامی، اس کے چہرے پر ہولے، ہوسا چپٹ لگائے۔ نرس کمرے میں داخل ہوئی۔ ”فوراً اسٹریچ منگواؤ اور اسے کسی بیڈ پر ڈالو..... لگتا ہے کہ کسی نوعیت کا دورہ پڑا ہے، اسے کوئی پرابلم ہے تو نہیں میرا مطلب ہے مریض وغیرہ؟“ اس نے پلٹ کر مجھ سے پوچھا۔

”نہیں! ہرگز نہیں.....“ میں نے پورے وثوق سے کہا، حالانکہ اندر سے میں خود بھی پریقین نہ تھی، ممکن ہے اسے کوئی مسئلہ بہت بچپن میں ہوا ہو یا شادی کے بعد۔ اسے اسٹریچر پر ڈال کر فوراً باہر کی طرف لے جایا گیا اور ڈاکٹر یا سبین بھی ساتھ ہی نکلیں۔

”تو تم یہ سب جانتی تھیں؟“ ماما نے مجھے گھور کر سوال کیا۔ ”اتنی بڑی بات سن کر تم یوں سکون میں ہو جیسے تمہیں نہیں بلکہ مجھے کینسر ہو۔“

(جاری ہے)



## چاند کا داغ

ہمایوگ

”سر پرانز!“ فرحان کی آواز نے کپ شپ کو محروم سب دوستوں کو چونکا دیا۔ یہ ان خوش دوستوں کا گروپ تھا جنہوں نے اسکول سے الگ ایک ساتھ تعلیم حاصل کی پھر مختلف تعلیمی

میدانوں میں قسمت آزمائی کے لیے نکل گئے مگر آج بھی ان کی دوستی میں کوئی فرق نہیں آیا تھا۔ کسی نے میڈیکل کو چنا تو کسی نے جرنلزم میں نام کمایا۔ گروپ میں لڑکے اور لڑکیاں دونوں شامل تھے۔ مگر جنس کے



کو دے دیا۔

”آپ کچھ تو بتائیں اس کو کیا مسئلہ ہے، یہ ٹھیک تو ہو جائے گا ناں۔“ فرحان بے تابی سے بولا۔

آمنہ نے یہ مشکل اپنے آنسوؤں پر قابو پایا ہوا تھا۔ ”فرحان لگتا ہے بچہ قوت گوبائی و سماعت سے محروم ہے مگر تم لوگ ہمت نہ ہارو، اللہ سے دعا کرو وہ تو ہمارے حق میں بہتری فرمائیں گے۔“ فرزانہ نے آمنہ کو گلے سے لگا کر کہا۔ آمنہ کی سسکیاں کمرے میں گونج رہی تھیں۔

کیسے وہ اپنے بچے کو سینے سے لگا کر گھر پہنچے، کیسے گھر والوں کو صورت حال بتائی۔ بس ایک قیامت نزر گئی۔ ”اوصاف ٹھیک کہہ رہا تھا، میں نے اس کی بات سمجھنے کے بجائے اس سے قطع تعلق کر لیا۔“ فرحان نے کمرے میں آکر آمنہ سے کہا۔

”اوصاف نے کیا کہا تھا اور تم نے مجھے نہیں کیوں بتایا؟ بولو فرحان۔“

ٹھنڈی سانس بھر کر فرحان نے اس شام کا واقعہ بتایا کہ شادی سے پہلے بلڈ اسکریننگ کتنی اہم ہوتی ہے۔

”فرزانہ نے بھی کہا تھا کہ حمل سے پہلے اور بعد میں خواتین کو کیا کھانا چاہیے، کیا نہیں لیکن میں نے بعد میں تو تمہاری خوارک کا خیال رکھا مگر پہلے نہیں..... اگر پہلے ٹیسٹ ہو جاتے تو تمہاری غذا میں وہ اجزاء شامل ہوتے..... جن کی تم میں کمی ہے یا مجھ میں کمی یا زیادتی ہے مگر اب کیا ہو سکتا ہے۔“

آمنہ نے شوہر کی حالت دیکھتے ہوئے اپنی ہمت مجتمع کی، کسی کو تو سمجھداری دکھانی تھی، یہ وقت رونے کا نہیں بلکہ آئندہ کے لیے لائحہ عمل طے کرنے کا تھا۔

”فرحان، اب بھی ہمارے پاس وقت ہے، کل ہی اوصاف سے معافی مانگتے ہم چلیں گے اور اب وہ اور فرزانہ جیسا کہیں گے وہی کریں گے تاکہ آئندہ ہمارے ہاں نارمل بچے ہوں۔“ دونوں ایک عزم کے ساتھ بڑے پیار سے بچے کو دیکھنے لگے۔

انگلے دن فرزانہ نے فرحان کو آفس میں فون کیا، لمبی بات ہو چکی، فرحان نے حیران ہو کر پوچھا۔

”ابھی کل ہی تو ملاقات ہوئی تھی۔“

”فرحان تم نے بچے کو چائلڈ اسپیشلسٹ کو دکھایا؟

”ہاں ویکسین وغیرہ کروائی؟“ فرزانہ نے پوچھا۔

”ہاں ویکسین تو باقاعدگی سے کروا رہے ہیں، اکثر کی ضرورت نہیں پڑی ابھی تک۔ بس پیدائش پر ہی دکھایا تھا اب تو کچھ نہیں کیا۔“ فرحان بے پروائی سے بولا۔

”پڑھ لکھ کچھ بھی فرحان تم نے حد کر دی۔ کیا کہوں تم کو فوراً عمران کو چائلڈ اسپیشلسٹ کے پاس لے کر جاؤ۔ میں تم کو اس کا نمبر بھیج رہی ہوں۔ میرا نام لینا فوراً پائنٹ مل جائے گی۔“ فرحانہ کے لہجے میں کڑواہٹ فرحان نے اپنے دل میں محسوس کی۔

شہر کے سب سے بڑے چائلڈ اسپیشلسٹ سے فرزانہ نے ٹائم لے دیا۔ طے شدہ ٹائم پر دونوں میاں بیوی ڈاکٹر کے پاس پہنچے تو فرزانہ بھی موجود تھی۔

دونوں ڈاکٹر نے مل کر کچھ عمران کا چیک اپ کیا۔ آپس میں گفتگو کی پھر اپنی کرسی پر بیٹھ کر فرزانہ نے کھانکھا کر بولنا شروع کر دیا۔

”آپ دونوں نے بھی بچے کو آواز دی تو اس نے رسپانس دیا؟ کبھی شور سے ڈسٹرب ہوا؟ نہیں ناں آپ نے سوچا کہ ایسا کیوں ہے؟“

”ہم سمجھے ابھی چھوٹا ہے بڑا ہوگا تو خود بخود رسپانس دے گا۔“

ڈاکٹر نے بچے کے کان کے پاس ٹھنڈی بجائی مگر اس کے چہرے پر کوئی تاثر نہیں آیا۔ ”دیکھا آپ دونوں نے... آج کل تو بچے پیدا ہو کر فوراً ہی آواز کی طرف سرگھاتے ہیں تاکہ کچھ مبینہ کا بچہ تو آوازوں پر کافی الٹ ہوتا ہے۔“ ڈاکٹر سن نے تھوڑی دیر تو قف کے بعد بولنا شروع کیا۔

”ابھی بچہ بہت چھوٹا ہے..... حتیٰ رائے نہیں دے سکتے آپ ENT اسپیشلسٹ کے پاس اس کو

”واہ بھی کیا زبردست بات ہے، ہمارے بچے تو شور برداشت ہی نہیں کر سکتے خوش قسمت ہو تم دونوں۔“

اوصاف اور فرزانہ نے ایک دوسرے کو ذومعنی انداز میں دیکھا۔ مگر کچھ بولے نہیں..... کہیں پچھلی دفعہ کی طرح بد مزگی نہ ہو جائے۔ سب نے مزے سے کھانا کھایا۔ ننھا عمران اٹھا تو فرزانہ نے اسے گود میں اٹھایا، پیار کیا اس سے اسی کے انداز میں باتیں کیں پھر آمنہ

کو ماتھے پر پیار کیا اور تسلی دی۔

”فرزانہ بیٹی، ماں کے لیے بچے ہمیشہ بچے ہا رہتے ہیں۔ چاہے جتنے بھی بڑے ہو جائیں، کل تمہاری

امی سے بات ہوئی تھی وہ تمہاری طرف سے پریشان تھیں کہہ رہی تھیں ہر وقت اسپتال میں مصروف رہتی ہے۔ دن کی خبر سے نہ رات کی.....“

”آپ بھی ناں چلیں آئیں آمنہ سے تول لیجیے۔“ فرزانہ ہنستے ہوئے بولی۔

دونوں گھروں میں دل بھر کر خوشیاں منائی گئیں۔ آمنہ اور فرحان کی خوشی قابل دید تھی۔ سب دوست بھی مبارک باد کے لیے آئے۔ پارٹی، پارٹی، ایک رٹ تھی ان سب کی۔ وہ کتنے بھی بڑے ہو گئے تھے مگر جب ملتے تو اسکول کے بچے بن جاتے۔ پارٹی ہونے میں چھ مہینے لگ گئے۔

آمنہ اور فرحان کیری کاٹ میں ننھے عمران کو لے کر آئے تو سب نے خوشی سے نعرے لگائے۔ ”ماشاء اللہ نظر بد دور“ کہہ کر سب نے بچے کی نظر اتاری۔ خواتین نے حسب عادت زور، زور سے بولنا شروع کر دیا۔ کسی نے ایک دم کہا۔

”آہستہ بولیں خواتین، بچہ آرام سے سو رہا ہے اگر اٹھ گیا تو ماں، باپ کو سکون سے نہیں بیٹھنے دے گا۔“

”ارے نہیں دوستو...! ہمارا بیٹا ماشاء اللہ بہت ڈسپلن والا ہے۔ شور سے ڈسٹرب نہیں ہوتا۔ جب دل چاہتا ہے اٹھتا ہے، روتا ہے، دو دھ پیتا ہے، سو جاتا ہے، ہم تیز آواز میں بی وی دیکھتے ہیں باتیں کرتے ہیں۔“ فرحان ہنستے ہوئے بولا۔

”واہ بھی کیا زبردست بات ہے، ہمارے بچے تو شور برداشت ہی نہیں کر سکتے خوش قسمت ہو تم دونوں۔“

اوصاف اور فرزانہ نے ایک دوسرے کو ذومعنی انداز میں دیکھا۔ مگر کچھ بولے نہیں..... کہیں پچھلی دفعہ کی طرح بد مزگی نہ ہو جائے۔ سب نے مزے سے کھانا کھایا۔ ننھا عمران اٹھا تو فرزانہ نے اسے گود میں اٹھایا، پیار کیا اس سے اسی کے انداز میں باتیں کیں پھر آمنہ

”جی اے ڈاکٹر! صلیبہ جو آپ کا حکم..... اب اجازت، آمنہ انتظار کر رہی ہوگی، اپنا بہت خیال رکھنا سنبھلی۔“ فرحان نے خوش ولی سے کہا۔

نومہینے گزرنے کا پتا ہی نہیں چلا۔ فرحان دفتر میں تھا جب اس کی امی کا فون آیا کہ ”آمنہ کو فوراً اسپتال لے جانا ہے، جلدی گھر پہنچو.....“

”جی اے بس ابھی آتا ہوں، آپ آمنہ کو تیار کیجیے۔“ آفس سے ہی فرحان نے فرزانہ کو فون کر دیا تھا۔

”پریشان مت ہو! تم ٹینشن لو گے تو آمنہ بھی ٹینس ہوگی۔ میں اسپتال میں ہی ہوں تم لوگ فوراً پہنچو۔“

فجر کی اذان کے ساتھ ہی ایک مصحوم سی رونے کی آواز نے دنیا میں آنے کا اعلان کیا۔ تھوڑی دیر بعد فرزانہ خود اپنی گود میں نپلے مکمل میں لپٹے ہوئے بچے کو لے کر لیبر روم سے باہر آئی۔

”مبارک ہو آنٹی پوتا ہوا ہے اور چونکہ اس کے ماں، باپ کی میں مشترکہ سنبھلی ہوں اسی لیے پہلے میں نے اسے پیار کیا اب دادی اور نانی کا حق بنتا ہے یہ بیجیے۔“

آمنہ کی امی نے فرزانہ کا ہاتھ پکڑ کر اس سے بیٹی کی خبریت پوچھی۔ رو، رو کر ان کی آنکھیں سوج گئی تھیں۔

”آنٹی ابھی تک آپ فرزانہ کے لیے اسی طرح پریشان ہوتی ہیں جیسے جب وہ ہمارے ساتھ اسکول جاتی تھی۔ اب وہ بڑی ہو گئی ہے خود ماں بن گئی ہے۔ اور فرحان کی ذمہ داری ہے۔“ فرزانہ نے ان

بیماریاں common ہیں؟ مطلب شوگر، بلڈ پریشر، پولیو، اندھا پن، بہرہ پن یا کچھ اور..... شکر خدا کا تمہارے بلڈ میں لیوکوسیا نہیں پایا گیا۔ مگر دوسری بیماریوں کا خطرہ بہر حال ہے۔ دیکھو مکمل ہونے سے پہلے ہی لڑکی کو مناسب مقدار میں آئیوڈین اور فولاد کھلانا ضروری ہے۔ بہر حال اب آمنہ کی خوراک کا تمہیں بہت خیال رکھنا ہوگا جس میں یہ اہم اجزاء شامل ہوں، وہ خاص طور پر اسے کھلاؤ، کچھ دوا بھی میں لکھ کر دے رہی ہوں۔ باقاعدگی سے کھلانا اور باقاعدہ چیک اپ کے لیے لانا، سمجھے۔“

”جی ڈاکٹر! صلیبہ جو آپ کا حکم..... اب اجازت، آمنہ انتظار کر رہی ہوگی، اپنا بہت خیال رکھنا سنبھلی۔“ فرحان نے خوش ولی سے کہا۔

نومہینے گزرنے کا پتا ہی نہیں چلا۔ فرحان دفتر میں تھا جب اس کی امی کا فون آیا کہ ”آمنہ کو فوراً اسپتال لے جانا ہے، جلدی گھر پہنچو.....“

”جی اے بس ابھی آتا ہوں، آپ آمنہ کو تیار کیجیے۔“ آفس سے ہی فرحان نے فرزانہ کو فون کر دیا تھا۔

”پریشان مت ہو! تم ٹینشن لو گے تو آمنہ بھی ٹینس ہوگی۔ میں اسپتال میں ہی ہوں تم لوگ فوراً پہنچو۔“

فجر کی اذان کے ساتھ ہی ایک مصحوم سی رونے کی آواز نے دنیا میں آنے کا اعلان کیا۔ تھوڑی دیر بعد فرزانہ خود اپنی گود میں نپلے مکمل میں لپٹے ہوئے بچے کو لے کر لیبر روم سے باہر آئی۔

”مبارک ہو آنٹی پوتا ہوا ہے اور چونکہ اس کے ماں، باپ کی میں مشترکہ سنبھلی ہوں اسی لیے پہلے میں نے اسے پیار کیا اب دادی اور نانی کا حق بنتا ہے یہ بیجیے۔“

آمنہ کی امی نے فرزانہ کا ہاتھ پکڑ کر اس سے بیٹی کی خبریت پوچھی۔ رو، رو کر ان کی آنکھیں سوج گئی تھیں۔

”آنٹی ابھی تک آپ فرزانہ کے لیے اسی طرح پریشان ہوتی ہیں جیسے جب وہ ہمارے ساتھ اسکول جاتی تھی۔ اب وہ بڑی ہو گئی ہے خود ماں بن گئی ہے۔ اور فرحان کی ذمہ داری ہے۔“ فرزانہ نے ان



ناولٹ

## جو دھڑکا وہ دل تھا

بنت محسن

”چار سال بعد حسن علی کو زویا سے محبت ہو گئی ہے۔“ رنگ محل کی کھڑکیوں، دروازوں سے جیسے خوشبوئیں باہر لپکی تھیں۔ یہ کیسے ہو سکتا تھا؟ یہ کیوں ہو رہا تھا؟ حسن علی اور زویا سے محبت؟ نہیں۔ نہیں۔ یہ شاید اس کا وہم تھا۔ جھگڑاتے فائوسوں کی ست رنگی روشنیوں کے درمیان کھڑی وہ زویا تھی۔ باوقار انداز میں کسی سے بات کرتی ہوئی۔ ڈیپ ریڈ لکڑ کا اناجلی فرائک پہنے وہ اتنی ہی عام لگ رہی تھی جتنی چار سال پہلے تھی۔ باوردی ویٹر اس کے سامنے سے گزرا تھا۔ اس نے اسے باوقار انداز میں بلایا تھا۔

”اورنج جوس۔۔۔۔۔۔ پلینز۔۔۔۔۔۔“ اب وہ ٹشو سے گلاس کے کنارے صاف کرتی ہوئی جوس پی رہی تھی۔ گہری ذہانت سے بھری آنکھوں میں بلا کی نخوت تھی۔

مدھم میوزک کی آواز جیسے کہیں دور سے آتی ہوئی محسوس ہوتی تھی۔ حسن علی کرسی پر مگر سا گیا۔ ذہن کی چوکھٹ پر وہ بریلی شام اتر آئی۔۔۔۔۔۔ وہ سانولی سی لڑکی اس

گی۔ ”اگر ہنسنا تھا  
دادی نے خشکیں نظر اس پر ڈالی تھی۔ الیاس  
ماموں نے انہیں متوجہ کیا تھا۔

”اچھا اماں..... چلتا ہوں..... آفس میں ضروری  
میٹنگ ہے.....“ وہ میرے سر پر پیار سے چپٹ لگاتے  
ہوئے آگے بڑھ گئے۔ ثانی مجھے اپنے کمرے میں لے آئی  
تھیں جہاں ہم دونوں کو اکٹھے رہنا تھا۔ کراکشاہ اور ہوا  
دار تھا..... بڑے پٹ والی دو کھڑکیاں تھیں جو باہر کی  
جانب کھلتی تھیں..... دیوار گیر اسٹائش سی الماری  
تھی..... اونچ ہاتھ بھی تھا..... پورے کمرے کے فرش پر  
ایرائی ٹائل تھیں۔ بچھا ہوا تھا۔ گلدانوں میں سبجے پھول تازہ تھے  
اور ان کی بگنی بگنی خوشبو پھیل رہی تھی۔  
وہ زویا اکرام کا رنگ محل میں پہلادان تھا۔

☆☆☆

اور رنگ محل کے باسیوں سے میرا تفصیلی تعارف  
دوپہر کے کھانے پر ہوا تھا۔  
ثانی اماں کے دو بیٹے تھے، الیاس ماموں اور  
رضوان ماموں..... نزہت مانی اور ندرت مانی  
دیوناںیاں ہونے کے ساتھ، ساتھ سگی بہنیں بھی تھیں۔ یہی  
وجہ تھی کہ رنگ محل میں شائقی اور سکون تھا..... نزہت ممانی  
کے دو بچے تھے۔ احرار اور فضا..... جبکہ ندرت مانی کے اریبہ اور  
حسن تھے۔

دوپہر کے کھانے کی میزاتی طویل اور انواع اقسام  
سے بھر پور تھی کہ مجھے وہ دسترخوان یاد آیا تھا جو میں اور انی  
فرش پر بچپانی میں۔ ای کی یاد نے جیسے مجھے اداس کر دیا  
تھا..... ثانی مختلف ڈشیں اٹھا، اٹھا کر میرے سامنے رکھ  
رہی تھیں۔

”زویا..... مینا لو ناں..... یہ سب کچھ میں نے  
تمہارے لیے بنوایا ہے۔ یہ تمہارا بھی گھر ہے۔“  
”دادو..... یہ اس کا گھر نہیں ہے، یہ ہمارا گھر  
ہے۔“ بریانی میں بیچ ہلاتا وہ زبردست انداز میں چونکا  
تھا۔ ثانی نے سالن میرے سامنے رکھی پلیٹ میں ڈال دیا تھا۔  
”یہ زویا کا بھی گھر ہے..... اب یہ بھی یہیں رہے  
گی۔“ میری نظریں اس پر ہی تھیں..... مجھے لگا تھا اس کو میرا  
یہاں رہنا تا کو اگر مرنا تھا..... اور میں سچ ہی سمجھتی تھی۔ وہ  
جیسے میری طرف دیکھ کر ناگواری سے بولا تھا۔

لہا وہ کا سامنا کرنا پڑا تھا جو میں ای کی وفات کے بعد  
سے کرتی آ رہی تھی..... تب مجھے اپنی ڈائری میں لکھی اس  
للم کا مطلب سمجھ میں آیا تھا۔ یہ نظم مجھے بہت اچھی لگتی  
تھی۔ جبکہ میں اس کا مطلب پوری طرح سمجھ نہ پائی تھی  
اور..... مگر اب مجھے ای نظم کے لفظوں سے خوف آرہا تھا۔  
نقصی لڑکی.....

تم اندھیروں سے ڈرتی ہو  
سناں راہوں سے خوفزدہ ہوتی ہو  
مگر اصل خوف تب ہوگا  
جب کوئی تمہارا نہ ہوگا  
تب لفظ ڈرائیں گے  
لے خوف زدہ کریں گے  
تب تم بھوکے

ڈر کیا ہوتا ہے

افسوس..... تم نقصی لڑکی ہو.....

میں وہیں کھڑی تھی جب گلاس ڈور کھول کر وہ اندر  
آئیں ڈرائیں..... اور پھر وہیں ٹھنک گئی تھیں۔ سفید  
پہن کا سوٹ پہنے وہ وہ بہت گریں گے لگ رہی تھیں.....  
ان کا چہرہ جیسے نور سے بھرا ہوا لگا تھا۔ وہ میری طرف  
بڑھی تھیں اور مجھے گلے سے لگایا تھا۔  
”میری بچی..... میری زویا..... کتنی پیاری ہو گئی  
ہے..... اور..... آنکھیں تو ہو ہو اسارہ کے جیسی ہیں۔“  
وہ مجھے خود سے لگائے ہوئے ہی الیاس ماموں کی طرف  
پلی تھیں۔

”اس کی آنکھوں کو دیکھو الیاس..... یوں لگتا ہے  
میری اسارہ ان آنکھوں سے جھانک رہی ہو.....“  
”جی اماں اس کی آنکھیں ای جیسی ہی ہیں.....  
روشن..... چمکیلی.....“ الیاس ماموں مسکراتے تھے۔ ثانی  
نے مجھے اپنے آپ سے پوچھا ہوا تھا اور پوچھ رہی تھی۔  
”یہ زویا اکرام..... تم ایکی نہیں ہو.....“ ان کے وجود  
سے شفقت سی اندر رہی تھی..... مجھے جیسے ای کی خوشبو محسوس  
ہوئی تھی۔

”ہتا ہے میں نے تمہارے لیے نئے کپڑے  
سلائے ہیں..... جوتے بھی بنوائے ہیں..... اور ڈھیلے  
سارے کھلونے بھی.....“

”دادی، وہ پتی نہیں ہے جو کھلونوں سے کھیلے

وہ بے خبر ہے..... اور وہ باخبر تھا..... رنگ محل کے  
احاطے میں محبت کی رومنائی ہونے والی تھی۔ گلدانوں میں  
سبجے گلابوں کی مہک ابھری اور سارے میں بھری۔  
اور حسن علی انچو بنا بیٹھا ہے، کوئی حرکت نہیں.....  
ہر جنبش سے خالی.....

☆☆☆

مجھے ان سب کی جانچتی، پرہتی نظروں سے خوف  
آیا تھا..... وہ سارے مجھے کھور کر دیکھ رہے تھے..... میں  
الیاس ماموں کے پیچھے چھپنے کی کوششوں میں تھی۔ رنگ  
محل کی کھڑکیوں سے اندر داخل ہوتی تاریکی دھوپ میں  
سب کے چہروں کے تاثرات دیکھنا مشکل نہیں تھا۔ مگر  
کاش یہ مشکل ہوتا۔  
اگر کی زبان پہلی تھی..... ”یہ تو.....“ فضا نے اپنے  
بھائی کو زور سے پتلی کاٹی تھی۔

اریبہ نے بغور اس کا جائزہ لیا تھا۔ سستے کاشن  
سوٹ میں ملبوس، سوئی چپل پہنے، اچھے بالی وہ سانولی  
رنگت والی لڑکی کم از کم ایسی شخصیت ہرگز نہیں تھی کہ اس پر  
دوسری نظر ڈالنے کی خواہش دل میں ابھرتی۔ اسی لیے  
اس نے بے رحمی سے تہہ لگایا تھا۔

”اسارہ پچھو تو بہت خوب صورت تھیں مگر یہ تو ان  
جیسی بالکل بھی نہیں.....“ مجھے اس کا یہ تہہ جیسے لبو لبان  
کر گیا تھا۔ میں چپ پاؤں کے انگوٹھے کے ناخن پر نظر  
جمائے کھڑی رہی..... جس سے اب بھی خون رس رہا تھا۔  
”جاؤ..... زویا، وہاں بیٹھ جاؤ.....“ الیاس  
ماموں نے صوفے کی طرف اشارہ کیا تھا۔

صوفے کی دوسری طرف ”وہ“ بیٹھا تھا۔ کلر پینسلو  
سے بائیو لوجی کی ڈائیگرامز بنا رہا تھا۔ ان سب میں سے  
وہ سب سے بے نیاز نظر آتا تھا۔ جیسے کسی دوسرے کی  
طرف نظر اٹھا کر دیکھنا اس کی شان کے خلاف ہو.....  
بہر حال ایک بات ماننے والی تھی کہ اس کے جتنے نقوش میز  
بلا کی کشش تھی..... سیاہ بال پیشانی پر بکھرے ہو۔  
..... ٹراؤزر، ٹی شرٹ میں وہ ملبوس تھا..... میں صوفے  
کے کونے پر بیٹھنے والی تھی کہ وہ اچھلا۔

”Please stay away from  
me“ اور میں جہاں کی تہاں کھڑی رہ گئی..... اور پہلا  
بار..... ہاں..... شاید پہلی بار مجھے اس کرب سے بچ

کے سامنے کھڑی تھی۔  
”تمہیں کیا لگتا ہے، میں تم جیسی لڑکی کو اپنی زندگی  
میں شامل کروں گا..... تم میرا آئیڈل نہیں ہو..... ہو ہی  
نہیں سکتیں..... کیا ہے ایسا تم میں کہ میں تمہیں ایک لمحہ بھی  
سوچے بغیر اپنی زندگی میں شامل کروں؟“ وہ پوچھ  
رہا تھا..... اور وہ چپ چاپ کھڑی تھی۔ جیسے کھڑے،  
کھڑے زمین میں گاڑ دی گئی ہو..... پہلا آنسو.....  
دوسرا..... موتیوں کی لڑیاں بکھر رہی تھیں..... وہ اس کے  
چمکتے بوٹوں پر نظریں جمائے کھڑی تھی۔  
”نہ اس وقت میری زندگی میں تمہاری جگہ ہے اور  
نہ ہی چار سال بعد ہوگی۔“

اور اب چار سال بعد..... وہ جملے حسن علی کو پسپا  
کر رہے تھے..... اب وہ کیسے زویا کے سامنے جائے اور  
کہہ دے.....

”زویا اکرام مجھے تم سے محبت ہے۔“  
اور وہ سانولی سی لڑکی جو اورنج جوس کے سب لے  
رہی تھی..... وہ بریلی شام کے منظر کو اپنی یادداشت کے  
خانے میں زندہ رکھے ہوئے ہے۔ وہ نہیں بھولی..... کچھ  
بھی نہیں.....

اور وہ..... سر جھکائے بوٹوں سے کارپٹ کی پٹیوں  
کو اکھاڑنے کی کوشش میں تھا..... دور سے وقت کی  
راہداریوں سے اسے اپنی آواز سنائی دی تھی..... اسے اس  
آواز سے خوف آیا تھا..... بے تحاشا خوف.....

”دادی..... وہ میرے لائق نہیں ہے..... میں  
کیسے ایسی لڑکی کو اپنی زندگی میں شامل کروں جس کا  
ایشیٹس، قابلیت، کچھ بھی تو مجھ سے بیچ نہیں کرتا.....  
”I can't do this“ اور پردے تھامے کھڑی زویا  
اکرام پتھر ہوئی تھی۔ گویا کوئی جبر..... وہ سیز جیوں پر بیٹھی  
رو رہی تھی..... اور تب..... غیر ارادی طور پر اس نے اپنی  
دانت میں حسن علی کو بیدو عادی تھی۔

”اللہ کرے..... تمہیں مجھ سے محبت ہو جائے۔“  
اور جب وہ اس دعا کے کبھی قبول نہ ہونے کا یقین  
بھی کر چکی تو..... خیر..... دعاؤں کی ڈائری سے کسی  
سوکھے پھول کے مانند وہ دعا قبولیت کے درجے میں  
داخل ہو چکی تھی۔

”چار سال بعد حسن علی کو زویا سے محبت ہو گئی ہے۔“

حسن اور احمر کچن کا سامان اسٹور سے لے آئیں گے.....“ فضا نے فنانٹ پر وگرا مے کیا تھا۔ اربیب نے قہقہہ لگایا۔ ”تمہیں یقین ہے کہ وہ دونوں آسانی سے یہ کام کر لیں گے؟“

میں دھاتی جھولے پر بیٹھی سوچ رہی تھی..... یہ  
کی بھی کیسے، کیسے رنگ دکھائی ہے۔ میں سوچ بھی  
کرتی تھی کہ میرا ان خیال ایسا ہوگا۔ اسی کی پسند کی شادی  
فیصلے نے تائی، تانا سے تعلق کا خاتمہ کروادیا..... مگر  
تو اور خون کے تعلق ختم نہیں ہو سکتے۔ کبھی نہیں..... اگر  
سب بھلا کر ماموں کو مجھے نہ لینے بیٹھیں تو میں آج  
س ہوتی..... شاید انہی ننگ و تاریک گلیوں والے  
برے گھر میں پڑی سک رہی ہوتی۔

میں نے آنکھوں میں آنے آنسو ہاتھ سے دوپٹے  
کو پونچھ لیے تھے..... میں نہیں چاہتی تھی کہ کوئی میرے  
دیکھے..... اور میں نے خبر بھی کہ کوئی میرے آنسو دکھ

”نہیں فضا..... میں کام کر رہی ہوں۔“ میں نے اس کے ناخلو پر نظر ڈالی تھی۔ وہ ابھی باتیں کر رہی تھیں۔ باہر سے زوردار بارش کی آواز آئی..... اریہ نے ٹیکل لڑتے ہوئے شولڈر بیک اٹھا کر کندھے پر ڈال لیا تھا۔

”ایک تو یہ دونوں ہر وقت جلدی میں ہوتے..... ایسی افراطی چماتے ہیں کہ بندہ یہ بھی بھول ہے کہ کون سا کام ضروری سرانجام دینا تھا۔“ فضا کی طرف لسٹ لینے لگی ہوئی تھی جب تک وہ آئی، حسن اور اصر کی شان میں تعیدے پر بڑھ رہی تھی۔

”جب تک ہم جیلر کے پاس ٹھہر رہے ہیں تو تک

"Its rapunzal" میں یہ کہہ کر اندر کی طرف بڑھ آئی تھی..... دروازے کے پینڈل پر میرا ہاتھ تھا جب میں نے حسن کی استہزاء یہی سنی تھی۔

"wrong answer" اب میں نے پیچھے پلٹ کر دیکھا تھا..... اریہ حیرت سے مجھے دیکھ رہی تھی۔

"نہیں حسن..... اس نے ٹھیک کہا یہ راپنزل کا ہی

دیکھا تھا..... اریبہ ریف پیپر پر کوئی ایچ ڈرا کر رہی تھی۔  
 ”بائیولوجی.....“ میں نے جواب دیا..... احمر نے

## غزل

دریا چاند ستارے فری  
چپ ہیں غم کے مارے فری  
ڈوب رہی ہے دل کی کشتی  
دیکھ رہے ہیں سارے فری  
کیوں بہتے ہیں رفتہ رفتہ  
میری آنکھ کے دھارے فری  
ہم کو تنہا چھوڑ گئے ہیں  
اپنی جاں سے پیارے فری  
کون لکھے گا درد کہانی  
اکثر میرے بارے فری  
اس نے لوٹ کے کب آتا ہے  
خود کو کون سنوارے فری  
کلام: فریدہ فری، لاہور

مائی کے سامنے رکھ دیا اور دوسرا خود اٹھالیا۔  
”شکر یہ زویا۔ کام میں مصروف تھی تو پیاس لگی  
ہوئی تھی تو خیال ہی نہیں آیا۔ شکر ہے کہ تم آگئیں۔“  
”کوئی بات نہیں مائی۔“ میں ہولے سے مسکرا  
دی تھی۔

نزہت مائی کسی تقریب میں مٹی ہوئی تھیں اور اب  
کچن کا سارا کام... ندرت مائی کر رہی تھیں۔ وہ پھرٹی  
سے سارا کام دیکھ رہی تھیں۔ ان کے انداز سے ذرا بھی  
تھکن ظاہر نہیں ہوتی تھی۔ میں نے خالی گلاس دھو کر کارنز  
میں بنے اسٹینڈ پر احتیاط سے رکھ دیے تھے۔

”مامی۔ میں آپ کی کچھ سیلپ کرواؤں۔۔۔؟“  
میں نے اپنی خدمات پیش کی تھیں۔

”ارے نہیں زویا بیٹا۔ میں سب کر لوں گی، تم  
بس ٹیبل پر بیٹھ کر مجھ سے باتیں کرتی رہو۔“ وہ ہنڈیا  
میں بیج پلاتے ہوئے بولی تھیں۔

کچن میں چھوٹی سی کھانے کی میز رکھی ہوئی تھی میں

بھی ہلتا تو وجود کانپ، کانپ جاتا تھا۔ بہت وقت لگا  
ہے ان خاموشیوں کے ٹوٹنے میں، بہت وقت۔۔۔“

میری نظریں دیواروں پر ابھرتے سائے کی طرف  
تھیں۔۔۔ بھی دروازہ کھلا اور ندرت مائی اندر آئی تھیں۔  
”ہاں مٹی۔ کیا باتیں ہو رہی ہیں تانی، نواسی میں؟“  
”بس۔۔۔ اسی کی باتیں کر رہے تھے۔“

”ہاں اماں۔۔۔ اسی نے بڑی تکلیف میں وقت  
گزارا۔۔۔ خیر جو قسمت میں لکھا ہو۔ انسان کی کیا مجال  
جو ٹال سکے۔“ وہ بولی تھیں۔ میں اپنی انگلیوں کے  
تاختوں کو دیکھنے لگی تھی۔

”درست کہتی ہو ندرت۔۔۔ تانی نے ہنکارا ابھرا۔  
”اماں۔۔۔ آج دوپہر میں کیا بناؤں۔۔۔؟“ ندرت  
مائی نے سر اثبات میں ہلا کر تانی سے پوچھا تھا۔

”جو مرضی بنا لو ندرت۔۔۔ جو سارے بچے شوق  
سے کھاتے ہوں۔“ تانی کی بات پر ندرت دروازہ بند  
کر کے باہر نکل گئی تھیں۔

”زویا۔۔۔ تجھے جوانی پسند کا کھانا ہونز بہت اور  
ندرت کو بتا دے وہ بنادیں گی۔“ تانی کی غنودگی بھری  
آواز آئی تھی۔ دوائی کا اثر ہو رہا تھا۔  
”نہیں تانی۔ جو سب کھائیں گے میں بھی وہی  
کھا لوں گی۔“

”ارے بیٹا۔ تمہارا اپنا گھر ہے۔“ وہ غنودگی  
میں چلی گئی تھیں۔ میں اٹھ کھڑی ہوئی تھی۔ کارڈور  
میں سے گزرتے ہوئے میں سوچ رہی تھی۔

”اپنا گھر نہیں ہے یہ میرا۔ میں تو یہاں ایک  
”پناہ گزین“ کی حیثیت سے ہوں۔ جو کھوں، پل بھر کو  
ٹھہرتے ہیں اور گزر جاتے ہیں۔ جانے وقت کے  
کھیل میں میرا کتنا حصہ باقی ہے۔“ میں کچن میں چلی آئی  
تھی۔ ندرت مائی کو رنگ رنج کے سامنے کھڑی گوشت  
بھون رہی تھیں۔ مجھے دیکھا تو مسکرا دیں۔

”کچھ چاہیے تھا زویا۔۔۔؟“  
”نہیں مائی۔ بس میں پانی پینے آئی تھی۔“ انہوں  
نے اسیروں کی دوری کتے ہوئے مجھے شفقت سے دیکھا۔

”ریفریجریٹر میں کولڈ ڈرنک رکھی ہے وہ لے  
لو۔“ میں نے فریج سے کولڈ ڈرنک نکال کر شیلٹ پر  
رکھی اور دو شیشے کے گلاسوں میں انڈیلی۔ ایک گلاس

تھی۔۔۔ کبھی چڑ جاتی اور کبھی بے بسی کے عالم میں رونے  
لگتی تھی۔۔۔ ہم دونوں بہت اکیلے تھے سوائے اللہ کے  
ہمارے پاس کوئی سہارا نہیں تھا۔۔۔ مجھے ان راتوں سے  
بڑا خوف آتا تھا۔ جو تھا سہا ای کی بیماری پر لگ گیا، میں  
نے اپنی سونے کی بالیاں بیچ دی تھیں۔ امی سے بڑھ کر کچھ  
نہیں تھا۔۔۔ اور ماؤں سے بڑھ کر کچھ ہوتا بھی نہیں۔۔۔ تانی  
وہ وقت بہت مشکل تھا۔ بہت مشکل۔۔۔ میں رو رہی  
تھی۔ ان دنوں کی اذیت بھلانے والی نہیں تھی۔

”میں اندھیرے کمرے میں فرش پر بیٹھی ہوں،  
ای خون تھوک رہی ہیں، بادلوں کے گرنے کی آواز آرہی  
ہے۔ کھڑکیوں پر اولے گر رہے ہیں۔۔۔ اور۔۔۔ امی  
دھم سے فرش پر گر گئیں تھیں۔ خوف مجھے جکڑ رہا تھا۔ میں  
نے سر اٹھایا، چھت ٹپک رہی تھی۔ ٹپ۔ ٹپ۔۔۔

ٹپ۔۔۔ کدلا پانی میرے بالوں کی جڑوں میں جذب  
ہو رہا تھا۔۔۔ میں باہر کی طرف بھاگی، بجلیاں کڑکنے کی  
آواز۔۔۔ ساری مٹی جل پھل تھی۔۔۔ میں ننگے سر  
دروازے سے بجاتی رہی مگر کوا نہیں کھلے۔ وہاں ”بندو لوں“

کے ”بوٹے“ رہتے تھے جو کسی کی بھی مدد نہیں آتے۔۔۔  
جب میں ٹھہرتی ہوئی ننگے سر اور ننگے پاؤں گھر لوٹی تو  
بارش کے گدے پانی میں سرخ خون جذب ہو کر  
سیڑھیوں سے قطرہ، قطرہ گر رہا تھا۔ بعض منظر پتھر کرتے  
ہیں اور میں۔۔۔ پتھر ہوئی بیٹھی ہوں۔

میری امی پر آمدے کے فرش پر اونٹنی پڑی ہیں اور  
میں ان کا سر گود میں رکھے بلک، بلک کر رو رہی  
تھی۔۔۔ امی۔۔۔ آنکھیں کھولیں۔ خدا کے واسطے امی مجھے  
دیکھیں۔ میں بھری دنیا میں اکیلے رہ گئی ہوں۔۔۔ امی آنکھیں  
کھولیں۔ اور بند آنکھیں کہاں کھلی ہیں؟ وہ بھی زمین اوڑھ  
کر لیٹ گئیں تھیں۔ تانی نے مجھے خود سے لپٹا لیا تھا۔

”ندرو میری بیٹی۔ میں جانتی ہوں تم دونوں نے  
کتنی تکلیف اٹھائی ہوگی۔ کتنا بھتیجی تمہارے تانا کوکہ  
اکہ کو معاف کر دیں۔ مگر انہوں نے ہمیشہ اپنی انا کو بلند  
رکھا۔ مٹی میں مٹی ہو گئے مگر انا کی عمارت مسمار نہیں  
ہوئے دی۔“

تانی رو رہی تھیں۔  
”امی ہمارے گھر کی رونق تھی جب سے مٹی تو لگا  
رنگ محل کو قبرستان بنا گئی ایسی خاموشی کہ پوچھو مت۔۔۔ در

چکا تھا۔  
مجھے یہاں آنے ہوئے دو ہفتے ہو چکے تھے اور جو  
انجان جگہ پر رہنے کی فطری سی جھجک ہوئی ہے وہ کسی حد  
تک دور ہو چکی تھی۔ میں نے پردے سیٹھ کر ایک ساڈر پر  
کر دیے تھے۔ ٹیبلٹس باکس سے تانی کی دو انیاں نکالیں  
اور کپن سے ایک گلاس دودھ لے آئی تھی۔ سارا کراہیلے  
گلابی رنگ میں پینٹ کیا ہوا تھا جو آنکھوں کو ذرا بھی نہیں  
چھینتا تھا۔ رنگ محل کے ہر کمرے کا پینٹ مختلف تھا۔ ہر کمرے  
ایک نئی حیران کن جگہ تھی اور ہر بار مجھے حیرت سی ہوتی تھی  
۔۔۔ تانی نے گولیاں نگل کر دودھ کا لمبا گھونٹ بھر کر گلاس  
سایڈ ٹیبل پر رکھ دیا تھا۔ میں کھڑکی کے پاس جا کر کھڑی  
ہوئی تھی۔

”آج کل انسانوں کو عجیب و غریب بیماریاں  
چھٹ مگی ہیں پہلے کہاں ایسے ہوتا تھا۔“ میں جو دور نظر  
آتے مکانات پر نظر جمائے کھڑی تھی۔ تانی کی بات پر  
چونک گئی۔

”جی تانی۔۔۔ ٹیکنالوجی کا استعمال جہاں فائدہ مند  
ہے دوسری طرف مضر اثرات بھی مرتب ہو رہے  
ہیں۔۔۔ امی بھی جان لیوا بیماری کا شکار ہوئی  
تھیں۔“ میری آنکھوں میں نمی آنے لگی۔ میں ذرا سا  
رخ موڑ گئی تھی۔

”زویا۔۔۔ اسارہ کو کیا ہوا تھا؟“  
”بلڈ کیٹرس۔۔۔“ میرے منہ سے سرسراتی ہوئی آواز  
نکل گئی۔

”بہت تکلیف میں رہی ہوگی میری بیٹی۔۔۔ وہ  
جیسے افسردہ ہوئی تھیں۔ میں ان کی طرف چلتی تھی اس  
بار میں نے آنکھوں کی نمی چھپانے کی کوشش نہیں کی  
تھی۔۔۔ کھلی کھڑکیوں سے سنہری دھوپ کارپٹ میں  
جذب ہو رہی تھی۔ میں آہستہ سے چلتی ہوئی بیڈ کے  
کنارے آئی تھی۔

”پتا ہے تانی وہ وقت قیامت جیسا تھا۔۔۔ میں اور  
ای بھری دنیا میں اکیلے تھے۔۔۔ دن بھی راتوں سے  
مشابہ تھے۔ ہر بار نئی تکلیف۔۔۔ ہر بار نئی  
اذیت۔۔۔ راتوں کو میں میڈیکل اسٹورز کے چکر کاٹی تھی  
اور امی اس اندھیرے کمرے میں خون اگل رہی ہوتی  
تھیں۔۔۔ میں فرش صاف کر، کر کے تھک جاتی

”آف کورس.....“ وہ بڑے دلکش انداز میں مسکرایا۔  
مجھے لگا تھا میں کھل رہی ہوں..... زرد موم کے  
مانند..... مسکرائیں بھی کچھلا دیتی ہیں..... یہ میرا پہلا  
تجربہ تھا۔  
”کہیں تم اپنی مس پر فیکٹ ڈھونڈ تو نہیں چکے؟“  
گولڈن نیل پالش چیک کرتی فضا نے مائیکرو اسکوپک  
انداز اپنا کر حسن کو دیکھا۔  
”ابھی نہیں..... اتنی جلدی قیتیں چیزیں نہیں ملا کرتیں۔“  
”کیا اسے ڈائلاگ سمجھا جائے؟“  
”اوہ نہیں..... یہ تو ایک فیکٹ ہے۔“  
”میرے خیال میں میری فرینڈز میں سے کسی کو  
کیوں نہیں ڈھونڈ لیتے تم.....“ اریبہ نے نیل پالش کی  
بولس کی کیپ بند کی اور پھر اپنے بھائی کو دیکھا۔  
”اس سے تو میں بیکڑی ہی اچھا ہوں۔“ حسن نے گھور  
کر بہن کو دیکھا۔  
”بیچارہ ٹھیک تو کہہ رہی ہے.....“ احمر نے لقمہ دیا  
تھا اریبہ نے یکا یک فضا کو متوجہ کیا۔  
”فضا..... تم شرا کو تو جانتی ہونا جو براؤن ہیزر  
کھر لگاتی ہے اور ڈارک مینسٹریوز کرتی ہے۔“  
”اچھا..... وہ..... کٹ کھنی ملی جو مجھے آنکھیں  
بھاڑ، بھاڑ کر دیکھتی ہے۔“ احمر چیخا۔  
”تمہیں.....؟“  
”لیس!“ وہ قفاخر سے مسکرایا۔  
”اسے تم میں بھلا کیا نظر آیا؟“  
”کیا مطلب.....؟“ وہ صدمے سے چور آواز  
میں بولا تھا..... میں ان کی باتیں سنتی مسکرا رہی تھی۔  
”لگتا ہے بیچارہ شرا کی نظر کمزور ہو گئی ہے تبھی  
تو.....“ اریبہ نے بالوں کی لٹ کو انگلی پر لپیٹا۔  
”ہونہر..... اتنی جلدی مس ورلڈ نہیں تمہاری وہ بھوتی  
دوست.....“ وہ جل کر بولا۔  
بلکی ہوا کی لہر سے پھولوں کی بھیننی، بھیننی خوشبو  
چاروں طرف پھیل رہی تھی..... تاریکی مگنا اندھیرا ہر  
طرف پھیل رہا تھا..... بھی پورچ میں رضوان ماموں کی  
گازی آن رکھی تھی۔  
”کیا ہو رہا ہے بھئی؟“ وہ بیک تھا سیدھے لان  
کی طرف آگئے تھے۔  
”کچھ خاص نہیں.....“ احمر مسکرایا۔

کی اور میں کچھ مطمئن ہو گئی۔  
”زویا..... یہ سب کس نے سکھایا؟“ کبھی ندرت  
مائی کے ساتھ مل کر سلائی کڑھائی کر دیتی تو وہ مششدر  
رہ جاتیں۔  
”ای نے مجھے سب سکھایا مائی..... سلائی کڑھائی،  
کھانا پکانا..... سب کچھ.....“ میں انہیں جواب دیتی۔  
انہوں نے سر اثبات میں بلایا۔  
”سچ کہتی ہو..... اکی بہت گمنوں والی اور سکھڑ  
تھی..... تبھی تمہیں سب سکھایا..... ایک ہماری اولاد ہے،  
ناک پر کبھی تک نہیں بیٹھنے دیتی۔“  
”تو چچی جان آج کل ناک پر کبھی کون بیٹھنے دیتا  
ہے بھلا؟“ احمر اچھل پڑتا تھا۔  
نزدت مائی کی پچھل اڑتی ہوئی اصر کی طرف لپکتی مگر  
وائے ری قسمت..... نزدت مائی کا نشانہ بھی نشانے پر نہ  
لگتا تھا..... اور اسی بات کا انہیں قلع اور احمر کو بے تحاشا  
خوشی ہوتی۔  
رنگ محل میں شام کی چائے کا اہتمام میں نے اپنے  
سر لے لیا تھا..... کباب، چپس، بکلیں سکٹ.....  
اس دن لان میں لگے سفیدے کے درخت ٹھنڈی ہوا  
سے جھول رہے تھے..... سکھ چین کے پتوں کا ساز ساز  
رہا تھا۔ زرد شام رنگ محل کی چوکھٹ پر اترتی ہوئی  
تھی..... مائی بابا نے ابھی پودوں کو پانی دیا تھا۔ چائے  
کے بعد کچھ وقت نو جوان پارٹی کپ شپ کے لیے پیش  
تھی..... ادھر ادھر کی باتیں کر کے دل بہلا لیا جاتا تھا۔  
میں اپنا کپ تھامے آسٹریلیا ٹیٹن طوطوں کے بچرے کی  
طرف نظر..... بجائے بیٹھی تھی۔  
”تم کیسا لانٹ پارٹنر چاہتے ہو؟“ اچانک احمر  
نے حسن سے سوال کیا۔  
مجھے لگا وہ اس سوال سے کئی کتر اجائے مگر میں غلط  
تھی..... اس نے جواب دیا تھا اور تفصیل سے دیا تھا۔  
”میں ایسا لانٹ پارٹنر چاہتا ہوں جو بہت بولڈ،  
خوب صورت اور مجھے سمجھے والی خصوصیات رکھتی  
ہو.....“ جانے کیوں مجھے چائے میں ٹکی کھلتی ہوئی محسوس  
ہوئی تھی۔  
”واؤ..... کیا ایسی شخصیات زمین پر ہی پائی جاتی  
ہیں؟“ یہ احمر کا سوال تھا۔

کر رہی ہو..... اور یہ حیرانی مجھے بہت پسند آئی ہے۔“  
اریبہ نے مجھے خاص طور پر کہا تھا۔  
”you are amazing“ فضا نے مجھے  
گلے سے لگایا تھا۔ میں ہولے سے مسکرائی تھی اور تبھی میری  
نظر اس پر پڑی تھی جواب مکمل طور پر لائق سنا بھٹا تھا.....  
حسن علی ایک ایسی پہیلی تھا جو میں ان دو ہفتوں میں کسی طور نہ  
سلجھا سکی تھی۔ ایک ایسا سوال جو حل ہی نہیں ہو سکے۔  
جانے ایسا کیوں تھا..... میں نہیں جانتی تھی.....  
میں..... ”بے خبر“ تھی۔ رنگ محل کی دیواروں پر سفیدے  
کا عکس پڑ رہا ہے.....

☆☆☆

کالج کیا اشارت ہوا یوں لگا زندگی مصروفیت کی  
دیزتہ میں دیتی جاری ہو..... دن، رات وہی تھے مگر بس  
اگر بدلاتا تھا تو انداز ہی بدلاتا تھا۔ میں رنگ محل کے پاسیوں  
کی زندگی میں یوں داخل ہوئی تھی کہ نہ مجھے علم ہو سکا اور نہ  
انہیں خبر ہو سکی تھی..... میں نے اپنے آپ کو ان کی  
زندگیوں میں ”عادت“ کی طرح شامل کر لیا تھا.....  
سوائے حسن علی کے..... رضوان ماموں کو میرے علاوہ  
اب کسی کے ہاتھ کی بنی ہوئی کافی پسند نہیں آتی تھی۔  
”پتا ہے زویا..... جب تمہارے ہاتھ کی بنی ہوئی  
کافی پیتا ہوں تو یوں لگتا ہے کہ سارے دن کی تھکن ایک  
دم سے غائب ہو گئی ہو..... تم ایک اچھی کافی میکر  
ہو.....“ اور میں اسٹڈی روم کی الماریوں میں سے کتابیں  
کھنگالتی ہوئی منہ حیرت سے کھول لیتی۔  
”سچ ماموں..... کیا میں واقعی اچھی کافی میکر  
ہوں؟“ میں پوچھتی..... اور مجھے آج تک یہ یقین نہیں ہو سکا  
کہ میں اچھی کافی بناتی ہوں..... شاید مگر کی مرغی دال  
برابر والی مثال مجھ پر فٹ آتی تھی۔ لیپ ٹاپ کے مٹن.....  
پر بس کرتے وہ خوب صورت مٹی بننے تھے۔  
”ارے بنی..... اب تو تمہیں یقین ہو جانا چاہیے آئی  
تھنک یہ سوال تم پچھلے دو ہفتوں سے کرتی آرہی ہو.....“  
”کیا پتا آپ لوگ میرا دل رکھنے کو کہہ دیتے  
ہوں؟“ میں نے خدشہ ظاہر کیا تھا۔  
”ارے نہیں..... دل بھی ایک یادو بار کھا جاتا  
ہے..... دو ہفتوں سے اب میں دل رکھنے کی کوشش نہیں  
کر رہا۔“ کافی کا سب لیتے ہوئے انہوں نے دلیل پیش  
ماہنامہ پاکیزہ 126 دسمبر 2017ء

اسی پر بیٹھ گئی تھی۔ اور ہم ادھر ادھر کی باتیں کرتے رہے  
اور تب تک کھانا بھی بن گیا تھا۔ مائی کے منع کرنے کے  
باوجود بھی سلا میں نے بنادیا تھا۔ مجھے اچھا نہیں لگا تھا  
یوں انہیں اکیلے کام کرتے ہوئے دیکھنا..... اسی لیے  
تھوڑی بہت مدد کرتا میں نے اپنا فرض سمجھا تھا۔  
”sorry zoya, i was so busy“ رضوان  
ماموں نے کھانے پر مجھ سے معذرت کی تھی۔  
میں نے سر اٹھا کر انہیں دیکھا۔  
”اٹلی کا ٹور تھا تو اتنا وقت لگ گیا..... کل ہی تمہارا  
ایڈیشن کروادوں گا۔ اسناد وغیرہ سب ریڈی ہیں  
ناں.....؟“ فضا اور اریبہ کھانا کھانے کے ساتھ ساتھ  
کسی فیشن میگزین کے تازہ شمارے پر بحث کر رہی  
تھیں..... احمر اور حسن کسی کرکٹ میچ پر تیرے کر رہے  
تھے جبکہ نزدت مائی، ندرت مائی کو تقریب کا احوال  
بتا رہی تھیں..... بانی بچے الیاس ماموں تو وہ فی الحال  
آفس میں تھے۔  
”جی ماموں..... سب ریڈی ہے۔“  
”آگے کیا ارادے ہیں؟“  
”جی بی ایس سی کروں گی۔“  
”گریٹ..... ایف ایس سی میں کتنے مارکس ہیں  
تمہارے.....؟“ وہ پوچھ رہے تھے میں نے ہاتھ میں  
پکڑے شے کے گلاس پر گرفت مضبوط کی تھی۔  
”جی..... ماموں..... میں نے ایف ایس سی میں  
ٹاپ کیا ہے۔“  
میں نے جتنے ”عام“ سے انداز میں یہ خبر ان کے  
مکوش گزار کر تھی اس خبر کا ری ایکشن اتنا عام ہرگز بھی  
نہیں تھا..... فضا اور اریبہ کی بحث ہوا میں تحلیل ہو چکی  
تھی..... حسن اور احمر بھی بے یقینی سے مجھے دیکھ رہے  
تھے۔ دونوں ممانیاں بھی میری طرف متوجہ تھیں۔  
سب کی نظریں میری طرف تھیں..... مجھے مرکز نگاہ  
بنا کبھی پسند نہیں رہا تھا مگر اب..... میں جھینپ گئی۔  
”واؤ..... بھئی..... ہماری زویا تو بہت اینٹی سینٹ  
ہیں..... اتنی بڑی خبر پہلے کیوں نہیں بتائی؟“ رضوان  
ماموں میرے سر پر پیار سے چپٹ لگا کر بولے تھے۔  
”ماشاء اللہ.....“ دونوں ممانیاں بولی تھیں۔  
”پتا ہے تم جب سے یہاں آئی ہو مجھے حیران

وہ میری طرف مڑے تھے۔

”زویا بیٹا..... پلیز ایک کپ کافی میرے لیے بیڈ روم میں بھجوادو.....“ وہ چلے گئے تو میں اٹھ کر پکچن میں آئی۔ فضا نے ہاتھ پھیلا کر تانوں کو دیکھا اور پھر دوبارہ نیل پالش کا ڈھکن کھول کر پھر نیا کوٹ لگایا۔

”زویا..... کتنی محل مل گئی ہے ناں یہاں..... بہت اچھی لڑکی ہے.....“

"I am not agreed with you"

حسن نے ناگواری سے فضا کو دیکھا تھا۔

اریبہ نے بھائی کو دیکھا تھا۔

"but why" اس کے انداز میں حیرت تھی۔

”مجھے تو وہ بالکل بھی اچھی نہیں لگی..... وہاں کھانے کو ایک وقت کا بھی نہیں تھا اور یہاں خود کو سارے گھر کا مالک سمجھ رہی ہے۔ اسٹریچ..... شکل دیکھی ہے اس کی دوسری نظر ڈالنے کا بھی دل نہیں چاہتا۔“ حسن نے کندھے اچکاتے ہوئے کہا تھا۔

”تم اتنے materialistic کیوں ہو رہے ہو؟“ احمر نے غصے سے اسے دیکھا۔

”ہاں میں ہوں۔“ حسن نے خالی کپ میز پر رکھا۔ ”مگر دیکھنا اب وراثت میں اس کا بھی حصہ نکل آئے گا۔“

فضا تیسرا کوٹ لگانا بھول گئی تھی۔ اریبہ حیرت سے بھائی کو دیکھنے لگی۔

”تم مت بھولو کہ وہ ہماری سگی بچھو کی بیٹی ہے اور وہ یہاں کی ہر چیز کی مالک ہے۔“ فضا نے حسن کو مخاطب کیا تھا۔

وہ غصہ ہوتا ہوا کرسی کو ٹھوکر مارتا باہر نکل گیا۔

”اسے زویا سے کیا پراہلم ہے؟“ احمر نے اریبہ کو دیکھ کر کہا۔

”مجھے تو خود کچھ بھی سمجھ نہیں آ رہا۔“ وہ بے بسی سے بولی تھی۔

رنگ محل کی روشنیاں جل اٹھی تھیں..... شام، رات کے وجود میں داخل ہونے کو تھی۔

☆☆☆

اندھیری رات ہر طرف خیمہ زن ہو چکی ہے..... ہر طرف اندھیرا ہے..... کالا..... سیاہ..... میں اس ٹھنڈی

ہوئی رات میں لان میں گئے کتنی بیچ پر تنہا بیٹھی ہوں..... مجھے بالکل بھی سردی نہیں لگ رہی۔ شاید میں کچھ زیادہ ہی مضبوط ہو گئی ہوں یا پھر مجھ پر موسموں نے اثر انداز ہوتا چھوڑ دیا ہے..... چار سال بعد وہ لوٹ آیا ہے..... اور وہ چار سال بعد کی کہانیاں مجھے سنانے آیا ہے۔ اور زویا اگر ام تو چار سال پہلے کے وقت میں زندہ ہے ناں.....

”کیسے بھلا دوں وہ سب؟“ بھولنا..... بھلانا اتنا آسان ہوتا ہے کیا؟“

مرد بھلا دیتے ہیں مگر عورت گزارا ہوا وقت پلو سے باندھے رہتی ہے..... میں بھی باندھے ہوئے ہوں اور اب جب وہ پلو کھلتی ہوں تو دل نے سرے سے ریزہ، ریزہ ہونے لگتا ہے..... زویا بنت اکرام اتنی بہادر نہیں..... بالکل بھی نہیں.....

مجھے ہر تاریکی شام اور نیلے پھر کا دکھ یاد ہے..... کیسے کہہ دوں..... کیسے؟

”جاؤ حسن علی..... چار سال پہلے کی اذیت، کرب میں نے تمہیں معاف کیا.....“ چار سال پہلے..... مجھ سے بے انتہا نفرت کرنے والا، میری طرف جاتا ہر رستہ بدلنے والا، مجھے اب کہہ رہا ہے۔ ”زویا..... مجھے تم سے محبت ہو گئی ہے۔“

اور میں اس بات پر ہنستا چاہتی ہوں..... تہقیر لگانا چاہتی ہوں..... اور میں واقعی ہنس بھی رہی ہوں..... لیکن میں روتا بھی چاہتی ہوں..... پھوٹ، پھوٹ کر پتا ہے کیوں؟ کیونکہ میرا دل میرا نہیں رہا، میرا وجود اس سے خالی ہے۔

”زویا اکرام..... جس کے واپس پلٹنے کی اتنی دعائیں، مناجاتیں، آج جب وہ پلٹتا ہے تو چار سال پہلے کی اذیت کی کہانی کیوں؟“ سوالوں کا دربار میرے گرد لگ گیا ہے..... اور مجھے سوالوں سے خوف آتا ہے..... ایک بات تو میں اچھی طرح سمجھتی ہوں..... جانتی ہوں..... اگر میں نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر ایک بل بھی دیکھ لیا ناں تو پھل جاؤں گی..... اس کی مسکراہٹ تک جو مجھے پکھلا دیتی ہے.....

”زویا اگر ام..... مات کا ہر رستہ تک ہی آ رہا ہے.....“ میں نے جھکا سر اٹھایا رنگ محل کی سرخ اینٹوں والی دیواریں مجھ پر طرز یہ قہقہے لگاتی..... سارے راستے

بند..... ساری امیدیں فریب.....

اور ان سب سے بے نیاز وہ نیلے پہر کی محبت مسکرا رہی ہے..... بھید بھری مسکراہٹ.....

”love is a magic“

☆☆☆

وہ سڑک کے کنارے چلتا جا رہا ہے..... تارکول پر بکھرے زرد پتے ادھر ادھر اڑ رہے ہیں۔ دور سے..... بہت دور سے وہ بازگشت سنانی دیتی ہے، روتی ہوئی سی آواز.....

”حسن علی..... میری برداشت، میرے صبر کو مت آزماؤ، میں بڑی مشکل سے سنبھلی ہوں..... بہت وقت لگتا ہے..... بہت وقت لگا ہے یہ ہنسی کا نقاب اوڑھنے میں، اسے تو سلامت رہنے دو۔“ اس نے پتھر کو ٹھوکر لگائی تھی..... پتھر کی گہری کھائی میں جا گرا۔

”میں خوب صورت نہیں ہوں، ایک عام سی لڑکی ہوں ناں جس پر دوسری نظر ڈالنے کو بھی کسی کا دل نہیں چاہتا۔ میرے پاس اسٹینش، شکل کچھ بھی تو نہیں تو پھر.....

ہاں..... مجھے کیسے زویا اکرام سے محبت ہو گئی؟“ وہ ایک پتھر پر بیٹھ گیا، ہلکی ہوا سے اس کی پیشانی پر بکھرے بال اڑنے لگے۔

”میں ایک خود غرض انسان ہوں اور میں پوزیسیو بھی ہوں ہر حوالے سے، اپنی ذات کے حوالے سے.....

مجھے اور زویا اکرام نے سیدھا میرے دل پر ضرب لگائی تھی، کیسے اپنا دل اس کے حوالے کر دیتا، کیسے؟“ مگر اب لگتا ہے مرجاؤں گا، میں نہیں جانتا..... وہ عام سی ہے تو اب ”عام“ کیوں نہیں لگتی؟ اگر اس پر دوسری نظر ڈالنے کو بھی دل نہیں چاہتا تو پھر میرا دل کیوں اسے ”بار“

بار“ دیکھنے کو چاہتا ہے؟ میں، ”میں“ نہیں رہا..... زویا اکرام میں ”تم“ ہو گیا ہوں۔ ”وہ تڑپ، تڑپ کر روتا ہوا تھا، سر ادھر، ادھر فنی میں ہلاتا ہوا۔ ایک خوب صورت مرد، ایک عام سی لڑکی کے لیے۔

”میں نہیں رہ سکتا تمہارے بغیر زویا!“ جنگلی پھولوں کی مہک اڑ رہی تھی اور وہ نڈھال سا بیٹھا تھا، تھکا ہارا، مات کھایا ہوا۔ یکا یک وہ اٹھا اور واپس مڑا کچھ.....

بڑبڑاتے ہوئے۔

جو دھڑکا وہ دل تھا

”وہ چار سال پہلے کی وضاحت مانگنے کی تو سب کہہ دوں گا..... مجھے تم سے بھی نفرت ہو ہی نہیں سکی، چاہ کر بھی نہیں..... تم نے مجھے کہیں کا نہیں چھوڑا زویا.....“ وہ برسی بارش میں ٹھنڈی برقیلی رات کو رنگ محل میں قدم رکھتا ہے اور رنگ محل کی ست رنگی روشنیوں کا عکس اس پر پڑ رہا ہے۔

”وہ“ کتنی بیچ پر بیٹھی رو رہی ہے اس کا وجود بارش میں بھیگ رہا ہے مگر وہ بے نیاز بیٹھی ہے، سر گھٹنوں میں دیے وہ روتے ہوئے کچھ بڑبڑا رہی ہے، کچھ ایسا جو نیلی بارش میں دھبہ بکھیر رہا ہے۔ حسن علی خیال کا ہاتھ تھام کر وہ لفظ سستا ہے جو وہ کب سے روتے ہوئے بڑبڑا رہی ہے۔

”please come back Hasan Ali, I forgive you“ اور پھر رنگ محل محبت سے بھر گیا..... ہر ادا داری سے محبت جھانک رہی ہے۔

☆☆☆

”وہ مجھے اکتوبر کی روشن صبح کو ملا تھا جب ہم تینوں رنگ محل سے تھوڑے فاصلے پر بنے وانگ ٹریک پر واک کو نکلے تھے..... وانگ ٹریک پر ٹراؤز اور نی شرت میں ملیں بنے، بوڑھے سگی تھے..... فضا جو بچوں کی دیوانی دو گول منول بچوں کے گالوں پر چمکیاں کاٹ چکی تھی جس کا انہوں نے کافی برا مانا تھا اور منہ بسورتے ہوئے اپنے دادا، دادی کو شکایت لگا چکے تھے جن کے ساتھ وہ واک پر آئے تھے۔

”تمہیں کیا ضرورت ہے دوسروں کے بچوں کو چمکیاں کاٹنے کی۔“ اریبہ نے فضا کو چھڑکا۔

”میں تو بس پیار کر رہی تھی انہیں۔“ وہ جاگزر کے تسے ٹھیک کرنے لگی۔ لوگ آ جا رہے تھے۔

”اچھا..... یہ پیار تھا..... بچاروں کے گال لال ٹماڑ ہو گئے تھے.....“ اریبہ نے اسے یاد دلایا تھا جیسے زمانے بھر کے بے پروا فضا پر ذرا بھی اثر نہیں ہوا.....

”یار..... کیا کرتی تمہیں پوتا ہے کہ ایسے گول منول چہرے دیکھ کر مجھ سے نہیں رہا جاتا..... ہاتھوں میں کھلی سی ہو رہی ہے۔“

”کسی دن بے موت ماری جاؤ گی اسی وجہ سے۔“

”کیا پتا بوا جرم ہے؟“ پونی کستی ہوئی فضا نے آ نکھیں پھیلائی تھیں۔

ماہنامہ پاکیزہ

دسمبر 2017

ماہنامہ پاکیزہ

وہ کیا تھا۔ وہ متاثر ہوا تھا یا متاثر کن زبردستی چہرے پر

- دسمبر 2017ء

ماہنامہ پاکیزہ 131

تائزے لگی تھی۔

دسمبر 2017ء

ماہنامہ پاکیزہ 130

15

باقول میں  
زندگی رہنے کا موقع

کیا آپ کو اپنے گھر کی آمدنی میں اضافہ کرنے کی ضرورت ہے؟  
کیا آپ کو کسی کام میں تربیت اور روزگار میں معاونت کی ضرورت ہے؟

کھانا پکانے اور امور خانہ داری کا تربیتی کورس

اس کورس کے ذریعے آپ کھانا پکانے اور امور خانہ داری کی تربیت حاصل کر کے کمزور مہنگی کی بھرتی ہوئی صنعت میں ایک باعزت روزگار حاصل کر سکتی ہیں۔

تیار داری کا تربیتی کورس

بیف وی ٹی آئی آغاخان یونیورسٹی اور ہولی فمیلی ہسپتال کے تعاون سے پاکستان میں اپنی نوعیت کا پہلا پروگرام پیش کر رہا ہے جس کے ذریعے آپ کو بزرگوں اور معمر افراد کی تیار داری کی تربیت کے ساتھ ساتھ ملازمت کے مواقع فراہم کئے جاتے ہیں۔

ملازمت کا  
یقینی موقع

بیف وی ٹی آئی  
آغاخان یونیورسٹی،  
ہولی فمیلی ہسپتال  
اور معمر افراد کی  
تیار داری کے ساتھ  
ملازمت کے مواقع  
فراہم کئے جاتے ہیں۔

کسٹمر سروس اینڈ ریشیل سیزل کورس

اس کورس میں نہ صرف کسٹمر سروس اینڈ ریشیل سیزل کورس کی پیشہ ورانہ تربیت فراہم کی جاتی ہے بلکہ رہنمائی، فوڈ پیپرز، ریشیل آؤٹ لٹس، سوپر اسٹورز جیسے اداروں میں ملازمت کا موقع بھی فراہم کیا جاتا ہے۔

پروگرام کی سہولیات:

• مفت پک اینڈ ڈراپ • ملازمت کی فراہمی • بیف وی ٹی آئی کاسٹریٹیکٹ • ماہانہ وظیفہ • دوپہر کا کھانا

اگر آپ تندرست اور صحت مند ہیں اور داخلہ شرائط پر پورا اترتی ہیں تو داخلے کے لیے  
ہیرو تاج محل سے 9 بجے کے درمیان اس نمبر پر رابطہ کریں: 0300-2523129  
ای میل: info@taffoundation.org ویب سائٹ: www.taffoundation.org



(نوٹ: ادارہ جاسوسی ڈائجسٹ پبلی کیشنز کا اس اشتہار سے کوئی تعلق نہیں)

کا weather تھامری کا بہت انجوائے کیا۔ وہ ٹرپ کا احوال بتا رہا تھا۔ اور حسن علی، وہ سڑکیوں کی طرف بے خیالی میں دیکھ رہا تھا جہاں سے زویا کی بھی۔ ان بھیجی ہوئی آنسوؤں سے لہریز آنکھوں میں کچھ تھا۔ شکوہ، شکایت، دکھ یا پھر کچھ اور۔؟ اس نے سر جھٹک دیا تھا۔

”اوہ۔۔۔۔۔ میں بھی کیا سوچنے لگ گیا۔۔۔۔۔“  
دوسرے لمحے وہ، حماد اور فضا کی بحث میں الجھے نظر آئے تھے۔ اتنی بے معنی اور بے مقصدی گفتگو نے تانی کو سخت کبیدہ خاطر کیا تھا وہ اٹھ کھڑی ہوئی تھیں۔  
”آپ کہاں جا رہی ہیں؟“ حماد نے پوچھا۔  
”ارے۔۔۔۔۔ میرا تمہارے ہنگاموں سے دل گھبراتا ہے۔۔۔۔۔ سر درد کرنے لگ جاتا ہے۔“  
”دادی پولیٹیکل ایڈوز میں تو ہر کوئی دلچسپی رکھتا ہے۔“ حسن ہنسا تھا۔۔۔۔۔

”مگر ہر کوئی تم لوگوں جیسا کوئے کا دماغ نہیں رکھتا۔۔۔۔۔“ وہ بیزار سی بولی تھیں۔ میکوٹیک سے بھری گلاسوں کی ٹرے اٹھا کر اسی اندر داخل ہوئی تھی۔  
”ایک تو ہمارے گھر کے لوگوں کو شرات اور چرند، پرند پر بات کرنے کا بڑا شوق ہے۔۔۔۔۔ بھلا کوئی بتائے انہیں، دنیا جہاں میں اور موضوعات کا فقدان ہے کیا۔“  
”ڈونٹ وری ڈیئر۔۔۔۔۔ آج کا موضوع بڑا انٹرٹیننگ ہے۔“ فضا ہنسی تھی۔ رنگ محل کے دروازے پر ان کی شریار اور کھلندری ہنسی گونج رہی ہے۔  
کبوتر اڑان روک کر اس بے فکری ہنسی کی بازگشت سنتے ہیں اور رنگ محل کی اوپری منزل پر سڑکیوں پر بیٹھی اس اداس لڑکی کی کھانسنے والا کوئی نہیں۔۔۔۔۔ کتنا بڑا دکھ ہوتا ہے نا یہ دنیا کا کہ آپ کے پاس کہنے کو تو بہت کچھ ہو مگر آپ کو سننے والا کوئی نہ ہو۔ کوئی سامع نہیں۔ خود سے گفتگو تو اذیت ہی دیتی ہے۔“ زویا بنت اکرام کی اداسی میں شراکت کی استدعا ہے۔۔۔۔۔ کب ہا۔۔۔۔۔ کوئی سامع نہیں۔۔۔۔۔

☆☆☆  
”محبت گمانی پہر کا ایسا کلمہ ہے جو جس دل میں اترتا ہے اس کو سحر زدہ کر دیتا ہے۔۔۔۔۔ جہاں محبوب کی آنکھوں سے ہی جہاں کے فسانے مجسم دیکھے جاتے

سجائے تھا۔ میں بالکل بھی نہ سمجھ سکتی تھی۔  
”واؤ گریٹ۔۔۔۔۔ بہت کم دیکھنے کو ملتے ہیں آج کل بک ریڈر۔ تو آپ کس، کس کو پڑھتی ہیں؟“ تانی نے جیسے بد مزہ ہو کر قرعہ لگان اٹھا کر اس کے گرد بندھی ڈوری کو تختی سے لپیٹنا شروع کر دیا تھا جو قدرے ڈھیلی ہو چکی تھی۔۔۔۔۔ میں نے تیل کی بوتل کو دائیں ہاتھ میں منتقل کیا تھا۔  
”کیٹس، شیلے میکسم گورکی اور آج کی پائلو کو ہلو، قرۃ العین حیدر، ممتاز، مفتی وغیرہ۔۔۔۔۔“ میں اسے بتا ہی رہی تھی کہ دروازہ دھکیلتا ہوا وہ اندر داخل ہوا تھا۔  
حماد اسے آگے بڑھ کر ملا تھا۔ وہ جم سے لوٹا تھا شاید۔ اس نے آگے بڑھ کر ٹشو باکس سے ٹشو نکالا تھا۔۔۔۔۔  
”یار تمہاری کزن تو بہت ادبی اور منفرد مزاج کی ہیں۔۔۔۔۔“ میری طرف دیکھتے ہوئے حماد نے حسن کو کہا تھا۔  
”کون فضا۔۔۔۔۔؟“ وہ حیران ہوا تھا۔  
”ارے نہیں۔۔۔۔۔ یہ زویا۔۔۔۔۔“

حسن نے میری طرف عجیب سی نظروں سے دیکھا تھا۔ کیا تھا وہ۔۔۔۔۔ نفرت، تعارت یا کچھ اور۔۔۔۔۔؟  
”ہاں۔۔۔۔۔ ایسے لوگ سستے شوق ہی پال سکتے ہیں۔۔۔۔۔“ حماد جیسے شرمندہ ہوا تھا۔۔۔۔۔ میں جیسے زمین میں گڑ گئی تھی۔۔۔۔۔ ”ایسے لوگ سے کیا مراد تھی؟“ میری آنکھوں کے آگے جیسے دھند سی چھانے لگی۔ سارے منظر غائب۔ بس ایک کھارے پانی کی چادر۔۔۔۔۔ میں ٹپکیں جھپکتی سڑکیوں کی طرف بھاگی تھی۔ فضا سڑکیاں اتر رہی تھی۔۔۔۔۔ مجھے تیزی سے اوپر جاتا دیکھ کر ہلکی۔  
”کیا ہوا زویا۔۔۔۔۔؟“ مگر میں آنکھیں ہاتھ کی پشت سے گڑائی سڑکیاں چھ لگتی تھی۔  
”زویا۔۔۔۔۔ کو کیا ہوا دادی۔۔۔۔۔؟“ فضا الجھن بھرے تاثرات کے ساتھ تانی کی طرف آئی۔  
”ارے کچھ نہیں۔۔۔۔۔ تیل کی بوتل رکھنے گئی ہے۔“  
”میرا خیال ہے وہ رو رہی تھی۔“ وہ حماد کی طرف مڑتے ہوئے بڑبڑاتی تھی۔

”کیسے ہو حماد اور ٹرپ کیا رہا۔۔۔۔۔؟“ فضا مسکراتے ہوئے پوچھ رہی تھی۔ حماد اس کی طرف متوجہ ہوا تھا۔  
”فائن۔۔۔۔۔ ٹرپ تو بہت زبردست رہا۔۔۔۔۔ کمال

”پتا ہے تمہاری سب سے اچھی بات کون سی ہے؟“  
میں نے اسے مسکرا کر دیکھا۔ وہ زبردست انداز میں چونکا تھا۔

”کون سی بات؟“

”یہی کہ تم ہمیشہ پوزیٹو سوچتے ہو۔ کاش میں بھی ایسی ہوتی۔“

”ڈونٹ وری۔۔۔ تم بھی ہو جاؤ گی۔۔۔ اب وہ مکمل طور پر میری طرف متوجہ تھا۔

”مجھے تمہیں کچھ بتانا ہے زویا۔۔۔ میں کچھ شیئر کرنا چاہتا ہوں۔“

”ہاں، ہاں ضرور بتاؤ۔“ میں ہنسی تھی۔

”مجھے محبت ہو گئی ہے۔“ اس نے جھجک کر بتایا اور رک کر میرے تاثرات کو جانچتا چلا۔ میرے ہاتھ میں پکڑا ہوا دم چھوٹ کر نیچے گر پڑا۔ جیسے رنگ گل کی دھند گلابی ہو گئی تھی۔

”کس سے۔۔۔ کون ہے؟“ میں نے اشتیاق میں دوسوال اٹھنے پوچھ لیے تھے۔

اس کی آنکھوں میں جیسے تاروں کی کپکپاں اتر آئی تھی۔ جو جلتی بجتی رہے۔ سحر طاری کرنے والی۔۔۔ میں بھی۔۔۔ سحر زدہ سی بیٹھی تھی۔

”اور یہ محبتوں کا حق ہے کہ ان کے قصے سحر زدہ ہو کر بڑے احترام سے سنے جائیں۔“

”میں اسے دیکھتا ہوں تو پھر کسی اور چیز پر نظر نہیں پڑتی۔۔۔ اس کی آنکھوں میں مجھے دنیا چلتی پھرتی دکھائی دیتی ہے۔ کیا کبھی ایسا بھی ہوتا ہے زویا کہ کسی کی آنکھوں میں آپ سارے رنگ دیکھ لیں؟“ میرے

ساتھ بار بار ایسا ہو رہا ہے۔ میں نے کبھی نہیں سوچا کہ کسی وجود کی اپنی خوشبو بھی ہوا کرتی ہوگی۔ مگر ہوتی ہے۔ جہاں بھی وہ ہوتی ہے جیسے مجھے الہام ہونے لگتا ہے۔ محبت کہیں الہام کا دوسرا نام تو نہیں؟ پتا ہے

اس کی ہنسی کے آگے سارے ساز پھلے لگتے ہیں۔ اب کوئی اور ساز دل کو لگتا ہی نہیں۔ کیا اسے ہی محبت کہتے ہیں؟ مجھے تو پتا نہیں چلا۔ اب تو لگتا ہے کہ محبت۔۔۔

بے خبری کا دوسرا نام ہے۔۔۔ وہ ہنسا ہوتا رہا تھا۔ اور لگا کہ فلیٹ روڈ کے گلابی پہر میں وائلن بجتے لگا ہے۔

ناں۔۔۔ نگر رہا ہے۔ اس نے میرا ہاتھ تھام لیا ہے۔ اور میں بے خودی اسے سن رہی ہوں۔

”دسمبر 2017ء“

بیٹھ گئی تھی۔ کبھی، کبھی اپنے آپ سے دکھ سکھ بانٹنے کو دل چاہتا ہے ناں۔۔۔ میرا بھی دل چاہ رہا تھا۔۔۔ بھید بھری دھند نے چاروں اور سفید اندھیرا طاری کر دیا۔۔۔ ہاں اندھیرے سفید بھی ہوتے ہیں۔

”تم رو رہی ہو۔۔۔؟“ وہ پوچھ رہا تھا۔۔۔ جو کہتا تھا میرا بہترین دوست ہونے کا اعزاز اسے حاصل ہے۔

”ہاں۔۔۔ کس دل چاہ رہا تھا۔“ میں اس دھندلے میں جانے کیا ڈھونڈ رہی تھی۔ کیا کھوج رہی تھی۔

”تمہارا ہر وقت رونے کو دل کیوں چاہتا ہے؟“ یہ سوال نیا نہیں تھا۔ وہ اکثر اسے دُہراتا۔

”جن کا کوئی نہیں ہوتا۔۔۔ جو تنہا ہوتے ہیں۔۔۔ وہ ایسا ہی کرتے ہیں۔۔۔“ اس نے جینز اور ٹی شرٹ کے ساتھ بلیک اپر پہنا ہوا تھا۔ اب وہ اپری کی جیبوں سے

بادام اور پستوں کا پیکٹ نکال کر ہمارے درمیان چھوڑی گئی جگہ پر رکھ رہا تھا۔ یہ روز کا معمول تھا۔

”please don't do this“ اس کی ناک سرخ ہو رہی تھی۔

”کیا نہ کیا کروں؟“ میں نے جواب مانگا تھا۔

”یہی خود ترسی کی باتیں۔۔۔“

”یہ خود ترسی والی باتیں نہیں۔“ میں نے ہر لفظ پر زور دیا تھا۔ بادام منہ میں ڈالتا وہ بغور مجھے دیکھنے لگا۔

”تم کیوں یہ کر رہی ہو اور جانے کب سے کر رہی ہو۔۔۔ میں، مانی اور باقی سب تمہارے ساتھ نہیں ہیں کیا؟“

یہ سوال لا جواب کر دینے والا تھا۔ مگر میں نہیں ہوتی تھی۔۔۔ اور وہ بھی یہ اچھی طرح جانتا تھا کہ میں لا جواب نہیں ہوتی تھی۔

”پتا ہے زویا۔۔۔ بعض اوقات انسان خود کو بڑا ہی اکیلا اور تنہا سمجھ رہا ہوتا ہے مگر ایسا ہوتا نہیں۔۔۔ بات صرف اتنی ہوتی ہے کہ وہ اپنے ارد گرد کے لوگوں کی طرف دیکھتا ہی نہیں۔۔۔ محسوس ہی نہیں کرتا۔۔۔ تب غلطی اس کی اپنی ہوتی ہے۔۔۔ جی بریو یار۔۔۔ you are not alone

سرد دھند میں میرا بہترین دوست مجھے دلاسا دے رہا تھا۔ شاید میں واقعی ”تنہا“ نہیں تھی۔ میں نے اسے دیکھا جو رنگ گل کے احاطے میں لگے دھاتی فوارے کے اوپر چلتے گلوب کو دیکھ رہا تھا۔

”دسمبر 2017ء“

”دسمبر 2017ء“

”دسمبر 2017ء“

اٹھاتے ہیں اور مسکرا دیتے ہیں اور ان کی سرگوشی بڑی زور دار ہوتی ہے۔۔۔ کھٹ سے سماعتوں میں سفر کرتی ہے۔

”محبت کے گلابی پہر میں دو اشخاص کے لیے وائلن بج رہا ہے۔“ اور وہ وائلن ہر بار نہیں بجتا۔ ہر کسی کے لیے نہیں بجتا۔ مگر وہ ہمارے لیے ہر اس گلابی پہر بجایا جاتا ہے جب ہم فلیٹ روڈ پر قدم سے قدم ملا کر چلتے ہیں۔

جانے وہ وائلن کون بجاتا ہے۔۔۔ مجھے نہیں معلوم۔۔۔ شاید کسی کو بھی نہیں معلوم۔۔۔

”شاید وہ“ چھپا بیٹھا ہے۔ مگر کبھی، کبھی مجھے لگتا ہے وہ ”محبت کا فرشتہ“ ہوگا۔

ہمارے گھر ایک دوسرے کے قریب ہیں مگر پھر بھی ہم دونوں اپنے، اپنے گھروں کے ٹیرس پر بیٹھے ایک دوسرے کو ٹیکسٹ کر رہے ہوتے ہیں۔

”کہیں چلیں؟“

”کہاں۔۔۔؟“

”چاند کے پار۔۔۔“

”نہیں۔۔۔ چاند کو نہیں بلایتے ہیں۔“

”بلانے سے چاند آ جاتا ہے؟“

”ہاں۔۔۔ آ جاتا ہے۔“

”جھوٹے۔۔۔“

میں چپ کر موبائل آف کر دیتی ہوں۔۔۔ اور وہ وہیں سے ہاتھ ہلا کر مجھے متوجہ کرتا ہے۔

”سنواریہ۔۔۔ میرے ٹیرس پر چاند اترتا ہے۔“

اور میں دیکھتی ہوں۔۔۔ ساکت ہوتی ہوں۔۔۔ ”وہ“ مجھے نظر آتا ہے۔

”اور ہاں۔۔۔ ٹیرس پر چاند اترتا ہے۔“

رنگ گل کی کھڑکیوں کے پردوں کے پیچھے کی دیوار پر کہانی جنم لیتی ہے۔۔۔ اور قصہ گو ہوائیں کہانی کا پہلا باب یہاں سے شروع کرتی ہیں۔

”ار بی علی کے لیے حماد اصغر چاند ہی تو ہے۔“

☆☆☆

برفیلی شام میں یسرب پوسٹ کی روشنی دھند میں

دراڑیں ڈالنے کی کوششیں کرتی رہی مگر ناکام رہی۔۔۔

گارڈن میں، میں اکیلی بیٹھی تھی۔۔۔ جانے کیوں دل بھر

آ رہا تھا۔۔۔ باقی سارے اندر تھے اور میں باہر ہی آ کر

ہیں۔۔۔ اور ساعیں صرف محبوب کا ساز سنتی ہیں اور پھر سر دھکتی ہیں۔۔۔ اور سچ ہی تو ہے محبت گلابی پہر کا جادو ہے۔۔۔

میں کھڑکی میں کھڑی چاند کو دیکھ رہی ہوں جس کا ہر کوئی دیوانہ ہے۔۔۔ اس پر ہے۔۔۔ مگر آج اریہ علی کو چاند کی چاندنی دیوانہ نہیں کر رہی۔۔۔ اس پر نہیں بنارہی۔۔۔ پوچھو تو وجہ بہت آسان اور سادہ سی ہے۔

اریہ علی محبت کے گلابی پہر میں قدم رکھ چکی ہے۔۔۔

جانے کیوں مجھے ایسا لگتا ہے۔۔۔ ”اسے“ بھی مجھ سے محبت ہو گئی۔ مگر وہ انظہار سے کتراتا ہے۔۔۔

بوکھلاتا ہے۔۔۔ مگر کب تک نظر انداز کرے گا۔۔۔ میں ایک بات اچھی طرح جانتی ہوں کہ اس کے سارے

راستے میری طرف آتے ہیں جہاں بھی جائے گا میری طرف ہی پلٹے گا۔۔۔ میں یہ نہیں جانتی کہ مجھے اس سے

محبت ہونا کب شروع ہوئی۔۔۔ دیے کتنا دلچسپ سوال ہے ناں یہ۔۔۔

شاید محبتوں کے وقت نہیں ہوتے ان کے تو۔۔۔

”اسباب“ ہوتے ہوں گے۔۔۔ ہم نے کافی شاپس کے مدھم اور خوباناک ماحول میں گھٹنوں ادھر ادھر کی باتیں کی

ہیں۔۔۔ میں اس بات پر ہنسا چاہتی ہوں جو اس نے مجھ سے کی تھی۔

”سنواریہ علی۔۔۔ وقت ختم ہو جائے گا مگر ہماری باتیں کبھی ختم نہیں ہوں گی۔“

ہم دونوں نے اپنی بیسٹ چیزیں آسانی سے ایک دوسرے سے شیئر کیں۔۔۔ اور وہ فضا کہتی ہے۔ ”اریہ تمہیں کبھی شیئرنگ نہیں آئے گی۔“

مگر فضا نہیں جانتی ناں کہ سبوندوں میں ایک تو ایسا ہوتا ہے ناں جس کے لیے آپ وہ سب کچھ کرنے کو تیار ہو جاتے ہیں جو آپ نے کبھی نہیں کیا ہوتا۔۔۔ میرے

ساتھ تو کم از کم ایسا ہی ہوا ہے برقی بارشوں میں فلیٹ روڈ کی سڑکوں پر ہم نے اس اطمینان سے بڑھ کر بہت سکون کے ساتھ چلنے پھرنے کی ہے جو اکثر لوگ ہوا ر تارکول کی

سڑکوں پر کرتے ہیں۔۔۔ فرق اتنا ہے کہ ہم ایک دوسرے کو گرنے ہی نہیں دیتے۔۔۔

یہ جو محبت ہوتی ہے ناں۔۔۔ یہ آپ کو گرنے نہیں دیتی۔۔۔ کبھی نہیں۔۔۔ کسی بھی حال میں نہیں۔۔۔ فلیٹ روڈ کے کنارے لگے گلابی پھول ہلکی بارش کے پانی میں سر

”دسمبر 2017ء“

”دسمبر 2017ء“

”دسمبر 2017ء“

رنگ محل کا ہر فرد شدت غم سے نڈھال تھا۔ رنگ محل کا اہم ستون نہیں رہا تھا۔ آنکھیں خشک ہی نہیں ہو رہی تھیں۔۔۔۔۔ میں ٹھنڈے فرش پر بیٹھی دیوار سے ٹک لگائے روتی رہی۔۔۔۔۔ میرا دوا پنا میرے قدموں میں پڑا تھا، روتے ہوئے فضا نے دوپٹے کو میرے سر پر جمایا تھا۔۔۔۔۔ وہ دن رنگ محل پر بڑا بھاری تھا۔ بہت۔۔۔۔۔

☆☆☆

کرشل پیسز کی احتیاط سے ڈسٹنگ کرتی میں ٹھک مٹی تھی۔۔۔۔۔ بھاری پردوں کے پار سے اس کی آواز آرہی تھی۔ ”نہیں دادی۔۔۔۔۔ آپ نے یہ کیسے سوچ لیا۔؟“ اس کے سوال میں حیرت تھی مجھے تھا۔

”کیا کیا ہے زویا میں۔؟“ نانی میرا نام لے رہی تھیں۔۔۔۔۔ میں چونک گئی تھی اور ڈسٹر سائڈ ٹیبل پر رکھ دیا۔ ”کیا خوبی ہے اس میں۔؟“ وہ میری آنکھیں مل نہیں ہے کسی بھی لحاظ سے۔۔۔۔۔ شکل صورت، انٹینس کچھ بھی تو اس کے پاس نہیں ہے۔۔۔۔۔ اتنی عام سی لڑکی کے ساتھ لائف گزرتا۔۔۔۔۔ نامکمل ہے میرے لیے۔۔۔۔۔ ”وہ قطعیت سے گویا ہوا تھا۔۔۔۔۔ میں نے ٹیبل کا کونا پکڑا تھا۔۔۔۔۔ ہاں میں ”عام“ سی تو تھی۔

اور وہ خوب صورت کشادہ پیشانی گھنے بال، روشن آنکھیں، ایک نظر ڈالو تو دوسری نظر ڈالنے کی تمنا۔۔۔۔۔ بے اختیار دل میں جاگتی تھی۔۔۔۔۔ اور دوسری طرف ”میں“ تھی۔۔۔۔۔ اتنی عام کہ دوسری نظری نہ ڈالی جائے۔

”وہ میری امی کی کشتی ہے سن۔“  
”تو کیا ہوا، ابو اور چچا کا سوشل سرکل بہت وسیع ہے۔۔۔۔۔ ایلیز زویا کے لیے رشتہ بن جائے گا۔“  
”میں اپنی امی کی کشتی، یتیم نواسی کو غیروں کے حوالے کر دوں۔۔۔۔۔ کیلئے برا تھا سزا پاتا ہے۔“

”مگر میں آپ کو بتا رہا ہوں دادی۔۔۔۔۔ میں زویا کو کسی بھی صورت اپنی زندگی میں جگہ نہیں دے سکتا۔“ اس کے لیے جیسے میں جھوٹ تھی۔۔۔۔۔ تب وہ اتنا میرے خلاف تھا شاید مجھے ایک نظر بھی گوارا نہ کرنے والا آج کیسے مان گیا تھا۔ حیرت صد حیرت۔۔۔۔۔ یقیناً کسی دباؤ کے تحت ہی اس نے ہائی بھری تھی ورنہ وہ کون سا مجھے پسند کرتا تھا جو باقی بھرتا۔ ”ہاں تو زویا اکرام تم بے وقعت ہو تمہاری کوئی وقعت ہی نہیں۔“

اور اسٹڈی ٹیبل پر دھری کتابوں کو ترتیب دیتی نانی کے پاس بیٹھ کر چلی آئی تھی۔

”پلیز نانی۔۔۔۔۔ ایسی باتیں مت کریں۔“  
”ڈر رہی ہو؟“ وہ ہنس کر پوچھ رہی تھیں ساتھ ساتھ ان کی انگلیاں میرے بالوں میں چل رہی تھیں۔  
”ہاں۔۔۔۔۔ نانی بہت ڈر گلتا ہے امی کے بعد آپ کو کھونے کا حوصلہ نہیں ہے مجھ میں۔“ میں ان سے لپٹ گئی تھی۔ کمرے میں لگایا سا اندھیرا تھا۔ جس میں زیر و پاور کے ننھے بلب کی روشنی ڈاڑھیں ڈال رہی ہے۔۔۔۔۔ اور کمرے کی بند کھڑکیاں کھول کر دیکھو تو باہر رات ہے۔۔۔۔۔

بھید بھری۔۔۔۔۔ اور۔۔۔۔۔ اور ساحر۔۔۔۔۔  
”نہیں زویا۔۔۔۔۔ یہاں سب تمہارے اپنے ہیں۔۔۔۔۔ ہر کوئی تم سے پیار کرتا ہے۔“  
”جی۔۔۔۔۔ مگر ہر کسی کی اپنی جگہ ہوتی ہے ناں۔۔۔۔۔ آپ کی چھوڑی گئی جگہ کو کون بھرے گا۔؟“ سوال کیا۔  
”کوئی جگہ خالی نہیں رہتی بھی نہ بھی بھر رہی جانی ہے اور یہ جو وقت ہوتا ہے ناں یہ سارے دکھ درد کی دوا بن جاتا ہے۔ مرہم ہو جاتا ہے۔“ نانی نے کہا تھا میں چپ بیٹھی رہی، ان کی انگلیاں اب بھی میرے بالوں میں سرسرا رہی تھیں۔

”میں نہیں اکیلا نہیں چھوڑوں گی۔ حتیٰ فیصلہ کر کے ہی رہوں گی۔ سانسوں کا کیا بھروسا آج ہوں کل نہ ہوں۔“ میں نے خوف سے سر اٹھایا تھا۔

اور وہ فیصلہ کر کے گئی تھیں۔۔۔۔۔ ان کی آخری خواہش ہی ان کا آخری فیصلہ تھا۔۔۔۔۔ اور ان کے فیصلے کا احترام کیا گیا تھا۔۔۔۔۔ زویا بنت اکرام کا حسن علی سے نکاح کا فیصلہ۔۔۔۔۔

وہ ٹھنڈی ٹھار صبح مجھے ٹھنڈا کر گئی۔۔۔۔۔ ایسا جود کہ جو لوٹ ہی نہ سکے۔ نکاح تارے پر سائن کرتے ہوئے میرے ہاتھ کتنی بار کانپتے تھے۔ مجھے ٹھک سے یاد نہیں۔۔۔۔۔ اور نانی اچانک زندگی سے منہ موڑ گئی تھیں۔

ہسپتال کے اس ٹھنڈے کمرے کی دیواروں پر مگی سینروں پر روتے ہوئے میری نظر پڑی تھی۔۔۔۔۔ آنسوؤں کی دھند کے پار الفاظ بھی گم ہونے لگے تھے۔  
”موت برحق ہے۔“  
”ہر نفس نے موت کا ذائقہ چکھنا ہے۔“

مابنامہ پاکیزہ

یہ جو ”انا“ نامی عمارت ہوتی ہے ناں۔۔۔۔۔ اسے ڈھانے کے لیے بڑے حوصلے کی ضرورت ہوتی ہے جو مجھ میں ہے ہی نہیں۔۔۔۔۔

گزرے برسوں میں ہم نے ایک دوسرے کو بہت نظر انداز کیا مگر ہوا کیا۔۔۔۔۔؟ اب تو یوں لگتا ہے کہ نظر انداز ہی تو نہیں کر سکے۔

اور مقناطیس کے ایک جیسے پول تو ایک دوسرے کو repel کرتے ہیں اور ہم دونوں تو مخالف تھے attract ہونا ضروری ہے۔۔۔۔۔ اور یہ ہو گیا۔۔۔۔۔ کب، کیسے؟ محبتوں میں شاید ”کب“ اور ”کیسے“ جیسے سوال اٹھانے والے بے وقوف ہی تو ہوتے ہیں۔۔۔۔۔ اور جس روز ہم ایک دوسرے سے شدید نفرت کا دعویٰ کر رہے ہوتے ہیں اسی وقت ہم پر محبت وارد ہو جاتی ہے۔

”نفرتوں، عداوتوں کے کھیت میں جب محبت کی بارش برتی ہے تو ٹپکنے والی فصل نفرت یا عداوت کی نہیں ہوتی۔ وہ تو محبت کی اٹھان لے کر بڑی ہوتی ہے۔“

☆☆☆

”قبول ہے۔“ اس سرد برقی صبح ہسپتال کے ٹھنڈے کمرے میں میرا لہجہ بھی غنڈا تھا۔ بہت سرد۔۔۔۔۔ جیسے میں کلید شری نیکی تھی۔۔۔۔۔ اور نانی کی آخری خواہش پوری ہوئی اور ادھر ان کی سانسوں کے تار بکھرے اور گردن ایک طرف ڈھلک گئی۔ ڈاکٹر رحمان نے سانس کی رفتار چیک کی اور آنکھوں کی پٹیوں کا جائزہ لیتے ہوئے اپنا فیصلہ سنا دیا تھا۔

”sorry...she is no more“ میری کھٹی، کھٹی سی چیخ نکل گئی تھی۔ پیاری سے پہلے کی وہ شام مجھے آج تک نہیں بھولی۔

”پتا ہے زویا۔۔۔۔۔ اسارا کی گھر چھوڑتے وقت کی وہ آخری نظر مجھے نہیں بھولتی۔۔۔۔۔ وہ اس گھر سے کچھ بھی نہیں لے کر گئی تھی۔ بس اس کے تن پر پہنے پڑے اس گھر کے تھے۔ مجھے آج بڑی یاد آرہی ہے امی۔۔۔۔۔ اور مجھے یوں لگتا ہے اب میرا بھی وقت قریب آن پہنچا ہے۔۔۔۔۔“ وہ اداس تھیں، میں جانتی تھی مگر وہ اس حد تک اداس ہوں گی کہ یہ میں قطعاً نہیں جانتی تھی۔۔۔۔۔ رنگ محل کے باہر پھیلی رات سے کہیں زیادہ نانی کی باتوں میں رات سا اندھیرا پن جھلکتا تھا۔۔۔۔۔ میں نے لیپ کا سوچ آف کیا

”زویا۔۔۔۔۔ کیا واقعی یہ محبت انسان کو اتنا خوشگوار بنا دیتی ہے کہ وہ ہر پل ہنسنا، مسکراتا، قہقہے لگانا چاہتا ہے۔۔۔۔۔؟“ وہ پوچھ رہا تھا رنگ محل میں یہ سوال گونج رہا ہے۔ اب روشنیوں سے گندھی دھند رنگ محل پر اترتی ہوئی ہے۔ وہ میرا ہاتھ چھوڑ کر اب قہقہہ لگا رہا تھا۔

بلکہ ہم دونوں ہنستے رہے۔۔۔۔۔ اور اس بات سے ہم بالکل بے خبر تھے کہ کوئی تھا جو ہمیں دیکھ کر سگ رہا تھا۔۔۔۔۔ اور لگائی دھند واقف تھی کہ وہ ہستی کس کی تھی۔ رنگ محل پر دھند بھری رات اتر آئی۔۔۔۔۔ سفید، ہاں، راتیں سفید بھی ہوتی ہیں۔

☆☆☆

”نفرتوں کے سائے میں کہیں نہ کہیں ایک چھوٹا سا محبت کا پودا بھی پرورش پارہا ہوتا ہے۔۔۔۔۔ اور وقت آنے پر وہ تناور درخت بن کر ہمارے سامنے آتا ہے۔“

میں نے خود کو بڑی اچھی طرح سمجھایا۔۔۔۔۔ دلیلیں، واسطے، منتیں سب کچھ مگر یہ دل جھٹکتا ہی نہیں۔۔۔۔۔ میں حیرت کے اول درجے پر ہوں۔۔۔۔۔ مجھے اور محبت۔۔۔۔۔؟ نہیں، نہیں مگر یہ ایسا سفید سج ہے جس پر بے یقینی کا ذرا برابر بھی چھینٹنا نہیں ہے۔ کاش یہ میرا دم ہوتا۔۔۔۔۔ مگر محبت وہی تو نہیں ہوتی۔۔۔۔۔ افسوس صد افسوس کہ یہ ہوتی۔۔۔۔۔ محبت ہوتی بھی تو کس سے بک۔۔۔۔۔ دل کو ڈپٹ کر چپ بھی تو نہیں کر سکتی۔۔۔۔۔

محبت نے اتنی چوری اور چپکے سے گھات لگائی تھی کہ سنبھل ہی نہیں سکی۔۔۔۔۔ بس محبت ہو گئی اور احساسات کے ہاتھوں منادی کر اودی گئی۔ ”زویا بنت اکرام تمہیں محبت ہو گئی ہے۔“

اور اس کے جانے کے بعد میں رنگ محل کے درود یوار میں اسے کھوجتی ہوں۔۔۔۔۔ ڈھونڈتی ہوں۔۔۔۔۔ مگر وہ نہیں نظر آتا۔۔۔۔۔ ساری کھوج کا رات جاتی ہے۔  
رنگ محل کی اوپری منزل پر میں کمرے میں اکیلی بیٹھی گیٹ کی طرف دیکھتی رہتی ہوں۔۔۔۔۔ بغیر پلکیں جھپکائے۔۔۔۔۔ یہاں تک کہ آنکھوں میں پانی اتر آتا ہے۔۔۔۔۔ میں گھار پانی بننے دیتی ہوں اور وہ پانی اس صاف شفاف کاغذ پر گرتا ہے جس پر ادھ کھلا چین پڑا ہے۔  
بڑا دل چاہتا ہے کہ اسے خط لکھوں۔۔۔۔۔ مگر رک جاتی ہوں۔

ہو..... وہ مجھے کسی ٹوٹی ہوئی عمارت کے مانند لگی تھی.....  
جو ٹکڑے ٹکڑے ہوئے۔

”وہ کسی اور سے محبت کرتا ہے.....“ وہ جیسے بے  
بیزاری تھی۔

پھر وہ آہستہ قدموں سے چلتی میری طرف آئی  
تھی..... اس کا دو ہٹا کر گیا تھا۔

”زویا..... بتاؤ مجھے..... وہ کس سے محبت کرتا  
ہے؟“ اس نے میرے کاندھوں پر ہاتھ رکھا تھا۔ اس

سوال میں امید، آس، تڑپ اور بہت کچھ تھا..... اور کہیں  
مر جانے کے جیسی کیفیت بھی تھی کی وہ مجھے اس پل بڑی ہاری

ہوئی..... مات کھائی ہوئی سی لگی تھی۔

”وہ کس سے محبت کرتا ہے؟“ وہ دوبارہ پوچھ رہی  
تھی..... آنکھوں سے چمکدار مونی سے آنسو ٹوٹ، ٹوٹ

کر کارپٹ میں جذب ہونے لگے ہیں۔

میں نے ایک نظر اس کو دیکھا اور پھر کہہ دیا تھا۔ ”وہ  
تم سے محبت کرتا ہے۔“ وہ بے یقین نظروں سے مجھے

دیکھتی رہی..... دیکھتی رہی..... میں کھڑکی کی طرف بیٹھی  
ابو کھڑکی کو کھول دیا تھا..... ہلکی چٹکی دھوپ اسٹڈی روم

میں چلی آئی۔

”حماد امترم سے محبت کرتا ہے ارپیہ.....“ میں نے  
دوبارہ دہرایا تھا..... اور محبت کی خوشبو رنگ محل کے گرد

ہجوم ڈالنے لگی..... اور وہ کہیں..... ساز محبت بن رہا  
ہے..... عمر خیال کی زبانی جیسا..... مقدس.....

☆☆☆

وہ اعلیٰ تعلیم کے لیے بیرون ملک جا رہا تھا..... نانی  
کو گزرے ہوئے چار ماہ ہو چکے تھے..... اور وہ شاید اب

یاد بن چکی تھیں..... ایک بھولی بھری یاد جو کبھی..... کبھی ہی یاد  
آتی ہے..... شاید یہی زندگی کا چلن ہے..... وہ ایک دھند

میں لپکتی تھی جو رنگ محل کے وجود کو اپنی دھند میں کسی حد  
تک غائب کر چکی تھی..... میں الماری کی شینگ کر رہی تھی

جبھی وہ کمرے میں داخل ہوا تھا..... ڈریس پینٹ  
میں لباس جیسے نفوش..... صاف پتا لگتا کہ وہ اس وقت

غصے کی حالت میں ہے..... وہ رائٹنگ ٹیبل کے ساتھ  
پڑی کرسی پر بیٹھ گیا تھا..... گول واٹر کی سرسبز گلی کرتی خوشبو

پورے کمرے میں بکھری تھی۔

”مجھے تم سے کچھ بات کرنی ہے۔“ وہ مجھ سے

دیکھ رہی تھی۔

☆☆☆

”میں جانتی ہوں کہ تم اس رشتے سے خوش نہیں ہو  
بلکہ میں یہ بھی جانتی ہوں کہ زویا تم کسی اور کو پسند کرتی

ہو۔“ میرے ہاتھ سے پن چھوٹ کر کارپٹ پر جا گرا  
تھا۔ ارپیہ مجھ پر سات آسمان تو ذکر کھڑکی کے پاس کھڑی

باہر کچھ دیکھ رہی تھی۔ اسے کوئی غلط فہمی ہوئی تھی اور بہت  
بڑی ہوئی تھی۔

”تم کسی غلط فہمی کا شکار ہو ارپیہ.....“ اسٹڈی روم  
میں موت کا سناٹا چھا گیا تھا۔

”نہیں زویا..... آنکھوں دیکھا جھوٹ نہیں  
ہوتا۔“ جانے کیوں مجھے اس کی آواز نیکی ہوئی سی لگی تھی۔

میں اس کے قریب جا کر کھڑی ہوئی تھی۔

”ہر بار آنکھوں دیکھا سچ بھی نہیں ہوتا۔“ وہ مزہ  
اور میری نظر اس کی آنکھوں پر پڑی..... آنکھیں بھیگ

رہی تھیں۔

”میں جانتی ہوں زویا کہ تمہارے دل میں حسن  
بھائی نہیں بلکہ حماد امترم ہے۔“ اور وہ یہ کہتے ہوئے کانپ

رہی تھی..... مجھے غصہ آیا تھا۔

”how can you say  
that...? you are absolutely

wrong“ میں نے زبردست انداز میں اس کی بات کی  
تردید کی تھی..... وہ حیرت سے سوالیہ نظروں سے مجھے دیکھ

رہی تھی۔

”حماد امترم صرف اور صرف میرا دوست ہے  
ارپیہ..... اس نے مجھے اس وقت سپورٹ کیا جب میں خود

کو بہت تنہا اور اکیلا سمجھ رہی تھی..... میرے لیے ماضی  
بھلانا آسان نہیں تھا مگر حماد نے یہ ممکن کیا..... میں نے

اپنا ہر پر اہم اس سے شیئر کیا ہے اور اس نے اس پر مجھے  
مشورے دینے کے بجائے پر اہم کا حل میرے سامنے رکھا

ہے۔ اس نے میرے دل میں جگہ بنائی ہے، میں نے وہ  
سب اس سے شیئر کیا جو میں کسی رنگ محل کے کسی فرد سے

نہیں کر سکتی تھی۔ ہم دونوں میں انڈرا سٹینڈنگ ہے..... تم  
ہماری دوستی کو محبت کا نام نہ دو..... اور یہی بات محبت کی تو

حماد امترم کی اور سے محبت کرتا ہے۔“ یہ کہہ کر میں نے  
ارپیہ کو دیکھا اور مجھے اس کا سارا خون چڑھ کر رہ گیا

گلابی پن دیکر رہا تھا۔

”ہیلو دوست..... کسی ہو.....؟“ تبھی وہ جانے  
کہاں سے نمودار ہوا تھا۔

”اچھی ہوں۔“ ٹینس شوز اور آنکھوں پر کاغذ  
چڑھائے وہ میرے سامنے موجود تھا۔

”وہ تو مجھے جانتا ہے.....“ وہ ہنسا تھا..... اور بیچ پر  
پڑی پانی کی بوتل اٹھائی تھی۔

”یہ تم اپنا پانی کیوں نہیں لاتے..... ہر روز ہمارا ختم  
کر جاتے ہو.....“ میں نے جھلا کر کہا تھا۔

”لڑکی..... پانی پلانے سے ٹوٹا ہوتا ہے۔“  
”یہ ٹوٹا کبھی تم بھی کھالیا کرو۔“

”تو پھر کھوٹو کھوٹو پر جو دکھان ہے ہالہ سے جس نے  
آؤں.....؟“ وہ پوچھ رہا تھا۔

”نہیں..... یہ تو محبت مت کرو.....“ وہ ریلیکس ہو  
کر بیچ کے دوسرے سرے پر بیٹھ گیا تھا۔ ہلکی ہوا سے

چنبیلی کی دھیمی، دھیمی خوشبو پھیلنے لگی تھی..... لائبریا کے  
پھولوں پر پھونزون کی بہتا تھا۔

”زویا..... تم نے اس سے بات کی تھی.....؟“ وہ  
اصل مدھے کی طرف آیا تھا۔

”تم خود کیوں نہیں کہہ دیتے اس سے؟“ میں نے  
جوابی سوال کر دیا تھا۔

”جانے کیوں میری ہمت ہی نہیں پڑتی..... ڈر سا  
لگتا ہے کہ کہیں اس نے میرا پوزل رینجنگ کر دیا تو کیا

ہو گا زویا.....“ وہ اس پل مجھے کافی بے بس سا لگا تھا۔

”میں اس سے جلد ہی بات کروں گی..... تم فکر  
مت کرو.....“ میں نے اسے تسلی دی تھی۔

”ٹھیک یو یار..... میں تمہارا یہ احسان کبھی نہیں چکا  
پاؤں گا.....“ وہ میرا منون نظر آتا تھا۔

”اُس اوکے..... تم نے بھی میری اتنی ہیلپ کی  
ہے۔“ میں قریب آئی ارپیہ اور فضا کو دیکھ رہی تھی۔

”میرا فرض تھا، سمجھیں؟“ وہ دھوکے جمانے لگا تو  
میں مسکرا دی تھی۔

”کن فرائض کی بات ہو رہی ہے؟“ فضا نے اس  
کی بات سن لی تھی اور منس کر بولی تھی۔ وہ بھی ہنس دیا تھا۔

”یہ تو میرا اور زویا کا secret ہے۔“ میں نے  
ارپیہ کی طرف دیکھا تھا وہ لائق نظر آتی تھی اور دور نہیں

نانی چلی گئیں تو جیسے رنگ محل سناٹوں کی زد میں  
آ گیا تھا..... زندگی پھر معمول پر آ گئی تھی۔

اور اب مجھے سمجھ آتا تھا کہ نانی واقعی سچ کہتی تھیں وقت  
سے بڑھ کر کوئی مرہم نہیں ہوتا..... ہر دکھ، درد اتنی آسانی

سے بھلا دیتا ہے کہ خبر بھی نہیں ہوتی اور پتا بھی نہیں چلتا۔

نانی کے وجود سے خالی پڑے تخت پر نظر پڑتی تو  
ایک بہت بڑی کمی کا احساس ہوتا تھا۔ وہ کسی جو بھی بھرتی

ہی نہیں ہمارے ساتھ، ساتھ رہتی ہے..... بس اس کی  
شدت کو یادیں کسی حد تک کم کر دیتی ہیں..... تب تھوڑا

ہنس لیا جاتا ہے اور تھوڑا رو لیا جاتا ہے۔ اب بھی  
معمولات وہی تھے..... وہی شام کو لان میں چائے کا

منظر، صبح ناشتے کی پکار.....

وہ ایک سرد شام کا منظر تھا..... وہ شام دھند سے  
خالی تھی..... رنگ محل کی روشنائی جل اٹھی تھیں۔ ہم تینوں

ٹیرس پر بیٹھے تھے..... سامنے رکھی ٹیبل پر کافی کے تین تک  
رکھے تھے۔

”دادی کے جانے کے بعد لگتا ہے رنگ محل کی  
روفتوں ہی ختم ہو گئی ہوں۔“ فضا نے جیسے سناٹے کو ٹوٹا تھا۔

”سچ کہتی ہو..... اب لگتا ہے ہر طرف خالی پن  
ہو.....“ میں نے ٹھنڈی سانس لی تھی۔

ارپیہ غائب دیاغی کی کیفیت میں لگ رہی تھی جیسے  
وہ ہم میں بیٹھی ہی نہیں تھی۔

”آریو اوکے.....؟“ فضا نے اس کے کاندھے پر  
رکھا تھا۔ وہ جیسے چوکی تھی۔

”ہاں..... میں ٹھیک ہوں..... تم دونوں کیا کہہ  
رہی تھیں؟“ وہ ہم سے پوچھ رہی تھی۔

فضا نے مجھے دیکھا تھا اور ہم دونوں مسکرا دیے۔

”ہم دونوں دادی کو یاد کر رہے تھے۔“

”ہاں فضا کتنا بڑا نقصان ہو گیا ناں..... ہر بات  
میں مشورہ دیتی تھیں..... ہر مسئلے کا حل ان کے پاس ہوتا

تھا..... اب تو مانو ہمارا صبح ہی گزر گیا۔“

جیسے ہر طرف اداسی پھیل گئی ہو.....

☆☆☆

میں اکیلی سنگی بیچ پر بیٹھی تھی وہ دونوں اپنا آخری  
چکر مکمل کرنے لگی ہوئی تھیں..... نیم کے درختوں کے زرد

پتوں کی ٹھکی باس پھیلی ہوئی تھی..... نیولپ کے پھولوں کا

بہترین تحریریں، لاجواب رد و ادا اور  
اعلیٰ داستانیں پڑھنے والوں کے لیے  
سرگزشت کا مطالعہ ضروری ہے

سرگزشت  
مہنامہ

شمارہ دسمبر 2017ء  
مسلکیاں

عمر خیام

مہم ہمدردی کے قلم سے اس شخصیت کا  
احوال جسے سائنسی علوم پر درس تھا لیکن  
دنیا والے اسے شاعر سمجھتے رہے

برائی ساس

مفت زہیر کے قلم سے ایک اچھوتا موضوع

کلاچی سے کراچی

محمد اقبال مانڈویا کے جادو اثر  
قلم سے تاریخ کراچی

اسم سال نو

وسیم بن اشرف کی دلچسپ تحریر، دنیا بھر  
میں سال نو کا استقبال کیسے کیا جاتا ہے

عشق گزیدہ

زویا اعجاز کی ایک دلچسپ مگر انوکھی سچ بیانی  
جس میں انتہائی انوکھی سزا تجویز ہوئی تھی

دلچسپ

بہت سی سچ بیانیاں دلچسپ  
سچے قصے اور تاریخی واقعات

اندرم..... بڑا کھن لہو تھا..... اور میں نے اپنے چہرے  
پر کھلکی ہنسی سجانے کی کوشش کی..... ایک، دو، تین اور  
چوٹی کوشش میں، میں کامیاب ہو گئی تھی۔

”ٹھیک ہے حسن علی.....“ میں نے ہای بھری تھی  
اور کس دل سے بھری تھی صرف مجھے پتا تھا..... مجھے خبر تھی  
اور شاید رنگ محل پر اتری دھند کو پتا تھا۔

اور اس شام جب وہ چلا گیا تو میں سیزمیںوں پر بیٹھی  
رو رہی تھی..... اکیلی..... اور روتے ہوئے اختیار کے  
دائرے سے باہر کی باتیں کی جاتی ہیں ناں..... اور میں  
بے اختیار اسے بدعا دے بیٹھی تھی۔

”اللہ کرے..... حسن علی کو مجھ سے محبت ہو  
جائے۔“ اور وقت کے مجید بھرے لمحوں نے یہ سرکشی  
پھیلادی..... دور تک..... بہت دور تک..... اور آج

جب زویا اکرام اس بدعا کو مکمل طور پر بھول چکی ہے تو  
میں کبھی اسے سامنے آن کھڑی ہوئی ہے..... مجھے  
ہوئی..... قبولیت کے درجے طے کرتی ہوئی.....

”بھئی، بھئی کچھ بد دعاؤں میں ڈھکیاں مارتے  
رنگ ہوتے ہیں جواستے یکے ہوتے ہیں کہ کسی کے نہیں  
ہتے..... بانی رہتے ہیں۔“

☆☆☆

فلٹ روڈ کی اونچی نیچی سڑک پر وہ بہت اطمینان اورو  
سکون کے ساتھ چہل قدمی کرتے ہیں۔ سہ پہر کا گھائی پہر  
ہر طرف چھا چکا ہے..... ہوا میں خشکی سی ہے..... وہ دونوں

ساتھ، ساتھ چل رہے تھے..... اریبہ کے ہاتھ میں چھین کا  
پکٹ تھا..... جو وہ اور حماد شیئر کر رہے تھے..... سڑک کے  
کنارے لگے درختوں کے فزاس رسیدہ زرد پتے ہلکی ہوا

کے جھونکے سے ٹوٹ کر سڑک پر گر رہے..... سڑک پر ان  
اردوچوں کی ہلکی سی جادربن چکی تھی۔  
”تم مجھ سے کتنی محبت کرتے ہو؟“ یہ اریبہ کا سوال

تھا..... وہ سوچ میں پڑ گیا۔  
”آسمان پر تاروں کے جتنی۔“  
”جی.....؟“ حیرت.....  
”جی.....“ تعجب.....

”پتا ہے میں کبھی، کبھی بہت شرمندہ ہو جاتی ہوں  
کہ میں نے کتنا غلط سوچا تم اور زویا.....“ زرد پتے ان  
کے پیروں تلے آ کر گرجے مر رہے ہیں..... لیے ہوا کے

آنسو میری پلکوں کا گھیرا توڑ کر میرے ہاتھوں پر گرا  
تھا..... ٹھنڈی صبح کے مانند ٹھنڈا آنسو۔

”میرا آئیڈیل تم جیسی شائی اور دیوتم کی لڑکیاں  
نہیں ہیں..... اور سوری اگر تمہیں برا لگا ہو یہ سب کچھ مگر  
مجھے افسوس کے ساتھ کہنا پڑ رہا ہے۔“

میں نے ہلکی ہلکی اٹھا کر حسن علی کے چہرے کی  
طرف دیکھا تھا..... وہاں ”سب“ کچھ تو تھا مگر ایک  
”افسوس“ ہی تو نہیں تھا..... کاش یہ ہوتا..... کمرے کی کھن

بڑھ گئی ہے..... کھڑکیاں بند ہیں.....  
”میرے آئیڈیل جیسی کوئی دو خصوصیات بھی تم  
میں ہوتیں تو میں سوچ سکتا تھا..... مگر زویا سوری ٹو سے تم

میرے معیار پر پورا نہیں اترتی ہو۔“  
مجھے اس لفظ ”معیار“ سے خوف آیا تھا..... ہر کسی  
کو آتا ہے۔

”اور میں یہی بتانے کے لیے تمہارے پاس آیا  
ہوں..... تم سمجھ گئی ہونا؟“ وہ غور سے مجھے دیکھ رہا تھا۔  
میں نے ہاتھوں کی پشت سے آنکھیں صاف کی

تھیں۔ تہ کر کے رکھا ہوا پکڑوں کا ڈھیر بکھریا تھا۔  
”تم روبروی ہو.....؟“ وہ منتظر سا پوچھنے لگا۔  
میں ہنسی تھی..... اور کس دل سے ہنسی تھی مجھے پتا تھا۔

”نہیں شاید آکھ میں کچھ چلا گیا تھا۔“ میں نے وہ  
بہانا بنایا جو اکثر ہمارے ہوئے، مات کھائے لوگ بناتے  
ہیں..... وہ ٹشو باکس سے ٹشو نکالتا میرے قریب آیا۔

”take it“ میں نے اس کے ہاتھ سے ٹشو  
لے لیا تھا۔

”زویا..... مجھے تم سے ایک فیور چاہیے.....“  
میں نے سر اٹھا کر اسے دیکھا..... وہ مسکراتا ہوا اور قریب ہوا  
تھا..... ”میں چاہتا ہوں کہ جب چار سال بعد میں واپس

لوٹوں تو تم اس سے پہلے ہی اس رشتے سے انکار  
کر دینا..... ابو اور چچا تک اپنا انکار پہنچا دینا..... میں نہیں  
چاہتا واپس پر مجھے کسی پریشانی کا سامنا کرنا پڑے..... تم

ایسا کرو گی ناں زویا.....؟“ وہ سوال تھا اگر تو جان لیوا تھا  
مگر میں اس کو سہہ گئی..... کبھی کبھی سوال بل صراط ہو جاتے  
ہیں یا کرنا مشکل اور نا ممکن ہوتا ہے..... کھڑکیوں کے شیشوں

سے کچھ نظر نہیں آتا تھا..... جیسے سفید جادوین کی ہو۔  
میں کسی اندھے گڑھے میں کھڑی تھی..... ہر طرف

مخاطب تھا..... میں نے اس کے لیے پر غور نہیں کیا تھا۔  
”جی..... آپ بات کریں، میں سن رہی ہوں۔“

میں نے جواباً کہا تھا..... وہ دونوں ہاتھوں کی انگلیاں  
ایک دوسرے سے ملائے شاید کوئی تمہید باندھنے کی سوچ  
رہا تھا..... میں نے الماری صاف کرنے کا اپنا کام

بدستور جاری رکھا تھا۔  
”شاید تم نہیں جانتیں کہ میں نے زندگی ایک  
organized طریقے سے گزاری ہے اور آگے بھی

میرا یہی ارادہ ہے..... زندگی کا ہر فیصلہ بچپن سے میں خود  
لیتا آیا ہوں چاہے جو بھی ہو..... اور میں یہ بھی کسی حد تک  
سمجھتا ہوں کہ مجھ میں اچھے فیصلے کرنے کی صلاحیت موجود

ہے..... تم میری بات سمجھ رہی ہونا؟“ وہ بات روک کر  
مجھ سے پوچھنے لگا تھا..... کمرے میں جیسے دھند چھانے لگی  
تھی..... میں واقعی سمجھ رہی تھی۔

”جی میں سمجھ سکتی ہوں۔“  
”ویل..... میں نے اپنی زندگی کے فیصلوں کا  
اختیار اپنے ہاتھوں میں رکھا، وہ سارے فیصلے جو ایک

انسان اپنے کیرئیر کے حوالے سے یا پھر اور کسی بھی  
حوالے سے لیتا ہے..... میری اپنی زندگی ہے اور اسے  
میں اپنے طریقے سے جینا چاہتا ہوں۔ میرا اپنا ایک

سوشل سرکل ہے..... وہ بول رہا تھا..... میں سن رہی تھی  
اور سن ہو رہی تھی۔  
”دادی کے پیار ہونے پر اور ان کی آخری خواہش

کے پورا کرنے کے لیے ابو اور چچا نے مجھے بہت فورس کیا  
کہ میرا نکاح تم سے کر دیا جائے اور مجبوری میں ایسا کرنا  
پڑا..... مگر اب جب میں چار سال کے لیے یہاں سے

جار ہا ہوں تو تمہیں پتا بنانا ضروری سمجھتا ہوں کہ اس رشتے  
میں میری مرضی ایک پرسنٹ بھی نہیں۔“ وہ میری طرف  
نہیں دیکھ رہا تھا مگر میں اس کی طرف دیکھ رہی تھی..... کتنا

آسان تھا اور کتنا آسان ہوتا ہے ناں کسی دوسرے کو زندہ  
درگور کر دینا..... کاش..... کوئی سمجھ سکے..... ٹھنڈے سہ پہر کا  
سانا مجھے جامد کر گیا۔

”میں نہیں چاہتا کہ اس relation کو لے کر تم  
مجھ سے کوئی امید باندھو..... یہ ہماری مشرٹی لڑکیوں کی  
عادت ہوتی ہے ناں..... سو میں تمہیں پہلے ہی بتا رہا

ہوں..... کہ تم ایسی کوئی بھی امید نہ باندھنا.....“ ایک

جھوٹے چوں کو جانے کہاں سے کہاں اڑا دیتے تھے۔  
 ”تم نے غلط سوچا تھا..... تمہیں missunder  
 standing ہوئی تھی اریہ۔“ زویا اور میرا رشتہ صرف  
 اور صرف دوستی کا ہے۔ میں نے اسے پہلی بار ٹیرس کے  
 جھوٹے پر روتے ہوئے دیکھا تھا۔ وہ مجھے بہت اداس  
 اور اکیلی سی لگی تھی۔ یہی میں نے اسے اس phase  
 سے نکلنے کے لیے دوستی کا ہاتھ بڑھایا تھا۔ وہ بہت  
 اچھی لڑکی ہے۔“ حماد نے رساں سے کہتے ہوئے  
 سامنے بڑے پتھر کو پاؤں کی شوکر سے اڑایا تھا۔ پتھر کی آواز  
 بازگشت بن گئی۔  
 ”تمہیں مجھ سے کب محبت ہوئی.....؟“ دلچسپ  
 سوال.....

”شاید محبت ہونے کا وقت نہیں ہوتا۔ مگر پھر بھی  
 شاید اس وقت ہوئی ہوگی جب تم دو چوٹیاں باندھتی تھیں  
 اور ہم ساتھ کھیلتے تھے۔ ہمارا بچپن، ہماری محبت کا سب  
 سے بڑا ثبوت ہے۔“ وہ مسکرایا تھا۔ وہ رکی اور سڑک کے  
 پتوں بچ ہاتھ باندھے کھڑی ہو گئی۔  
 ”پھر تم نے انہیں دیے کیوں کی؟“ تفتیشی انداز۔  
 ”مجھے کیا شاید تم میری محبت کو قبول ہی نہیں کرو.....  
 ایک دوسرا لگا رہا بھی خاموش رہا۔“ ہاں..... میں نے  
 زویا سے یہ بات شیئر کی تھی۔ ”مذافقتی انداز۔  
 گلابی پھول سر اٹھائے ادھر ادھر نظر دوڑاتے ہیں  
 اور پھر سر جھکا لیتے ہیں.....  
 ”میں بہت بے یقین ہوئی کیونکہ مجھے یقین ہی  
 نہیں آ رہا تھا کہ تم مجھ سے محبت کرتے ہو۔ تم اور زویا  
 شاید یہی سب ڈسکس کرتے ہوئے لان میں بیٹھ کر بیٹھے  
 روز قہقہے لگاتے تھے اور میں سلکتی رہتی تھی۔“  
 ”تو تم نے سلکتی تھیں..... ہمیں جوائن کر لیتیں۔“  
 ”تم نے آفر کی تھی؟“  
 ”تم ویسے ہی آ جاتیں.....“  
 ”جی نہیں.....“  
 اور وہ مٹکتے ہیں۔ رکتے ہیں۔ والٹن کی  
 آواز..... فلیٹ روڈ پر کوئی والٹن بج رہا ہے۔ اریہ  
 نے خالی چپس کا بیٹک ہوا کے سپرد کیا تھا۔  
 وہ جینز کی جیبوں میں ہاتھ ڈالے اس کے ساتھ  
 چل رہا تھا۔

”کتنا پیارا موسم ہے ناں آج.....“  
 ”تم جو ساتھ ہو جی پیارا لگ رہا ہے۔“ وہ  
 مسکرایا تھا۔ خوب صورت مسکراہٹ.....  
 ”ڈائلاگ بول رہے ہو؟“ وہ پوچھ رہی تھی۔  
 ”مجھیں ڈائلاگ لگ رہا ہے؟“ وہ سنجیدہ ہوا تھا۔  
 ”مجھیں نہیں۔“ وہ بوکھلائی۔  
 ”مجھوں میں یقین نہ ہوتا ہے جان لگتی ہیں۔“  
 ”اور اگر مجھوں میں بھڑے ہوں تو.....؟“ وہ  
 شون ہوئی تھی۔  
 ”جب مجھوں کو جاندار تصور کیا جاتا ہے.....“ وہ  
 بھی شونی سے مسکرایا تھا۔ وہ واپس پلٹ رہے تھے۔  
 ہلکی ہوا زرد پتوں کو اڑا لے لگی تھی..... فلیٹ روڈ کی سڑک  
 خالی تھی۔  
 ”میں ایک بات سوچ رہی تھی.....“ وہ حماد کو  
 دیکھتے ہوئے بولی۔  
 ”کون سی بات.....؟“ وہ حیرت سے اسے دیکھنے لگا۔  
 ”جانے کیوں مجھے لگتا ہے زویا اور حسن بھائی ایک  
 دوسرے سے محبت کرتے ہیں۔ مگر پھر ایک بات سمجھ  
 نہیں آتی۔“  
 ”کون سی بات.....؟“  
 ”یہی کہ زویا نے اس رشتے سے انکار کر دیا مگر  
 کیوں.....؟ اس نے ابو اور چچا سے نکاح توڑنے اور  
 طلاق کا مطالبہ کیا ہے..... جانے کیوں.....؟“  
 ”تم اچھی طرح جانتی ہو کہ حسن اس رشتے کے  
 خلاف تھا..... تو جب ایک فریق کی مرضی نہ ہو تو زبردستی  
 کے بندھن کا کیا فائدہ.....“ حماد نے کہا تھا۔ خنک ہوا  
 گلابی پھولوں کی خوشبو سے بھر گئی ہے۔ پرندوں کی  
 آوازیں سنائے میں گل ہوئی ہیں۔  
 ”مجھے لگتا ہے حسن بھائی، زویا کے اس فیصلے سے  
 ڈسٹرب ہیں۔“  
 ”مگر کیسے.....؟“ یہ بات واقعی حیرت انگیز تھی۔  
 چار سال پہلے کے حالات سے وہ واقف تھا مگر اب حسن  
 کیوں ڈسٹرب تھا۔  
 اور اب زویا اکرام وہی چار سال پہلے والی زو  
 نہیں تھی..... چار سالوں نے اسے تراش کر ہیرا بنا دیا تھا۔  
 مگر کس فل اور باوقاری زویا اب بڑی خاص تھی.....

عراج میں ایسی تمکنت تھی کہ مخاطب مسرور ہو جاتا تھا.....  
 لہر ارادی نظریں، ارادی بن کر پلٹتی تھیں۔  
 اب وہ لکچرار زویا اکرام تھی..... جس کے  
 اسٹوڈنٹس اس کے مداح تھے..... وہ واحد لکچرار تھی  
 ہارے کالج کی جس کی کلاس کی حاضری لیفتی ہوتی تھی۔  
 اس نے بڑی محنت اور ریاضت سے وقت کے  
 ساتھ قدم ملا کر چلنا سیکھا تھا..... وقت لگا تھا..... مشکل  
 اہی ہوئی تھی مگر آخر کار وہ سیکھ ہی گئی تھی۔ اور رنگ محل کے  
 اردو پوار اس کی تنہائیوں اور خود کو دی جانے والی کھوکھلی  
 لیلیوں سے بخوبی واقف تھے..... وقت نے اسے کندن  
 کر دیا تھا۔

☆☆☆

رنگ محل پر بارش برس رہی تھی..... ہلکی، ہلکی سی  
 اور بارش کی ہر بوند، ہر قطرے میں خوشبو تھی..... وہ  
 مہرے ساتھ ہی بیٹھ کے دوسرے سرے پر آن بیٹھا ہے،  
 وہ بارش میں بھیگ رہا ہے۔ مگر اسے کوئی پروا نہیں.....  
 ہے مجھے نہیں.....  
 وہ خاموش بیٹھا ہے، بالکل چپ چاپ..... حماد اور  
 اریہ کی شادی کی تقریب اختتام پزیر ہو چکی تھی۔  
 اور ساری تقریب کے دوران وہ مجھے اپنی طرف  
 ہی متوجہ نظر آیا تھا..... مجھے حیرت ہوئی تھی اور بار بار ہوئی  
 گی۔ اب یہ توجہ کیا معنی رکھتی تھی؟  
 سارے سلسلوں کے اختتام کے بعد یہ نیا آغاز کیا؟  
 مجھے ابھن ہوئی تھی ان نظروں سے جن نظروں سے  
 لکھ دیکھا جا رہا تھا۔ اور پھر وہ میرے قریب چلا آیا تھا.....  
 ہمارا بعد کی پہلی ملاقات..... اور چار سال پہلے کی آخری  
 ملاقات..... بلیک اور وائٹ ڈریس پیٹ میں وہ اتنا ہی  
 شاندار تھا جتنا چار سال پہلے تھا..... وہی تھکے نقوش؟ وہی  
 لہ..... اور..... ہاں..... اور وہی مسکراہٹ.....  
 ”کیسی ہو زویا.....؟“ میں نے اس کے بڑھے  
 ”ہے ہاتھ کودیکھا تھا اور پھر اسے.....  
 ”میں ٹھیک ہوں..... تم کیسے ہو.....؟“ میں نے  
 اس سے ہاتھ ملاتے ہوئے پوچھا تھا۔  
 ”تمہیں کیسا لگ رہا ہوں.....؟“ وہ مسکرایا تھا۔  
 اور میں ایسے پھٹنے لگی تھی۔  
 ”بالکل ویسے ہی جیسے چار سال پہلے تھے.....“ میں نے

جو دھڑکا وہ دل تھا

کمال اطمینان سے جواب دیا تھا۔ وہ مجھے حیران، حیران سا لگا۔  
 ”کیا واقعی میں نہیں بدلا؟“  
 ”کیا سوال غیر ضروری نہیں؟“ میں باوقار انداز  
 میں دو پانچ ٹھیک کرتی مسکرائی تھی۔  
 ”ہر وہ سوال جس میں میرا ذکر ہو..... تمہیں اب  
 غیر ضروری لگتا ہے کیا؟“  
 فانوس کی جگر، جگر کرتی روشنیوں میں ہم آسنے  
 سامنے کھڑے تھے..... ہر طرف خوشبو سی تھی۔ باوردی  
 ویژر گھوم پھر رہے تھے۔  
 ”تم نے خود ضروری لگنے کا جواز چھینا تھا.....“ میں  
 اس بار بڑی دقت سے مسکرائی تھی۔  
 ”اگر میں دوبارہ جواز دے دوں تو.....؟“ وہ

آس سے مجھے دیکھ رہا تھا۔  
 ”نوٹے شیٹوں میں دڑا میں ہمیشہ باقی رہتی ہیں.....  
 ناممکن ہے اب.....“ میں نے مڑ کر ٹیبل سے ٹٹو اٹھایا  
 تھا..... وہ ٹھیک ٹھیک ہنستا ادھر ادھر نظر دوڑاتا رہا۔  
 ”سارے راستے بند ہیں..... کوئی کھڑکی نہیں کھلی  
 ہوئی؟“ حسن علی کی آواز میں جیسے چار سال کا سرفسٹ آیا  
 تھا..... میں نے نظر چرائی تھی۔  
 ”ساری کھڑکیاں بند ہیں اب حسن۔“ روشنیاں  
 جلنے بجھنے لگی تھیں۔  
 ”میں بار، بار دھڑک دیتا رہوں گا۔“  
 ”تھک جاؤ گے۔“  
 ”نہیں..... مری جاؤں گا۔“ کیا تھا اس کے لہجے  
 میں..... میں ہول گئی۔  
 میں چپ کھڑی رہ گئی..... خامی بھلانے کی سکت  
 مجھ میں نہیں تھی۔ شاید کسی میں بھی نہیں ہوتی..... کاش  
 ہوتی..... اور بھی مجھے لگا کوئی والٹن بج رہا ہو..... ایسی  
 دھن جو مجھوں کے عالم میں بجائی جاتی ہے۔ فلیٹ روڈ کا  
 والٹن بچ رہا ہے۔ جیسے چاروں طرف گلاب گر رہے  
 ہوں..... سرخ، نارنجی۔  
 ”میں تم سے شرمندہ ہوں زویا.....“ وہ پھکی ہنسی ہنسا۔  
 اور والٹن کی دھن نہیں ٹھم رہی..... محبت کا گلابی  
 پہر وارد ہونے کو ہے۔

☆☆☆

”پتا ہے تمہیں زویا..... ان چار سالوں میں کوئی دن

ان کے بیک تھامے اور دونوں کو اندر چلنے کا اشارہ کیا۔  
جب تک بچے یو نیفارم تبدیل کر کے منہ ہاتھ دھو کر  
ٹیبیل تک پہنچے۔ بسمہ تمام چیزیں ٹیبیل پر لگا چکی تھی۔  
دونوں بچوں کی تو خوشی کی انتہا نہ رہی۔  
”ماما! کولڈ ڈرنک بھول گئیں آپ؟“ ایمان نے  
چھوٹی سی ناک چڑھاتے ہوئے کہا تو بسمہ فوراً فریج کی  
طرف دوڑی۔

دونوں بچے کھانے میں مصروف ہو گئے ساتھ ہی ماما  
کو پورے دن کی رواد بھی سنائی جانے لگی۔ ساتھ ہی  
ساتھ برگرز، فرائز اور ٹلٹس پر خوب ہاتھ صاف کیے  
جارہے تھے۔ تبھی تیل دوبارہ بج اٹھی۔ بچوں کی باتوں میں  
منہبک بسمہ چونک اٹھی۔ گیٹ کھولنے پر معلوم ہوا کہ کچرا  
اٹھانے والی پتی ہے۔

گر ماگرم برگرز بڑے سے خوب صورت پلیٹر  
ہا ہائی بہار دکھا رہے تھے۔ خستہ، خستہ چکن ٹلٹس کی  
لہو سے بچن مہک رہا تھا اور اب بسمہ جلدی، جلدی فریج  
لاڑمانے میں لگی تھی۔ وہ وقتاً فوقتاً کھڑی پر بھی نظر دوڑا  
لیا کرتی۔ بچوں کے اسکول سے آنے کا وقت بس ہوا ہی  
ہوتا تھا اور سات سالہ شان اور نو سالہ ایمان اسکول سے  
آتے ہی بھوک، بھوک کا شور مچا کر پورا گھر سر پر اٹھا لیتے  
تھے۔ اور آج تو خصوصی طور پر بسمہ نے ان کی پسند کا کچ  
لا تھا۔ بچوں کی خوشی کا سوچ کر ہی بسمہ بھی خوش تھی۔  
لیکن اس نے فرائز کی آخری کھپ نکالی ساتھ ہی کال تیل  
بج اٹھی۔ وہ ہاتھ صاف کرتے ہوئے مچن سے نکلی۔  
گیٹ کھولتے ہی دونوں بچوں نے سلام کے بعد پہلا نعرہ  
”سبہ توقع بھوک کا ہی لگایا۔ بسمہ نے مسکراتے ہوئے

## ایسا بھی ہوتا ہے

بالہ احمد



خٹک ہوانے میرے بالوں کو اڑایا۔  
”کہیں چلیں؟“ وہ میری طرف جھکا تھا۔  
”کہاں.....؟“  
”فلٹ روڈ واک کرنے.....“  
”اس وقت؟“ میں حیرت زدہ ہوئی۔  
”ہاں.....“ وہ میری طرف ہاتھ بڑھا رہا تھا.....  
ہم دونوں اٹھ کھڑے ہوئے تھے۔  
بارش ختم ہو چکی ہے..... فلٹ روڈ کے گلابی پھول سر  
اٹھا کر دیکھتے ہیں..... جھک جاتے ہیں۔  
”شکر ہے.....“ وہ رک کر میرے سامنے آن کھڑا تھا۔  
”کس لیے؟“ میں نے پوچھا تھا۔  
”اس فیور کے لیے جو تم نے مجھے دیا.....“  
”تمہیں خالی ہاتھ لوٹانے کا حوصلہ نہیں تھا مجھ  
میں.....“ میں نے اڑتے ہوئے بال سیٹھے تھے۔  
”میں اسے اظہار محبت سمجھوں.....؟“  
”ہاں..... سمجھ سکتے ہو.....“  
وہ میرے سامنے کھڑا تھا..... اس نے میرے ہاتھ  
تھامے تھے۔  
”میں اللہ کا شکر ادا کرتا چاہتا ہوں کہ اس نے مجھے  
تمہاری محبت سے نوازا.....“  
میں ہنسی..... اور ہنسی چلی گئی۔  
فلٹ روڈ کی سڑکوں پر چہل قدمی کرتے ہوئے ہم  
خوش ہیں..... بہت.....  
”زندگی میں سچی محبتوں کے لیے کھڑکیاں ہمیشہ کھلی  
رکھنی چاہئیں، کبھی کبھار دستک دینے والوں کی زندگی میں  
شام آ جاتی ہے..... اس شام سے انہیں بچا کر رکھنا چاہیے۔“  
ہم دونوں ایک دوسرے کا ہاتھ تھامے چلتے جا رہے ہیں۔  
اور فلٹ روڈ کا واکس اور میری ڈائری میں خرم  
ایک غزل اس خٹک رات کے سنانے کو توڑتی ہے۔  
کچھ دور ہمارے ساتھ چلو ہم دل کی کہانی کہہ دیں گے  
سمجھ نہ جے تم آنکھوں سے وہ بات زبانی کہہ دیں گے  
پھولوں کی طرح جب ہونوں پر اک شوخ نیم بکھرے گا  
دھیرے سے تمہارے کانوں میں اک بات پرانی کہہ دیں گے  
اظہار وفا تم کیا سمجھو، اقرار وفا تم کیا جانو  
ہم ذکر کریں گے غیروں کا اور اپنی کہانی کہہ دیں گے۔

ایسا نہیں گزرا جب میں نے تمہیں یاد نہ کیا ہو..... مجھے  
بہت حیرت ہوئی تھی کہ میں اسے یاد کر رہا تھا جو میرے  
نزدیک عام سی تھی..... میری ایک نیم کزن..... پھر مجھے یہ  
پتا چلا تو میں ساکت ہو گیا کہ یہ بادل ہوتا ہے یہ کسی ”عام“  
کو کیسے ”خاص“ کے دائرے میں رکھتا ہے..... وہ برسی  
بارش میں مجھے گزرے چار سالوں کا احوال سن رہا تھا۔  
اور میں رنگ محل کی روشنیوں کو دیکھتے ہوئے سن  
رہی تھی۔

”یہ جو محبت ہوتی ہے ناں یہ آپ کو.....“ ”آپ“  
نہیں رہنے دیتی..... ”تم“ گرد دیتی ہے..... اور پہلے دن  
سے مجھے تم سے خوف محسوس ہوا تھا جیسے تم مجھے ”بھگہ“ سے  
چھین لوگی..... اور میں ٹھیک سوچتا تھا۔ تم نے یہ کر دکھایا۔“  
گہری رات اور آسمان پر ٹہلتے تارے وہ سب سن  
رہے تھے۔

”زندگی کے ان چار سالوں نے مجھے یہ اچھی طرح  
بتا دیا تھا کہ عام لوگ کبھی عام نہیں ہوتے..... ہر انسان  
اکٹیل ہے، خاص ہے..... اور ہر انسان ہر انسان کے لیے  
خاص نہیں ہوتا بلکہ کوئی کبھی ایک کے لیے ہوتا ہے۔“  
سحر زدہ لمحوں میں سحر زدہ وقت آن ٹھہرا تھا۔  
وہ مجھے دیکھ رہا تھا..... مسکراتی آنکھیں..... ہاں.....  
آنکھیں بھی مسکراتی ہیں۔

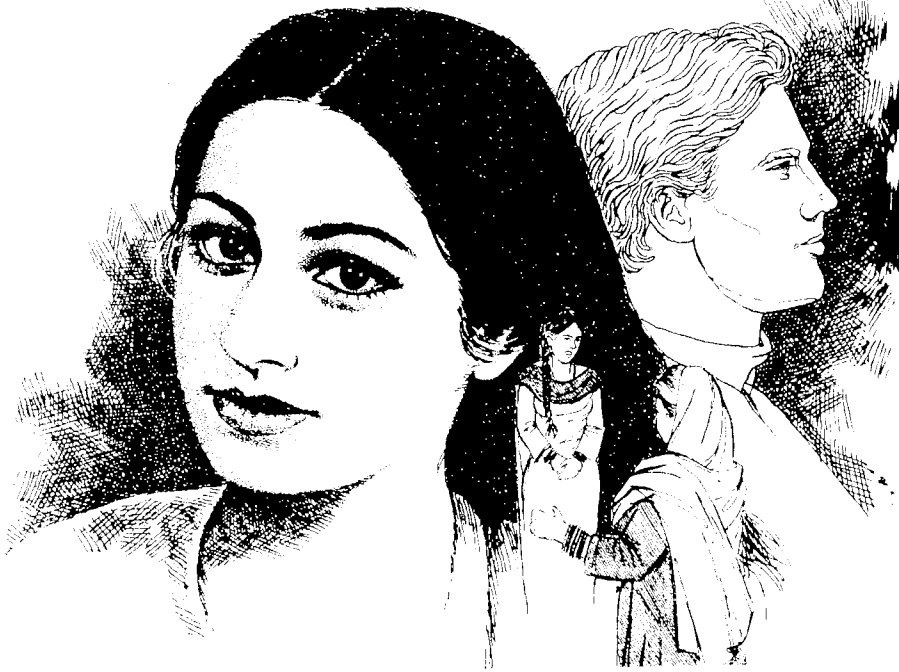
”you are special for me“ ہلکی  
بارش سے رات بھینگ رہی تھی..... رفتہ، رفتہ ہوئے، ہوئے۔  
”معاف کرنا آسان نہیں ہوتا حسن..... یہ بہت مشکل  
کام ہوتا ہے۔ اور یہ مشکل کام میں نے بڑے صبر سے کیا  
ہے..... دل کی بند کھڑکیاں کھولنا آسان نہیں ہوتا۔“  
میری آواز بارش میں بھینگ رہی تھی۔

”اگر آج تم مجھے معاف نہ کرتیں تو میں بھی کبھی  
اپنے آپ کو معاف نہ کر پاتا۔“ وہ شرمندہ لگ رہا تھا۔  
بارش میں بھگا ہوا..... ماتھے پر بھرے بال.....  
”کوئی بات نہیں..... میں نے تمہیں معاف کیا۔“  
”شکر ہے زویا.....“ وہ مسکرایا تھا۔

اس بیک رات میں ایک اعتراف بڑے چپکے سے  
میرے دل نے کیا تھا۔  
”حسن علی کی مسکراہٹ زویا اکرام کی سب سے  
بڑی کمزوری ہے۔“

غلطی  
سیرم

سیرم شہزاد



کر دیا..... الگ ہونے کا بھی کوئی فائدہ نہیں۔ ساس بن جاتے ہیں یہ بھی پوری..... یہاں جاؤ..... وہاں نہ جاؤ، یہ نہ کرو، اچھا چھوڑیں..... اب بتائیں کیا کروں..... آپ مایہ بیچ رہی ہیں ناں..... میرا تو بی بی شوٹ کر رہا ہے، کچن الگ گندا، اسٹری والی بھی نہیں آئی۔ جھاڑو والی صبح صبح حساب کر کے چلتی بنی، ای ماسی.....“ اچانک فون بند ہو گیا، شاید بیٹری لوتھی، ورنہ لگتا تو یہ تھا کہ وہ ابھی بات کرتے، کرتے روہی دے گی۔

اس کے اس انداز پر شائستہ بیگم کو کہنی روکنا مشکل ہو گیا تھا کہ آشین نے اپنی امی کی جگہ شوہر کی اماں کو فون کر دیا تھا۔ فون بند ہوتے ہی وہ کھل کر ہنس دیں مگر پھر

”یا اللہ خیر، آج بہو بیگم نے صبح ہی صبح کیسے یاد کر لیا؟“ شائستہ بیگم نے فون کی چمکتی ہوئی اسکرین کو دیکھا اور گھڑی پر نظر ڈالی، 12 بج رہے تھے اور یقیناً آشین کی تو ابھی صبح ہی ہوئی ہوگی، انہوں نے فون اٹھایا اور ویلو کہنا ہی چاہا تھا کہ ان کے کچھ بولنے سے پہلے ہی آشین ناں اسٹاپ شروع ہو گئی۔

”ہائے امی، آپ ہی کوئی مایہ بیچ دیں، جسم سے لہو کو دیکھ، دیکھ کر ہول اٹھ رہے ہیں، سمجھ ہی نہیں آ رہا کہ کیا کروں ہفتہ اور اتوار ہم نے باہر سے کھانا منگو لیا تھا مگر ابھی اتنے سارے برتن جمع ہو گئے۔ میں تو آج بھی آپ کے ہاں آ رہی گی۔ مگر پتا نہیں، انہوں نے کیوں منع

”نہیں! میں بھی کھاؤں گی ماما“ نئی فرمائش..... بسمہ نے انہیں مصنوعی غصے سے گھورا اور پھر موبائل فون اٹھا لیا۔ آرڈر ہو گیا۔ کچھ ہی دیر بعد پارسل دروازے پر تھا۔ بچوں نے مزے، مزے سے کھایا۔ دوپہر والے برگرز، فرائز اور ٹٹلس کے ڈبے جوں کے توں فرنا میں رکھے رہ گئے۔

رات کو پیٹ بھرا ہونے کی وجہ سے بچوں نے کچھ نہیں کھایا صرف دودھ کا ایک، ایک گلاس پی کر سو گئے۔ صبح اسکول جاتے ہوئے دونوں نے بریک میں کھانے کے لیے فرینج ٹوسٹ کی فرمائش کر دی۔ یوں بچ بکس فرنا ٹوسٹ سے بھر کر دونوں کے ساتھ روانہ کر دیے گئے۔

بچوں کے اسکول چلے جانے کے بعد بسمہ نے میاں کو دفتر روانہ کیا۔ خود بچوں کا بچا ہونا شتالے کرنی والی کے آگے آگے تھی۔ شائستہ مکمل کر کے وہ کچن کی طرف آگئی۔ برتن دھو کر بریک میں رکھے۔ ساتھ ہی فرینج کی صفائی کا بھی خیال آگیا۔ ”خاصا بھر گیا ہے فالٹو کے سامان سے آج کچھ ہلکا کر لینا چاہیے۔“ اس خیال کے آتے ہی فرنا کھولا۔ دوسری بہت سی بیکار نظر آنے والی چیزوں کے ساتھ وہ ڈبے بھی نظر آئے جن میں ٹٹلس وغیرہ تھے۔ کھول کر دیکھا پھر سوچنے لگی۔

”اب کہاں بچوں نے یہ سب کھانا ہے۔ دیے گی فاسٹ فوڈ اتنا باسی تو ہرگز بھی بچوں کو نہیں دے جاویں۔“ خواہ مخواہ چیزوں کو سونگھا۔ ”اوپہوں..... ماما کی تو عجیب سی اسمبل آ رہی ہے..... اور یہ فرائز بھی مگر سخت ہو گئے ہیں..... برگرز تو بالکل بھی صبح نہیں لگ رہے مجھے..... انہیں کیوں سنہیال کے رکھوں..... بچوں کا کھانا ہوگا تو فریش بنادوں گی سب کچھ..... یہ سب کھانا خدا نخواستہ بیارہ پڑ جائیں.....“ ف اللہ نہ کرے۔“ سو کر ہی بسمہ کو جھرجھری آگئی۔ اس نے سب چیزیں اکٹھا کر میز پر رکھیں اور شاپر کی گرہ لگاتے ہوئے سوچا..... ”آج کچرا لینے والی بچی آئے گی تو اس کے مانتے سے ہی اسے دے دوں گی..... خوش ہو جائے گی بچاری۔“

”آ جاؤ کچن سے ڈسٹ بن خالی کرلو۔“ بسمہ اندر آئی تو دونوں بچے کھانے سے ہاتھ کھینچ چکے تھے۔

”ماما.....! بس۔“ ایمان نے ماں کو دیکھتے ہی نومور کا بورڈ لگا دیا۔

”ماما بس اور دل نہیں چاہ رہا، ہم نے بریک میں چکن رول بھی کھائے تھے ناں.....“ شان نے بھی بہن کی تقلید کی۔ بسمہ نے ایک نگاہ ٹیبل پر ڈالی۔

”ارے شان! ایمان! تھوڑا سا تو اور کھاؤ بیٹا، ماما نے اتنی محنت سے بنایا ہے۔“

”بھئی ماما کھانا ناں بس اور نہیں کھایا جارہا اب۔“ دونوں نے کورا جواب دیا۔

”اچھا چلو تھوڑا ٹھہر کے یا شام میں کھا لیتا..... اوکے؟“ بسمہ نے مسکراتے ہوئے برگرز کا پیپر اٹھایا۔ اتنے میں وہ کچرے والی بچی بھی ڈسٹ بن خالی کر چکی تھی۔

”کیا بات ہے؟“ بسمہ نے اسے ہنوز کھڑے دیکھا تو پوچھا۔

”باجی کوئی کھانے کی چیز ہے تو دے دو بھوک لگی ہے۔“ اس نے بچی نظروں سے بسمہ کی طرف دیکھا۔

”نہیں بھئی رولی وغیرہ تو آج بنی نہیں کچھ اور بھی ایسا نہیں جو تمہیں دے سکوں۔“ بسمہ نے ٹٹلس اور فرائز اتر ٹائٹ ڈبے میں رکھتے ہوئے مصروف سے اعماز میں جواب دیا۔ بچی نے عجیب سی نظروں سے ڈبے کو فرینج میں منتقل ہوتے دیکھا اور خاموشی سے کچرا اٹھا کر باہر نکل گئی۔

شام کو دونوں بچے سو کر اٹھے۔ نہاد دھو کر ہوم ورک لے کر بیٹھ گئے۔ پڑھتے، پڑھتے انہیں کچھ کھانے کی طلب ہوئی۔ بسمہ فوراً اٹھی۔ ”چلو میں تم لوگوں کو ٹٹلس اور فرائز گرم کر کے لا دوں۔“

”نہیں ماما ٹٹلس اور فرائز نہیں کچھ اور.....“ شان نے غرہ دکھایا۔

”ماما برگرز بھی نہیں اب کچھ اور دل چاہ رہا ہے۔“ ایمان کیوں پیچھے رہتی۔

”اچھا کچھ اور کیا بھئی؟“ بسمہ نے ان کی طرف دیکھا۔

”ماما ہاٹ ڈوگ سینڈوچ آرڈر کر دیں۔“

جگہ پر رکھواتی تھیں۔ چارو ناچار افشین بھی ساتھ ہی لگا گئی۔ سب چیزیں جگہ پر ہوئیں تو اتنی دیر میں کچن سال ہو گیا انہوں نے لڑکی سے کہا۔

مکراتنی دیر میں شائستہ بیگم کی آواز آئی۔

”پڑا“ انشیں نے دل ہی دل میں شرمندہ ہوئے ہوئے جواب دیا۔

کے لیے خود بھی صاف ستھرا ہونا چاہیے اور کمر بھی جھکنا نہ چاہیے۔ “انٹین تال بعداری سے اٹھ گئی وہ ویسے بھی ہٹھک گئی تھی، جب تک وہ تیار ہو کر آئی پڑا چکا تھا اور اس کی ساس جانے کے لیے تیار کھڑی تھیں۔

”نہیں بیٹا..... اس لڑکی کو بھی بہت دیر ہوگئی ہے،  
بہ تم بھی آرام کرو، ریحان کے ابو بھی آنے والے ہوں

نے منسکرا کر کہا اور گاڑی کی طرف چل دی۔ افشین نے ان کے جانے کے بعد سوچا، ایسی بھی ہوتی ہیں ساسیں، الیم

کہ انہوں نے ماسی بھیجی کیوں نہیں؟ تو اس پر یہ عقدہ کھلا کہ اس سے کیا غلطی ہو گئی تھی۔ موبائل اس کے ہاتھ ہے۔

”سنا ہی تھا۔ ساس بھی، بھئی امی بن جاتی ہیں اور آج دیکھ بھی لیا۔“

سے بائیں لڑی شروع کر دیں اور ساکھ، ساکھ چیزیں جی

ماہنامہ پاکیزہ 148

بشری سیال

”لگتا ہے آج تو بارش ضرور ہوگی۔“ اس نے پریشانی کے عالم میں فائل کو دبا رہا تھا۔ اس نے دیکھتے ہی دیکھتے کالی گھانسی اور پورے آسمان پر چڑھائی۔ ”الہی خیر۔“

”جائے پوگے؟“  
”آپ رہنے دیں میں بنا لیتا ہوں، ہم دونوں کے لیے۔“ کہتے ہوئے وہ ساس پین میں پانی ڈالنے لگا۔  
”نہیں بیٹا، میں بنائی ہوں، تم رہنے دو۔“ انہوں نے ساس پین اس کے ہاتھ سے پکڑ لیا۔  
”ای آپ کو یاد کر رہی تھیں۔“ اچانک یاد آنے پر اس نے کہا۔

”کسی دن ملوانے لے آؤ، میرا تو تمہیں پتا ہے جب سے معصومہ کے ابو باہر گئے ہیں کہیں آتا جانا ہی مشکل ہو گیا ہے۔“

”ویسے معصومہ کو جاب نہیں کرنی چاہیے، گھر پر رہے، آپ کا ہاتھ بٹائے، کیا کرے گی جاب کر کے۔“ اس نے ایک بار پھر سے کہا۔

”تمہیں پتا ہے اس کا، زیادہ دن ایک کام نہیں کر سکتی، کچھ ہی دن بعد خود ہی چھوڑ دے گی۔“ انہوں نے مسکراتے ہوئے کہا جواب میں اس نے بھی صرف مسکرانے پر ہی اکتفا کیا۔

☆☆☆☆  
شکر ہے کہ وہ لیٹ نہیں ہوئی تھی۔ گیٹ بری گاڑی سے اتر کر وہ تیز، تیز قدموں سے اندر چلی گئی۔  
انٹرویو اشارت ہو چکے تھے، وہ اپنی باری کا انتظار کر رہی تھی۔ اس کی باری آئی تو وہ فائل کو سینے سے لگائے بیک کندھے پر لٹکائے بڑے اعتماد سے قدم اٹھاتی اندر آفس کی جانب بڑھی۔  
”السلام علیکم.....!“ اس نے اندر داخل ہو کر سلام کیا۔

”وعلیکم السلام.....!“ اس نے ایک طائرانہ نظر کرے پر ڈالی۔ اسے سلام کا جواب دینے والا نظر نہیں آیا۔ اچانک اس کی نظر سامنے پڑی۔ ریوانونک چیئر کا منہ دیوار کی جانب کیے بیٹھے آدمی نے شاید اس کے سلام کا جواب دیا تھا۔

”تشریف رکھیں۔“ اس نے منہ اب بھی ادھر نہیں کیا تھا۔ کچھ اچھٹے ہوئے وہ بیٹھ گئی۔  
آفس کی گلاس وال سے باہر دیکھتے ہوئے وہ کسی

”گرتا.....“ اتنا کہہ کر گاڑی اس نے آگے بڑھائی۔  
”آگے پتا نہیں کس خبیث سے کالا پڑنے والا، دل تو کرتا ہے انٹرویو والے کو کھری، کھری طاوول کر ہی ایک جگہ ہونی ہے جہاں میری بولتی بند ہ جاتی ہے۔“ وہ خود کلامی کے انداز میں بڑبڑاتی۔ ”لے لے اچھے خاصے موڈ کا ستیاناس کر دیا۔“ اس نے کوئی ۱۵ اب نہ دیا اور گاڑی کی اسپید بڑھادی۔

☆☆☆  
”خالہ جان.....!“ دلید انہیں آوازیں دیتا ہوا اور داخل ہوا۔ مگر وہ کہیں نظر نہیں آئیں۔ ”خالہ ہاں.....!“ اس نے پھر آواز لگائی۔

”بیٹے میں ادھر ہوں، کچن میں۔“ ان کی آواز وہ ان کے پاس کچن میں ہی آگیا۔  
”کیا کر رہی ہیں آپ؟“ وہ ان کے پاس جا کھڑا ہوا۔

”کھانا بنا رہی ہوں، تم سناؤ کیسے ہو؟ بہت دنوں امد پھر لگایا۔“ انہوں نے ہنڈیا میں پیچ چلاتے ہوئے ”آپ کو میرے نام سے کیا دچکی؟“ اس نے اس کی طرف دیکھا۔

”موڈ کرا سے گھورا۔ وہ بس اسے دیکھ کر رہ گیا۔“ مجبوری! آپ سے لفٹ لے لی تو آپ تو فریک ہی ہونے لگے۔“ اس نے استفسار کیا۔  
”حد میں رہیں اپنی۔“ وہ جیسے سے لہجہ میں بولی۔  
”سوری! آپ کو برا لگا تو..... میرا مقصد..... اہ زہر لب مسکرا دیا۔

”بس، بس بہت اچھی طرح جانتی ہوں۔“ یہ نوکری کا شوق کب سے چرایا۔“ اس نے کے مقصد کو۔“ اس نے رعب سے کہا۔ گاڑی ایک اکر می میں سے مفر کے دانے نکال کر منہ میں ڈالے۔  
”تمہیں تو پتا ہے اس کا، چین سے بیٹھنے والی سے رک۔“  
”ایک تو آپ کو اپنی ہی کالونی کا جان کر.....“ اس نے نہیں ہے اس کی آگے یونیورسٹی میں ایڈمیشن لینے سے ہمدردی کی ہے اور آپ میرے ساتھ بدتمیاضد کر رہی تھی۔ میں نے منع کیا تو کیا تو خفا ہو کر جاب کے کر رہی ہیں۔“ وہ کسی قدر غصے سے بولا۔  
”پہل پڑی۔“

”ہمدردی کی ہے تو بدلے میں کیا میں آپ“ ارے آپ پڑھنے دیتیں اسے شاید اسی طرح وہ شجرہ نسب بتا دوں۔ گاڑی چلائیں، مجھے دیر ہو وڑی پیچور اور ڈتے دار ہو جائے۔“ وہ کہے بنانہ رہ سکا۔  
”وہ ورنہ میں یہیں اتر جاتی ہوں۔“ اس نے، ”وہ بہت سادہ اور معصوم ہے۔ زمانہ بہت واضح پر نگاہ دوڑاتے ہوئے بڑے رعب سے کہا۔ لاک ہے، مجھے بہت ڈر لگتا ہے، میں تو بس جلد از جلد ”مس“ مجھے بھی وہیں جانا ہے اس لیے آ کر رخصت کرنا چاہتی ہوں۔“ انہوں نے پیچ بٹا لے جا رہا ہوں ورنہ کسی کی بھی اتنی بدتمیزی بردا، ہنڈیا پر ڈھکن رکھا اور اس کی طرف مڑیں۔

اس نے فوراً کہا۔ ”مجھے بھی ادھر ہی کی طرف جانا ہے۔“  
”شکر یہ.....“ اس نے کھڑکی سے باہر بھاگا دوڑتے مناظر کو دیکھا۔

”انٹرویو کس چیز کا ہے، آئی مین کس پوسٹ کے لیے؟“ اس نے موڈ کاٹتے ہوئے ایک اچھٹی سی اس پر ڈالی۔

”میکر ٹری کی پوسٹ مگر انٹرویو ایسے کریں گے جیسے صدر یا وزیر اعظم اپنا ٹکٹ کرنے لگے ہیں۔“ اس نے جل کر کہا۔ اس کی بات پر وہ زیر لب مسکرا دیا۔  
”کیا کوئی ٹیکیشن ہے آپ کی؟“ وہ مزید گویا ہوا۔  
”مرکر مگر بچویشن۔“ وہ برا سامنے بنا کر بولی۔  
”مرکر.....؟“ اس نے استفسار یہ نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔

”اور کیا..... اس سے آگے امی نے ایڈمیشن نہیں لینے دیا۔ ہر وقت فیوچر ہز بیڈ اور ساس ڈرائی رہتی ہیں۔“ وہ تیزی سے بولی۔

”آپ کا نام.....؟“ اس نے یونہی پوچھ لیا۔  
”آپ کو میرے نام سے کیا دچکی؟“ اس نے اس کی طرف دیکھا۔  
”موڈ کرا سے گھورا۔ وہ بس اسے دیکھ کر رہ گیا۔“ مجبوری! آپ سے لفٹ لے لی تو آپ تو فریک ہی ہونے لگے۔“ اس نے استفسار کیا۔  
”حد میں رہیں اپنی۔“ وہ جیسے سے لہجہ میں بولی۔

”سوری! آپ کو برا لگا تو..... میرا مقصد..... اہ زہر لب مسکرا دیا۔  
”بس، بس بہت اچھی طرح جانتی ہوں۔“ یہ نوکری کا شوق کب سے چرایا۔“ اس نے کے مقصد کو۔“ اس نے رعب سے کہا۔ گاڑی ایک اکر می میں سے مفر کے دانے نکال کر منہ میں ڈالے۔  
”تمہیں تو پتا ہے اس کا، چین سے بیٹھنے والی سے رک۔“

”ایک تو آپ کو اپنی ہی کالونی کا جان کر.....“ اس نے نہیں ہے اس کی آگے یونیورسٹی میں ایڈمیشن لینے سے ہمدردی کی ہے اور آپ میرے ساتھ بدتمیاضد کر رہی تھی۔ میں نے منع کیا تو کیا تو خفا ہو کر جاب کے کر رہی ہیں۔“ وہ کسی قدر غصے سے بولا۔  
”پہل پڑی۔“

”ہمدردی کی ہے تو بدلے میں کیا میں آپ“ ارے آپ پڑھنے دیتیں اسے شاید اسی طرح وہ شجرہ نسب بتا دوں۔ گاڑی چلائیں، مجھے دیر ہو وڑی پیچور اور ڈتے دار ہو جائے۔“ وہ کہے بنانہ رہ سکا۔  
”وہ ورنہ میں یہیں اتر جاتی ہوں۔“ اس نے، ”وہ بہت سادہ اور معصوم ہے۔ زمانہ بہت واضح پر نگاہ دوڑاتے ہوئے بڑے رعب سے کہا۔ لاک ہے، مجھے بہت ڈر لگتا ہے، میں تو بس جلد از جلد ”مس“ مجھے بھی وہیں جانا ہے اس لیے آ کر رخصت کرنا چاہتی ہوں۔“ انہوں نے پیچ بٹا لے جا رہا ہوں ورنہ کسی کی بھی اتنی بدتمیزی بردا، ہنڈیا پر ڈھکن رکھا اور اس کی طرف مڑیں۔

اس نے ہوا کے دوش پر بے قابو ہوتے اپنے دوپٹے کو سنبھالنے کی کوشش کرتے ہوئے گھبرا کر دائیں بائیں دیکھا۔ ہوارفتہ، رفتہ تیز ہو رہی تھی۔ ”کیا کر دوں خدایا؟“ اس نے کلائی پر بندھی گھڑی پر ٹائم دیکھا۔

سامنے سے آتی گاڑی کو دیکھ کر اس کے ذہن میں اچانک ایک خیال ابھرا اور اس نے جھٹ عملی جامہ بھی پہنا دیا۔ اس نے ہاتھ سے گاڑی کو روکنے کا اشارہ کیا۔ گاڑی کی رفتار ہلکی ہوئی، وہ ایک ہاتھ سے دوپٹا اور دوسرے سے فائل سنبھالتی دوڑ کر گاڑی کے قریب آئی۔

”پلیز آپ کو زحمت نہ ہو تو برائے مہربانی مجھے اسٹاپ پر ڈراپ کر دیں۔“ اس کی گھبراہٹ کو بھانپتے ہوئے اس نے کوئی جواب نہیں دیا اور فوراً سے پیشتر فرنٹ ڈور کھول دیا۔ اس کی کالونی کا مین گیٹ خاصا دور تھا اور وہ دیر ہونے سے بچنے کے لیے لفٹ مانگ بیٹھی تھی۔ اس کالونی میں بڑے، بڑے بنگلے بنے ہوئے تھے جبکہ ایک طرف فلیٹس کی قطار تھی۔ گاڑی کسی بنگلے سے ٹکلی گئی۔

”ٹھیکس!“ اس نے بیٹھنے میں ایک لمحہ بھی نہیں لگایا۔ اس کے بیٹھے ہی گاڑی آگے بڑھ گئی۔

”دراصل میرا آج انٹرویو ہے، ایک تو امی نے موڈ خراب کر دیا اور سے یہ موسم..... پتا نہیں وقت پر پہنچ بھی پاؤں گی یا نہیں۔“ اس نے بڑبڑاتے ہوئے کہا۔

”ایڈریس بتائیں، میں آپ کو ڈراپ کر دیتا ہوں۔“ اس نے جذبہ ہمدردی سے مغلوب ہو کر آفر کر ڈالی۔

”خواخشاہ آپ کو زحمت ہوگی، آفس بہت دور ہے، پتا نہیں کیا شوق چراتا ہے جو شہر کے دوسرے کونے میں ویرانے میں جا کر آفس بنا لیتے ہیں۔ آپ بس مجھے گیٹ سے باہر بس اسٹاپ پر ڈراپ کر دیں، میں چلی جاؤں گی۔“ اس نے آف موڈ سے کہا۔

”آپ ایڈریس تو بتائیں، ہو سکتا ہے مجھے بھی ادھر ہی جانا ہو۔“ اس نے استفسار کیا۔ بالآخر اس نے ایڈریس بتا دیا۔

”اوکے، میں ڈراپ کر دیتا ہوں آپ کو ڈونٹ وری۔“

میں کہا۔

”جائے محترمہ.....!“ اس نے معصومہ کی طرف دیکھتے ہوئے کہا اور پھر اپنے کام میں مشغول ہو گیا۔

☆☆☆☆

خالہ جان کی طبیعت تاساز تھی..... آفس سے واپسی پر وہ امی کو ساتھ لے کر ان کی طرف آگئی تھی۔ ”کیا خالہ آپ بالکل اچھی نہیں لگ رہیں ایسے لینے ہوئے۔“ انھیں ناں۔“ اس نے مکمل ان کے اوپر سے اتارنا چاہا۔

”معصومہ، امی کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔“ ولید نے آگے بڑھ کر مکمل ان کے اوپر دو بارہ درست کیا۔ ”میری بیٹی میرے پاس آگئی ہے ناں تو اب میں ٹھیک ہوں۔“ وہ نجف سی آواز میں بولیں۔

”خالہ جان ایک کام کرتے ہیں۔“ وہ ان کے پاس پہنچ گئی۔ ”آپ ولید امی کو دے دیں اور مجھے اپنی بیٹی بتائیں، سچ میں مرے ہو جائیں گے، امی تو ہر وقت مجھے ڈانٹتی رہتی ہیں۔“ اس نے آخر میں برا سامنے بنایا۔

”میں بھی یہی سوچ رہی ہوں۔“ وہ پچھلے پن سے مسکرا دیں۔ ولید بچن میں چلا گیا تھا وہ بھی اس کے پیچھے آگئی۔

”کیا کر رہے ہو؟ چائے بنا رہے ہو؟“ اس نے آگے بڑھ کر سراسر بین اس کے ہاتھ سے لینا چاہا۔ ”رہنے دو، میں بنا لوں گا۔“ اس نے انکار کیا۔

”جب میں موجود ہوں تو بھلا تم کیوں بناؤ گے، ہٹو میں بناتی ہوں۔“ اس نے اسے بازو سے پکڑ کر ایک طرف کیا، اب کی بار اس نے کوئی جواب نہ دیا۔

”خالہ جان بالکل ٹھیک ہیں، ڈونٹ وری..... اتنی طبیعت خراب نہیں ہے، ایسے منہ لٹکا کر مت پھر و کہ وہ تمہیں دیکھ کر گھبرا جائیں۔“ اس نے مدبرانہ انداز میں نصیحت کی۔

”معصومہ..... امی کے بغیر میں ایک لمحہ بھی نہیں جی سکتا۔“ اس کی آواز بھاری ہونے لگی۔ وہ تیزی سے مڑی..... اس نے دیکھا کہ شدت ضبط کے باوجود اس کی آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں۔

اعتس ربی تھی۔

”جی سمجھ آ گیا؟“ انٹرویو والے دن کی نسبت آج وہ خاصا سنجیدہ تھا۔

”ایک لفظ بھی سمجھ نہیں آیا سر۔“ اس نے بلا اٹھ کہہ دیا۔

”واٹ.....؟“ وہ ایک جھٹکے سے سیدھا ہوا.....

الحمد میں پیچروٹ تھا ہے وہ اسے گھور رہا تھا۔ ”عجیب بے وقوف لڑکی ہو۔“ وہ ہنسنے لگا۔

”مانسٹر یور لیکچر سر۔“ اسے اس کی بات سخت ملی گئی۔

”تو کیا آپ کو کچھ کہنے کے لیے پہلے آپ سے اجازت لی جائے؟“ وہ قدرے ترش لہجے میں بولا۔

آپ جانتی تھیں کہ آپ سیکرٹری کی جاب کے لیے ہلائی کر رہی ہیں تو کام کی نوعیت کا بھی آپ کو اندازہ ہوگا۔“ وہ مزید بولا۔

”سر غلطی میری نہیں، آپ کی ہے۔“ وہ نہایت سکون سے بولی۔ ”آپ نے اپنی مرضی سے مجھے اجازت کیا ہے، میں نے آپ سے کوئی ریکویسٹ نہیں کی تھی۔“ وہ اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے بے خوفی سے بولی۔

”ٹھیک کہہ رہی ہیں آپ، غلطی تو میری ہی ہے۔“ اس نے سر جھٹکا۔

”اور اب مجھے اس غلطی کو بیچ کرنا ہوگا۔“ اس نے انٹر کام اٹھایا۔ دو منٹ بات کرنے کے بعد اس نے فون رکھ دیا۔

”صنذر صاحب کے ساتھ کمپیوٹر سیکشن میں چلی میں، وہ آپ کو کام سمجھا دیں گے۔“ اس پر ایک نظر ل کر وہ فائل دیکھنے لگا۔

”مے آئی کم ان سر؟“ وہ صنذر صاحب تھے۔

”ہیں.....“ اس نے فائل بند کر دی اور کرسی کی ت سے ٹیک لگا کر ریلیکس انداز میں بیٹھ گیا۔

”یہ مس معصومہ ہیں، ان کو لے جائیں اور کام مادیں۔“ وہ اس سے مخاطب تھا۔

”اوکے سر.....!“ اس نے مؤدب انداز

اتوار کا دن تھا۔ ولید آج اپنی امی کو لے کر ان کے گھر آیا ہوا تھا۔ وہ ان لوگوں کے لیے چائے بنا رہی تھی۔ ولید اس کے پاس بچن میں آکھڑا ہوا۔

”یہ تمہیں جاب کا شوق کب سے ہو گیا؟“ اس نے سرسری سے انداز میں پوچھا۔

”بس ہو گیا ہے شوق، کیوں؟“ وہ کباب فرانی کرتے ہوئے بولی۔

”کیا ضرورت ہے آخر..... تم گھر پر رہو، خالہ کا ہاتھ بناؤ کام کاج میں۔“ اس نے مدبرانہ انداز میں کہا۔

”میں کوئی کام والی مای تھوڑی ہوں کہ ہر وقت کام ہی کرتی رہوں۔“ اس نے برا سامنے بناتے ہوئے کہا۔

”اچھی لڑکیاں اپنے گھر کا کام خود کرتی ہیں۔“ اس نے تاحسانہ انداز میں کہا۔

”چلو، اب بورن کرنا امی کی طرح نصیحتیں کر کے، متوقع سسرال سے ڈرا کے۔“ اس نے کچھ اس انداز سے کہا کہ وہ ہنس دیا۔

”تمہیں سسرال سے کیا ڈرانا، ہاں تمہارے ان لا کو تو تم سے ڈرنا پڑے گا۔“ وہ شرارت آمیز لہجے میں بولا۔

”کیوں؟“ اس نے غصے سے آنکھیں نکالیں۔

”نہیں لیں۔ ویسے ہی۔“ وہ ہنستے ہوئے بچن سے باہر آ گیا تھا۔

☆☆☆☆

”آج اسے اپائنٹمنٹ لیٹر ملا تھا۔ کتنی دیر بے نتیجہ سے وہ اسے دیکھتی رہی تھی۔ کیونکہ اسے یقین تھا کہ وہ شخص اسے ہرگز اپنے آفس میں جگہ نہیں دے گا۔

آفس میں اس کا پہلا دن تھا۔ تک سب سے تہ ہو کر وہ مقررہ وقت تک آفس پہنچ گئی تھی۔

”مس معصومہ میرے روم میں آئیں۔“ اس نے سامنے سے گزرتے ہوئے اسے کہہ کر وہ اندر چلا گیا۔

”مے آئی کم ان سر؟“ وہ اٹھ کر آفس میں آئی۔

”ہیں.....“ وہ اپنے لیپ ٹاپ کو بیگ میں نکال کر ٹیبل پر رکھ کر آن کرتے ہوئے بولا۔ اسے سمجھاتے ہوئے وہ بہت تیزی سے لیپ ٹاپ اٹھایاں چلا رہا تھا۔ اور وہ پورے دھیان سے اس

گہری سوچ میں گم تھا۔

”سراخرو پو شروع کریں۔“ بالآخر اس نے کہہ ہی دیا۔

”اس کی فی الحال ضرورت نہیں ہے، ہاں آپ کھری، کھری سنانے کا شوق پورا کر سکتی ہیں۔“ ساتھ ہی اس نے چیئر کو گھمایا اور رخ پھیر کر اس کی طرف منہ کیا۔

”آ.....؟“ کا تو تو بدن میں لہو نہیں کے مصداق وہ لب لب لب واکے اسے دیکھ رہی تھی۔

”ہیں اس آفس کا خبیثت پاس میں ہی ہوں۔“ اس کے چہرے پر ایک رنگ آ رہا تھا تو دوسرا جا رہا تھا۔

”مم..... میرا یہ مطلب نہیں تھا۔“ اسے ڈھیروں شرمندگی نے آن گھیرا۔ فوراً رنگاں ہیں جھکا گئیں۔

”اب جو کچھ سنا چاہتی ہیں، سنا دیں۔ ورنہ بعد میں ہمیں بددعا سیں دیتی پھر سیں گی۔“ اس نے محظوظ ہوتے ہوئے اس کا جائزہ لیا۔

”آئے ایم سوری سر۔“ مارے خفت کے اس کا چہرہ سرخ ہو گیا۔

”اٹس اوکے! ویسے اگر آپ کو برا نہ لگے تو اپنا نام بتا سکتی ہیں؟“

اس نے نظریں اٹھا کر اسے دیکھا۔

”وہ..... دیسے آپ نے سی وی میں پڑھائیں کیا؟“

”آں..... ایک منٹ۔“ اس سے پہلے کہ وہ اور کچھ بولتی، اس نے ہاتھ اٹھا کر اسے بولنے سے روکا۔

”صرف اپنا نام پورا شجرہ نسب نہیں۔“ وہ شاید بدلہ لینے کے موذ میں تھا۔ اس سے پلکیں اٹھنا مشکل ہو گیا۔

”معصومہ شیراز۔“ اس نے مرے ہوئے انداز میں کہا۔ جانتی تھی وہ ریمیکس ہو چکی ہے مگر فی الوقت وہاں سے اٹھ کر جانا بھی ناممکن تھا۔

”فائل دیجیے.....“ اس نے خاموشی سے فائل میز پر اس کی طرف کھسکا دی۔ وہ کھول کر دیکھنے لگا۔

حالانکہ اس کے سی وی کی کاپی اس کی میز پر موجود تھی۔

”ویل مس معصومہ ٹھیک، ہم آپ کو کال کریں گے۔“ اس پورے عرصے میں اس نے یہ بات بغیر طنز کے اور سنجیدگی سے کہی تھی۔ وہ فائل اٹھا کر باہر نکل گئی۔

☆☆☆☆

”ڈونٹ بی سلی ولید، یہ کیسی باتیں کر رہے ہو۔“ اس نے ولید کا ہاتھ پکڑ کر اسے سہلایا۔ ”کچھ بھی فضول سوچنے کی ضرورت نہیں ہے۔“ اس نے اسے بھی پریشان کر دیا تھا۔

☆☆☆

اسے آفس جوائن کیے ہوئے دو ہفتے گزر گئے تھے۔ اس نے خدا کا شکر ادا کیا تھا کہ اسے کوئی مسئلہ نہیں ہوا۔ وہ کافی حد تک ایڈجسٹ ہو گئی تھی۔ ”محترمہ زہرا آفس میں تشریف لائیں۔“ انٹرکام پر سرشارم کی آواز سنتے ہی وہ جو ریمیکس بیٹھی تھی۔ ایک دم الارٹ ہو گئی۔

”میں سر.....!“ وہ فوراً اٹھ کھڑی ہوئی۔

”سے آئی کم ان سر.....؟“ اس نے دروازے میں کھڑے ہو کر اجازت طلب کی۔ وہ اسے خشکیں نگاہوں سے گھور رہا تھا۔ وہ اندر داخل ہو کر کرسی پر بیٹھ گئی۔ ”میں نے آپ کو بیٹھنے کے لیے نہیں کہا۔“ وہ غصہ ضبط کرتے ہوئے بولا۔

”سر کہنا چاہیے تھا ناں آپ کو..... یہ بات میسرز کے خلاف ہے کہ.....“ ”مس خاموش ہو جائیں۔“ وہ زور سے بولا۔ اس کی فرمائے سے چلتی زبان کو فوراً بریک لگ گئے۔ ”آپ کو کچھ اپورٹنٹ ڈاکومنٹس کے پرنٹس نکالنے کے لیے کہا تھا۔“

”سر میں نے ابھی نکال کر بھیجے ہیں آپ کو۔“ اس نے فوراً کہا۔

”یہ ان کی بات کر رہی ہیں آپ؟“ اس نے میز کے کونے میں پڑے کاغذات اٹھا کر اس کے سامنے رکھے۔ ”جی یہی.....“ اس نے کاغذات اٹھائے اور دیکھنے لگی۔ ”مائی گڈ نیس۔“ اس نے سر اٹھا کر شارم کے چہرے کی طرف دیکھا، جہاں غیظ و غضب اسے صاف نظر آ رہا تھا۔ وہ دوبارہ کاغذات کی جانب متوجہ ہو گئی۔ پہلے صفحے پر لکھا ہوا تھا۔

”مگر تے بالوں کی روک تھام، بالوں کو خوب

صورت بنانے، لمبا کرنے اور سیاہ کرنے کے لیے اسٹون کو ایک مرتبہ ضرور آزمائیں۔“ اس کے پیچھے لکھے ہوئے تھے..... اس نے جلدی سے کاغذ پلایا۔ ”اگر آپ کارنگ گورائیں ہے تو۔“

”میرا خیال ہے کچھ میسرز جاب کے لیے کم ہوتے ہیں مگر آپ ان سے نوٹس نا واقف ہیں۔“ اس کا آواز پر اس نے سر اوپر اٹھا کر دیکھا۔ ”وہ سرائیکوگی میں نے.....“

”آپ صرف ایک بات بتادیں۔“ اس نے ہاتھ اٹھا کر اسے مزید بولنے سے روکا۔ ”آپ یہ جاہ کرنا چاہتی ہیں یا نہیں.....؟“ اس کی اس بات سے معصومہ کے اوسان خطا ہو گئے۔

”سر پلیز یہ ظلم نہیں کریں، میرے چھوٹے، چھو۔ بہن، بھائی بھوک سے مرجائیں گے، میں مانتی ہوں مجھ سے غلطی ہو گئی، آئندہ ایسا نہیں ہوگا۔“ چہرہ دونوں ہاتھوں میں چھپا کر رو رہی تھی۔

”میرا یہ مطلب نہیں تھا مس معصومہ.....“ شار کو تو لینے کے دینے پڑ گئے۔ ”پلیز چپ ہو جائیں، اس نے گلاس میں پانی اٹھایا اور اس کے قریب آ کھڑا ہو گیا۔ ”یہ پانی پی لیں۔“ اسے سمجھ نہیں آ رہی کیا کرے۔

”دیکھیں مجھے کسی روتے ہوئے انسان اسپیشلی کسی لڑکی کو چپ کروانے کا کوئی تجربہ نہ ہے..... آپ پلیز چپ ہو جائیں۔“ اس نے اچھڑے سے ہاتھ ہٹا کر جھوٹ موٹ کے آنسو صاف کیے اور اٹھ کر باہر کی جانب چل دی۔ مبادا شارم اسے شکل دیکھ کر اس کی اداکاری کو بھانپ نہ لے۔ ”یہ اپنے ٹوٹے لیتی جائیں۔“ اس نے ہاتھ سے ہانک لگائی مگر اس نے ان سے ہی غافیت جانی۔ اس نے واپس آ کر سیٹ پر بیٹھتے ہی دیکھا جو کاغذ سر کو بھیجنے تھے وہ پڑے تھے۔

”باپ رے آج تو مشکل سے بچے۔“ اس ایک لمبی سانس فضا کے سپرد کی اور کام کی طرف

ہو گئی۔

☆☆☆

”معصومہ یہ میری شرٹ پریس کر دو گی؟“ وہ اپنے کل کے لیے کپڑے پریس کر رہی تھی جب ولید ہاتھ میں شرٹ پکڑے اس کے پاس آیا تھا۔ خالہ کی طبیعت کی وجہ سے وہ اور امی کچھ دن کے لیے ادھر ہی ٹھہر گئی تھیں۔

”کیوں نہیں ضرور.....“ اس نے شرٹ اس کے ہاتھ سے لے لی۔ اپنے کپڑے پریس کر کے وہ اس کی شرٹ پریس کرنے لگی۔ ”اوہ میں نے تو دودھ چولھے پر رکھا تھا۔“ وہ کچن کی طرف بھاگی مگر بہت دیر ہو چکی تھی۔ دودھ ابل کر چولھے کے علاوہ پورے فلیٹ اور نیچے فرش پر گر چکا تھا۔

”یہ کیا ہوا؟“ ولید اندر آیا..... اس نے معصومہ کے ہاتھوں کچن کی درگت بنے دیکھی تو پوچھے بنادرہ سکا۔ ”دودھ بواہل ہونے کے لیے رکھا تھا، میرے ذہن سے نکل گیا اور کپڑے پریس کرنے لگ گئی۔“ اس نے چولھا بند کیا۔

”کپڑے.....“ اس کے ذہن میں جھماکا ہوا۔ ”شرٹ.....“ وہ اندر کی طرف بھاگی استری اٹھائی مگر بے سود، شرٹ بری طرح جل چکی تھی۔ ”اوہ مائی گاڈ.....“ وہ مڑی۔ ولید سامنے ہی کھڑا تھا اس کے میروں تلے سے زمین نکل گئی۔

”وہ ولید.....“

”شرٹ اپ معصومہ.....!“ وہ غصے سے بھونکا۔ ”کوئی ڈھنگ کا کام کرنا بھی آتا ہے تمہیں۔ غلطی میری ہے، جو تمہیں کہہ دیا۔ ان فیکٹ تم کو کام کہنے سے بہتر ہے بندہ خود کر لے۔“ اس نے بولنے کے لیے منہ کھولا مگر اس سے پہلے کہ وہ کچھ کہتی وہ شدید غصے سے سر جھٹکتے پاؤں پٹختے وہاں سے چلا گیا۔

☆☆☆

وہ شرٹ سامنے رکھے ایک کے بعد دوسری شرٹ نکلوا رہی تھی مگر کوئی شرٹ بھی ویسی نہیں تھی جیسی کہ ولید کی تھی۔

واپس الف

”یہ دیکھیں یہ ٹھیک ہے۔“ سیلز مین نے ایک شرٹ اس کے سامنے رکھی۔

”یہ بھی صحیح نہیں ہے۔“ اس نے تنقیدی نظروں سے شرٹ کا جائزہ لیا۔ ”دیکھیں میم same ویسی چیز دوبارہ ملنا بہت مشکل ہوتا ہے۔“ سیلز مین بھی اب تنگ آ گیا تھا۔ ”ہیلو.....“ آواز سن کر وہ چونکی۔

”سر آپ.....“ وہ تھوڑا سا گڑبڑائی۔ ”السلام علیکم.....“

اس نے فوراً سلام جھاڑا۔ ”علیکم السلام۔“ اس نے شرٹ اٹھائی، اسے پلایا۔ ”سر یہ مجھے دے دیں۔“ اس نے ہاتھ آگے بڑھا کر شرٹ لینا چاہی۔ مگر تب تک وہ دیکھ چکا تھا۔ بے اختیار مسکراہٹ اس کے لبوں کو چھو گئی۔

”یہ حادثہ کب پیش آیا؟“ اس نے معصومہ کے شرمندہ چہرے کی طرف دیکھا..... اس نے کوئی جواب نہیں دیا اور خاموشی سے کھڑی لب چلی رہی۔

”آئیں میں آپ کو ایک شاپ دکھاتا ہوں وہاں سے ہم ایسی شرٹ مل جائے گی۔“ وہ نہ جانے کب سے وہاں کھڑا تھا..... شاید اس کا مسئلہ جان گیا تھا۔ وہ خاموشی سے اس کے ساتھ ہوئی۔

”ویسے یہ شرٹ ہے کس کی ہے؟“ شارم نے سرسری انداز میں پوچھا۔

”میرے کزن کی۔“ اس نے مختصر جواب دیا۔

”ویسے یہ کس طرح چلی؟“ وہ دھچکی سے پوچھ رہا تھا۔ اس نے تمام واقعہ بتا دیا۔

”ہا ہا.....“ وہ دل کھول کر ہنسا۔ وہ دونوں شاپ میں داخل ہو چکے تھے۔ شارم نے شرٹ دیکھنے میں اس کی مدد کی۔ تھوڑی دیر تک وہ دو کے بعد انہیں بالکل اسی طرح کی شرٹ مل گئی تھی۔

”آپ کی فیملی کے لوگوں کو تو عادی ہونا چاہیے اس چیز کا، آپ کے کزن نے نئی شرٹ کا مطالبہ کر دیا؟“ وہ شاپ سے باہر آ گئے۔

”اس نے نئی شرٹ کا مطالبہ نہیں کیا سر، اس نے مجھ سے بدتمیزی کی۔ ایک شرٹ ہی تو تھی پھر میں نے

## خوب صورت کلام

☆ ایک لمحے کا انصاف ستر سال کی عبادت سے افضل ہے۔ (حضرت محمد)  
☆ جس پر نصیحت اثر نہ کرے وہ جان لے کر ایمان سے اس کا دل خالی ہے۔ (حضرت ابو بکر صدیق)  
☆ ہر شے کا ایک حسن ہوتا ہے اور نیکی کا حسن یہ ہے کہ نوراً کی جائے (حضرت عمر فاروق)  
☆ جانور اپنے مالک کو پہچانتا ہے مگر انسان اپنے رب کو نہیں پہچانتا۔ (حضرت عثمان غنی)  
☆ علم حاصل کرنے کے لیے خود کو بیخ کنی کی طرح پکھلاؤ۔ (حضرت علی المرتضیٰ)

مرسلہ: عائشہ سجادہ، ڈی آئی خان

## قابل غور

☆ لوگوں کو معاف کرنا سیکھو..... ہمارا پروردگار تو بے پل ہمیں معاف کر دیتا ہے مگر ہم اپنے جیسے انسان کو معاف کرنے کا حوصلہ نہیں رکھتے۔  
☆ دوسروں کے حصے کا کام انہی کے لیے رہنے دیں، آپ اپنی ذمہ داری اپنے فرائض نیک مٹتی سے پورے کریں، ہم اپنی خوبیاں اور دوسروں کے عیب گناتے نہیں جھکتے۔  
☆ تجسس، ٹوہ اور آنا کالی سے بچیں، اس سے دل خراب رہنخوش میں اضافہ اور بد اعتمادی کی فضا فروغ پاتی ہے۔

☆ مگر کی بات یہ ہے جو آپ اپنے لیے چاہتے ہیں، وہی باشتا شروع کر دیں، لوٹ کے وہی چیز آپ کے پاس ضرور آئے گی۔ کبھی غور کیا کہ غصہ کریں گے، دوسرے کی بے عزتی کریں گے تو یہی چیز بالآخر پلٹ کر بھی ملتی ہے۔  
☆ دوسروں کو بدلنے کے بجائے خود کو بدلیں..... پوری دنیا بدل جائے گی۔ فکر و نظر میں وسعت پیدا کریں، تنگ نظری اور کوتاہ فکری تعلقات اور رشتوں کو دیکھ کی طرح چاٹ جاتی ہے۔  
از: نورین شہزادہ، کراچی

”تم اسے کیسے جانتے ہو؟“ اس کے جاتے ہی معصومہ نے جھٹ پوچھا۔  
”ایک سیمار میں ملاقات ہوئی تھی۔ بہت اچھا انسان ہے۔“ ولید نے تعریف کی۔ اس نے خاموشی میں ہی عافیت جانی۔

☆☆☆

”ہیلو..... السلام علیکم ایو..... کیسے ہیں آپ؟ اب طبیعت کیسی ہے؟ امی بتا رہی تھیں کہ آپ کی طبیعت کچھ تازہ ہے۔ آپ واپس آ جائیں بس، میں آپ کو اتنا مس کرنی ہوں۔ ویسے آپ کب آرہے ہیں؟“ اس نے ایک ہی سانس میں اتنے سارے سوال کر ڈالے۔  
”ارے لڑکی ذرا چھری تلے دم تو لو۔“ امی نے اسے گھر کا۔

”اور ابوائی ہر وقت مجھے ڈانٹتی رہتی ہیں، سارا دن گھر کا کام کرواتی ہیں۔“ اس نے شرارت سے امی کی طرف دیکھا۔

”تو یہ ہے خدا کی پناہ تم سے۔“ امی اس کی شرارت کو بھانپتے ہوئے مسکرا دیں۔ جبکہ ولید بغور اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔ بے پروائی سے شانے پر جھولتا دو پٹا، بکھرے بالوں کو پچھر میں قید کیے، چہرے پر سارے جہان کی معصومیت، آواز میں شرارت اور آنکھوں میں ایک عجیب سی چمک کے ساتھ وہ عام لڑکیوں سے بہت مختلف نظر آ رہی تھی۔

خالہ جان بھی اس کی شرارت پر مسکراتے ہوئے اسے محبت پاش نظروں سے دیکھ رہی تھیں۔ انہیں وہ بے حد بیاری لگتی تھی۔

☆☆☆

”آہ.....!“ وہ تیزی سے آفس کی سیڑھیاں چڑھ رہی تھی جب بے خیالی میں سامنے سے آتے وجود سے بری طرح ٹکرائی۔ اس کا سر مقابل کے چوڑے سینے سے ٹکرایا اور خوشبو کو جھوکا اس کے تھنوں میں گھس گیا۔  
”نظر نہیں آتا آپ کو۔“ وہ دشتی سے بولی اور سر اوپر اٹھایا۔ ”اوہ سر آپ.....“ وہ اپنی پیشانی سہلانے لگی۔

پر آیا تھا۔ شرٹ اور دوسری چیزوں کا نقصان تو پورا ہو جاتا ہے مگر کبھی، کبھی ہماری بے پروائی اور غفلت ہمارا بہت بڑا ناقابل تلافی نقصان بھی کر دیتی ہے۔“ اس نے اپنا نیت سے کہا۔

”جانتی ہوں، میں بہت بری اور بے وقوف ہوں۔“ وہ ہنوز سنجیدہ تھی۔

”کم آن معصومہ..... اب یہ ایسٹنل بلیک میلنگ چھوڑ دو اور ریڈی ہو جاؤ ہم آفس کریم کھانے چلتے ہیں۔“ اس نے بشت سے مسکراتے ہوئے کہا۔ وہ بھی زیادہ دیر انکار نہیں کر سکتی تھی، تیار ہونے چلی گئی۔ کچھ ہی دیر میں وہ اس کے ساتھ باہر جا رہی تھی۔  
”بہت مزے کی ہے آفس کریم۔“ وہ ارد گرد سے بے پروا بڑے سکون سے کھا رہی تھی۔

”اب گھر چلیں؟“ آخر کار ولید کو کہنا پڑا۔  
”ابھی نہیں.....“ ولید نے سر پکڑ لیا۔  
”ہیلو.....“ آواز اس کر ولید نے سر اٹھایا۔

”السلام علیکم.....“ وہ اٹھ کھڑا ہوا اور اس سے مصافحہ کرنے لگا وہ جو بڑے سکون سے آفس کریم کھا رہی تھی بل بھر کو نظریں اٹھائیں اور پگلس جھپٹا بھول گئی۔  
”کیسے ہیں آپ؟“ ولید نے دریافت کیا۔  
”لیس آئی ایم فائن.....“ وہ دوستانہ انداز میں مسکرایا۔  
”ہاؤ آریو.....“ وہ سر جھٹک کر دوبارہ آفس کریم کھانے میں مصروف ہو چکی تھی۔

”یہ کون ہیں؟“ اب وہ ولید سے پوچھ رہا تھا۔  
”اونہ، ڈرامے باز.....“ وہ دانت چیں کر رہ گئی۔ ”ایکٹنگ ایسے کر رہا ہے جیسے مجھے جانتا ہی نہیں۔“ وہ دل ہی دل میں تلملا کر رہ گئی..... مگر اس پر کچھ ظاہر نہیں ہونے دیا۔

”یہ.....“ ولید نے اس کی طرف دیکھا..... ارد گرد سے بے نیاز وہ آفس کریم کھا رہی تھی۔ انداز بالکل بچوں جیسا تھا۔ ”میری کزن ہے۔“ اس نے بدقت تمام کہا۔  
”شارم کے سامنے اسے سنی کا احساس ہوا۔  
”اوکے انجوائے یور سیلف، سی یو.....“ اسے ہاتھ ہلا کر وہ چلا گیا۔ ولید بیٹھ گیا۔

سوری بھی کہہ دیا تھا۔“ وہ سادگی سے بولی۔  
”ہاں یہ تو ہے۔“ اس نے اس سے اتفاق کیا..... ”چنانچہ اور ہونے والا ہے، کیا خیال ہے لیج میں آپ مجھے جوائن کر سکتی ہیں؟“ اس کی پیشکش پر اسے اچھا ہوا تھا۔

"sorry sir, but this is impossible for me"

اس نے دو ٹوک جواب دیا۔  
"why?" وہ پوچھے بنانہ رہ سکا۔

”میں کس حیثیت سے آپ کے ساتھ بیٹھ کر کھانا کھاؤں؟“ اس نے چبھتی ہوئی نظروں سے اسے دیکھا۔  
”جس حیثیت سے آپ نے مجھ سے لفٹ لی تھی

اور جس حیثیت سے ابھی میرے ساتھ ہیں۔“  
”آپ جانتے ہیں میں نے لفٹ انتہائی مجبوری کی حالت میں لی تھی اور ابھی آپ نے اپنی مرضی سے میری ہیلپ کی ہے۔“ اس کی بات معصومہ کو سخت بری محسوس ہوئی تھی۔

”دیری گڈ.....“ وہ استہزائیہ انداز میں ہنسا تھا۔  
”عام حالات میں جو چیز آپ کے لیے ناجائز ہے وہ مشکل وقت میں جائز ہو جاتی ہے، اچھے اصول ہیں آپ کے..... بٹ اپنی ویز، ایز یوٹس۔“ وہ بے لے لیے ڈگ بھرتا اس سے دور ہوتا گیا جبکہ وہ..... پتھر کا بت بنی وہیں کھڑی رہی۔

☆☆☆

وہ شرٹ لے کر ولید کے کمرے میں آئی تھی۔  
”معصومہ اس کی کیا ضرورت تھی۔“ وہ شرٹ دیکھ کر شرمندہ ہوا تھا۔ ”میں نے کیا تم سے کہا تھا کہ مجھے شرٹ لا کر دو۔“

”تم نے نہیں کہا تھا مگر مجھ سے تمہارا نقصان ہوا میں نے ضروری سمجھا اسے پورا کر دو۔“ وہ سنجیدگی سے بولی۔

”آئی ایم سوری معصومہ..... شاید میں زیادہ ہی بارش ہو گیا تھا مگر معصومہ بات شرٹ کی نہیں تھی۔“ وہ اٹھ کر اس کے قریب آیا۔ ”مجھے غصہ تمہاری بے پروائی



وہ بری طرح ہرٹ ہوئی تھی۔

”تو پھر مان لو بات، یہی تمہارے ابو کی بھی خواہش ہے۔“ انہوں نے جتنی نظروں سے اس کی جانب دیکھا۔

”بھئی کیا بات منوائی جا رہی ہے ہماری بیٹی سے؟“ ابو بولنے ہوئے اندر کمرے میں داخل ہوئے۔

”آپ ہی سمجھا میں اپنی لاڈلی کو میٹر مہ فرماتی ہیں شادی نہیں کروں گی۔“ اسی کچھ ناراضی باہر نکل گئیں۔

”ارے نہیں، میری بیٹی تو بہت سمجھدار ہے۔“ ابو اس کے پاس بیٹھ گئے، اس نے مارے شرم کے سر جھکا لیا۔

”مجھے ہمیشہ آپ کے ساتھ رہنا ہے ابو۔۔۔۔۔“ اس نے کچھ جھجکتے ہوئے ان سے کہا۔

”کیا اپنے ابو کی بات بھی نہ مانو گی؟“ انہوں نے اس کے سر پر ہاتھ رکھتے ہوئے پیار سے کہا۔

”میں نے اس رشتے کے لیے تقریباً ہاں کہہ دی ہے، میرا مان نہ توڑنا بیٹا۔۔۔۔۔ ہمارا یہ فیصلہ تمہارے لیے

بہت اچھا ثابت ہوگا۔“ اس نے تیزی سے سر اوپر اٹھایا۔ اس کی آنکھوں کی سطح پر نمی تیرنے لگی۔ ”لیکن اگر تم راضی نہیں تو میں مجبور نہیں کروں گا۔“ وہ اٹھ کر باہر چلے گئے۔

اس نے ہاں کر دی تھی۔ ایسا کیسے ہو سکتا تھا کہ وہ ابو کو مایوس کرتی۔۔۔۔۔ اسے مان رکھنا آتا تھا۔

☆☆☆

وہ سر جھکائے خیالوں میں محو بیٹھی تھی کہ دفعتاً کمرے کا دروازہ کھلا تھا۔ اس نے خیالوں کی دنیا سے

موڑ کاٹا اور حال میں لوٹ آئی۔

”السلام علیکم۔۔۔۔۔“ کارپٹ پر دبے قدموں چلتا ہوا وہ اس کے سامنے سے گزر کر شاید کمرے کی کھڑکی میں جا کھڑا ہوا تھا۔

”کیسی ہیں آپ۔۔۔۔۔؟“ چند ٹائیپ خاموش رہنے کے بعد اس نے پوچھا تھا مگر جواب ندارد۔۔۔۔۔

”آپ کو تپا ہے آپ پچھلے مین منٹ اور 37 سینڈرز سے خاموش ہیں۔“ وہ جو اتنی دیر سے اس کی آواز پر غور کر رہی تھی، چونک کر سراوڑ اٹھایا اس کے ہاتھوں کے

”ہاں الحمد للہ۔۔۔۔۔“

”میں کھانا گرم کرتی ہوں، آپ فریش ہو جائیں۔“ کچھ دیر باتوں کے بعد ای نے کہا اور اٹھ کر کچن میں چلی گئیں۔

”ہاں بہت زور کی بھوک لگی ہے، معصومہ نے خاص ہدایت کی تھی کہ کھانا گھر پر ہی کھانا ہے۔ اس لیے میں نے راستے میں کچھ نہیں کھایا۔“

”ابو آپ کتنے اچھے ہیں۔“ وہ خوش ہوتے ہوئے بولی۔

”ابو، کس کا ہوں۔۔۔۔۔“ انہوں نے پیار سے چپت اس کے سر پر سید کی پھر دونوں ہنس دیے۔

☆☆☆

رات آدھی سے زیادہ بیت چکی تھی۔ وہ میسر پر کھڑا تھا۔ ہلکی ہلکی ہوا چل رہی تھی۔

”میں نے اتنا بڑا جرم تو نہیں کیا تھا، جس کی تم یہ سزا دے سکتی۔“ چشم تصور میں وہ اس سے مخاطب ہوا۔

ہوا کی سرسراہٹ اور خشک پتوں کی کھٹکناہٹ بھی اس کی محویت میں نخل نہ ہو سکے۔

”مجھے پتا ہی نہیں چل سکا کہ تم میرے لیے اتنی اہم ہو گئیں۔ تمہیں کھودینے کے بعد تمہاری اہمیت کا اندازہ ہوا۔“ اس نے ایک طویل سانس فضا کے سپرد کی۔

”کیا کروں، کہاں سے ڈھونڈ لوں تمہیں؟“ جانک دودھیا روشنی کی ہر طرف پھیلی ہوئی تھی۔ اس کا دل بری طرح سے اداں تھا۔

☆☆☆

ای، ابو کی خفیہ میٹنگز بڑھتی جا رہی تھیں۔ وہ کچھ الجھی مگر ظاہر نہ کیا۔ وہ ابو کے آجانے سے بہت خوش تھی۔

جلدی ہی ان کی میٹنگز کا رزلٹ اس کے سامنے آ گیا۔

”امی مجھے شادی وادی نہیں کرنی۔“ وہ منہ پھللا کر نزوٹھے پن سے بولی۔

”دیکھو معصومہ فضول کی خدمت کرو پھر کیا تم ولید کی وجہ سے۔“

”امی۔۔۔۔۔“ اس نے سخت شاک کی نظروں سے ان کی طرف دیکھا۔ ”آپ ایسا سوچ بھی کیسے سکتی ہیں۔“

اور بڑھ گئی جب وہ اگلے دن بھی نہیں آئی اور اس طرح پورا ایک ہفتہ گزر گیا۔

☆☆☆

”بہت مایوس کیا ہے تم نے مجھے ولید۔۔۔۔۔“ وہ شام کو گھر آیا تو ای نے پھر وہی موضوع شروع کر دیا۔

”ای مجھے معاف کر دیں، میں اس معاملے میں خود کو مجبور پاتا ہوں۔ عمر بھر کی بات ہے، میں۔۔۔۔۔“

”زمانے کی چالاک اور ہوشیاری سے انجان وہ ایک معصوم لڑکی ہے۔“ انہوں نے سمجھانے کی ہر ممکن کوشش کر ڈالی مگر بے سود۔۔۔۔۔

”میں سب باتیں کئی بار سن چکا ہوں۔۔۔۔۔ پلیز ان کو ڈہرانے کا کوئی فائدہ نہیں ہے۔“ وہ اٹھ کر اندر کی جانب بڑھ گیا۔ جبکہ وہ خفگی سے اس کی پشت کو گھور کر رہ گئیں۔

☆☆☆

”تمہیں پتا ہے اگلے ہفتے تمہارے ابو آرہے ہیں۔“ وہ کوئی کتاب پڑھ رہی تھی۔ ایک دم سے اس کا چہرہ کھل اٹھا تھا۔

”سچ امی۔۔۔۔۔؟“ وہ بے حد خوش تھی، ابو دو سال بعد واپس آرہے تھے۔

”بالکل سچ۔۔۔۔۔“ اسے خوش دیکھ کر وہ بھی مسکرا دیں۔

”بس اب میں ابو کو واپس جانے نہیں دوں گی۔“ اس نے کتاب بند کر کے رکھ دی۔

پھر وہ ابو کے آنے کی تیاریوں میں مصروف ہو گئی۔۔۔۔۔ سارے گھر کی خوب صفائیاں کیں۔۔۔۔۔ امی کے ساتھ مل کر شاپنگ کر کے آئی جس دن انہوں نے آنا تھا امی کے ساتھ مل کر کھانا بنوایا۔

”ابو! رات دو بجے کے قریب وہ گھر پہنچے تھے۔ وہ ان کے انتظار میں جاگ رہی تھی۔ بھاگ کر ان کے سینے سے جا لگی۔

”کیسی ہے میری بیٹی؟“ انہوں نے اس کا سر چومنا تھا۔ اسے دیکھ کر وہ اندر تک سرشار ہو گئے تھے۔

”آپ کے لیے بہت اداں تھی۔“ وہ لوگ اندر کمرے میں جا بیٹھے تھے۔

”سفر ٹھیک رہا؟“ امی ان کا بیک اٹھا لائیں۔

گئیں۔ ”میں ولید کو ایسا نہیں سمجھتی تھی۔“ اسے روتا دیکھ کر ان کا دل کٹنے لگا۔

”نہیں تو نہ سہی۔۔۔۔۔ میری بیٹی کے لیے اللہ نے اس سے زیادہ اچھا سبب بنا دینا ہے۔ وہ خود کو کیا سمجھتا ہے۔“ وہ اس کا سر سہلانا لگیں۔

”آج میرے پاس نے بھی کہہ دیا کہ آپ ایک بے وقوف لڑکی ہیں، امی کیا واقعی میں اتحق ہوں؟“

اس نے اچانک سراوڑ اٹھا کر ان کی طرف دیکھا۔

اس کے چہرے پر بلا کی معصومیت تھی۔ انہیں اس پر ٹوٹ کر پیار آیا۔

”دفع کرو پاس کو اور سب کو۔۔۔۔۔ یہ دنیا تو کسی حال میں خوش نہیں ہوتی میری بیٹی تو بہت اچھی ہے۔ معصوم اور صاف شفاف طبیعت کی مالک، دوسری لڑکیوں کی طرح چالاک اور دھوکے باز نہیں ہے۔“

انہوں نے اس کے زخموں پر مرہم رکھنے کی کوشش کی تھی۔ ”اور اب آفس جانے کی بھی ضرورت نہیں ہے۔“ اور خود اس کا بھی ایسا کوئی ارادہ نہیں تھا اس لیے خاموش ہی رہی۔

☆☆☆

غصے میں آکر اس کو اتنا کچھ منڈا لایا تھا اور پھر جلد ہی اسے اپنی غلطی کا احساس ہونے لگا۔ اس نے خود کو مصروف کرنے کی بہت کوشش کی مگر اس کا خیال ذہن سے جو نہیں ہو رہا تھا۔

”یہ مجھے کیا ہو رہا ہے؟“ وہ آفس کی گلاس وال کے قریب جا کھڑا ہوا اور باہر سڑک پر بھاگتی دوڑتی ٹریفک کو دیکھنے لگا۔ ”وہ بالکل خاموش تھی، کچھ نہیں کہا، ورنہ عام طور پر چپ ہوتی نہیں ہے۔“ آخر کار اس سے رہا نہیں گیا اسے بلوا بھیجا۔

”سرس معصومہ آفس سے جا چکی ہیں۔“ ملازم اٹلے قدموں واپس آیا۔

”جا چکی ہیں؟“ وہ تیزی سے پلٹا تھا۔ ”مگر کب؟ اور کہاں؟“ اسے حیرت کا شدید جھٹکا لگا تھا

”بتا کر نہیں گئیں۔“ وہ باہر نکل گیا۔ اس کی پریشانی میں مزید اضافہ ہو گیا اور یہ پریشانی اس وقت

ہیں، مجھے اندازہ نہیں تھا۔ میرے معصوم والدین کو  
 ماہنامہ پاکیزہ

یہاں - میں - وہ اسے ساتھ لے کر بیڈ تک

چھوڑ دینے کی بات کبھی نہیں کریں گی۔“ وہ

فوشو مارموس کی نوید دے رہے تھے۔

2017ء

# بدلتے رشتے

غزالہ عزیز

Pakistanipoint

Waqar  
Fizem



لے زندگی اور وقت کی کڑی آزمائشوں میں سائبان کے مانند ہوتا ہے جو انہیں زمانے کے سرد و گرم سے بچا کر تحفظ دیتا ہے..... انہیں اپنے نرم ہاتھوں میں پروان پڑھا کے اتنا مضبوط بنا دیتا ہے کہ ایک دن اولاد خود اپنے، ساتھ ماں، باپ کی محافظ بھی بن جاتی ہے۔ ماں، باپ کے وجود کی قدر و اہمیت بھی کم نہیں ہوتی۔ اولاد چاہے عمر اور ترقی کے کتنے ہی زینے عبور کر لے مگر والدین کی ضرورت اسے ہمیشہ رہتی ہے اور یہ ضرورت

ماواں ٹھنڈ یاں چھاواں..... ماؤں کو ٹھنڈی چھاؤں کہا جاتا ہے کیونکہ ان کے قدموں تلے جنت ہوتی ہے اور جنت کا احساس ہی ٹھنڈک و راحت بھرا ہوتا ہے۔ دوسری طرف باپ بھی اولاد کے لیے چتھی دھوپ میں محفوظ سائبان کی حیثیت رکھتا ہے۔ باپ کا درجہ بھی کسی طور ماں سے کم نہیں ہوتا۔ اور سچ تو یہ ہے کہ ماں، باپ دونوں ہی اللہ تعالیٰ کی طرف سے اولاد کے لیے آسمانی تحفہ ہوتے ہیں۔ جن کا وجود اولاد کے

لوگوں کے قیام و طعام کا بندوبست دیکھتی ہوں۔“ آمنہ بی بی کمرے کے ایک کونے میں سوگوار بیٹھی بسمہ پر ایک تاسف بھری نگاہ ڈال کر اٹھنے لگی تھیں۔ تب ہی شاہینہ کے ساتھ بیٹھے اس کے شوہر عامر نے نظروں ہی نظروں میں بیوی کو اشارہ کیا تھا جس کا مفہوم سمجھتے ہوئے شاہینہ نے فوراً ہی آمنہ بی بی کے سوال کا جواب دینے کا فیصلہ کر لیا۔

”معاف کیجیے گا استانی جی..... میں تو بسمہ کی ذمہ داری اٹھانے سے قاصر ہوں۔ میں تو خود دو کمروں کے چھوٹے سے فلیٹ میں رہائش پزیر ہوں، اب بچوں کے ساتھ بسمہ کو کیسے اپنے ساتھ رکھ سکوں گی۔ میرے خیال میں بسمہ اب ماموں، ممانی کے ساتھ رہے تو زیادہ مناسب رہے گا۔“ وہ جوان بہن کا بھاری بوجھ اٹھانے سے صاف معذرت کر چکی تھی۔ جس کی شاید ایک سے زیادہ وجوہات ہوں گی۔ مگر شاہینہ کی بات نے صوفے پر ساتھ ہی بیٹھی ممانی صاحبہ کے ماتھے پر بے ساختہ بڑنے والی ناگواری کی سلوٹوں میں اضافہ کر دیا تھا۔ وہ بھی شاہینہ کی طرح اس ذمہ داری کو اپنے سر لینے کو ہرگز تیار نہیں تھیں بلکہ وہ تو گھر سے ہی دل میں فیصلہ کر کے آئی تھیں کہ انہیں اس معاملے پر کیا دلائل دے کر انکار بلکہ معذرت کر کے اپنا دامن بچانا ہے۔ لہذا شاہینہ کا عذر سن کر وہ بے ساختہ بولی تھیں۔

”تمہاری بات معقول ہے شاہینہ..... لیکن ہماری مجبوری یہ ہے کہ میں اور تمہارے ماموں بچوں کے ساتھ حیدر آباد شفٹ ہو رہے ہیں تمہارے ماموں کا حیدر آباد ٹرانسفر ہو گیا ہے اور ابھی ہم اپنے بھائی کے گھر رہائش رکھیں گے۔ لہذا ہم بسمہ کو فی الحال اپنے ساتھ نہیں لے جاسکتے..... اس لیے ابھی کچھ عرصے کے لیے تو تم ہی بسمہ کو اپنے ساتھ لے جاؤ۔ مگر حیدر آباد پہنچ کر اپنی رہائش کا بندوبست ہوتے ہی ہم جلد ہی بسمہ کو بلانے کا بندوبست کر لیں گے۔“ نورین بیگم نے بڑی صفائی سے اپنا دامن بچایا تھا۔ اور کسی کو اعتراض کرنے

دونوں بہنیں ایک دوسرے سے گلے لگ کر خوب دھاڑیں مار، مار کر روئی تھیں۔

ماں کے بعد اس کے لیے باپ کا ہی واحد سہارا تھا۔ جس کے سائے میں وہ زندگی گزار رہی تھی۔ اب وہ سہارا بھی قضائے اجل نے چھین لیا تھا..... اور اسے لگ رہا تھا کہ وہ باپ کا سائبان چھٹنے کے بعد کھلے آسمان تلے آگئی ہے۔ کیونکہ باپ کی میت اٹھنے کے ساتھ ہی اس کی زندگی کا فیصلہ بھی ہوتا تھا۔ اب وہ کس کے ساتھ یا کس کے پاس رہے گی۔ اور پھر میت اٹھنے کے بعد گھر میں موجود لفظوں بھی ایک، ایک کر کے اٹھنے لگے تھے۔ دوپہر سے شام ہوئی پھر مغرب کی اذانوں تک سارا گھر خالی ہو گیا۔ صرف اس کے ماموں، ممانی اور بہن، بہنوئی ہی گھر میں موجود تھے۔ جن کے درمیان بیٹھ کر آمنہ بی بی نے بسمہ کی ذات کے حوالے سے ان کے سامنے سوال رکھا تھا کہ اب بسمہ کو اس گھر سے اپنی ذمہ داری بنا کر کون لے جائے گا۔ کیونکہ باپ کی موت کے بعد جوان جہان لڑکی بہر حال اکیلے گھر میں نہیں رہ سکتی تھی۔ اس ذمہ داری کو اب پیچھے بچ جانے والے خونی رشتوں نے ہی اٹھانا تھا۔ آمنہ بیوہ عورت تھیں اور اپنے بیٹے کے ساتھ رہتی تھیں۔ اس لیے انہیں مناسب نہیں لگا تھا کہ بسمہ اب اس گھر میں رہے۔ مگر آمنہ بی بی کو اپنے سوال کا جواب دینے والے چاروں چہروں پر سناٹا دکھائی دے رہا تھا۔ جو وہاں موجود ایک دوسرے سے نگاہیں چرانے لگے تھے۔ شاہینہ بڑی بہن ہو کر بھی متذبذب نظر آ رہی تھی تو ماموں، ممانی کے ہونٹوں پر بھی گہری چپ لکھی تھی۔ جسے پڑھنے میں آمنہ بی بی کو دشواری محسوس نہیں ہوتی تھی۔ لیکن انہیں اپنے سوال کا جواب ہر حال میں چاہیے تھا۔ لہذا اس طویل خاموشی کو آمنہ بی بی کی آواز نے ہی توڑا تھا۔

”میرے خیال میں آپ لوگ خود اطمینان سے آپس میں بات کر کے باہمی مشورے سے اس بارے میں فیصلہ کر لیں تو مناسب رہے گا۔ تب تک میں آپ

نے بھی ان ہی موذی بیماریوں کے ہاتھوں جان دے دی تھی۔ صبح وہ اچھے بھلے گھر سے پنشن لینے نکلے تھے اور واپسی چارکاندھوں پر ہوئی تھی۔

جانے بد نصیب بشیر احمد کے ساتھ آٹا فانا کیا ہوا تھا۔ دل کے دعا دینے پر بغضیں ڈوبنے لگی تھیں، شوگر لیول بڑھی تھی یا پھر بلڈ پریشر کی اونچائی نے بلندی پر جا کر ان کی زندگی کی ڈور کوٹھوں میں کاٹ ڈالا تھا۔ تب روح کے جسم سے آزاد ہوتے ہی کسی ذی روح کو رحم آیا تھا۔ اور اس نے بشیر احمد کے چمڑے کے ہینڈ بیگ میں گھسا ہوا بدرنگ سیل فون نکال کر گھر پر فون کر دیا تھا۔ چھوٹے سے دل کی مالک بسمہ پر یہ خبر سن کر سکتہ طاری ہو گیا تھا۔

وہ تو شکر تھا کہ اس وقت آمنہ بی بی گھر پر موجود تھیں جنہوں نے اسے حوصلہ دیا تھا۔ اور اسے لے کر بتائے گئے پتے پر پہنچی تھیں۔ انہوں نے گھر سے نکلنے سے پہلے اس کی بڑی بہن شاہینہ کو بھی فون کر دیا تھا۔ مگر بسمہ اور آمنہ بی بی نے دیر کر دی تھی۔ وہ بشیر احمد کے پاس پہنچیں تو چند لمحوں پہلے ہی بشیر احمد کی روح قفسِ عنصری سے پرواز کر چکی تھی۔ ان کے گرد دو لوگوں کا جھوم اکٹھا تھا۔ اس دوران کسی نے ایسبولینس کو فون کر دیا تھا۔ بسمہ پر تو سکتہ طاری ہو گیا تھا۔ وہ لنگ رہ گئی تھی۔ آمنہ بی بی نے اپنے بیٹے کو فون کر کے فوری طور پر اسے وہاں تک بلایا تھا۔ اور اس کے پہنچنے ہی ایسبولینس بھی پہنچی تھی۔ تب وہ قریبی اسپتال لے جا کر بشیر احمد کی موت کی تصدیق کے بعد گھر لے آئے..... جہاں شاہینہ اور اس کے شوہر کے ساتھ دیگر قریبی و دور کے رشتے دار اور محلے والے اکٹھا ہو چکے تھے۔ آمنہ بی بی کے بیٹے نے اسپتال سے گھر فون کر دیا تھا۔ اور اس وقت صحن میں رکھی تیار میت کے گرد محلے کے افراد کے علاوہ کچھ قریبی رشتے دار ماموں، ممانی اور شاہینہ کے سسرال والے موجود تھے۔ دونوں بہنیں ایک طرف سوگوار بیٹھی تھیں۔ بسمہ کا سکتہ بھی صحن میں رکھی باپ کی میت پر پڑ کر تپتی بہن کی چیخوں سے ہی ٹوٹا تھا۔ اور پھر

اس وقت بڑی شدت سے محسوس ہوتی ہے جب یہ نعمت بدقسمتی سے اولاد سے چھین جاتی ہے۔ تب احساس ہوتا ہے کہ انسانی زندگی میں انسان جتنے بھی رشتے بناتا ہے وہ اکثر ناپائیدار ثابت ہوتے ہیں۔ بس ایک ماں، باپ کا ہی رشتہ ایسا ہوتا ہے جو کسی بھی غرض و مفاد سے پاک، خالص، سچا اور کھرا ہوتا ہے اور جو کسی بھی دولت سے کم نہیں..... جو اگر کوئی اس نعمت سے محروم ہو جائے تو وہ صحیح معنوں میں کنگال ہو جاتا ہے اور زمانے کے بازار میں یہ انمول دولت بھی کمائی نہیں جاسکتی۔ کیونکہ یہ صرف عطا ہوتی ہے۔ بسمہ سے جب یہ عطا چھین گئی تو وہ صحیح معنوں میں خالی ہاتھ، خالی دامن اور خالی دل کے ساتھ ویران ہی نہیں سیم اور بے آسرا بھی ہو گئی۔ اتنی بڑی دنیا میں اس کے پاس صرف چند ہی خونی رشتے بچے تھے۔ جن میں ایک بڑی بہن، ماموں اور ایک چھوٹی..... ماں، باپ قضائے الہی سے دنیا سے رخصت ہو گئے اور بڑی بہن پرانی ہو گئی۔ اور ماں، باپ نے جو رشتہ اس کے لیے ڈھونڈا تھا اس نے بھی طلاق کا داغ لگا کر چند ماہ میں ہی اسے واپس گھر بھیج دیا تھا۔ ایک روحانی رشتہ آمنہ بی بی کا رہ گیا جو بہت سالوں سے اس کی رہنما و استاد تھیں۔

استاد بچوں کے روحانی ماں، باپ ہوتے ہیں۔ بسمہ کے لیے اس کے بچے سچے خونی رشتے زندگی اور وقت کی آزمائش میں ناکام ہو کر بسمہ کو بھری دنیا میں تنہا کر گئے۔ جس کے بعد آمنہ بی بی ہی اس کی رہنما، چارہ گر اور غم گسار تھیں۔ وہ اصل میں اس کی مالک مکان تھیں۔ اب صرف نیگیس سالہ طلاق یافتہ بسمہ اپنے بوڑھے باپ کے ساتھ ان ہی کے مکان کے نچلے پورشن میں بطور کرایے دار رہ رہی تھی۔ آمنہ بی بی شاہینہ اور بسمہ کی اسکول اور نیوٹن بچہ تھیں مگر وہ اسے حوصلہ اور رہنمائی ہی دے سکتی تھیں۔ سہارا اور تحفظ نہیں..... اور بسمہ کو تو دونوں چیزیں چاہیے تھیں۔ سال بھر پہلے ماں کو شوگر اور بلڈ پریشر کے مرض نے موت کا اڑو دھابن کر رکھ لیا تھا۔ اور سال بھر بعد نانا تو ان باپ

کا موقع بھی نہیں دیا تھا۔ جبکہ ان کے شوہر نامداریوں خاموش بیٹھے تھے جیسے بیوی کا کہا پتھر کی لکیر ہو۔

اور یوں بسمہ کی قسمت کا فیصلہ ہو گیا۔ ممانی صاحبہ نے بڑی چالاکی سے شاہینہ کے لیے مزید کسی بہانے کا عذر ہی نہیں چھوڑا تھا اور ہوا بھی یہی تھی۔ شاہینہ چالاک ممانی کی ہوشیاری بھانپ کر منہ بناتے ہوئے وہیں سوئے بچے کو اٹھا کر انہیں ملاستی نگاہوں سے دیکھتی بچے کو دوسرے کمرے میں سنانے کا کہہ کر چلی گئی۔ ممانی نے بھی شوہر کو آنکھ کے اشارے سے اٹھنے کو کہا۔ اور آمنہ بی بی... دونوں طرف کی معذرت سننے کے بعد کمرے کے ایک کونے میں سو گوار بیٹھی بسمہ کو تاسف بھری نگاہوں سے دیکھتے ہوئے یہی سوچنے لگیں کہ واقعی ماں، باپ کا مضبوط سائبان اولاد کے لیے کسی نعمت سے کم نہیں ہوتا ہے لیکن اگر یہ سایہ بد قسمتی سے چھن جائے تو اولاد صحیح معنوں میں زمانے کی ٹھوکروں پر آ جاتی ہے۔ وہ اس کے لیے بہت دھمی اور افسردہ تھیں لیکن چاہے کبھی کبھی نہ کر سکتی تھیں۔ وہ خود جوان بیٹے کی ماں تھیں۔ اور جوان لڑکی کی ذمہ داری چاہے کبھی نہیں اٹھا سکتی تھیں۔ بھلا ان کا رشتہ ہی کیا تھا، بسمہ کے سگے خونی رشتوں کے سامنے... وہ اس کی استانی اور مالک مکان تھیں۔ اس لیے مجبوراً خاموش رہیں۔

نورین ممانی نے تو شوہر کو یتیم بھانجی کے سر پر حوصلے کی تلقین کے لیے ہاتھ رکھنے کی مہلت بھی نہیں دی تھی۔ ہاں جاتے، جاتے انہوں نے بسمہ کے سر پر ہاتھ رکھ کر مغموں لہجے میں چند نلی و حوصلے کے روایتی بول بولے تھے اور جلدی سے باہر نکل گئیں۔

بسمہ تو بس سو گوار چہرے اور ہنسی آنکھوں کے ساتھ بے حس و حرکت بیٹھی تھی۔ رشتوں کے بے حس رویوں نے شاید اس کے وجود کو بھی سن (بے جان) کر دیا تھا۔ اور پھر عامر بھی اٹھ کر ممانی کے پیچھے کمرے سے باہر نکل کر دوسرے کمرے میں اپنی بیوی شاہینہ کے پاس چلا گیا تاکہ اسے تازہ ترین صورت حال سے آگاہ کر سکے۔ مگر آمنہ بی بی کو بسمہ کی حالت اور ان

حالات پر بڑا تاسف ہو رہا تھا۔ وہ کمرے سے باہر جانے کے بجائے بسمہ کے پاس وہیں فرش پر کچھی بزر در پر بیٹھ گئیں۔ انہیں لگا تھا شاید بسمہ کو ان کی ضرورت ہے۔ اپنی نہ ہو کر بھی ان کا ساتھ اپنائیت کا باعث تھا۔ لہذا بسمہ نے بھی وقتی طور پر اس سہارے کو تھا مایا تھا۔

☆☆☆

”تو پھر کیا سوچا ہے تم نے عامر... ماموں اور مامی نے تو بڑی چالاکی سے صاف بہانہ بنا کر اپنا دامن بچا لیا ہے۔ اب ہمیں ہی بسمہ کو اپنے ساتھ لے جانا پڑے گا۔“

شاہینہ نے بیڈ پر قریب سوئے دونوں بچوں کو دیکھتے ہوئے شوہر کو مخاطب کیا تھا جو پہلے ہی ناگوار موڈ میں یہاں آ کر بیٹھا تھا۔

”مگر میں اتنی بڑی ذمہ داری اٹھانے کے لیے تیار نہیں ہوں۔“ وہ بڑی بیزار سی بولا تھا۔ عامر کے برجستہ انکار پر وہ شوہر کو اچھینے سے دیکھنے لگی۔ جو سارے حالات جانتے ہوئے بھی معاملے کی حساسیت کو سمجھنے کے لیے تیار نہیں تھا۔ حالانکہ چاہتی تو وہ بھی نہیں تھی لیکن کیا کرتی... اور کوئی چارہ بھی تو نہیں تھا۔ اب ایک سگی بہن کے ہوتے ہوئے بسمہ کو اکیلے استانی جی کے گھر تو نہیں چھوڑ سکتی تھی اسی لیے اس نے شوہر کو سمجھانے کی ایک کوشش کی۔

”تو پھر بسمہ کہاں جائے گی... ماموں اور ہمارے سوا اس کا اور ہے کون... وہ کس کے پاس رہے گی... اگر ہم نے بھی اسے ساتھ لے جانے سے انکار کر دیا تو لوگ کیا کہیں گے۔ ماں، باپ کے مرنے کے بعد بڑی بہن نے یتیم بہن کو بے سہارا چھوڑ دیا۔“ شاہینہ نے شوہر کو دنیا داری کے حوالے سے ڈرانا چاہا۔ اپنی مجبوری بیان کی تھی۔ صرف دنیا والوں کے ڈر سے... بہن کی محبت اور فکر میں نہیں... اسے بہن سے ہمدردی ضروری تھی مگر وہ فطرتاً خود غرض اور مطلب پرست واقع ہوئی تھی... جو رشتوں کو وقت پڑنے پر ضرورتاً استعمال تو کرتے ہیں مگر ان ہی رشتوں کو اپنی

زندگی میں کوئی اہمیت نہیں دیتے۔ اب چاہے یہ رشتے خون کے ہوں یا پائتا ہوئے۔ ایسے لوگوں کو صرف اپنے مفاد اور غرض سے مطلب ہوتا ہے۔ شاہینہ نے بھی اپنے بچوں کی پیدائش پر سوا مینے تک بسمہ کو گھر بلا کر اپنی اور نومولود بچے کی خدمتیں کروائی تھیں اور آج اسے بسمہ کو اپنے گھر لے جانا مشکل فیصلہ لگ رہا تھا۔ شاید اس لیے کہ اب بات چند دنوں یا چند ماہ کی نہیں تھی۔ بسمہ کی پوری ذمہ داری اٹھانے کا معاملہ تھا۔ جس سے برخونی رشتہ اپنا دامن بچانا چاہ رہا تھا۔ مگر اب گلے میں پڑے ڈھول کو بچانا شاہینہ کی مجبوری تھی۔ اسی لیے شوہر کو رام کرنا چاہ رہی تھی۔ لیکن شوہر کے بڑے تیور دیکھ کر وہ مزید کچھ بولنے کے بجائے خاموش ہو گئی۔ جانتی تھی کہ ساتھ والے کمرے میں آمنہ بی بی اور بسمہ موجود ہیں۔ البتہ عامر چپ نہیں رہا... اسے کسی کی پروا نہیں تھی۔

”تمہیں کچھ اندازہ بھی ہے۔ بسمہ کو اپنے ساتھ لے جانے کا مطلب کیا ہے؟ ساری عمر کے لیے اس کی ذمہ داری اٹھانا۔ یعنی اس کی شادی بیاہ کا خرچ بھی ہمیں ہی کرنا پڑے گا۔ آخر ہم اسے ہمیشہ گھر بٹھا کے تو نہیں رکھ سکتے۔ اس سے تو چھوٹا تھا کہ وہ طلاق لے کر میکے آ کر بیٹھنے کے بجائے وہیں سرال میں گزارہ کرتی مگر تم عورتوں کو تو سرال والوں کی پابندیاں برداشت کہاں ہوتی ہیں۔ بس آزادی چاہیے ہوتی ہے۔“

اور شوہر کے اس بے بنیاد الزام پر شاہینہ نے ملامت سے اس کی طرف دیکھا۔ وہ سارے حالات سے باخبر تھا۔ پھر بھی بے قصور بسمہ پر الزام لگا رہا تھا اور تب وہ چپ نہیں رہی تھی۔

”تم تو ایسے کہہ رہے ہو جیسے بسمہ کی طلاق میں نے

کرائی ہویم اچھی طرح جانتے ہو... بسمہ کا گھر اس کی چنڈاں ساس، نندوں نے بسے نہیں دیا اور اس کجخت ماجد نے بہنوں کی باتوں میں آ کر بسمہ کو طلاق دے کر گھر سے نکال دیا۔ وہ بیچاری تو بے قصور تھی۔ اس

بدلتے رشتے

نے تھوڑی طلاق کا مطالبہ کیا تھا۔“

”میں کچھ نہیں جانتا... تم بسمہ کو سمجھا دو... اس کا ماموں، ممانی کے ساتھ رہنا زیادہ مناسب رہے گا۔ اگر... تم نے اسی وقت اپنی مامی کو جواب دے دیا ہوتا تو یہ مصیبت ہمارے گلے نہ پڑتی۔“ عامر نے... بے بردی کی حد کر دی تھی... وہ یہ بھی بھول گیا تھا کہ یہ وہی بسمہ ہے جو شاہینہ کی شادی کے بعد بہن، بہنوئی کے گھر آنے پر بھاگ، بھاگ کر ان کے لیے چائے، ناشتے اور کھانے کا بندوبست کرتی تھی۔ پھر ان کے دونوں بچوں کو بھی بسمہ نے گودوں کھلایا تھا، ان کے لاڈ اٹھائی رہی تھی... اور آج عامر سب کچھ فراموش کر چکا تھا۔ شاید سگے بھائی اور بہنوئی میں یہی فرق ہوتا ہے بسمہ کا کوئی بھائی نہیں تھا۔ اس نے بہنوئی کو ہی بھائی سمجھا تھا۔ اور آج وہی بھائی، خود غرض بہنوئی بن کر سالی کو بوجھ سمجھ رہا تھا۔ اسی لیے بیوی پر سارا غصہ نکال رہا تھا لیکن شاہینہ ان عورتوں میں سے نہیں تھی جو بلا وجہ کے شوہر کے طعنوں سے دیتی ہیں۔ اس نے عامر کی ملامت کے جواب میں ممانی کو ہی الزام دھرنا تھا۔

”ہاں تو میں نے بھی تو ماموں پر ہی یہ ذمہ داری ڈالنے کی کوشش کی تھی۔ مگر تم تو جانتے ہو ہماری مامی کو... کتنی تیز ہیں وہ... کس صفائی سے معذرت کر کے اپنا دامن بچا کر چلتی بیٹیں... اور ماموں بھی سدا کے جو رو کے غلام، بیوی کی ایک آواز پر ہاتھ باندھ کر ان کے پیچھے کھڑے ہو گئے۔“

ممانی کا صاف انکار اسے ابھی تک غصہ دلا رہا تھا۔

”ارے... ابھی تو ابائی قبر کی گیلی مٹی سوکھی بھی نہیں تھی اور ماموں نے آنکھیں پھیر لیں۔ مرگ والے گھر میں ایک رات ٹھہر کے یتیم بچوں کو دلاسائی تھی دینے کی زحمت بھی نہیں کی۔ اور اصولاً تو بسمہ کو اپنے ساتھ ماموں کو ہی لے جانا تھا۔ امی، ابو کے بعد اب ان کے سوا ہمارے یہاں ہے ہی کون...“

شاہینہ کو بھی اب اچانک ہی اپنے یتیم ہونے کا

خیال آیا تھا اور غصے میں بیوی کے اشاروں پر کچھ پتلی کی طرح تاپنے والے ماموں کو بھی ملامت کرنے سے گزیر نہیں کیا۔ جو دب بنگ بیوی کے سامنے دم مارنے کا حوصلہ بھی نہیں رکھتے تھے۔ اور بیوی کی لعنت ملامت سنتے ہوئے عامر نے بیزاری کا اظہار کرتے ہوئے اپنا حتیٰ فیصلہ سنایا تھا۔

”بس کرو، تمہارے نفسیاتی رشتے داروں کو میں اچھی طرح جان چکا ہوں۔ اس لیے میں نے فیصلہ کر لیا ہے۔ آج کی رات ہم یہاں ٹھہر جاتے ہیں۔ صبح بسمہ کو ساتھ لے جا کر تمہارے ماموں کے گھر چھوڑ آئیں گے۔ پھر وہ جائیں اور ان کا کام..... وہ اپنے فرض سے اتنی آسانی سے جان نہیں چھڑا سکتے۔“

شاہینہ جیسی بیوی کی صحبت میں رہ کر اسے بھی گھریلو سیاست کا خاصا تجربہ ہو گیا۔ اسی لیے وہ کسی گھاگ عورت کی طرح بڑی دور کی کوڑی لایا تھا۔ شاہینہ نے شوہر کی تجویز سن کر اطمینان بھرے انداز سے سکون کی سانس لی کیونکہ اس وقت رات کو سوئے بچوں کو اکٹھا کر کے گھر روانہ ہونے کا اس کا بھی موڈ نہیں تھا اس لیے شوہر کی بات اس کے دل کو گئی تھی۔

”بالکل ٹھیک سوچا ہے تم نے..... ماما کی چال بازی کا جواب اسی طرح دینا ہوگا۔ بسمہ کی تم فکر مت کرو، اسے میں اپنی جیوری بنا کر سمجھا دوں گی۔ ہم کل صبح ہی یہاں سے روانہ ہو جائیں گے۔ ایسا نہ ہو کہ ماموں، ممانی، شام میں ہی حیدر آباد کی گاڑی پکڑ لیں۔“ شاہینہ نے بھی شوہر کی سمجھداری کو سراہتے ہوئے مطمئن لہجے میں آگے کی پلاننگ بتا دی تھی..... اور عامر نے پرسکون ہو کر وہیں بیٹھ کر اپنے لیے جگہ بناتے ہوئے پیر کر نکلی اٹھا کر اپنے سر کے بچے رکھ لیا۔

”ٹھیک ہے..... استانی جی جی کھانا لگا دیں تو مجھے اٹھا دینا..... تب تک میں کچھ دیر آرام کر لیتا ہوں۔ صبح سے بھاگ دوڑ میں لگا ہوا تھا۔ اب تھکن ہو رہی ہے۔“

اور عامر کے بچوں کے پاس لیٹتے ہی شاہینہ

آہستگی سے بچوں کی نیند خراب نہ ہونے کے ڈر سے بیڈ سے اٹھ کر کمرے سے باہر نکل گئی تاکہ بہن کو ساری بات سمجھا سکے۔ البتہ ایسا نہیں تھا کہ شاہینہ کو باپ کی اچانک موت کا دکھ نہیں تھا۔ یا بہن سے بالکل ہمدردی نہیں تھی۔ مگر بسمہ کے مستقبل کے بارے میں سوچتے ہوئے وہ واقعی خود غرض بن گئی تھی اور جوان بہن کو ساتھ رکھنے میں متذبذب تھی کیونکہ عامر لاکھ اچھا سہی مگر تھا تو بہنوئی..... کل کو ایک گھر میں رہتے ہوئے کوئی اونچ نیچ ہو گئی تو وہ کیا کرے گی..... وہ اپنی اچھی بھلی گزشتہ کوانڈیشن کی نذر کرنا نہیں چاہتی تھی اس لیے یہ فیصلہ کیا تھا۔ اب شوہر اور بہن کو تو یہ سب کچھ سمجھا نہیں سکتی تھی۔ وہ کون سا بہن سے رشتہ توڑ رہی تھی۔ ماموں کے گھر رہتے وہ بہن کی خبر گیری کر سکتی تھی۔ وہ اپنے دل کو تسلی دے کر بسمہ کو سمجھانے کے بعد واپس بچوں کے پاس چل دی تھی۔

☆☆☆

بشیر احمد کا تعلق پنجاب کے شہر گجرات کے نواحی علاقے کچھاہ سے تھا۔ وہ دو بی بہن بھائی تھے، بڑی بہن زینب بی بی سولہ سال کی عمر میں وہیں کچھاہ میں ہی بیاہی گئی تھیں..... اور بشیر احمد انٹرنڈ پلومہ کرنے کے بعد کراچی شہر میں آکر ریفرنسری میں اچھی جاب کر رہے تھے۔ نذیر احمد (بشیر کے والد) کی اپنی کچھ زمینیں تھیں..... جبکہ بشیر احمد کو بچپن سے پڑھنے لکھنے کا شوق تھا۔ وہ میٹرک پاس کر کے کراچی شہر مزید پڑھنے آگئے تھے۔ اور پھر بیس شادی بھی اپنی پسند سے کر لی تھی۔ امجد ان کا دوست تھا۔ جس کے گھر بشیر احمد کا آنا جانا تھا..... کیونکہ انہوں نے وہیں دیکھا تھا۔ اور پہلی نظر میں ہی وہ اس کی معصومیت اور خوب صورتی کے اسیر ہو گئے تھے۔ جس کے بعد کیونکہ سے شادی کرنے کا انہوں نے فیصلہ کر لیا تھا۔ اور خوش قسمتی سے انہیں جلد ہی اچھی نوکری بھی مل گئی تھی۔ اس لیے انہیں پورا یقین تھا کہ امجد اور اس کے گھر والے ان کے رشتے کے لیے انکار نہیں کریں گے۔ حالانکہ گھر والے ان کی شادی اپنے

رشتے داروں میں کرنا چاہتے تھے بشیر احمد کی بہن زینب نے تو اپنی چھوٹی نند سے بشیر احمد کے بیاہ کا سوچ بھی رکھا تھا..... مگر بشیر احمد کی خواہش اور ضد کے آگے کسی کی نہیں چلی تھی اور پھر بشیر احمد نے مل باپ کو منانے کے لیے بڑی مٹیس کی تھیں۔ وہ ان کے اٹکوتے بیٹے تھے لہذا بیٹے کی خوشی کی خاطر انہیں بالآخر سیکینہ کو بہو ماننے کے لیے راضی ہونا پڑا تھا البتہ زینب چھوٹے بھائی سے بری طرح ناراض ہو گئی تھیں۔ انہوں نے چھوٹے بھائی کی شادی کے کیسے، کیسے ارمان دل میں ہالے تھے۔ کیا کچھ سوچ رکھا تھا۔ لیکن بشیر احمد نے بقول زینب کے شہر میں چاند چڑھا لیا تھا..... وہ سسرال میں اپنی نسکی کے باعث غصے میں بشیر احمد کی شادی میں شریک بھی نہیں ہوئی تھیں۔

بہر حال بشیر احمد کے والدین تو بیٹے کی شادی میں شریک ہوئے۔ اور پھر شہر میں ہی بشیر احمد کے کرایے کے گھر میں اپنی بہو سیکینہ کے ساتھ کچھ دن رہ کر واپس کچھاہ چلے گئے تھے۔ کیونکہ بشیر احمد نے بیوی کو شہر میں اپنے ساتھ ہی رکھنے کا فیصلہ کیا تھا۔ وہ تو ماں، باپ کو بھی اپنے ساتھ رکھنا چاہتے تھے لیکن وہ دونوں اپنی ذات برادری اور آبائی علاقے کو چھوڑنے کے حق میں نہیں تھے۔ اس لیے بشیر احمد کے اصرار کے باوجود واپس لوٹ گئے تھے۔ البتہ کچھ ہفتوں بعد بشیر احمد بیوی کو لے کر کچھاہ روٹھی بہن کو منانے گئے تھے مگر زینب فردوس سے بڑی ضدی اور اکڑ مزاج کی مالک تھیں۔ انہیں شروع سے گھر میں اپنی بات منوانے کی عادت تھی اور بشیر احمد نے ان کی نند سے شادی کرنے سے انکار کیا تھا۔ لہذا زینب نے بھی اپنی پکی ضد کے باعث ناراضی ظاہر نہیں کی..... آخر سسرال میں انہیں بھی اپنی عزت کا ان رکھنا تھا۔ چھوٹے بھائی کی وجہ سے پہلے ہی ان کی سسرال میں خاصی نسکی ہوئی تھی۔ لہذا مجبوراً بشیر احمد وہاں کے ساتھ واپس شہر آگئے۔ اس کے بعد یکے بعد دیگرے باپ کی فوتگی کے بعد بشیر احمد نے مکمل طور پر اپنی شہر جانا ترک کر دیا۔ اور یوں دونوں بہن، بھائی

کا رابطہ اور تعلق وقت گزرنے کے ساتھ رفته، رفته واجبی سا بھی نہیں رہا۔ بشیر احمد اپنے ترکے کی زمینیں بھی فروخت کر کے ہمیش کے لیے کراچی جیسے بڑے شہر میں بس گئے۔

وہ اپنی چھوٹی سی جنت میں بیوی، بچوں کے ساتھ مگن ہو چکے تھے۔ شادی کے سال بھر بعد شاہینہ رحمت بن کر ان کی جنت کی نئی مکین بنی تھی۔ اور پھر دو سال بعد بسمہ ان کی زندگی میں رونق بڑھانے چلی آئی۔ جس کی پیدائش کے بعد کچھ پیچیدگیوں کے باعث سیکینہ مزید بچے پیدا کرنے کی صلاحیت سے محروم ہو گئیں۔ حالانکہ بشیر احمد نے بہت اچھے اسپتال سے ان کا علاج بھی کروایا تھا۔ لیکن دل میں اولاد زینہ کی شدید خواہش کے باوجود سیکینہ اس نعمت سے محروم ہی رہیں۔ جس کا انہیں بہت قلق تھا کہ وہ جان سے عزیز شوہر کو ان کے بڑھاپے کا کوئی مضبوط سہارا دینے میں ناکام رہی ہیں۔ تب بشیر احمد نے ہی انہیں سمجھایا تھا کہ انہیں اللہ کی رضا میں راضی ہونا چاہیے..... کیونکہ اللہ پاک کی رضا میں حکمت و مصلحت ہی پوشیدہ ہوتی ہے۔ جس تک بندے کی سوچ کی رسائی مشکل ہوتی ہے۔ لہذا وہ اللہ کی دی ہوئی رمتوں پر شکر ادا کر کے راضی بہر رضا ہوں گی تو اللہ پاک بھی ان سے راضی ہوگا۔ اولاد رحمت ہو یا نعمت دونوں صورتوں میں رب کی طرف سے بندے کے لیے انمول دولت ہوتی ہے۔ اور بشیر احمد اس دولت کو پا کر خوش و مطمئن تھے تو سیکینہ نے بھی رفته، رفته پاگل دل کو سمجھ لیا۔ ان کا ملال تو بشیر احمد کی سوچ جان کر ہی کم ہو گیا تھا کہ ان کے نزدیک لڑکے پا لڑکی میں کوئی فرق نہیں ہے۔ کیونکہ بندے کو ہر مشکل گھڑی میں سہارا دینے والی ذات صرف اللہ کی ہوتی ہے۔ جس کے لیے بیٹے کا ہونا ضروری نہیں ہے۔ تب سیکینہ شوہر کو تشکر آمیز نگاہوں سے دیکھ کر مسکرائی تھیں۔ یوں بشیر احمد کے خوب صورت ساتھ کے ساتھ تلے دونوں بچیوں کی پرورش میں وقت گزرنے کا احساس بھی نہیں ہوا۔ اب بسمہ میٹرک اور شاہینہ انٹر

کی بھی اسی شرط کو سن کر بالآخر سارے جذباتی حربے استعمال کر کے ماں، باپ کو منایا تھا۔ اب باقی رہا کہ شوہر سے سیکینے کی طرح بات کرنی ہے اس کا بیٹی کو یقین تھا کہ ماں اپنی بھعداری سے معاملے کو اچھی طرح سنبھال لیں گی۔ اور واقعی سیکینے کی بی بی نے اپنی فہم و فراست سے کام لے کر ایسا ہی کیا تھا۔ شوہر کو بھی بتایا تھا کہ ان کی کسی جاننے والی کے توسط سے شاہینہ کے لیے رشتہ آ رہا ہے۔ اور بشیر احمد تو کچھ اور سمجھنے کے بجائے اس سوچ میں بڑ گئے تھے کہ ان کے آنگن میں کھیلنے والی بچیاں دیکھتے، دیکھتے آج اتنی بڑی ہو گئیں کہ ان کی رخصتی کا وقت آن پہنچا ہے اور اب انہیں بابل کے گھر سے پیادیں بھیجنا پڑے گا..... ساتھ ہی یہ فکر بھی لاحق تھی کہ دونوں بیٹیاں باری، باری بیاہ کر چلی جائیں گی تو وہ دونوں میاں، بیوی اکیلے کس کے سہارے زندگی جیئیں گے۔ تب اتنے عرصے بعد ان کے دل میں بھی اس خواہش کی ہوک اٹھی تھی کہ کاش دو بیٹیوں کے ساتھ اللہ پاک انہیں ایک بیٹے کی نعمت بھی عطا کر دیتا تو آج وہ خود کو اتنا کمزور محسوس نہیں کرتے۔ لیکن اس ہوک کو دل میں ہی دبایا تھا۔ اگر سیکینہ سے اس کا اظہار کر دیتے تو سیکینہ بیچارہ کا دل بھی اپنی اس کم مانگی کے احساس سے بوجھل ہو جاتا۔ انہوں نے بھی تو بیٹے کی کتنی خواہش دل میں پالی تھی۔ ڈاکٹروں، حکیموں سے علاج کرایا تھا۔ مزاروں پر جا کر منت بھی مانگی تھی۔ لیکن خدا کی مرضی اور مصلحت کے آگے بندہ بشر کیا کر سکتا ہے، وہ بے بس بے اختیار ہوتا ہے۔ اسی لیے اسے اپنے رب کی بڑائی کا احساس ہوتا ہے۔ اور وہ عاجزی کے ساتھ بندگی اختیار کرتا ہے۔ بہر حال بشیر احمد نے بوجھل دل کو سمجھا بھکا کر راضی کر لیا تھا کہ بیٹیاں ماں، باپ کے گھر پر آئی امانت ہوتی ہیں اور وقت آنے پر انہیں پرانے دلس کو اپنا بنانے کے لیے خوشی، خوشی رخصت کرنا ہی پڑتا ہے۔ یہی دستور زمانہ بھی ہے۔ یوں سیکینہ کی بی بی کی فراست کے باعث شاہینہ کا بھرم باپ کی نظروں میں قائم رہ گیا تھا۔ وہ اصل

بدلتے رشتے کی انہیں کیسے دورا ہے پر لا کھڑا کیا تھا۔ بسہ کی زبانی سب کچھ جاننے کے بعد انہوں نے شاہینہ کو رانے کی اونچ نیچ سمجھا کر اسے اس راہ پر چلنے سے باز رکھنے کی کوشش کی۔ کیونکہ وہ جان چکی تھیں کہ بزرگوں کی مرضی اور خوشی کو نظر انداز کر کے کیسے جانے والے پہلے بظاہر کہتے بھی پائدار ثابت ہوں مگر وقت گزرنے کے بعد سودو زیاں اور خسارے کا احساس ضرور ولادیتے ہیں۔ بشیر احمد کی ضد اور فیصلے کے سامنے سالوں پہلے اگرچہ ان کی ماں نے بیٹے کی خوشی کی خاطر سیکینہ کو قبول کر لیا تھا۔ لیکن بشیر احمد کی بڑی بہن نے اگلے بھائی کی ضد کے آگے ہتھیار نہیں ڈالے تھے کیونکہ وہ خود ضد کی بڑی پکی تھیں۔ لہذا بھائی کی من مانی سے بعد انہوں نے چھوٹے بھائی سے ہمیشہ کے لیے قطع تعلق کر لیا تھا۔ اور یہ بشیر احمد کے لیے بڑا جذباتی دھچکا تھا۔ بڑی بہن نے بچپن سے ان کے بڑے لاڈ اٹھائے تھے۔ اور جوان ہو کر وہ اسی بہن کو ناراض کر چکے تھے۔ اور یہ ناراضی بہن کی ضد کی طرح پکی نکلی تھی۔ چار سالوں پر محیط ہو چکی تھی۔ بس یہی خسارہ بشیر احمد اور سیکینہ کو اکثر طویل کر دیتا تھا۔ سیکینہ یہ سوچ کر ملول رہتی تھیں کہ ان کی وجہ سے بشیر احمد کا بڑی بہن سے خونی انوث روٹ ٹوٹ گیا۔ اور شاید یہ اس کی سزا ہے جو آج سالوں بعد شاہینہ کی ضد کی صورت میں سامنے آ کر سیکینہ کو احساس دلائی کہ کسی بھی ضد کے نتیجے میں بالآخر کوئی نہ کوئی خسارہ ضرور آتا ہے۔ اور اب یہ جاننے کے بعد کہ عامر کے گھر والے اس رخصتے کے لیے راضی نہیں ہیں۔ انہیں شدید دھچکا لگا تھا۔ اسی لیے وہ بیٹی کو سمجھانا چاہتی تھیں تاکہ وہ اپنی ضد سے باز آ جائے مگر اس کی منہ زور خواہش کے آگے اسے پسپائی اختیار کرنی پڑی۔ شاہینہ، عامر کے سوا کسی سے شادی کے لیے تیار نہیں تھی..... لہذا مجبوراً انہیں فرط رنجی پڑی تھی کہ جب تک عامر کے ماں، باپ اور شاہینہ رشتہ لے کر نہیں آئیں گے..... وہ شاہینہ کی فوری عمار سے ملے نہیں کریں گی۔ اور عامر نے شاہینہ

جس میں بہہ کر وہ دونوں سارے جہان کی مخالفت لے کر بھی ایک دوسرے کو ہر قیمت پر پانا چاہتے تھے۔ حالانکہ بسہ نے چھوٹی ہونے کے باوجود شاہینہ کو سمجھایا بھی تھا کہ جس فیصلے میں بزرگوں کی مرضی اور خوشی شامل نہ ہو، وہ ساری عمر من کی خوشی پا کر بھی کد میں مبتلا رہتے ہیں۔ مگر شاہینہ نے صاف کہہ دیا تھا کہ وہ اپنے فیصلے سے پیچھے ہٹے گی اور نہ ہی کسی اپنے فیصلے، ہچکچتائے گی۔ یہ سوچے بغیر کہ جب وقت اپنا فیصلہ سنا دے تو بڑے، بڑے فیصلہ سازوں کو ان کی لمبائی غلطیوں کا ادراک کروا کے عمر بھر کی پشیمانی میں بدل دیتا ہے۔ اگرچہ عامر کے والدین اور بہن، بھائی ہرگز اس رشتے کے لیے راضی نہیں تھے۔ وہ اس کی شادی اپنے خاندان میں کرنا چاہتے تھے۔ مگر جب جوان اولاد والی من مانی کی ٹھان لے تو اس منہ زور جذبے کے آگے بڑی سے بڑی مضبوط چٹان کو بھی اپنی جگہ سے ہلا کر رکھ دیتی ہے۔ عامر کے گھر والوں کو بھی عامر کی ضد کے سامنے ہار مانی پڑی تھی۔ اور انہوں نے بڑی بے دلی سے شاہینہ کو بھونکا کر لانے کی عامر کی ضد مان لی تھی۔

☆☆☆

دوسری جانب بسہ کی زبانی شاہینہ کی خواہش جاننے کے بعد سیکینہ دم بخود رہ گئی تھیں۔ ماں ہو کر مگر انہیں اندازہ نہیں ہو سکا تھا کہ بیٹی انجانے میں کس راستے پر چل پڑی ہے۔ کہیں یہ مکافات عمل نہیں..... ان کی شادی بھی تو بشیر احمد سے ان کے گھر والوں کی مرضی کے خلاف مجبوراً ہوئی تھی۔ لیکن اگر میں سیکینہ کی بی بی کا قصور صرف اتنا تھا کہ بشیر احمد نے اپنی دوست کے گھر ایک دن سیکینہ کو دیکھا اور اسی دن کد سے شادی کا فیصلہ کر کے اپنے دوست کے سامنے اپنی خواہش کا اظہار کر دیا۔ آگے کے مرحلے سیکینہ کے ماں، باپ اور بھائی نے بشیر احمد کے ساتھ مل کر ملے تھے۔ سیکینہ نے اپنی طرف سے کوئی ضد نہیں کی تھی۔ بشیر احمد کی محبت اور خواہش جاننے کے بعد ماں، باپ کے فیصلے کے سامنے سر جھکا چکی تھیں۔ پھر اتنے سالوں

کر رہی تھی۔ جوان ہو کر شاہینہ نے بڑا رنگ روپ نکالا تھا۔ سرو قد ہونے کے ساتھ گھڑی چست رنگت نے اسے خود پسند اور مغرور بنا دیا۔ جبکہ شاہینہ کے مقابلے میں بسہ کی رنگت دیتی ہوئی گندی مائل تھی۔ قد بھی اس سے دیتا ہوا تھا۔ مگر چہرے پر معصومیت اور بڑی، بڑی سیاہ آنکھوں کی چمک اور خوش مزاجی کی ممت نے اسے بڑی بہن کے مقابلے میں زیادہ پُرکشش بنایا تھا۔ البتہ مزاجاً وہ کچھ خود سے بے پروا اور ملنگ ٹائپ تھی۔ جوں گیا اسے اپنی خوشی قبول کر لیا۔ ضد نہیں باندھی۔ نہ ماں، باپ سے اور نہ نصیب سے..... جبکہ شائستہ بچپن سے اپنی ضد میں منواتی چلی آئی تھی۔ اچھا لگنا اور اچھا پہننا، اور ہنسا اس کا شوق تھا۔ اور چونکہ بشیر احمد کی بچی نوکری تھی، وہ اچھا کمار ہے تھے۔ اس لیے شاہینہ کو ہمیشہ سے کھلے ہاتھ سے خرچ کرنے کی عادت تھی۔ خود بشیر احمد نے بھی اپنے ماں، باپ کے زیر سر پرستی ٹھاٹھ باٹ والی زندگی گزار لی تھی، اس لیے بیٹی کے نت نئے شوق اور خرچوں پر انہیں کبھی اعتراض نہیں ہوا تھا۔ وہ اولاد پر دل کھولی کر خرچ کرتے تھے۔ کبھی ان کی کوئی خواہش رد نہیں کی تھی یہاں تک کہ شادی کے لیے بھی اس نے اپنی پسند کا اظہار کر لیا تھا۔

عامر اس کی دوست ثمرہ کا کزن تھا اور ثمرہ کے گھر میں دونوں کی ملاقات ہوئی تھی..... جو پہلی نظر کی محبت ثابت ہوئی۔ عامر نے ثمرہ سے شاہینہ کا سیل نمبر لیا تھا۔ اور یوں عامر کی پسندیدگی کی سند پا کر شاہینہ محبت کی خوشنما شاہراہ پر عامر کی سنگت میں قدم سے قدم ملاتی دور تک چلی گئی۔

دونوں رات کو گھنٹوں موبائل پر ایک دوسرے سے باتیں کرتے۔ مستقبل کے منصوبے بناتے اور ایک دن شاہینہ نے بسہ کو اپنی محبت کا راز دار بنا کر ماں تک پیغام پہنچا دیا کہ وہ ثمرہ کے کزن عامر سے شادی کرنا چاہتی ہے حالانکہ عامر کے گھر والے اس رشتے کے خلاف تھے لیکن عامر کے دل کی حالت بھی شاہینہ سے مختلف نہیں تھی۔ جذبات کی ندی کا بہاؤ بہت تیز تھا۔

## خدائے ذو الجلال والاكرام

### کے حضور اظہار تشکر

رحمن نے رحم سے نواز رکھا ہے  
کریم نے کرم سے نواز رکھا ہے  
قدوس کی قدوسیوں پاک کر گئیں  
وہاب نے بھرم سے نواز رکھا ہے  
رزاق نے غیب کے درواکے  
غفار نے عزم سے نواز رکھا ہے  
خبیر جانتا ہے میرے دل کا حال سب  
عطاؤں کے قلم سے نواز رکھا ہے  
ضار نے بچایا مجھے ہلاکتوں سے  
مجیب نے کرم سے نواز رکھا ہے  
حمید نے غلاظتوں سے دور کر دیا  
مجید نے مرم سے نواز رکھا ہے  
سلام نے سلامتی کی راہ کھول دی  
تواب نے شرم سے نواز رکھا ہے  
کاوش: کوثر خالد، جڑانوالہ

کسمپرسی کے حالات میں ہوئی۔ اس کا بھرم جلد ہی اس کے سرال والوں کے سامنے کھل گیا۔ دوسرے اس کی ساس نے شادی کے ڈیڑھ سال بعد بھی بسمہ کی طرف سے کوئی خوش خبری نہ ملنے پر اسے بے اولادی کے طعنے دینے شروع کر دیے۔ جبکہ شاہینہ دو بچوں کی ماں بن چکی تھی۔ شاہینہ یہاں بھی قسمت کی دھن ٹکلی تھی..... مگر بسمہ میر و شکر سے سرال کے دکھ درد برداشت کر رہی تھی۔ وہ نہیں چاہتی تھی کہ اس کے ماں باپ جو پہلے ہی صدموں سے نڈھال ہیں، وہ بچی کے دکھ میں زندگی کے ایک اور کڑے امتحان میں مبتلا ہو جائیں۔ لیکن انسان کے چاہنے سے اگر سب کچھ حسب منشا ہو جائے تو دنیا میں کوئی نامراد و ناشاد نہ رہے۔ بسمہ کے ساتھ بھی یہی ہوا تھا۔ اس کی ساس نے جو بیٹیوں کے زیر اثر زیادہ

ہو گیا۔ مگر وہ ایک ہی جھٹکے میں عرش سے فرش پر آ گئے۔ یہ صدمہ اور پشیمانی کا بوجھ ان کے دل و دماغ سے ہٹتا ہی نہیں تھا۔ حالانکہ سیکینہ نے تو ہر بل بی بی سمجھایا کہ وہ سب کچھ خدا کی رضا اور آرزائیں سمجھ کر صبر کر لیں۔ خود کو بھرم اور قصور وار نہ ٹھہرائیں۔ لیکن رشید خان نے دوستی کا بھروسہ ہی نہیں توڑا بلکہ بشیر احمد جیسے مضبوط آدمی کو بھی توڑ دیا تھا۔ جن کا کمزور وجود اب کسی کو سہارا دینے سے قاصر تھا۔ ایسے میں سیکینہ نے خود کو مضبوط بنا کر اپنے ہمیز کا زیور بیچ کر بسمہ کی رخصتی کا سادگی سے انتظام کیا..... اور کچھ امجد نے ماموں ہونے کی حیثیت سے ہمہ کو میکے سے عزت سے رخصت کرنے میں بہن کی مدد کی۔ بڑی بیٹی اور داماد سے تو امید رکھنا فضول تھا۔ یوں بسمہ بیاہ کر سرال سدھاری تھی اور اس کے بعد امجد کی مدد سے ہی بشیر احمد کو نیا روزگار ملا تھا۔ امجد نے اپنی ذمہ داری پر انہیں اپنے دوست کے ٹرانسپورٹ کے چھوٹے موٹے کاروبار سے کرایے کا رکشا دلوا دیا۔ کیونکہ اب اس عمر میں وہ کوئی نئی ملازمت نہیں ڈھونڈ سکتے تھے۔ لہذا جیسے تیسے زندگی ایک نئی ڈگر پر چل پڑی۔ جس پر شاہینہ نے سرال میں اپنی تسکینی ہونے کے خیال سے بہت برا مانا تھا۔ حالانکہ سرال والوں سے فتنی بھی نہ تھی مگر باپ کے رکشا ڈرائیور بننے پر سرال کیا شوہر کے سامنے اسے کتنی خفت اٹھانی پڑے گی اس بات سے وہ پریشان تھی۔ تب بسمہ نے ہی اسے اس کی بے حسی کا احساس دلایا کہ اسے صرف اپنی عزت کا خیال ہے، بوڑھے ماں، باپ کی مجبوری لاچار ہے کوئی سروکار نہیں۔ ایسی بات تھی تو پہلے ہی باپ کا ماحول دینا تھا۔ چھوٹی بہن کی باتوں نے شاہینہ کو شرمسار کرنے کے بجائے الٹا متغیر کر دیا۔ اس نے سرال والوں اور عامر کی تنقید اور طعنوں بھری ملا متوں سے آکر میکے آنا ہی چھوڑ دیا۔

حالانکہ طعنے تو بسمہ کو بھی سرال میں مل رہے تھے مگر جب اس کا رشتہ طے ہوا تھا تو وہ ایک خوشحال گھرانے سے تعلق رکھتی تھی لیکن اس کی رخصتی جس

ایک نہایت شاطر اور گھراگ آدمی نکلا کہ جس کی دوستی پر بشیر احمد نے آنکھ بند کر کے بھروسہ کر کے اپنا سب کچھ داؤ پر لگا دیا تھا۔ انہیں رشید خان کی نیت کے فتور کا علم نہیں ہوا تھا۔ انہوں نے تو دوستی پر اعتماد کر کے جوا کھلیا تھا۔ لیکن رشید خان نے اسی اعتماد کی پیٹھ میں چھرا گھونپ کر بازی خود جیت لی۔ اس نے پہلے دھوکے سے بشیر احمد کو کاروبار سے الگ کیا۔ پھر چالاک سے ان کے سر کا سائبان بھی گروی رکھوا کر کاروبار میں انویسٹ کر دیا۔ اور پھر اچانک کاروبار میں خسارہ دکھا کر بشیر احمد کو چند ہزار دے کر کاروبار سے مکمل طور پر ہی بے دخل کر دیا..... کیونکہ اگر بشیر احمد کو دوست کی نیت کے کھوٹ کا علم ہو جاتا تو قانونی کاغذوں پر کچے کام کرواتے مگر وہ تو بے خبری میں لٹ گئے تھے۔ رشید خان نے ان کا گھر اور کاروبار دونوں نہایت چالاک سے ہتھیال لیے اور بشیر احمد اس خسارے کے سودے میں اعتماد و بھروسہ ہی نہیں بارے تھے اپنا دل بھی ہار گئے تھے..... عمر بھر کی جمع پونجی اور ماں، باپ کی دی جائداد کے ساتھ سرچھپانے کا آسرا بھی چھن گیا۔ اس صدمے نے دل کی دیواروں پر ضرورت سے زیادہ بوجھ ڈالا تھا۔ اور انہیں پہلا ہارٹ ایک ہوا۔ صدمہ تو سیکینہ کو بھی بہت تھا بڑھاپے میں جوان بیٹی کے ساتھ وہ بے گھر ہو گئے۔ بشیر احمد تو کوری تو پہلے ہی چھوڑ چکے تھے۔ اب آگے زندگی جینے کا آسرا بھی نہیں رہا تھا۔ بسمہ کی شادی بھی کرنی تھی۔ دن رات کی سوچوں اور ٹھکرات نے انہیں شوگر اور بلڈ پریشر کی مریض بنا دیا۔ بشیر احمد تو پہلے ہی شوگر پیسٹ تھے۔ اب دل نے بھی دغا دے دی تھی۔ وہ پہلے دوستی کا بھرم اور بھروسہ ٹوٹنے پر صدمے سے نڈھال تھے۔ اوپر سے بیوی، بیٹی کو بے سہارا کر دینے کی شرمندگی اور پچھتاوا اندر ہی اندر دیمک بن کر چاٹنے لگا۔ ایسے میں سیکینہ کے بھائی امجد نے اس وقت ان کی مدد کی تھی۔ اور وہ ایک چھوٹے سے کراچی کے مکان میں شفٹ ہو گئے۔

زندگی کا، کارواں پھر سے آگے بڑھنا شروع

معاظے سے فی الوقت بے خبر ہی رہے تھے۔ پھر سب کچھ جلدی، جلدی میں طے ہوا تھا۔ عامر کے گھر والوں نے انہیں صرف ایک ماہ کی مہلت دی تھی اس پر بشیر احمد پریشان ہو اٹھے کہ اتنی جلدی سب انتظام کیسے ہوں گے لیکن سیکینہ بی بی نے انہیں یہ کہہ کر سمجھایا تھا کہ جوان بیٹی کو زیادہ دیر گھر میں بٹھا کر نہیں رکھنا چاہیے۔ لہذا سیدھے سادے مزاج کے مالک بشیر احمد نے مزید کوئی اعتراض نہ کیا اٹھانے کے بجائے شادی کی تیاری شروع کر دی۔ انہوں نے اپنی بساط سے بڑھ کر دھوم دھام سے بیٹی کو رخصت کیا تھا۔

شادی کے صرف ایک ماہ بعد ہی عامر کو صرف اپنی پسند کی شادی کی پاداش میں شاہینہ کے ساتھ کرایے کے گھر میں شفٹ ہونا پڑا تھا۔ جس کے بعد شاہینہ کو جن آزمائشوں کا سامنا کرنا پڑا وہ ایک لمبی کہانی تھی۔ لیکن اس نے صحیح معنوں میں شاہینہ کو زندگی کے سبق کے ساتھ یہ بھی سکھایا کہ جو رشتے بزرگوں کی خوشی اور خواہش کے برخلاف بنائے جاتے ہیں ان کی بنیاد اکثر کمزور اور کھوکھلی ثابت ہوتی ہے۔ بہر حال دونوں نے اپنی محبت کا بھرم قائم رکھنے کے لیے زندگی کی آزمائشوں اور کٹھن امتحانوں سے لڑتے لڑکھڑاتے سنبھل کر بالآخر چند سالوں میں اکیلے جینا سیکھ لیا تھا۔

ادھر بشیر احمد اور سیکینہ بی بی کو زندگی نے نئے امتحان سے دوچار کر دیا تھا۔ سیکینہ نے اپنے دور کے رشتے داروں میں بسمہ کا رشتہ طے کر دیا تو اچانک ہی بشیر احمد کے من میں کیا سمانی کہ اپنی بچی نوکری کو ختم کر کے اپنا کاروبار شروع کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ حالانکہ سیکینہ نے سمجھا بھی دیا تھا لیکن بیوی سے زیادہ بشیر احمد کا دوست سیانا نکلا تھا۔ اس نے جانے کیسے سیدھے سادے بشیر احمد کو ششے میں اتارا۔ جس کے بعد بشیر احمد نے اپنے دوست کے ساتھ مل کر پارٹنرشپ پر پرانی گاڑیوں کی خرید و فروخت کا بزنس شروع کر دیا۔ جس میں اپنی عمر بھر کی پونجی لگا دی۔ لیکن جانے دوش قسمت کی ستم ظریفی کا تھا یا پھر بشیر احمد کی سادگی کا، رشید خان

صدے اور دکھ سے منگ کیفیت میں اس سے رات کچھ بھی کھایا نہیں گیا۔ البتہ اگلی صبح آمنہ بی بی نے ہی زبردستی اصرار کر کے اسے تھوڑا سا ناشتا کرایا۔ اور اس سے انکار نہیں کیا گیا۔ لیکن ان کے خلوص و ہمدردی پر اس کا دل ضرور ہل گیا تھا اور وہ کچن میں ان کے پاس بیٹھی بغیر سوچے، سمجھے ہی ان سے تقاضا کرتی تھی۔

”استانی جی..... کیا آپ مجھے یہاں اپنے پاس نہیں رکھ سکتیں؟ میں آپ کے ساتھ ہی رہنا چاہتی ہوں“ مجھے کسی کے ساتھ نہیں جانا ہے۔ میں ساری زندگی آپ کی خدمت کروں گی۔“ بسمہ نے بہت الجاحت سے ان کے ہاتھوں کو تھام کر کہا تو آمنہ بی بی کا دل بھی پلچ گیا۔ مگر وہ مجبور تھیں برائی اولاد کی ذمہ داری اٹھانا آسان نہیں تھا۔ ویسے بھی کچھ دن بعد ان کے بیٹے کی شادی ہونے والی تھی گھر میں بیوہ آجانی تو پھر جانے وہ غیر جوان جہان لڑکی کو اپنے گھر میں پسند کرتی نہ کرتی..... اس کے علاوہ بھی اور بہت سے خدشات تھے جو انہیں روک رہے تھے۔ وہ زمانہ شناس اور جہاندیدہ عورت تھیں۔ جانتی تھیں کہ مرد کا کوئی بھروسہ نہیں ہوتا..... وہ کسی غیر عورت کو کبھی اپنی سگی ماں، بہن یا بیٹی کی نظر سے نہیں دیکھتا ہے۔ اسی خیال نے ان کے دل و دماغ کو زنجیر کر دیا۔ کل کلاں کو کچھ ہو گیا تو یہی نام نہاد رشتے دار انہیں ہی الزام دینے آجائیں گے۔ اس لیے وہ بسمہ کو زنی سے سمجھانے لگیں۔

”بیٹا..... میں اکیلی ہوتی تو کبھی تمہیں اپنے ساتھ رکھنے سے منع نہ کرتی..... لیکن اب یہ کسی طرح بھی مناسب نہیں ہے۔ میں چاہ کر بھی تمہیں اپنے پاس نہیں رکھ سکتی۔ البتہ بہن، بہنوئی سے زیادہ تمہارا ماموں، ہمانی کے ساتھ رہنا زیادہ مناسب رہے گا۔ میں شاہینہ سے اس کے بارے میں بات کروں گی۔ وہ تمہارے ماموں کو ضرور راضی کر لے گی۔“ آمنہ بی بی نے اسے بڑے پتے کی بات سمجھا دی تھی۔ پھر اس سے پہلے کہ وہ بسمہ کے مایوس چہرے کو مزید..... دیکھ کر دھجی ہوتیں۔ وہ ناشتے کی ٹرے لے کر اس کے سر پر

بالت گواہ ہے اکثر کڑے وقت میں بیٹوں سے زیادہ ہٹاؤں کی بوٹھے ماں، باپ کا سہارا بہن کران کی خدمت کرتی ہیں۔ انہوں نے دل میں بسمہ کی خوشیوں اور اچھے نصیب کے لیے ڈھیروں دعائیں کیں..... اب یہی دعائیں تو ان کے بس میں تھیں جو وہ..... اپنی بیٹی کو دے سکتے تھے۔

اگلے روز بشیر احمد کی طبیعت قدرے بہتر تھی۔ اس لیے وہ بسمہ کے منع کرنے کے باوجود اپنی ماہانہ پنشن لینے کے لیے صبح صبح ہی روانہ ہو گئے تھے مگر انہیں کیا پتا تھا کہ ابھی کے راستے پر قضا گھاٹ لگائے بیٹھی ملے گی۔ اور اب بشیر احمد کے اپنی آخری آرام گاہ تک پہنچنے کے بعد بسمہ صبح معنوں میں بے سہارا و یتیم ہو کر بدلتے رشتوں کی بے حسی و خود غرضی کی دھول میں رُل گئی۔

☆☆☆

ماموں، ہمانی اور بہن، بہنوئی کے بدلے ہوئے قہر اور کترائے ہوئے رویوں کے بارے میں بسمہ رات بھر سوچتی رہی تھی۔ ماں، باپ کی آنکھ بند ہوتے ہی اس کے خونی رشتوں نے کس طرح اس سے آنکھیں پھیر لی تھیں۔ کوئی بھی اس کی ذمہ داری اٹھانے کے لیے تیار نہیں..... اب صحیح معنوں میں اسے لگ رہا تھا کہ واقعی وہ یتیم و بے سہارا ہونے کے ساتھ، ساتھ لاوارث بھی ہو گئی ہے۔ ساتھ ہی یہ احساس بھی شدت سے ہو رہا تھا کہ ماں، باپ کے سائے کی ٹھنڈی چھاؤں میں وہ کتنی مضبوط و محفوظ تھی۔ اب تو چند گھنٹوں میں لوگوں کے بے حس رویوں نے اسے اتنا کمزور بنا دیا تھا۔ جتنا نہ مساعد حالات نے بھی نہ بنایا تھا۔ اسے سمجھ ہی نہیں آ رہا تھا کہ اب وہ کیا کرے کہاں جائے، کس سے سہارا مانگے..... انہوں نے تو کڑا وقت گزارنے پر منہ پھیر لیا۔ وہ رات تک بھوکے بیٹھی رہی۔ شاہینہ اور ہمانی کو اس کی بھوک، پیاس کا خیال تک نہیں آیا۔ دونوں اپنے بچوں کے ساتھ مصروف رہی تھیں۔ صرف استانی جی (آمنہ بی بی) ہی تھیں۔ جنہوں نے اسے بار بار کھانا کھانے کی کوشش کی لیکن

لیے انہیں کم از کم پنشن تو مل ہی رہی تھی۔ سیکینہ کی موت کے بعد نوکری جاری نہ رکھ سکے تھے۔ بس کسی نہ کسی طرح پنشن لینے بینک چلے جاتے کہ یہ بھی ضروری ہوتا ہے۔ پنشنر چاہے اسپتال کے بستر پر بھی پڑا ہو تو بینک والے اس کے آنے کا اصرار کرتے ہیں، وہ الگ بات کہ کہہ سن کر انہیں راضی کر لیا جائے مگر یہاں کون بشیر احمد کا ساتھ دیتا سو خود ہی مرتے کھینچے جاتے تھے۔ بیٹی کو نوکری پر جاتا دیکھ کر ان کے دل میں ملال اٹھتا..... ایک تو پتھاری کا گھرا جڑ گیا تھا، دوسرے اب باپ کی..... دیکھ بھال کی ذمہ داری بھی ان پر ہی کر رہی تھی۔ جب وہ زیادہ پریشان ہوتے تو بسمہ ان کا کمزور ہاتھ تھام کرسی دیتی۔

”آپ فکر کیوں کرتے ہیں اب..... میں ہوں ناں..... اور میرے ہوتے ہوئے آپ کو بالکل پریشان ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ آپ اپنے ذہن پر کسی بات کا بوجھ نہ ڈالائیں“ بسمہ کی باتیں چند لمحوں کے لیے انہیں پرسکون کر دیتی تھیں۔

”جیتی رہو بیٹا..... تم تو اس کڑے وقت میں ہمت سے کام لے کر ایک بیٹے کی کی پوری کر رہی ہو۔ اللہ تمہیں اس کا اجر دے آمین.....“ بسمہ نے جواباً ان کے جھریوں بھرے ہاتھ کی عقیدت سے چومنا تھا۔

”حالات ہمیشہ ایک جیسے نہیں رہتے اب..... ہر آزمائش اور امتحان کے بعد انعام بھی ملتا ہے۔ اور صرف اور صرف مہربانہ شکر کرنے والوں کے حصے میں آتا ہے۔ آپ بھی پریشان ہونا چھوڑ دیں۔ کیونکہ میں اب آپ کا بیٹا ہی ہوں۔“ بسمہ کے جواب پر بشیر احمد کے لبوں پر ہلکی سی پرسکون مسکراہٹ ابھرنے لگی تھی۔

”اچھا میں اب چلتی ہوں اب..... اسکول سے دو ہو رہی ہے، آپ آرام کریں۔“ بسمہ نے کہا اور کمرے سے باہر نکل گئی۔ پیچھے بشیر احمد بڑی عقیدت و محبت سے جاتی بیٹی کو دیکھتے رہے تھے۔ اور سوچ رہے تھے کہ

تھی۔ صرف چند ماہ اور انتظار کیا۔ اس کے بعد بسمہ کے ماتھے پر بے اولادی کا ٹھپا لگا کر اس کے سینے روانہ کر دیا تھا۔ اور اس بار یہ صدمہ کمزور دل کے ساتھ بشیر احمد نے تو سہارا لیا لیکن سیکینہ کے ناتواں کاندھوں بلکہ ذہن پر آنے والے بھاری بوجھ نے اسے چند دنوں میں بستر سے لگا دیا اور صحت گرنی چلی گئی۔ اور ایک دن جوان بیٹی کے اجڑنے کی بربادی کا صدمہ برداشت نہ کرتے ہوئے اس نے بشیر احمد کا عمر بھر کا ساتھ چھوڑ دیا۔ کیا کرنی موت، زندگی سے زیادہ آسان تھی۔

یہ صدمہ بشیر احمد کے ساتھ بسمہ کے لیے بھی بہت بڑا جذباتی دھچکا تھا اور خلاف توقع جوان بیٹی کی خاطر بشیر احمد نے خود کو مضبوط کر کے جھیل لیا۔ اب وہی تو بسمہ کا واحد سہارا رہ گئے تھے، چاہے کمزور ہی سہی..... بسمہ کے لیے ان کا دم ہی غنیمت تھا۔ بیٹی و اماں اور سالے اور اس کی بیوی نورین نے سیکینہ کے انتقال پر ان کا ہر ممکن ساتھ دیا تھا۔ پھر کچھ دن بعد واپس اپنے، اپنے گھروں کو رخصت سفر باندھ کر اپنی، اپنی زندگی میں مگن ہو گئے..... اب صرف بشیر احمد اور بسمہ ہی پیچھے کھڑے رہ گئے۔ جن کی زندگی کا سفر سیکینہ کے جانے کے بعد آگے بڑھنے کے بجائے وہیں ٹھہر گیا تھا۔ بسمہ، باپ کی ڈھارس بندھاتی مگر وہ بیٹی کی فکر میں زندگی کی کمزوری و دور کو مضبوطی سے پکڑے رہے مگر کام پر جانے کے قابل نہیں رہے تھے اس لیے بسمہ کو قریبی پرائیویٹ اسکول میں نیچنگ کرنی پڑی۔ وہ تو شکر تھا کہ ان کے مالک مکان اچھے لوگ تھے۔ آمنہ بی بی بیوہ عورت تھیں۔ اور اپنے جوان بیٹے کے ساتھ رہتی تھیں جو نہایت ملنسار، ہمدرد اور شفیق تھیں۔ شاہینہ اور بسمہ نے ان سے قرآن پاک کی تعلیم حاصل کی تھی..... لہذا وہ ان کی استانی بھی تھیں۔ اور ان کے گھر کے سارے حالات سے باخبر بھی۔ انہی کے کہنے پر بسمہ نے اپنی تعلیم کا سلسلہ آگے بڑھانے کا سوچا تھا۔ میٹرک کے بعد تو اس کی شادی ہو گئی تھی۔

بشیر احمد کی پہلی والی گورنمنٹ جاب تھی۔ اس

نری سے ہاتھ رکھتے ہوئے مچن سے باہر چلی گئیں۔  
عمران کو آفس سے دیر ہو رہی تھی۔ وہ اپنی بات مکمل کر کے سمر کی سنے بغیر مچن سے باہر جا چکی تھیں اور سمر سوچنے لگی کہ جانے اب اس کی قسمت کا فیصلہ کس کے ہاتھ میں جائے گا۔ ماموں، ممانی یا پھر بہن، بہنوئی.....

اور جب وہ اپنی سوچوں کے سفر سے واپس لوٹی تو گھر کی بیٹھک سے کسی عورت کے زور، زور سے بولنے کی آوازیں سنائی دیں۔ شاید ان ہی آوازوں نے اس کی گہری سوچوں کا ارتکاز توڑا تھا۔ وہ چونک کر مچن سے باہر آگئی تھی۔

”ارے..... میں کوئی پردیس میں تھوڑی بیٹھی تھی جو تم لوگوں نے میرے آنے کا انتظار بھی نہیں کیا۔ کوئی غیر نہیں، میرا اکلوتا چھوٹا بھائی تھا۔ مجھ بے نصیب کو مرے ہوئے بھائی کا منہ بھی تم ظالموں نے دیکھنے نہیں دیا۔ بڑا ظلم کیا ہے تم لوگوں نے مجھ پر..... اللہ تم لوگوں کو پوچھے گا۔“

بسمہ صحن سے گزرتی ہوئی بیٹھک کے دروازے تک آکر باہر ٹھہر گئی تھی۔ اندر بیٹھک میں موجود چہرے کے ناک، نقش جانے پہچانے سے تھے۔ اب ان کی پوری بات سن کر یقین بھی ہو گیا کہ اندر بیٹھی دینگ سی خاتون اس کے باپ کی بڑی بہن ہیں۔

”ہائے..... میرا اکلوتا ویر.....“ نرنب بی بی کا دکھ، ہی ختم نہیں ہو رہا تھا۔ حالانکہ قصوران کا اپنا بھی تھا۔ انہوں نے خود ہی دیر کر دی تھی۔ ورنہ زندگی میں تو بشیر احمد نے روٹی، بہن کو منانے کی کئی بار کوشش کی تھی۔ وہ ہی ضد کی کچی نکل تھیں۔ پھر اب پچھتاؤ اس بات کا تھا۔ شاہینہ اور عامر سب کچھ جانتے تھے۔ اس لیے سامنے بیٹھی عورت کے واہیلے سے قطعی بھی متاثر نظر آنے کے بجائے ملائی نگاہوں سے دیکھ رہے تھے۔

نرنب بی بی کا واہیلہ ختم ہی نہیں ہو رہا تھا یا شاید ان کا پچھتاؤ اور پشیمانی ان دونوں کو ڈراما لگ رہا تھا۔ لیکن نرنب بی بی واقعی دکھی تھیں۔ اسی لیے سامنے بیٹھی ان دونوں شاہینہ اور عامر کو ملامت کر رہی تھیں۔ جنہوں

نے بشیر احمد کے انتقال کی خبر (اطلاع) چھوٹی کو نہیں دی تھی۔ حالانکہ وہ بھی کیا کرتے انہیں تو یہی پتا تھا کہ چھوٹی نرنب اپنے بھائی سے ناراض تھی۔ اور یہ ناراضی برسوں پر محیط ہوئی چلی گئی۔

جب بشیر احمد کجگاہ (مغربات) سے چلے آئے تھے۔ اس کے بعد سارے رابطے تعلق خود بخود ختم ہوتے چلے گئے۔ نہ بشیر احمد نے پلٹ کر پیچھے رہ جانے والوں کی خبر لی اور نہ بھائی سے روشی نرنب بی بی نے بھائی کو معاف کیا۔ ایک چھوٹی سی بات بڑھ کر بڑی رنجش کا سبب بن گئی تھی۔ کیونکہ بشیر احمد نے بڑی بہن کی نند سے بیاہ کرنے سے انکار کر کے اپنی پسند سے سیکندہ سے شادی کر لی تھی۔ لہذا نرنب بی بی نے اپنا مان ٹوٹنے پر بھائی سے ہر رشتہ تعلق توڑ دیا۔ آج برسوں بعد جب ایک دوسرے کے بچے بھی جوان ہو چکے تھے بھائی کی ناگہانی موت کی خبر سن کر نرنب بی بی کا سخت دل بچ کر پانی کی طرح بہہ رہا تھا۔ وہ روٹی بیٹتی تیر رفائیس سروس کے ذریعے کراچی آج صبح ہی پہنچی تھیں۔

جب پتا چلا کہ ان کے بھائی کو تو اس کی آخری آرام گاہ تک بھی پہنچا دیا گیا تھا۔ وہ اپنا غم و غصہ بیٹھی اور اس کے شوہر پر نکال رہی تھیں۔ جبکہ ان کے ساتھ بیٹھان کا بیٹا جاذب سلطان بالکل خاموشی سے ماں اور کزن کے ساتھ بہنوئی کے چہرے تک رہا تھا۔ جیسے اتنی دور سے اس شہر میں یہی کرنے آیا ہو مگر جب نرنب بی بی کا واہیلہ کم نہ ہوا تو شاہینہ کو بھی سارے لحاظ بالائے طاق رکھ کر زبان کھولنی ہی پڑی۔ جس کے بعد نرنب بی بی کی بولی یلخت ہی بند ہو گئی۔

”بس کریں چھوٹی..... یہ اتنا واہیلہ اس بات کا ہے، جب آپ نے ابا کی زندگی میں ان سے سارے تعلق توڑ لیے تھے پھر اب شکایت کس بات کی..... اگر آپ کو اپنے بھائی سے واقعی محبت ہوتی تو ان کا چھوٹا ما قصور معاف کر کے بڑے ظرف کا مظاہرہ کرتیں۔ مگر آپ کو تو اپنی ضد و رنام نہاد اعزیز تھی۔ ہمیں تو آپ نے کبھی قبول ہی نہیں کیا۔ پھر ہم کس رشتے سے آپ کا

گھر مرنے کی اطلاع دیتے۔“ شاہینہ نے چھوٹی نرنب کو اٹھ لا جواب کر دیا۔ باقی وہاں موجود تمام افراد تو جیسے دم سادھے بیٹھے تھے۔ اور سمر بیٹھک کی دہلیز کے پار گم عم سو گوار کھڑی سب کچھ گوشتے بہروں کی طرح دیکھ لاریں رہی تھی۔ مگر شاہینہ کے آئینہ دکھانے پر نرنب بی بی فرموندہ ہونے کے بجائے التا ہلکا ہوا تھا۔

”ارے تو بشیر احمد نے کون سا بڑی بہن کو منانے کے لیے وہاں رکنے کی کوشش کی۔ وہ تو تیری ٹیلی بیوی کے ساتھ ماں، باپ کو چھوڑ کے شہر میں آکر بس گیا۔ لہاری ماں نے اسے ہم سے جدا کر دیا۔ اگر وہ چاہتی تو بہن، بھائی میں صلہ کر سکتی تھی لیکن وہ تو خوش ہوئی کہ سسرالی بلا سے جان چھوٹی سولہ لاکھوں پائے۔“ لعل بی بی غصے میں کچھ سوچے بغیر بولیں تو شاہینہ کو ان کے ذکر پر مزید تاؤ آیا تھا۔ چھوٹی اب اس کی مری ہوئی ماں کو الزام دے رہی تھیں۔ اس لیے اس سے برداشت نہیں ہوا تو چھوٹی کو دو ٹوک لہجہ میں مزید مارنے سے روک دیا۔

”خبردار چھوٹی..... آپ میری مری ہوئی ماں پر ہوا الزام نہیں لگا سکتیں۔ نہ ہی میں مزید اپنے ماں، آپ کے خلاف کوئی بات سنوں گی۔ آپ ابا کی عزیت کے لیے آئی تھیں کر لی ہے تو یہاں سے رخصت لیں۔ میں بھی اپنے گھر جاتا ہے۔ ابا کے بعد ویسے بھی اب مارا آپ سے کوئی تعلق، رشتہ باقی نہیں رہا ہے۔“ شاہینہ کی کھری، کھری باتوں نے نرنب بی بی کو اڑا کر دیا تھا۔

ان کے بیٹے جاذب کو غصہ آ رہا تھا۔ لیکن وہ میت مارے گھر کا لحاظ کر کے ضبط کر رہا تھا۔ شاہینہ کی باتیں تلخ لہر تھیں پر بچی تھیں۔ نرنب بی بی کی ضد نے آج ان کے اور پشیمانی کے دکھان کی جھولی میں ڈالے تھے۔ ”چلو عامر..... ہمیں چلنے کی تیاری بھی کرنی ہے۔ تم بھی اپنی تیاری کر لو، تمہیں ماموں کے گھر لڑکے اپنے گھر جائیں گے۔ اب بھلا تم یہاں اکیلی مار گیا کرو گی..... اور ہمیں اجازت دیں۔ اگر آپ

## بھلتے ایشیے

لوگوں کو یہاں مزید بیٹھنا ہے تو شوق سے بیٹھیں۔“ شاہینہ نے بیٹھک کی دہلیز کے پار کھڑی سمر کو مخاطب کر کے کہا اور آخری جملہ نرنب بی بی کی طرف دیکھ کر مکمل کیا تھا اور سونے سے اٹھ کھڑی ہوئی تھی۔

اس کی یہ حرکت نرنب بی بی کے ساتھ جاذب کو بھی تاؤ دلانے لگی۔ مگر شاہینہ کی اس درجہ بدلتا لہجے پر نرنب بی بی... جو برہم ہوئیں وہ الگ..... لیکن جاذب کو اب مزید وہاں بیٹھنا اپنی اور اپنی ماں کی توہین لگا تھا۔ اس لیے وہ اٹھ کھڑا ہوا۔ سچ تو یہی تھا کہ اتنی دیر سے خاموش بیٹھے ٹھنڈے مزاج کے مالک جاذب سلطان سے اپنی اور اپنی ماں کی اس درجہ بے عزتی برداشت نہیں ہوئی۔

”ہمیں بھی اب یہاں بیٹھے رہنے کا کوئی شوق نہیں ہے۔ جس کے حوالے سے یہاں آئے تھے وہ اب دنیا سے منہ موڑ چکا ہے۔ اور رہی بات تمہاری..... تو گلتا ہے کہ تمہارا خون سفید ہو چکا ہے۔ اسی لیے اپنی ماں کی عمر کی چھوٹی کے ساتھ اس طرح دو بدو گستاخی کرتی چلی جا رہی ہو۔ یہ میت کا گھر نہ ہوتا تو میں تمہیں ضرور جواب دیتا..... لیکن میں سمجھتا ہوں کہ یہ ہمارے بزرگوں کے آپس کے معاملات تھے جس میں ہم بچوں کا بولنا مناسب نہیں..... مگر تمہارا اتنا بولنا ہم نے بہت برداشت کر لیا اب اور نہیں..... چلو اٹھو اماں..... ہم بھی یہاں ڈیرے ڈالنے نہیں آئے ہیں۔“

بسمہ نے اتنی دیر سے ضبط سے بیٹھے جاذب سلطان کے سرخ و سفید چہرے پر برہمی کے آثار دیکھے تو احساس ہوا کہ شاید وہ ٹھیک کہہ رہا ہے۔ لیکن وہ بہن کو ٹوکنے کی پوزیشن میں نہیں تھی۔ جبکہ جاذب سلطان نے شاہینہ کو ملامت کرنے کے بعد صوفے پر بیٹھی ماں کو حتی انداز میں دیکھا تھا۔ جیسے کہہ رہا ہو کہ بس ابھی رخت سفر باندھ لو۔ اور نرنب بی بی بھی شاہینہ کو ناگواری سے ٹھوکتے ہوئے اٹھ کھڑی ہوئیں مگر فیصلہ کر کے..... سمر کو ماموں کے حوالے کرنے پر انہیں اعتراض تھا۔ لہذا انہوں نے وہیں اپنا قطعی اور حتی فیصلہ سنایا تھا۔

کی پسند پر راضی خوش سیکھنے کو بھانج کے روپ میں قبول کر لیتیں۔ یہی سوچ کر کہ جوڑے تو آسمانوں پر بنتے ہیں۔ بشیر احمد اور سیکھنے کا بھی بن چکا تھا۔ یہ خدائی اختیار ہے پھر انہوں نے یہ اختیار اپنے ہاتھ میں لینے کی کوشش کیوں کرنا چاہی تھی۔

تاریک رات کے ساتھ سفر کرتی لکڑی بس بڑی تیزی سے منزل کی جانب اپنا سفر طے کر رہی تھی..... سب مسافر بھی کھانے وغیرہ سے فارغ ہو کر اب خود پر چادریں ڈالے پاؤں پمارے لیٹ چکے تھے۔ سوائے جاذب اور بسمہ کے۔ دونوں ہی... بے چین و فکر مند..... جاذب پیچھے گھر والوں کے لیے تو بسمہ آگے آنے والی زندگی کا سوچ کر..... جاذب نے کئی بار اسے دیکھا تھا۔ جو چپ کی بکل اوڑھے وینڈو والی سیٹ پر بیٹھی شیشے کے پار اندھیرے میں بھاگتے دوڑتے مناظر میں گم تھی۔ جانے کیوں..... جاذب کو اس کے دکھ ہی نہیں حالات پر بھی اس سے ہمدردی محسوس ہو رہی تھی۔ ورنہ شاہینہ سے تو وہ خاصا بدگمان ہو چکا تھا۔ بسمہ پھوپھی کی ہمدردی یا پھر ان کے ساتھ لگی بیٹھی خاموشی سے آنسو بہاتی رہی۔ وہ اس سے بشیر احمد کے بچپن ولوہن کی باتیں اور قصے یاد کر کے خود بھی آبدیدہ ہو رہی تھیں۔ جاذب تب بھی خاموش رہا تھا۔ اس طرح تو اس نے شاہینہ کو بھی روتے نہیں دیکھا تھا۔ جانے کیا بات تھی، رشتوں سے انجان ہو کر بھی اسے بسمہ کے لیے افسوس ہو رہا تھا۔

اسے دیکھ کر صبح سے اب تک وہ یہی اندازہ لگا پایا تھا کہ واقعی ایک ماں، باپ کی اولادیں مختلف مزاج اور عادات کی مالک ہو سکتی ہیں۔ ایک شاہینہ تھی، جس نے میت والے گھر میں ماں جیسی پھوپھی کی عزت کا لحاظ بھی نہیں کیا تھا۔ دوسری بسمہ تھی جو سارا وقت چپ اور صبر کی بکل میں دبی بیٹھی رہی۔ اور اب ہنسائی اعتراض اور تردد کے ان کے ساتھ اپنے گھر اور اپنوں سے اتنی دور جا رہی تھی۔ یا تو وہ مجبور تھی یا پھر خونی رشتے کے حوالے سے اس نے باپ کی سگی بہن پر بھروسہ کر لیا

اب کو انہوں نے نور بسمہ کا نکٹ کرانے کے لیے روانہ کیا۔ اسے تو واپسی کے نکٹ کر آئی تھیں کہ قتل کے بعد لوگ نکل جائیں گے۔ رسم قتل کے بعد آمنہ بی بی کے دل کو اس گھر اور شہر سے رخصت ہوتے ہوئے بسمہ کی بت کے مانند زینب بی بی کے ہمراہ چل رہی تھی۔ بہن نے بھی اپنی مجبوری کے قصے سنا کر بسمہ کے دل کو اپنی طرف سے صاف کرنے کی کوشش کر کے رخصت کیا تھا۔ یہ جانے بغیر کہ بسمہ کا خونی رشتوں پر اعتماد، بھرم اور مان سب کچھ ٹوٹ چکا ہے۔

☆☆☆

وہ تینوں اب اپنی منزل کی جانب محو سفر تھے..... لعل بی بی تو مغرب کا اندھیرا جھیلے ہی سیٹ کی پشت پر لیٹ لگا کے آنکھیں موند چکی تھیں۔ بسمہ اور جاذب اپنی جگہ خاموشی کے ساتھ سفر کر رہے تھے۔ دونوں میں سے کون جانتا تھا کہ زینب بی بی کی بند آنکھوں اور دل کے اندر پچھتاوے اور دکھ کے کالے آدوں برس رہے تھے۔ وہ جیتے جی بھائی کا چہرہ نہ دیکھنے کا قصد کر کے مرنے کے بعد بھی بھائی کا چہرہ نہیں دیکھ سکی تھیں۔ ان کی ضد عمر بھر کا پچھتاوا بن گئی۔ وقت اور قسمت دونوں نے ان کا ساتھ نہیں دیا تھا یا پھر قدرت نے ہی انہیں ان کی ضد اور ہٹ دھرمی کی سزا دی تھی کہ وہ مردہ بھائی کا چہرہ بھی قبر میں اترنے سے پہلے آخری بار نہیں دیکھ سکیں۔

یہ عمر بھر کا پچھتاوا اور ملال تھا جو شاید اب ان کے ساتھ قبر تک جانا تھا..... کسی اور کے سامنے نہ سہی مگر اپنے دل میں وہ یہ تسلیم کر چکی تھیں کہ غلطی ان کی اپنی تھی۔ بلا وجہ کی ضد اور ناراضی باندھ کر گئے بھائی اور اپنے خون کو خود سے جدا کر دیا۔ ورنہ بشیر احمد نے تو بہن کو مرنے کے لیے معافیاں تک مانگ لی تھیں۔ حالانکہ مرضی اور پسند سے شادی کرنا اتنا بڑا قصور نہیں تھا..... لیکن اس وقت غصے نے زینب بی بی کی عقل سلب کر لی تھی..... وہ سنگدل بن گئی تھیں۔ اور اب وہ دل و دل میں اپنا محاسبہ کر رہی تھیں کہ کیا تھا جو وہ بشیر احمد

جواب پر چند لمحوں کے لیے چپ رہ گئے تھے جبکہ سخت مایوسی ہوئی تھی۔ وہ تو اس امید پر بڑی بہن کو رہی تھی کہ شاید وہ چھوٹی بہن کو خود سے اتنی دور کر جانے نہیں دے گی۔ اعتراض کرے گی..... لیکن شاہینہ کے اقرار نے بسمہ کی خوش فہمی کا بھرم بڑی بے دردی سے توڑا تھا۔ وہ بس خاموشی سے پلٹ کر کمرے کے باہر نکل گئی۔ اور تب جاذب نے پہلی بار غور سے بسمہ کی دہلیز کے پار کھڑی مایوس و دکھی لڑکی کی آنکھوں میں تیرتے عجیب سے تاثر کو دیکھا تھا۔ اسے بس بھرنے کے لیے اس لڑکی پر ترس آیا تھا۔ پھر اس کے ہاتھ ہی وہ ماں کی طرف دیکھنے لگا۔ اور زینب بی بی کی ہاتھ پر سکون نظر آئیں۔ وہ بھی شاہینہ کی بات سننے کے بعد..... یہ واقعی حیرانی کی بات تھی۔ جبکہ آمنہ بی بی خونی رشتوں کی اس ناقداری پر بس دل ہی دل میں تاسف ہی کر سکتی تھیں، کر کیا سکتی تھیں۔ وہ کچھ کہنے کا حق بھی کہاں رکھتی تھیں۔ البتہ دل میں بسمہ کی بھلائی اور بہتری کے لیے دعا ضرور کی کہ زینب بی بی کا فیصلہ بسمہ کی بھلائی کے لیے ہو۔

اور زینب بی بی کے دل کا حال تو خدا ہی جانتا یا پھر وہ خود..... جنہوں نے بسمہ کو ساتھ لے جانے کا فیصلہ کیا تھا..... بھلا کیوں.....؟ اس سوال کا جواب شاید آگے جا کر وقت نے دینا تھا۔ اس لیے آمنہ بی بی خاموشی سے وہاں سے اٹھ کر چلی گئیں۔ تاکہ بسمہ دلا سے، تسلی کے ساتھ سمجھا سکیں جبکہ شاہینہ اور عامر تھوڑی دیر پہلے پھوپھی نے زینب کو کینہ توڑنگا ہوں سے دم کر ملامت کر رہے تھے۔ اب شیر و شکر لہجے میں ان کو خوشامدیں کر رہے تھے۔

شاہینہ نے تو ان سے اپنے رویے کی معذرت مانگ کر لی تھی۔ اس ڈر سے کہ کہیں وہ اپنا فیصلہ اس کے نامناسب رویے کی وجہ سے بدل ہی نہ لیں..... زینب بی بی بھی جہاندیدہ خاتون تھیں۔ لوگوں کے لہجہ رویوں سے انسان کی پہچان کرنا جانتی تھیں..... اس نے انہوں نے شاہینہ کو زیادہ مند لگانے کی کوشش نہیں کی۔

”مجھے بھی کوئی شوق نہیں ہے غیروں کے گھر بیٹھ کر بھائی کی اولاد سے اپنی بے عزتی کرانے کا..... تمہیں تو بڑے، چھوٹے کا لحاظ ہی نہیں..... مگر بسمہ کو میں کسی کے ساتھ جانے نہیں دوں گی..... یہ میرے بھائی کی نشانی ہے۔ اسے میں اپنے ساتھ لے کر جاؤں گی۔“

اور ان کا فیصلہ سن کر بسمہ ہی نہیں جاذب نے بھی ماں کے آٹا فانا فیصلے کو چونک کر سنا تھا۔ جبکہ شاہینہ اور عامر کے چہرے جذبات و تاثرات سے عاری بالکل ساٹ نظر آ رہے تھے۔

”جب تمہاری ماں سے ہم نے کوئی رشتہ نہیں رکھا تو پھر اس کے بھائی کے گھر اپنی بیٹی کیوں چھوڑ دوں گی۔ چل بسمہ دھی..... اتو اپنا سامان باندھ لے..... اب تو ہمارے ساتھ رہے گی۔“ انہوں نے بسمہ کی طرف دیکھ کر کہا جو گم گم کھڑی تھی۔ جیسے مٹی کا بت ہو..... جبکہ جاذب ناگواری سے دیکھ رہا تھا۔ بھلا وہ بسمہ کو اپنے ساتھ کیوں لے جانا چاہتی ہیں؟ لیکن ماں کے غصے کے ڈر سے خاموش رہا..... البتہ عامر اور شاہینہ کے چہروں پر اب کچھ دیر بعد سکون در آیا تھا۔ جیسے کوئی ناپسندیدہ بوجھ شانوں سے خود بخود اتر گیا ہو۔ انہیں پتا تھا۔ ماموں اور ممانی پہلے ہی بسمہ کی ذمے داری لینے سے اپنی جان چھڑا کے جا چکے تھے۔ اب اگر وہ پھوپھی کے فیصلے پر اعتراض اٹھائی تو بسمہ کو اپنے ساتھ گھر لے جانا پڑتا..... لہذا ”جان بچی سولا کھوں پائے“ کے مصداق اس نے جلدی سے ہامی بھر لی۔ انہیں بسمہ خود پھوپھی کے ساتھ اتنی دور دوسرے شہر جانے سے انکار نہ کر دے۔

”ٹھیک ہے پھوپھی..... اس معاملے میں ہم اعتراض نہیں کریں گے۔ کیونکہ ماموں کے بعد اب آپ ہی خاندان کی بڑی بزرگ ہیں۔ آپ کا فیصلہ ہمیں منظور ہے۔“ شاہینہ نے جھٹ سے لہجے اور رویے کے اتار چڑھاؤ کو نرمی و حلاوت میں ڈھال کر پھوپھی سے کہا تو وہ اور جاذب بھی اس کے خلاف توقع

تھا۔ حالانکہ اتنے برس کی لائقیت کے بعد وہ اس کے لیے اجنبی ہی تو تھے۔ اگرچہ جاذب اس کی سوچیں تو نہیں پڑھ سکا تھا۔ مگر اسے اس لڑکی کے دکھ اور نقصان کا پورا احساس تھا۔

”وہاں اندھیرے میں کیا دیکھ رہی ہو۔“ اسے مسلسل کھڑکی کی سمت دیکھتے پا کر وہ بالآخر وہ بول پڑا تھا اور جاذب کی آواز پر ہسمہ نے چونک کر اسے دیکھا تھا۔ وہ ان کی برابر والی سیٹ پر بیٹھا تھا۔ دو والی سیٹ پر ہسمہ اور پھوٹی بیٹھی تھیں۔ بڑی، بڑی سیاہ آنکھوں کی مٹی جھالیں جاذب کی آواز پر وا ہوئی تھیں۔ اسے جاذب کے پکارنے پر حیرانی ہوئی تھی۔ لہذا وہ بس جاذب کی طرف ایک نظر دیکھ کر خاموش نگاہیں جھکا چکی تھیں۔ اسے سمجھ ہی نہیں آیا کہ جاذب کو کیا جواب دے۔ اور جاذب اس کی دلی کیفیت کچھ، کچھ سمجھتے ہوئے سوچنے لگا کہ واقعی ماں، باپ سے جدائی صدمہ بہت بڑا ہوتا ہے۔ لیکن اگر انسان دیگر رشتوں سے بھی بے سہارا ہو جائے ہسمہ کی طرح تو یہ صدمہ کنھن آزار بخش بن جاتا ہے۔ ہسمہ بھی اسی اذیت سے گزر رہی تھی اور جاذب نے اس کے دکھ کو پورے دل سے محسوس کرتے ہوئے تسلی و حوصلے کے چند بول سے اس کے دل کا بوجھ ہلکا کرنا چاہا۔

”کیا ہوا..... نیند نہیں آرہی ہے کیا؟“ اس نے دھیمے لہجے میں مزید سوال کیا تو اس بار ہسمہ کو اثبات میں جواب سر ہلا کر دینا پڑا۔

”آئے گی بھی کیسے..... اماں کہتی ہیں کہ خالی پیٹ نیند نہیں آتی ہے اور تم نے تو دوپہر سے کچھ نہیں کھایا ہے۔ کچھ کھا لو تو نیند ضرور آجائے گی۔“ اسے اندازہ تھا کہ وہ شاید کل سے ہی بھوک ہوگی اور اس کی بات سن کر ہسمہ کی بڑی، بڑی سیاہ آنکھیں حیرت سے چمکی تھیں۔ بھلا اسے کیسے پتا کہ ہسمہ نے دوپہر سے کچھ نہیں کھایا ہے۔ وہ کچھ نہیں بولی تھی۔ البتہ جاذب نے کھانے کی چیزوں والی باسکٹ میں سے ہسمہ کے حصے کے کباب پرائے والا باکس نکال کر اس کی طرف بڑھا دیا۔

”اب یہ مت کہنا کہ تمہیں بھوک نہیں ہے۔“ صبح تک یوں ہی کھڑکی کے پار آسمان کے تارے کھل رہے تھے۔ جاذب کے لہجے میں اپنائیت ہی نہیں محبت بھی تھی۔ اور ہسمہ سے اس بار انکار نہیں کیا گیا..... اور بھوک بھی لگ رہی تھی، کیا کرتی، زندہ انسان کے لیے زندہ رہنے کے لیے پیٹ کی آگ بجھانا ضروری ہوتا ہے۔ پھر چاہے وہ مرنے والوں کے دکھ میں ساری عمر جلتا رہے۔ لیکن جب تک زندگی کی سانسیں چل رہی ہیں، انسان کو جینا پڑتا ہے۔ اس لیے ہسمہ نے نفن باکس جاذب کے ہاتھوں سے لے لیا۔ پھر منزل وائر کی چھوٹی بوتل نکال کر جاذب نے اسے پکڑائی تھی۔ جسے اس نے لے کر سیاہ مٹی ریشمی جھالروں (پلکوں) کو جھکا لیا۔ اور کھانے لگی۔ مگر جاذب کی نگاہیں ان ریشمی جھالروں میں کہیں انک کر رہی تھیں۔ وہ چند لمحوں تک اس کے سوگوار چہرے کو دیکھتا رہا پھر کچھ دیر بعد اپنی سیٹ سے اٹھ کر پچھلی خالی سیٹوں کی جانب چلا گیا۔ جاذب نے ایک نظر اسے پلٹ کر دیکھا..... پھر اسے ریلیکس ہو کر کھاتا دیکھ کر اطمینان بھری سانس بھرنے آگے بڑھ گیا۔ نیند تو اسے بھی نہیں آرہی تھی۔ اسی لیے پچھلی خالی سیٹوں میں سے ایک پر جا بیٹھا..... اسے سگریٹ پینے کی عادت تھی مگر بندیشوں والی لکڑی بس میں اس کی ممانعت تھی وہ کسی قریبی اسٹاپ اور کے انتظار میں بیٹھ گیا۔

شاید یہ واحد بری عادت تھی جو جاذب سلطان نے جانے کب اور کہاں سے لگالی تھی۔ وہ کبھی کبھار اس کو تنگ کرتا تھا وہ بھی مگر والوں سے چھپ کر۔ اور یہ عادت بھی اسے پچھلے کچھ سالوں سے ہی پڑی تھی۔ باہر زوروں کی سردی تھی تو اندر کے گرم ماحول میں جاذب نے گرم چادر اچھی طرح لپیٹتے ہوئے سیٹ کی بیک سے ٹیک لگائی۔

بس اپنی منزل کی طرف آگے بڑھی رہی تھی اور جاذب کی سوچوں نے کچھ سال پیچھے کا سفر شروع کر دیا تھا۔

دوسرا اور آخری حصہ اگلے ماہ پڑھیں

## محبتِ جوانی میں تارا

شمالہ و لعل آباد



”ہر بیرون چندے آفتاب و چندے ماہتاب،  
بتا نہیں یہ راسخ زنس و رلد سے نچے اتر کر ہم جیسی عام سی  
لڑکیوں کو بیرون کب دکھائیں گی جو بھی اسٹوری کھولی  
آنکھوں سے لے کر بیرون تک بیرون کو حسن میں  
افروز کو حیرت ہوئی شہزادی پچھلے آدھے گھنٹے  
سے رسالے میں سر دیے بیٹھی تھی اس سے پہلے کہ وہ  
اس سے پوچھتی ”طبیعت تو ٹھیک ہے؟“ شہزادی نے  
رسالہ اٹھا کر اس کے بیڈ پر فح دیا۔

ڈوبے پایا ہونہ.....

”یاد دل پر کیوں لیتی ہو، رائٹر زکشن لکھتی ہیں ویسے بھی تم پتا نہیں اس کامیکس سے کب نکلے گی ہزار بار تمہیں بتایا ہے، تم اچھی ہو، اچھی لگتی ہو اور ہنستی ہوئی تو بہت ہی اچھی لگتی ہو۔“

”بس، بس کو اس بند کرو..... پہلے ہی رسالے کھنگال کر میرا موڈ آف ہے اور اوپر سے تم جھوٹ بولے جا رہی ہو۔“ شہزادی واقعی بیزار ہو رہی تھی۔ وہ اسی لیے رسالے نہیں پڑھتی تھی۔

ساڑھے چار فٹ قد کے ساتھ خاصی دیتی ہوئی رنگت متضاد نام شہزادی..... حقیقت میں شہزادی کو مذاق اڑاتا ہوا لگتا تھا جب سے اس نے ہوش سنبھالا ماں اور نانی سے یہی سنا تھا۔ ”ہائے، ہائے یہ کالی کوٹنی باپ پر کیوں چلی گئی، کیسے بیاہیں گے اسے؟“ پھر ان کے بعد چچا بیگم ایسی بیاہ لائے جو اندھیرے میں بیٹھیں تو گویا روٹی کر دیں، ایسے میں ماں اسے اور خود سے دور کر دیتیں، واحد ابا کا سہارا تھا انہوں نے نام بھی شہزادی رکھا تھا اسے پال پوس بھی شہزادی جیسا رہے تھے پر وہ اپنی عمر بڑی تھوڑی لائے تھے محض سات برس کی شہزادی باپ کے سائے سے محروم ہو گئی۔ پھر نانی اور ماموں نے ماں کی دوسری شادی کر دی، سوتیلے

رشتے ایسے تنگ دل نکلے کہ اسے پناہ چچا کے پاس ہی ملی تھی، شائستہ چچی کی زبان نہایت غیر شائستہ تھی اوپر سے تنگ دلی بھی پائی جاتی تھی لیکن پھر بھی وہ شہزادی کو اپنی ممانوں سے اچھی ہی لگتی تھیں شوق تو شہزادی کو ڈاکٹر بننے کا تھا مگر باپ کے ساتھ جیسے باقی شوق اور کھیل ادھر رہے رہ گئے تھے وہاں یہ بھی رہ گیا اور شہزادی بیگم بن گئیں نس، آسمانی صحیفوں جیسا مقدس مسیحائی کا یہ پیشہ اسے بڑا عزیز تھا دل و جان کی طرح، دل و جان تھوڑا غلط ہو گیا کیونکہ دل اس کے پاس تھا ہی نہیں پچھلے کئی سالوں سے۔

☆☆☆

آج کل افروز اور شہزادی کی ٹائٹ ڈیوٹی تھی

افروز نیند پوری کرنے کے بعد حسب معمول رسالے میں سرسھیر پڑے ہوئے تھی جبکہ شہزادی میڈیم سائز کا پنا ہڑپ کرنے کی تک دو دو میں تھی۔ افروز کی نظر اب اس پر پڑی تھی تو وہ بیڈ سے چھلانگ لگا کر اتری تھی۔

”بھوکی، ندیدی، بیڈ..... میں نے کیا وارڈ میں جا کر گھوکو زنگ لگوانا ہے جو خود سارا ہڑپ کر رہی ہو۔“ آج کینٹین میں ماش کی وال کے نام پر عجیب ملغوبہ تھا جسے چھوڑ کر وہ باہر سے پراسٹکو آکر عیاشی کر رہی تھیں۔

”روزی آج وہ بہت یاد آ رہے ہیں، دل بہت دکھا ہوا ہے۔“ وہ پرا کا بڑا سا بائٹ لے کر بولی تو افروز نے بے اختیار دانت چکپکپائے۔

”تبدیل تجھے یاد آنے پر اتنی بھوک لگ رہی ہے، اللہ جھوٹ نہ بلوائے تو قریب، قریب سارا بڑا اور ہاف لیٹر ڈرنک ڈکار گئی ہو، نہ یاد آنے پر پتا نہیں کیا کرو گی۔“ ”تجھے بھی ہضم کر چکاؤ گی وہ بھی ہڈیوں سمیت اور بی بی روزی اس سے پہلے کہ اسپتال کا گیٹ بند ہو یا سسٹر ریٹائے درگت بنے جلدی سے یونیفارم پہنو، آٹھ بجنے میں صرف سات منٹ ہیں۔“ پھر جو انہوں نے ریس لگائی تو وارڈ نمبر تین کے کاڈنٹر پر ہی جا کر رکیں۔ سسٹر ریٹائے عینک کے اوپر سے ان کی پھولی سانسوں کو دیکھا تھا۔

☆☆☆

وہ تیزی سے بی بی لیتی جا رہی تھی، ساتھ ساتھ معمول کے سوالات تھے۔ اس کے نرم رویے پر مریض اور لوہا تھیں اسے بہت دعائیں دیتے تھے ابھی وہ تین دن پہلے ایڈمٹ ہونے والی ماں جی کی ٹانگ کی پٹی بدل رہی تھی، شوگر کی وجہ سے ان کی ٹانگ کا ذم بہت خراب ہونے پر ایڈمٹ کر لیا گیا تھا۔

”اب کیسا حال ہے ماں جی؟“

”پتر بہوں درد ہے برداشت ای کے نہیں تھیدا۔“ (بیٹا بہت درد ہے برداشت نہیں ہو رہا) ماں جی نرم سے سرانگیسی لہجے میں بولیں۔

”گھبراؤ نہیں ماں جی میں درد کا انجکشن دے

دیتی ہوں۔ آپ کو نیند بھی آجائے گی۔“

”آپ ڈاکٹر عثمان سے پھر سے بات کریں، ہو سکے تو باہر کی میڈیسن بھی لکھوائیں اماں جی کے لیے۔“ وہ ان کے بیٹے کو ہدایت دے رہی تھی۔

”ہمیں بھی کوئی ایسا ڈاکٹر دیں ساری عمر کو قرار آجائے۔“ بیڈ نمبر انیس کے منچلے نے دانت نکوسے تو بیس والا بھی بول پڑا۔

”اجی ہماری ایسی قسمت کہاں..... ان کا التفات تو بابے بڑھوں کے لیے ہی ہے۔“ شہزادی نے بے اختیار گھوڑ کر دیکھا اور ٹرائی دکھائی ہوئی بیڈ نمبر ایکس پر پہنچ گئی۔

”بشیر بھائی، بیڈ نمبر انیس، بیس کو کسی چین کلر کی ضرورت نہیں ہے، وہ بالکل فٹ ہیں، اگلے چار گھنٹے تک نو چین کلر نو انجکشن، اوکے.....“ وارڈ بوائے وارڈ میں داخل ہوا تو اس نے سمجھا کہ کیا وہ ان دونوں مریضوں کی پینٹی طبیعت سے عاجز تھی۔

”ٹھیک ہے جی، ویسے بھی باہی مجھے یہ دونوں ضرورت سے زیادہ ٹھیک لگ رہے ہیں، منج و سچارج کروا دیتے ہیں۔“ بشیر غور سے انہیں دیکھ رہا تھا وہ سات سال سے ایک دوسرے کے ساتھ بہاول و کٹوریہ میں کام کر رہے تھے، ایک دوسرے کے مرض شاس تھے سواب بھی وہ سمجھ گیا تھا اور باقی مریضوں کی ڈریس بدلنے میں مہیلا کر رہا تھا۔ جی بیڈ انیس والا بول پڑا۔

”پلیز سسٹر لگا دیں درد والا انیکا، مجھے درد ہو رہا ہے۔“ ”تیرے درد سے دل آبا در ہا کچھ بھول گئے کچھ یاد رہا، یاد رہا؟“ وارڈ بوائے بشیر زور سے گنگنا رہا تھا۔ دوسری طرف سے افروز نے سر راہ کر حوصلہ افزائی کی تو صفائی کرتا مائیکل بھی بول پڑا تھا۔

”بشیر بھائی میں تو آپ کا فین ہوں۔“ جبکہ دونوں مریض شرمندہ ہو کر معافی طلب کر رہے تھے۔

## محبت مانگ میں تارا

اور سوتیلے باپ دونوں نے انکار کر دیا تھا۔ چچا بھی ہرگز اس کے نس بننے پر راضی نہیں تھے۔

”چچا جان وہاں سے ٹریننگ کے ساتھ، ساتھ سیلری بھی ملے گی۔“ اس نے تڑپ کا پتا چھپک دیا تھا۔

”لیکن بیٹا نرسوں کے ساتھ بہت بدتمیزی ہوتی ہے اب تم ہی بتاؤ۔“

”لو بھلا بدتمیزی اور وہ بھی اپنی شہزادی سے۔“ چچی نے سر سے حیرت تک اسے حقارت سے دیکھ ڈالا تھا۔

”بیٹہ کے ابا آپ بھی کمال کرتے ہیں، اس بیچاری حبشہ سے کسی نے کیا لیتا، لٹا اسے تنخواہ ہی ملے گی چلو خود کا دان (ججیر)، ہی لہسا چوڑا بنالے گی۔ کیا پتا کوئی نوکری و سامان کے لالچ میں پھنس جائے۔ ہمارے پاس وڈے داج کے پیسے کہاں۔“ چچی بیگم نے ایک ہی سانس میں مکمل تجزیہ دیا تو چچا پر ہی نہ مار سکے۔

☆☆☆

رات کے تین بج رہے تھے جب وہ کافی کی طلب میں سسٹر ریٹائے کے پاس چلی آئی تھی۔ سسٹر ریٹائے لیے اسٹرائنگ اور اپنے لیے سپرائزنگ کپ تھا وہ کاؤنٹر کے بیک پر کھڑے صوفے میں دھنس گئی۔

”تم نے پھر تیز کافی بنائی ہے ناں..... اتنی کڑی خوشبو.....؟“

”ارے نہیں ریٹائے سسٹر سیم آپ کے والی ہے۔“ اس نے شرارت سے کپ کو چیخ کر زور کے انداز میں لہرایا۔

”رنگ کالا ہو جائے گا۔“ ”کالے کا کیا کالا ہوتا ہے۔“ وہ مسکرائی۔

”بہت بری بات ہے، نا شکری نہیں کرتے خداوند ناراض ہوتا ہے، سب اسٹاف سے لے کر ڈاکٹر تک اتنی سی عمر میں تمہاری اتنی عزت کرتے ہیں تم ہو کہ اب بھی رنگوں میں الجھی ہو۔ انسان کو بلند تو کر دیا کیا کرتا ہے رنگ تو فقط خوشنما دکھایا کرتے ہیں.....“

”اور اگر یہ دونوں چیزیں اکٹھی ہو جائیں تو.....؟“ وہ سوالیہ ہوئی۔ پتلون پر ڈاکٹر ستین کا عکس محبت بن کر پھیلا تھا۔ دل نے خون کی جگہ محبت کو پیروں

”جی سر.....!“  
”ہائے اتنا سہنا، شہزادی یہ تو بالکل شہزادہ ہے۔“ جوش میں افروز نے اس کے پہلو میں کچھ زیادہ ہی زور سے کہنی مار ڈالی۔

”بیڑا غرتے..... اپنا کام کر دھیان سے ورنہ اس شہزادے نے منٹوں میں جلا دین جاتا ہے۔“

بڑی مترنم رنگ ٹون بھی، سیل یقیناً ان کے ساتھ کھڑے قافلے میں سے کسی کا تھا۔ وہ جو بڑے دھیان سے مریض کو چیک کر رہے تھے۔ سینے کے مختلف حصوں پر باؤ ڈال، ڈال کر جو نیزہ زکوکچر بھی رہے تھے یک دم چونکے پھر مریض کی شرٹ بھی اپنے ہاتھ سے برابر کر ڈالی اب وہ جیک کی پاکٹوں میں ہاتھ ڈالے بالکل سیدھے کھڑے تھے پورے قد کے ساتھ، چہرے پر واضح طور پر غصے کی سرخی لیے۔

”اب میں یہ کہوں کہ اپنے سیل فون گھر پر رکھ کر آیا کریں؟ شرم آتی چاہیے۔“

”س سوری سر.....“ جیک ڈاکٹر مننٹا رہی تھی۔ شہزادی نے جھرمجھری لے کر اپنا سیل پھر سے چیک کیا تو افروز نے بھی تقلید کی تھی۔

”بشیر وارڈ میں اتنی ٹھنڈ کیوں ہے؟“  
”سرا ایک ہیڑ کام نہیں کر رہا اس لیے۔“

اب وہ ہیڑ کے پاس کھڑے اسے ٹھونک بجا کر دیکھ رہے تھے بالآخر نیچے بیٹھ کر ہیڑ کو ایک دھبہ رسید کر کے بھی دیکھا۔ سارا قافلہ جزیرہ کھڑا وہ نیچے بیٹھے ہیڑ سیٹ کرتے بولے۔

”بس یہ تو جواب دے گیا ہے بشیر میرے کمرے سے ہیڑ لاکر ادھر لگا دو۔“ بشیر نے حکم کی نکیل میں دوڑ لگا دی تھی۔

☆☆☆

ڈاکٹر متین کے وارڈ میں ڈیوٹی کا یہ تیسرا ہفتہ تھا، اب وہ دونوں عادی..... ہو گئی تھیں، افروز مٹرکشی کا وقت بھی نکال لیتی تھی لیکن وہ اب بھی رات کے ڈھائی بجے مستعد کھڑی وارڈ پر طائرانہ نظر ڈال رہی تھی جب

سے راؤنڈ لیتے رہتے ہیں۔ ان کے ساتھ ڈیوٹی میں سو نہیں سکتے، فضول مذاق اور فضول گفتگو نہیں چلے گی نہ خود فری ہوتے ہیں اور نہ کسی کو ہونے دیتے ہیں۔ باقی بہت نرم دل و مشفق ہیں تم کوں سا کام چور ہو جو ڈری ہی ہو۔“ سسٹر ریٹا نے بڑی تفصیل سے ان کے بارے میں بتایا۔

”سسٹر، بات، بات پر ہاتھ تو نہیں ہوتے سر.....؟“ شہزادی منمنائی۔

”ارے نہیں بچے ایسی کوئی بات نہیں، ایسے ہی وہ کبختیں تمہیں ڈرا لگیں۔ ان کے ساتھ ٹھنڈے بازی جو نہیں ہوتی اس لیے۔ جب سے ان کی بیوی کی وفات ہوئی تب سے وہ ضرورت سے زیادہ سنجیدہ ہو گئے ہیں اصل میں موت کو بہت قریب سے دیکھا ہے ناں ڈاکٹر متین نے..... ایکسیڈنٹ بہت شدید تھا بیٹیم تو ان کی موقع پر ہی مر گئی تھیں۔ جبکہ بیٹی اور یہ خود معجزانہ طور پر بچ گئے تب سے ذرا ڈرا ہی اور سنجیدہ ہو گئے ہیں۔“

بات دکھ کی تھی مگر ان دونوں کو قدرے اطمینان ہوا تھا کہ یہ اصل کہانی ہے۔ پھر وہ وارڈ چلی آئیں۔ بشیر دوسری بار گزر، مرکز صفائی کر رہا تھا وہ اپنے کام میں جتی رہیں حالانکہ شہزادی کا دل کر رہا تھا ایک بار جا کر چائے کا کپ لے آئے سردی بھی تو غصہ کی تھی لیکن جرات نہیں ہو رہی تھی اور بالآخر تھا جس کا انتظار وہ شاہکار آ گیا۔

بلیک پنٹ کے ساتھ سی گرین شرٹ اور سردی کی وجہ سے ساتھ بلیک ہی جیکٹ پہن رکھی تھی صاف رنگت، کھڑے نقوش، چہرے پر داڑھی، وہ بلاشبہ مردانہ وجاہت کا جاندار نمونہ لگ رہے تھے۔ دائیں، بائیں کھڑے جیک ڈاکٹر میں وہ سب سے ممتاز سب سے الگ اپنی نرم و مشفق آواز میں بیڈ نمبر ایک کے مریض سے حال چال پوچھ رہے تھے وہ دونوں بھی میڈیکل ٹرائی چھوڑ کر بھام بھام گئے ان کے پاس پہنچی تھیں اور بیک وقت سلام بھڑا تھا۔

”سسٹر آپ جا کر اپنا کام کریں۔“

آتا اور انجکشن ٹوٹ جاتا تو وہ ڈرپ لگانا بھول جاتی لیکن وہ شہزادی بھی حوصلوں کی، اس نے دل مضبوط کیے رکھا اور بالآخر چار سال بعد بہترین نمبروں سے نرسنگ کر کے (بہاول پور و کنورہ اسپتال) بی، وی، ایچ ہی میں سرکاری نوکری سے سرفراز ہو گئی۔ اس سفر میں جہاں افروز اور سسٹر ریٹا ساتھ تھیں وہیں ڈاکٹر متین بھی قلمی طور پر اس کے ہم سفر رہے۔ وہ جو کسی کے ہم سفر بننے کے قابل نہ رہے تھے وہ چپکے سے انہیں اپنا بنا بیٹھی، پتا نہیں کیسے اور پتا نہیں کیوں وہ جب بھی سوچتی بس لفظ ”کیوں؟“ تک ہی رہتی۔

☆☆☆

تین ماہ ہو گئے تھے نرسنگ ہاسٹل میں رہتے اور ٹریننگ لیتے، اب دوائیوں کی ناگوار پوسے الکا کی آلی تھی نہ ہی خون دیکھ کر ہاتھ ہیرا کہتے تھے، انجکشن پر بھی اس کا ہلکا سا ہاتھ تھا۔ لیکن سینئر زاب بھی اسے ڈراتی تھیں۔

”ڈاکٹر متین معطفی کا وارڈ، وہ بھی ناٹ ڈیوٹی کے ساتھ، تو یہ ڈاکٹر متین کی وارڈ ڈیوٹی..... خیر مناؤ کھڑوس ہے پورا کلف زدہ سڑیل، لوگوں کا۔“

شہزادی کی پسیلوں میں دل مزید سکڑا تھا اسے تو ابھی تک ڈاکٹر بشیر اور ڈاکٹر افتخار کی ڈانٹ نہ بھولی تھی اب پھر سے..... بس ایک گہری سانس لے کر رہ گئی۔

”آپ کی کیا بہت ٹھہری ہے؟ مطلب ناٹ ڈیوٹی.....“ افروز تھوک نکلتے ہوئے بات کو دوسرے زاویے سے لے رہی تھی۔

”ٹھہری.....؟“ دونوں سینئر نے ہاتھ پر ہاتھ مارا اور خراماں خراماں چل دیں۔ ان کے تہقیروں کی آواز کے پیچھے یہ دونوں بھی چل پڑیں ان کی دوڑ بس سسٹر ریٹا تک ہی تھی باقی بھلے ان سب سے ڈرتی تھیں مگر شہزادی اور افروز، سسٹر ریٹا، سے گاندس لیا کرتی تھیں۔

”ڈاکٹر متین بہت قابل اور باکردار ہیں بس اصول ذرا سچے رکھے ہوئے ہیں ڈیوٹی میں کوتاہی نہ کام میں کبھی، کبھی تو ناٹ ڈیوٹی پر ساری، ساری رات وارڈ میں ہی ہوتے ہیں۔ ویسے بھی وہ وقفے، وقفے

کے ناخن تک سپلائی کیا تھا، انٹر کام کی کھٹی نے اسے حصار محبت سے وارڈ کے کاؤنٹر تک پہنچایا تو وہ پھر سے بول اٹھی۔

”سسٹر آپ نے جواب نہیں دیا۔“  
”جو تیرے پاس ہے اس پر شکریہ۔“ وہ صبح ہوئیں۔  
”آپ نہ ملتیں تو شاید یہ بھی نہ ہوتا۔“

اسے ان کے پہلے دن کے الفاظ ہمیشہ یاد رہتے تھے۔ سارا ہال فرسٹ ایئر کی لڑکیوں سے کچھ کچ بھرا تھا، گلابی آنچل کی کے گلے میں، کسی کے کندھے پر تو کوئی مضبوطی سے شہزادی کی طرح سر پر جمائے ہوئے تھے۔

”دیکھو لڑکیوں..... باس، سیکرٹری اور ڈاکٹر، نرس کا رشتہ جتنا پرانا ہے، تاریخ بتاتی ہے اتنا بدنام بھی ہے جبکہ میں اس بات سے اتفاق نہیں کرتی۔ رشتے سب مقدس ہوتے ہیں انسان اپنی کم علمی اور... بے شعوری سے ان کو بدنام بناتا ہے۔ تم جب تک اپنی حدود و قیود اور اپنے دائروں میں رہو گی محفوظ رہو گی جب بھی ان سے نکلو گی خود کو کم کر دو گی میری بچیوں.....

اپنا راستہ سیدھا رکھنا چاہیے لاکھ پکارنے والے ملتیں، وہ محض فریب دیں گے اور تم خود کسی کو فریب نہ دینا یہی میری نصیحت ہے اس پر عمل کرو گی تو ایک دن جب میری طرح تیس سالہ سروں کے ساتھ یہاں کھڑے ہو کر اپنے ضمیر اور باقی لوگوں کے سامنے بھی سراٹھا کر نصیحت کر پاؤ گی تو اپنی ذات کا غرور اپنے ساتھ پاؤ گی۔ پھر یہاں بھی اور وہاں بھی معزز ہی رہو گی۔“

ان کا اشارہ آسمان کی طرف تھا۔ اور کسی کا تو پتا نہیں لیکن شہزادی نے ان کی باتیں گرہ سے کس کر باندھ لیں، وہ جیسی تھی ویسی ہی رہی بس سسٹر ریٹا سے ہر گزرتے دن کے ساتھ تعلقات مضبوط ہوتے گئے، احمد پور جیسے چھوٹے سے شہر سے تو بہاول پور کہیں بڑا تھا۔ ہزار بار وہ وارڈ بھولتی، او، ٹی میں جانا ہو تو وہ ہال میں جا لیتی، ڈاکٹر عثمان کے وارڈ میں جانا ہوتا تو سامنے ڈاکٹر ذکیہ کا وارڈ آ جاتا ہے۔ وہ اس نئی دنیا میں گھبرائی، گھبرائی رہی۔ سرخ آٹھائی تو انجکشن توڑتا نہ

تین ہاؤس جابرز داخل ہوئے تھے ڈو لیڈی ڈاکٹر اور ایک میل ڈاکٹر وہ اپنا پریکٹس لیتے رہے، وہ وہیں کھڑی رہی۔

”بیزنسرسات کو بھی چھوڑ دیں ڈاکٹر۔“  
”کیوں.....؟“

”بہت sensitive بچہ ہے پہلے ہی بڑی مشکل سے سویا ہے۔“

”تو کیا اپنا کام چھوڑ دیں؟“

”میرا مطلب یہ نہیں ہے ڈاکٹر دراصل وہ پھر سے تکلیف سے روئے گا دوسرے پشٹ بھی ڈسٹرب ہوں گے ابھی تو پین کلر دیا ہے پھر نیند کے لیے اینجلیشن دینا پڑے گا سرنے منع کیا ہے۔“

”نہیں ہم سے زیادہ پتا ہے۔“ جموری آنکھوں والی ڈاکٹر کو شاید بہت برا لگا تھا اس کا لکچر.....

”اینجلیشن لگانا آئی نہیں اور شروع ہو گئی ہو ڈاکٹر کو لکچر جھاڑنے، اوقات کیا ہے تمہاری۔“ وہ حقارت سے اس کے گلہ باری رین (فرسٹ ایئر) کو دیکھ کر بولی۔  
”ڈاکٹر آپ مس بی ہو کر رہی ہیں۔“ شہزادی کو اب غصہ آنے لگا تھا۔

”تو آپ بھی اپنی لمٹ میں رہیں ناں سسر.....!“ اب تو میل ڈاکٹر نے بھی آئی فون سے سر اٹھالیا تھا۔

”لمٹ تو آپ لوگ کراس کر رہے ہیں جبکہ بات اتنی بڑی نہیں ہے۔“ اب کے شہزادی کا میٹر پکا محسوس کیا تھا اس نے بھی دو بدو جواب دینے کا سوچ لیا۔ اسے پتا تھا سسر نرسز تو ان تک ڈاکٹر ز کو کھیلتے ہیں نہیں رکھتی تھیں۔ تھوڑی پڑھنے کے بعد پریکٹس کے لیے جوائن کرتے تھے لیکن ریسپیکٹ پروفیسرز جتنی مانگا کرتے خاص طور پر نرسز کو کہتے کہ ان کا مشغلہ بن جاتا تھا سب ایسے نہیں ہوتے لیکن کچھ میں تو ڈاکٹر ہونے کا غرور کوٹ، کوٹ کر سما یا ہوتا ہے شہزادی کا واسطہ بھی شاید ایسی ہی ٹولی سے پڑ گیا تھا۔

”سر آرہے ہیں، سر آرہے ہیں۔“ بشیر ہانپتا ہوا

آیا تھا۔

”اب بتاتے ہیں سر کو۔“ وہ تینوں مانو خوش ہی ہو گئے تھے۔ شہزادی نے گہری سانس لے کر خود کو ڈھیلا چھوڑ دیا، وہ اب ان ڈاکٹرز کے سامنے اپنی درگت بنوانے کے لیے تیار تھی۔

ڈاکٹر متین وارڈ اور انہیں بس ایک نظر دیکھ کر واپس ہو لیے تو پیچھے، پیچھے ایک ڈاکٹر چل دیے۔

اس نے اسٹاف اسٹیشن پر آکر کافی کا پہلا سپ لیا ہی تھا جب بشیر بلانے چلا آیا۔

”بشیر بھائی کیا سر کا موڈ زیادہ خراب ہے؟“

”ان ڈاکٹروں کو تو اللہ ہی پوچھے۔“ وہ منہ ہی منہ میں بد بایا تو وہ خاموشی سے اس کے پیچھے چلتی کاؤنٹر کے قریب آ گئی تھی۔

”آپ بتاؤ بچے کیا بات ہوئی تھی؟“ وہ اپنی نیند کے خمار میں ڈوبی سرخ آنکھیں اس کے چہرے پر گاڑھ کر بولے تھے۔ (چھوٹے قد اور دبے پتلے وجود کے ساتھ شہزادی میٹرک میں پڑھتی بچی ہی معلوم ہوتی تھی) پھر جو ہوا وہ اس کے سان و گمان میں بھی نہیں تھا سر نے ان تینوں کو خاصا لکچر دے کر رخصت کیا تھا اور اسے شاباشی کے ساتھ اپنا کام عبادت سمجھ کر کرنے کی تلقین کر دی تھی۔ اس نے نظر اٹھا کر دیکھا وہ مکمل کلر کی شلوار قمیص میں ملبوس کندھوں پر گرم شال رکھے رف سے چلے میں بھی عجیب شان بے نیازی سے کھڑے تھے۔

شہزادی کو لگا کہ انہیں دور بہت دور کسی تہا جرے پر کوئی کشمی لنگر انداز ہوئی ہے جسے جنگلی پھولوں کی باس نے مرجبا، مرجبا کر کے گلے لگا یا ہے۔ وہ شب کے طلسماتی پل تھے جب دینے والا بھی پکارتا ہے کہ۔ ”آؤ مانگو جو مانگنا ہے میں لائے آیا ہوں۔“ وہ تو خاموش کھڑی تھی کچھ نہ مانگنے پر بھی اس نے سب کچھ دے دیا تھا۔ کئی عمر میں اس پر بڑی بچی واردات گزر گئی تھی۔ محبت معجزہ ہے جو خاص، خاص دلوں پر ودیعت ہوتا ہے وگرنہ دل تو کائنات کے ہر ذی نفس کے پاس ہے۔

محبت کے لیے کچھ خاص دل مخصوص ہوتے ہیں

یہ وہ نغمہ ہے جو ہر ساز پر گایا نہیں جاتا

☆☆☆

چچا، چچی اور بیہ وغیرہ کے لیے گرم سوٹ اور دوسری چھوٹی موٹی چیزیں خرید کر وہ ہائی ایس میں آئی تھی۔ دو ماہ بعد وہ ہفتے بھر کے لیے احمد پور جاری تھی، ماں کی ممتا کو اس نے آزما کر بھی شرمندہ نہیں کیا تھا بلکہ اب تو اس کا دل کرتا تھا کبھی سامنا نہ ہو۔ ماں نے خود کے بنا اسے رہنے کی ایسی عادت ڈالی تھی کہ وہ ممتا جیسے جذبے کو ہی بھول گئی تھی جب ساتھ والی لڑکیاں گھر والوں کے لیے شاپنگ کرتیں تو وہ بھی بیچا کی فینا کے لیے کر لیا کرتی تھی اور اسی شاپنگ کی وجہ سے چچی اسے سر آنکھوں پر بٹھا کر کچھ نئی فرمائشیں بھی جڑ دیا کرتی تھیں۔ اب بھی موسم بدل رہا تھا نومبر کے وسط میں ہی دن ٹھنڈے رہنے لگے تھے تو اس نے سردیوں والے لباس خرید ڈالے تھے۔

”بڑی تو شہزادی تھی پھر تم نے پہلے بیہ کی ممتا کیوں کر دی؟“ یہ ان کے محلے کی خاتون تھیں اور خوش قسمتی سے شہزادی کی خیر خواہ بھی تھیں۔ سو وہ چچی کو بات لگانے سے باز نہ آئیں دراصل گھر آ کر شہزادی کو پتا چلا تھا کہ بیہ کا رشتہ طے کر دیا گیا ہے اور دو دن بعد ممتا بھی سو گھر کے محسن کو صاف ستر کر کے ایک دیوار کے ساتھ صوفہ رکھ کر اسٹینج بنالیا گیا تھا شہزادی گریے اور ریڈ کے کنٹراسٹ سوٹ میں بڑے، بڑے آؤیزے پہنے معمول سے زیادہ اچھی لگ رہی تھی جو نئی وہ بیہ کے برابر بھی محسوس دایوں نے چنگوٹیاں شروع کر دیں۔

”بہن بات دراصل یہ ہے کہ تمہیں تو پتا ہے آج کل لڑکے والے تو خوب صورت کے سوا کسی کو دیکھتے نہیں، شہزادی کے چھوٹے قد اور سانولی رنگت کی وجہ سے ہمیں مشکل ہو رہی تھی جو دیکھتا یہ کو مانگ لیتا اب یہی سوچا ہے بیہ اور دیا کی اکٹھے شادی کر کے پھر شہزادی کی طرف ہوجا میں گے تب تک اس کے پاس پیسہ بھی کافی ہو جائے گا قسم لے لو جو کبھی روپیہ بھی لیا اس سے، بس یہی کہتی ہوں بیٹی جوڑ لو ہمارے جیتے

محبت مانگ میں ناں

جی، نصیب کا کیا پتا؟ اب۔“ چچی نے آبدیدہ ہونے کی مکمل اداکاری شروع کر دی تو اس نے پہلو بدل کر سوچا اور جو ہر تیسرے مہینے وہ ان کی فرمائشیں لے کر شاپنگ کرتی ہے تو وہ کس کھاتے میں؟ اسے پیسے دینے پر اعتراض نہیں تھا اسے جھوٹ اور پرایا بنائے جانے پر ہمیشہ دھک ہوتا تھا۔

☆☆☆

اس کے بار، بار کروٹیں بدلنے پر بیہ اٹھ کر بیٹھ گئی۔  
”آپ کیا ہوا، آپ کی طبیعت تو ٹھیک ہے ناں؟“  
”ہوں، ٹھیک ہے۔“  
بیہ نے لائٹ جلا کر بیڈ پر آلتی پالتی مارکر بیٹھے ہوئے اس کے ہاتھ تھام لیے۔ وہ تینوں ہی ایک دوسرے کے ساتھ بہت تخلص تھیں۔ ماں کی باتوں میں نہیں آتی تھیں۔

”آبی، امی کی باتوں کا دکھ ہے؟“  
”نہیں تو..... انہوں نے کون سا کچھ غلط کہا۔“  
”آبی میں خود ابھی ممتا، شادی کے حق میں نہیں برای بھلا کب کسی کی سستی ہیں وہ تو بس آپ سے چیزیں منگوا کر اور خود بھی دھڑا دھڑا خرید کر ہمارا جہیز بنائے جا رہی ہیں..... پھر آپ سے کہہ دیں گی کہ ہم نے تو ٹیڈی پیسہ نہیں لیا بس اس نے کوئی چیز کنٹ کر دی تو ہی رکھی ہے۔ آپ کا بھی احسان نہیں مانیں گی۔“ وہ بھی ماں کی رنگ، رنگ سے واقف تھیں اور کرکھتی بھی تھیں۔  
”آبی آپ کوئی چیز نہ لایا کریں، اپنے پیسے سیو کریں بس۔“

”بھئی ہو تم، میں کون سا ان کے لیے لاتی ہوں سب چیزیں تمہاری تو ہیں۔“ شہزادی نے نمی کو پلکوں کے پیچھے روکنے کی جدوجہد کی تھی۔

”آبی دیکھنا وہ بہت اچھا ہوگا جو آپ کو ملے گا ساری، دنیا سے اچھا۔“ بیہ نے اسے گلے لگایا تھا۔

”برا بھئی پتا نہیں ملتا ہے کہ نہیں، سرکاری نرس اور اوپر سے کوئی بھی۔ لوگ گھروں میں بیٹھی لڑکیوں کو رنجیکٹ کر رہے ہیں، میرا تو پروفیشن بھی پسند نہیں

”مطلب مولوی یعنی اللہ والے.....“ بیہ نے

”دونوں ہی کام ناممکن لگ رہے ہیں کاش کہ ہوش

نمبر 2017ء کا شمارہ ایک نظر میں  
خلوص و کھلم کھلا

”کب تک پاکستان آئیں گے سر؟“

شکست کی فتح

لات سر اک جمن کے لفظ

ماہنامہ پاکیزہ 191 دسمبر 2017ء

”ابھی تو تین ماہ باقی ہیں۔“ اس نے گہری سانس کھینچ کر بتایا تھا۔ ڈاکٹر تین ایک سال کے لیے سرکاری طور پر ہڈل ایسٹ میں تعینات تھے۔

☆☆☆

ڈاکٹر تین میڈیکل کالونی ہی میں رہ رہے تھے ہاسٹل سے نکل کر وہ دونوں خراماں، خراماں ان کے گھر کی طرف چل رہی تھیں۔ جب شہزادی کی ہی نظر پڑی تھی گندے سے علیے والا آدمی زبردستی بچی کو کھینچ کر گھر کے باہر بنی ہوئی پودوں کی باڑ کے اندر کر رہا تھا۔ شہزادی نے لحوں میں پچھانا تھا، وہ فاطمہ تھی۔

”ڈاکٹر تین کی بیٹی؟“ شہزادی نے یکا یک اس طرف دوڑ لگا دی پیچھے افروز بھی تھی۔

”اے چھوڑو اے۔“ وہ چیخ بھی رہی تھی، آدمی نے انہیں دیکھتے ہی دوڑ لگا دی۔ افروز نے پاس پڑا پتھر اٹھا کر پھر بھی پیچھے سے مارا تھا۔

”بیٹا آپ گھر سے اتنی دور یہاں کیا کر رہے ہو؟“ وہ اسے خود سے لپٹائے، بار، بار منہ سرچوم رہی تھی۔ فاطمہ بچی بھی جلد ہی اتنی بڑی بات کے اثر سے نکل کر اس سے کپ شپ کرنے لگی، وہ اپنے بابا کے ساتھ اسپتال آتی رہتی تھی اس لیے ان لوگوں سے واقف تھی۔

”بے بی بولو بھی آپ یہاں کیا کر رہے تھے اکیلے؟“ وہ اب ان کی اسٹریٹ میں داخل ہو رہی تھی افروز نے سائیکل پکڑ رکھی تھی۔

”میں تو برگر لینے جا رہی تھی۔“ اس نے سٹھی میں دبا پانچ ہزار کا نوٹ آگے کر دیا۔ شہزادی نے خاموشی سے لے لیا۔

”آپ نے شیم سے کیوں نہیں کہا وہ لے آئی۔“

”وہ تو گھر نہیں اور مجھے بہت بھوک لگ رہی تھی۔“

”آپ کچھ اور کھا لیتے ناں، ایسے اکیلے گھر سے دور توڑی نہ جاتے ہیں جب بے بی اکیلے جاتے ہیں تو گندے والے انکل بچوں سے بہت بدگیزی کرتے ہیں۔“ شہزادی نے ہاتھ میں پکڑا اس کا روٹی جیسا نرم ہاتھ چومنا تھا جواباً اس نے ہاتھ پھرا کر منہ پر انگلی رکھ کر خاموشی کا سائن بنا دیا۔

”دادو سو رہی ہیں نوشاؤٹ.....“ وہ کان میں بتانے لگی۔ افروز خاموشی سے ڈرائنگ روم میں بیٹھ گئی جبکہ شہزادی نے منہ ہاتھ دھلا کر اس کے منی سے لتھڑے کپڑے بدلے، بال بنائے اور اسے لے کر کچن میں آگئی۔ وہ اس کی فرمائش پر لڑائیہ بن رہی تھی چیزیں اسے ڈھونڈ ڈھانڈ کر مل گئی تھیں۔ جیسی سرخ سفید رنگت پر سفید ہی بالوں والی خاتون کچن میں داخل ہو گئیں۔ شہزادی نے لڑائیہ ٹرے اوون میں رکھ دی۔ اب وہ ان کے ساتھ ڈرائنگ روم میں بیٹھی تھی، افروز ان سے ملنے کے بعد فاطمہ کو لے کر کچن میں آگئی۔ شہزادی نے جھپکتے ہوئے بات شروع کی، وہ فاطمہ کے آنے سے پہلے، پہلے پوری بات بتا دینا چاہتی تھی۔ اس نے پانچ ہزار کا نوٹ ان کی طرف بڑھادیا۔

”ہائے میں سرگئی، میں بڑھی سے سوتے رہ جاتا تھا اور.....“ وہ زارو قطار رونے لگیں تو شہزادی نے پاس بیٹھ کر انہیں ساتھ لگا لیا خود اس کی آنکھیں بھی نم ہو گئی تھیں۔

”بیٹی سردی نے جوڑوں کے ساتھ، ساتھ سر میں بھی درد کر دیا تھا۔ میں نے دوائی کھائی اور لیٹ گئی۔ فاطمہ اسکول سے آئی تو اسے لٹچ پند نہیں آیا۔ عجیب، عجیب کھانوں کی فرمائشیں کرتی ہے جو نہ مجھے بنانے آتے ہیں نہ شیم کو (میڈ) میں نے کہا ابھی میرے ساتھ لیٹ جاؤ شام کو برگرمگوا دوں گی۔ میرے ساتھ لیٹی تھی پھر میں تو سو گئی، مجھے کچھ نہیں پتا بیٹا، شیم کب گئی اور فاطمہ باہر کیسے نکلی۔“

”آئی وہ برگری لینے گئی تھی۔“

”ارے بیٹا ہم نے کبھی اسے پیسے نہیں دیے بس چیز ہی لے کر دیتے ہیں اس لیے اسے کم زیادہ پیسوں کی سمجھ نہیں آئی جو نوٹ میری الماری کی دراز سے ہاتھ لگا وہی لے گئی۔“

طرف پھر لیا۔

آئی کا بھوکھو پسندیدہ ٹاپک شروع ہو گیا تھا۔

”ارے میری سستا نہیں، نہ بچی کو کسی کے پاس چھوڑنے پر راضی، نہ شادی پر..... ہزار بار سمجھایا ساری سوتیلی ماںیں بری نہیں ہوتیں خود اکیلے بیٹی کی تربیت کیسے کرو گے۔“

افروز نے آج کے لیے اتنا کافی سمجھ کر اٹھنے کا اشارہ کیا تھا فاطمہ نے بھی ساتھ جانے کی ضد پکڑ لی۔

”ہم کل پھر آئیں گے بیٹا، اوکے.....“ افروز نے اسے آنکھ ما کر بچی کے گال تھپتھپائے تو دادی نے کل پھر آنے کا وعدہ لے لیا۔

☆☆☆

”ڈاکٹر تین آپ چائے لیں گے؟“ سسر مالتی نے ان کے روم میں جھانکا تھا۔

”کافی ہو جائے تو زیادہ بہتر نہیں رہے گا۔“ وہ ہلکا سا مسکرائے۔

”اوکے میں لاتی ہوں۔“

”اماں جی اس وقت کال.....؟“ اس نے کال اٹھاتے ہی کہا۔

”اب بھی وقت دیکھتی رہی تو وقت ہاتھ سے اور آگے نکل جائے گا۔“

”میں سمجھ نہیں اماں جی۔“

”دیکھ تین تو ڈاکٹر ہوگا اسپتال میں، میرا تو، تو بیٹا ہے، اب کے تجھے میری بات ماننا ہی پڑے گی، قہر خدا کا، قیامت آتے، آتے رہی ہے۔ مجھے تو اس بھلی ماںیں بچی نے کہا بھی تھا سر کو نہ بتانا، ہفتہ ہو گیا مانو پیٹ میں غم کا گولہ لیے گھوم رہی ہوں اب اور کب تک نہ بتاؤں۔“

”اماں جی! آپ بتا دیں میں بہیلیاں نہیں بوجھ سکتا۔“ وہ نچل سے گویا ہوئے۔

انہوں نے آدھی ادھوری کر کے تو زمر وڑ کر بات کو نبھنا کم خطرناک کر کے بتایا تھا کہ فاطمہ سے کسی نے پیسے جھیننے کی کوشش کی تھی مگر وہ باپ تھے اور زمانہ شناس بھی لحوں میں نہ تک پہنچے تھے، آنکھیں جذبات پورے

محبت مانگ میں تارا

بدن میں پھیلے تو لگا جیسے وہ ہم بن کر بھٹ جائیں گے۔

”اماں جی آپ نے پوچھا نہیں کون تھا وہ، کالونی کا کیا.....“

”ارے دفع کرو، وہ جنہی تو بھاگ کھڑا ہوا تھا، تم شکر کرو کہ سوہنے رب نے ہمیں کسی امتحان میں نہ ڈالا، میں نے بکرا منگوا کر فاطمہ کا صدقہ بھی دے دیا تھا۔ وہ بچیاں ہمارے لیے رحمت کا فرشتہ ہی بنی بس۔“

ان کی بات پر ڈاکٹر تین کا دل بھی سجدہ ریز ہوا تھا روم، روم میں شکر کیف بن کر دوڑا تو اماں کی آگلی بات پر وہ سیدھے ہو کر بیٹھے پر مجبور ہوئے تھے۔

”اماں جی کیسی باتیں کرتی ہیں شہزادی ایک نرس ہے، میرے ساتھ کام کرتی رہی ہے۔ ہاں اچھی لڑکی ہے اب اور کیا معلومات دوں وہ کون سا پھوٹی کی بیٹی ہے۔“

نہ چاہتے ہوئے بھی وہ ہلکا سا برہم ہوئی گئی تھے۔

وہ بھی بیٹے کی لیے دیے رہنے والی عادت سے واقف تھیں سو محل کر بول پڑیں۔

”پورے چار دن وہ بچی ہمارے گھر آتی رہی ہے، دو دن سپرٹل کے ساتھ دو دن اکیلی، ان چار دنوں میں ہی مجھے پتا چل گیا وہ تیرے لیے بڑے نیک جذبے رکھتی ہے۔ بن ماں، باپ کے پتی ہے، ہماری فاطمہ کو سنبھال سکتی ہے، تمہیں گھر کا سکھ دے سکتی ہے۔“

یہ میرا تجربہ کہہ رہا ہے بیٹا، بال دھوپ میں سفید نہیں کیے اب تو دیسے بھی چل چلاؤ کا وقت ہے، تجھے ہنستا بستا دیکھ لوں، بس یہی خواہش ہے یہی دعا ہے۔“

”لیکن اماں جی.....“

”ارے کیا لیکن ویکن..... اب تو شکل صورت کی بات کرے گا، ہر چیز میں خوب صورتی ہے بس دیکھنے والی آنکھ ہونی چاہیے۔“

”لا حول ولا اماں.....! آپ بھی حد کر رہی ہیں۔ میں کہہ رہا ہوں، مجھے سوچنے دیں۔“

”سات سال اسی سوچ میں گزار لیے اب اور کوئی سوچ نہیں میں بس کل جا رہی ہوں اسپتال، اس کا ہٹا ڈھونڈنے۔“

”بابا کی جان، شہزادی آئی ہے بات کرواؤ۔“  
”دیکھی از ناٹ آئی اپنی مور..... شی از مائی  
ماما.....“ وہ خفا ہوئی۔

”ماما بات کریں۔“ انہیں اسپیکر سے سنائی دیا۔  
”شہزادی.....“ وہ بڑے نرم گرم سے لہجے  
میں مخاطب تھے۔

”میں کہاں کی شہزادی.....؟“ وہ متہم ہوئی۔  
”میرے دل کی سلطنت کی۔“ وہ برجستہ تھے۔  
”بابا..... ویسے تو ہمیں سکتی تیاں.....“  
”کس نے کہا؟“

”مجھے خود پتا ہے۔“  
”غلط پتا ہے، میں بتا رہا ہوں ناں..... نہ تم  
شہزادی ہو۔“

”کچھ سرجی.....“ وہ ہنوز بے یقین تھی۔  
”نور، ناؤ جہت متین۔“  
”وہ تو میں جان بوجھ کر نہیں کہتی۔“  
”کیوں.....؟“ تھوڑی حیرانی در آئی۔

”آپ اسم باسمی، میں اسم متضاد..... بابا۔“  
(بلند قہقہہ)

”آئی تھک میں پروفیسر یوسفی سے ٹائم لے لی لوں۔“  
”کس کے لیے؟“

”تمہارے لیے؟“ پروفیسر یوسفی شعبہ نفسیات  
کے ہیڈ تھے، وہ بے ساختہ کھلکھلائی تھی۔

”آپ مل گئے تو میں نے مان لیا میں شہزادی  
ہوں قسمت کی۔“ وہ طمانیت سے بول اٹھی تھی۔  
”متین اب فون سوچ آف کر دو، رخصتی کراتے  
ہیں بہت دیر ہوگئی یا.....“ بڑے بھیا پاس آتے  
جارہے تھے۔

”ساری باتیں فون پر کرنی ہے تو رخصتی رہنے  
دیتے ہیں۔“ اسپیکر سے بیہوشی آواز سن کر انہوں  
نے جلدی سے لال نشان پر بج کیا تھا محبت سرخرو ہو کر  
مکراتی تھی۔

”ہیلو بابا جانی۔“ فاطمہ کی جھکتی آواز تھی۔

سے لطف اندوز ہو رہے تھے، ان کی رضامندی کے بعد  
اماں نے باقی مرحلے اس قدر تیزی سے طے کیے تھے  
کہ وہ اٹش اٹش کر اٹھے۔

ہفتہ پورا وہ بیمار سے کہیں زیادہ بیمار بن کر مرع  
فاطمہ اسپتال جاتی رہیں وہاں دو کم اور رشتے اور ان  
کی شادی اور فاطمہ کی باتیں زیادہ کرتی رہی تھیں، ہر  
بات کا اختتام وہ کچھ یوں کرتیں۔

”بس لڑکی سادہ سی ہو جو والدین سے محروم ہو  
تاکہ میری فاطمہ سے محبت کرے، اسے اپنی طرح  
محروم نہ رکھے، بالآخر پانچویں دن انہوں نے شہزادی کا  
نام تجویز کر کے ڈاکٹر کی دنگ کے سامنے رکھ دیا اور  
رائے طلب کر ڈالی۔ وہ بھی بقلم خود مطلب نفس نفس  
خود گو کہ بہت ساری متحمل ڈاکٹر کو اعتراض بھی تھا کہ  
ان کے ہوتے ہوئے شہزادی کی کیا ضرورت مگر.....

بہر حال ان کے منہ پر کہنے کا رسک کسی نے نہ لیا تھا۔ پھر  
کمال سادگی سے ان کے دوستوں سے کہا تھا کہ وہ بھی  
متین پر زور ڈالیں تاکہ وہ شادی کر لے اور یوں ان کی  
شادی بالآخر سہ ماہی شہزادی سے وقوع پذیر ہوگئی تھی۔ یہ  
ساری تفصیلات ان تک پروفیسر یوسفی سے پہنچی تھیں۔

جواب ان کے ساتھ بیٹھ کر کھانا تناول کر رہے تھے۔ میز  
نوں پر انہوں نے اپنا اسمارٹ فون نکالا تھا سفید لباس  
میں پری بن کر بیٹھی فاطمہ نے مہندی سے رنگین ہاتھ  
بڑے ذوق شوق سے پکڑ رکھا تھا انہوں نے زوم کر لیا  
ہتھیلی کے عین درمیان میں گل بوٹوں کے بیج ان کا اور  
فاطمہ کا نام لکھا ہوا تھا اب شک کی گنجائش نہیں رہی تھی وہ  
شہزادی کا ہی ہاتھ تھا۔ بیٹی کو دیکھ کر جہاں پدرانہ  
شفقت ابھری تھی وہیں ہتھیلی پر سجے اپنے نام نے دل کو نبی  
آنے والی خوشیوں پر عجیب لمے میں دھڑکتا محسوس کیا۔

پھر انہوں نے اس خوب صورت وائس ایپ کے جواب  
میں کال ملائی ڈالی تھی تیسری تیل پرفون اٹھالیا گیا تھا۔  
وہ اپنے چائے کا کپ اٹھا کر غیر محسوس طور پر باقی  
لوگوں سے علیحدہ ہوئے تھے۔

”ہیلو بابا جانی۔“ فاطمہ کی جھکتی آواز تھی۔

تھے۔ صحرانعلف کے خوب صورت ترین ساحلوں میں  
سے ایک ساحل زیر زمین دہی ہوئی روشنیاں، خوب  
صورت پتھر سے مزین وانگ ٹریک، سر پر نصب خیمے  
اور تاجہ نگاہ پھیلا نیلگوں سمندر..... وہ سبکی بیچ پر بیٹھ کر  
آتی جاتی لہریں گنتے رہے فرار آخر تک؟ دنیا کے  
سارے کونوں سے آئے ہوئے بے شمار لوگ اپنے حال  
میں مست تھے، وہ اپنے ماضی میں گم ہونے لگے۔

”واپسنگی کا ایک، الگ گداز ہوا کرتا ہے پھر یہ  
کیسے ممکن تھا کہ فریق ثانی کی حیثیت سے ان تک نہ  
پہنچتا وہ جب، جب محبت سے لبریز آنکھ اٹھاتی تھی، وہ  
لہریں ان تک پہنچا کرتی تھیں۔ پہلے پہل وہ کچی عمر  
میں نادانی سمجھتے رہے پھر عام مرد جہ اصول کے مطابق  
اسٹیشن تبدیل کرنے کی چاہ سمجھ کر ٹالتے رہے جیسے باقی  
ماپوس ہوئیں یہ بھی ہو جائے گی لیکن وہ جہاں تھی وہیں  
کھڑی رہی وہ چاہتے تھے کوئی موقع ملے اور وہ اسے  
دل کھول ڈانٹ ڈپٹ کر لیں اس نے آج تک وہ بھی  
نہ دیا تھا۔ وہ مضبوط کردار کی مالک تھی، آس پاس کے  
سب لوگ اس کی عزت کرتے تھے۔ وہ اس بات سے  
بھی باخبر تھے مگر شادی کا خیال کبھی نہیں آیا تھا۔ آج  
اماں جی نے کہا کہ کرجب مجھے میں ڈال دیا تھا بالآخر  
انہوں نے اس سیدھی مانگ والی لڑکی کے حق میں فیصلہ  
کر ہی ڈالا تھا بڑے دل سے یا پھر شاید دل کے اندر  
کہیں بہت دور اس کی محبت سرنگ پہلے ہی بنا چکی تھی۔  
جبھی تو ایک بار مانگ پر نظر پڑی تھی جو برسوں بعد بھی  
یاد تھی۔ وہ فاطمہ کے لیے بہت اچھی ماں ثابت ہوگی۔  
مجھ سے وابستہ چیزوں کو چھپا کر رکھنے والی میری بیٹی کو  
کیونکر نظر انداز کر سکتی ہے، انہیں اپنی وہ ٹوٹی ہوئی ٹائی  
پن یا د آئی جو ان کے پھینکنے پر اس نے اٹھا کر اپنے کوٹ  
میں چھپائی تھی وہ چوری کر رہی تھی لیکن ونڈو کے کھلے  
شیشے کی بدولت وہ عینی شاہد بن گئے تھے۔

”سلی گرل.....“ لب آپوں آپ مسکرا اٹھے تھے۔  
☆☆☆

نکاح کے بعد اب سب لوگ پُر تکلف کھانے

”اماں جی سب لوگ کیا کہیں گے اچھا نہیں لگتا۔“  
اسکیڈ لائز ہوتا۔“

”بیچے تو، تو ایسے بول رہا ہے جیسے اسپتال والے  
تجھے جانتے نہیں، ویسے بھی میں کام ہی ایسے طریقے  
سے کرنے کا سوچ رہی ہوں کہ تیرا اور بیچاری بچی کا نام  
نہ آئے۔“

”کیا سوچ رہی ہیں اماں جی آپ؟“  
”ارے کچھ بھی سوچوں تجھے کیا اور کچھ سکھا ہوا  
نہ ہو تیری پھوپھوں سے چالاکیاں تو سیکھ ہی لیں ہم  
نے۔“ وہ جل کر بولی تھی۔ اماں فل فارم میں تھیں اس  
لیے اب فون بند کرنا مناسب سمجھا تھا۔ اماں کی بات پر  
وہ مسکرا رہے تھے۔

☆☆☆

کوٹ بازو پر لٹکا کر وہ گھر کے لیے نکلے تو کاؤنٹر  
پر سسٹر ہائی نظر آئی تھی وہ اس کے پاس چل دیے۔  
”سسٹر بڑی اچھی کا کافی تھی۔“

”اوہ سوسوری ڈاکٹر، ایچو نیلی منگلا کے ساتھ  
ایمر جنسی چلی گئی تھی ابھی آئی تو آپ نے یاد کروایا  
ہے۔“ وہ چہرہ دراز میں رکھنے کے لیے ذرا سا جھکی تھی وہ  
جو عین کاؤنٹر کے سامنے کھڑے تھے انہیں اس کی  
سیدھی مانگ نظر آئی تھی وہ بے ساختہ اس کی مانگ  
دیکھتے رہے، دل ابھی تک اماں سے کئی باتوں کے  
ٹرائس میں تھا لگ بھگ دس ماہ سے وہ جو پزل حل کر  
رہے تھے لحوں میں حل ہوا تھا۔

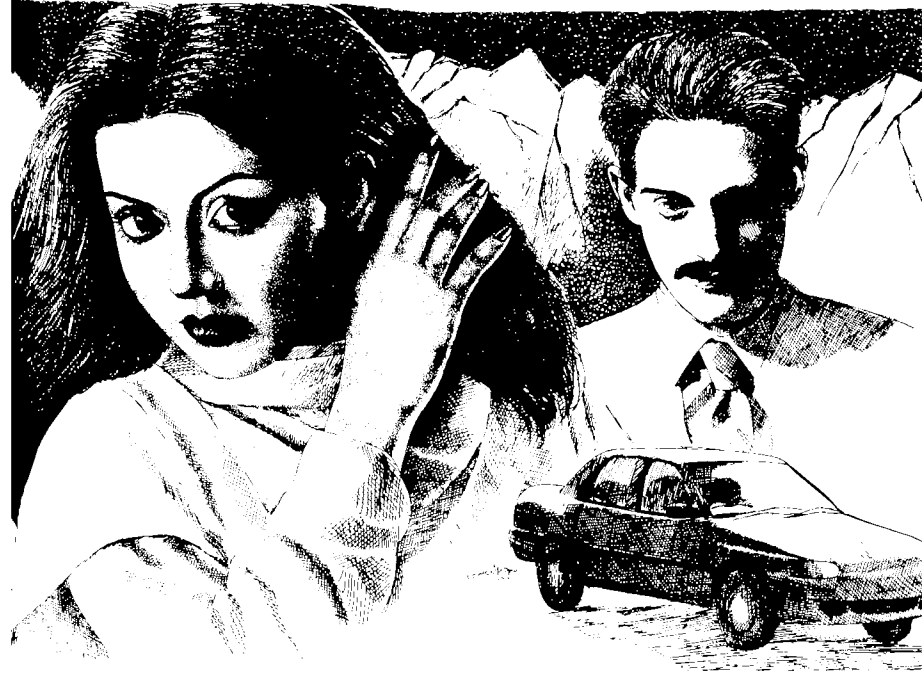
سسٹر ہائی کیہاں تھی (انڈین اسٹیشن کیہاں  
سے) سانوئی رنگت نارل سی قامت کے ساتھ وہ جب  
بھی ان کے سامنے آتی انہیں کوئی یاد آتا تھا کون یہ سمجھا  
نہیں آج اور ابھی آئی تھی۔

”شہزادی.....“ وہ ہلکے سے بڑبڑائے۔  
گامڑی میں بیٹھے لیکن فلیٹ پر جانے کو دل نہیں  
کر رہا تھا۔ وہ بہت دیر بیٹھے قابوس اسپتال (عمان) کو  
نکلتے رہے پھر جیسے تھک کر گامڑی ٹرن کی تھی اب وہ  
شارع ابو بکر سے ہوتے ہوئے ساحلی پٹی پر نکل آئے

”وہ ہلکے سے بڑبڑائے۔“

گامڑی میں بیٹھے لیکن فلیٹ پر جانے کو دل نہیں  
کر رہا تھا۔ وہ بہت دیر بیٹھے قابوس اسپتال (عمان) کو  
نکلتے رہے پھر جیسے تھک کر گامڑی ٹرن کی تھی اب وہ  
شارع ابو بکر سے ہوتے ہوئے ساحلی پٹی پر نکل آئے

نکاح کے بعد اب سب لوگ پُر تکلف کھانے



## میرے خواب؟ چھین لو

عقیدہ حق

لگتا تھا عدالت کے باہر سارا شہر جمع ہو گیا ہے۔ میڈیا والے ایک دوسرے کو دھکے دے کر آگے سے آگے کھڑے ہونے کی کوشش کر رہے تھے، یہ وہ کیس نہیں تھا جس کی رپورٹنگ نہ کرنے پر سیاسی محاذوں پر باز پرس ہو سکتی تھی۔

یہ ایک غریب لڑکی کا مقدمہ تھا۔ لیکن ملزمان کی لسٹ میں اتنے بڑے، بڑے نام تھے۔ ایسے، ایسے خوب صورت چہرے تھے، ایسے، ایسے لوگ تھے کہ مقدمہ اہم نہیں..... بہت اہم ہو گیا تھا۔

ماہنامہ پاکیزہ 196 دسمبر 2017ء

گھر میں بیٹھی اسی فیصد آبادی ٹی وی کھولے مقدمے کی کارروائی کی تفصیلات سننے کو بے چین تھی۔ عدالت کے باہر رش اور چمکونیاں بڑھتی جا رہی تھیں۔ لوگوں کی نظریں اس خوب صورت خاتون وکیل پر ٹھہر سی تھیں جو اس غریب چھریوں زدہ چہرے والے بوڑھے کے ساتھ گاڑی سے اتری تھی..... یہ اس لڑکی کی وکیل تھی جو چند دنوں پہلے اس فضا میں سانس لیتی لیکن اب.....

☆☆☆

”چل اٹھ، تیرا ابا آنے والا ہے جلدی سے آنا گوندھ کر رکھ دے پھر اس کے آنے کے بعد روٹی ڈال لیجو..... سارا دن بیمارہ محنت مزدوری کر کے گھر لوٹے تو کم از کم باسی سالن کے ساتھ روٹی تو تازہ اور گرم ملے۔“ مختاراں بی بی نے سولہ انچ کے ٹی وی پر شوق نظریں گاڑے بیٹھی شمشہ کو آواز لگائی جو اس نے حسبِ عادت ایک کان سے سن کر دوسرے کان سے نکال دی۔

”تو سن رہی ہے یا لگاؤں دو جوتیاں.....“ مختاراں بی بی پیچھے سے چلائی۔ ہلکا گلابی ہواؤں سے نازک سوٹ پہنے، کھلے بالوں میں گلابی پھول لگائے، ہوا میں لہراتا پھولدار جالی کا خوب صورت دوپٹا قدم سے قدم ملا کر مسکراتی نظروں سے دیکھتا وہ وجہ نہ ہو جو اس کی بات پر مسکرایا تو اس کو ایسا لگا جیسے اس کا وجود ہواؤں میں اڑنے لگا.....

”اری کیا ہو گیا ہے تو کیا پتھر کی ہو گئی ہے؟“ وہ جو ٹی وی پر چلے اشتہار میں، اس نو جوان کے قدم قدم چل رہی تھی مختاراں کی پھینکی گئی چپل پر جو اس کی کمر پر بڑی زور سے لگی تھی، بلبلاتا تھی۔

چھوٹا سائین کی چادر والا کرا جس میں ٹٹماتا ساٹھ واٹ کا بلب دیواروں کا اکھڑا پلستر..... ”حقیقت کتنی بھیا نک ہے..... تو بہ.....!“ شمشہ نے ٹی وی بند کر کے مچن کے کونے میں رکھے چو لھے کو جلاتے ہوئے اپنے آپ سے کہا۔

☆☆☆

مختاراں چکی آبادی سے ملحق کوشیوں میں جھاڑو برتن کرتی تھی..... عید القدوس روز صبح اپنا سامان لے کر سارے مزدوروں کے ساتھ اس فٹ پاتھ پر جا بیٹھتا، جہاں سے ٹھیکیدار اور کبھی، کبھی صاحب لوگ مزدور لینے آتے، کبھی دیہاڑی لگ جاتی اور کبھی سارا دن ادھار

چائے پی کر وہ گھر آ جاتا..... ”باجی آپ یہ ٹی وی نہیں دیکھتیں؟“ مختاراں نے اسٹور صاف کرتے ہوئے، چھوٹے سے ٹی وی کو کپڑے سے پونچھتے ہوئے بڑے شوق سے پوچھا تھا۔ ”ارے بھی اب ٹی وی کا زمانہ کب رہا ہے اب تو ایل ای ڈی کا زمانہ ہے اور یہ تو میں نے اپنے ڈرائیور کو دلوا یا تھا اب اس کو بڑا دلوا دیا تم کو چاہیے کیا؟“

”جی، جی باجی دراصل وہ میری بیٹی ہے ناں شمشہ اسے بہت شوق ہے۔ ماشاء اللہ جوان ہو گئی ہے۔ محلے کے گھروں میں بیٹھی رہتی ہے، یہ گھر میں ہوگا تو کم از کم گھر میں تو کچے کی ناں.....“ مختاراں کی نظریں ٹی وی پر جمی تھیں اور وہ اسے دھمکائے جا رہی تھی۔ ”تم لے لو.....“ باجی نے بے پروائی سے کہا اور اسٹور سے باہر نکل گئیں۔

☆☆☆

”اُف اللہ حیدہ، میں تجھے بتائیں سکی کتنا اچھا لگتا ہے رگین ٹی وی ہے ناں تو ہر چیز اتنی خوب صورت لگتی ہے۔ اتنے پیارے، پیارے سوٹ پہنے لڑکیاں اشتہاروں میں آتی ہیں، میری اماں تو اتوار بازار میں سے پرانے کپڑوں میں سے بھی جو سب سے سستا وہ وہ میرے لیے لے آتی ہے۔ وہ بھی چار، چھ مہینے میں ایک۔ یقین کر سکتی بھی کوشش کر لوں، فنگک ہوئی ہی نہیں پہلے تو بلیک اینڈ وائٹ ٹی وی دیکھتی تھی لیکن جب سے کھڑی وی دیکھا ہے تو دل چاہتا ہے سارے کپڑوں کی گھڑی باندھ کر آگ لگا دوں، ایک سے بڑھ کر ایک ڈیزائنز اور ایک سے بڑھ کر ایک حسین سوٹ..... میں تو اب ہر نماز میں دعا کرتی ہوں اللہ میاں مجھے بھی ایسے کپڑے دے دے۔“ شمشہ نے پھولی، پھولی سانسوں کے ساتھ اپنی پکی سہیلی حیدہ کو بتایا۔

”ہاں ہاں زندگی تو ان بڑے لوگوں کی ہوتی ہے۔ ہماری کوئی زندگی ہے، کتنے خوب صورت گھر ہوتے ہیں۔ ڈراموں میں دیکھو، گھر کم کل زیادہ لگتے ہیں، ایک ہمارے گھر ہیں، کبھی ایک کمرے میں دو بلب بھی نہیں چلتے اور ان کے تو زینوں پر بھی اتنے بڑے، بڑے فانوس چلتے ہیں میرا تو دل چاہتا ہے۔ سب چھوڑ چھاڑ کر ٹی وی کی دنیا میں چلی جاؤں۔“ حیدہ نے کہا۔

ماہنامہ پاکیزہ 197 دسمبر 2017ء

علی کی گستاخوں سے گھبرا کر اس نے علی کی توجہ سڑک پر مرکوز کروائی۔  
”اری کیا ہو گیا بس علی کو روک رہی ہے، پامل تو نہیں ہو گئی، ایک تو دیے ساری رات کبخت پچھروں اور کھٹملوں کی وجہ سے نیند نہیں آتی اور پھر اس کے دورے، خناروں نے اپنے ہنگ سے اٹھ کر کس کے ایک ہاتھ اس کی کمر پر مارا۔

ٹین کی چادر والا کرا جس کی دیواریں پلستر سے بے نیاز تھیں، بان کی چارپائی پر روٹی کا میلا سا گدا، برابر میں سوئی ماں اور ذرا سا ہٹ کر چارپائی پر لیٹا بیمار باپ..... ایک لمحے میں شمس آسمان سے زمین پر آگری۔  
”ف خدا..... کتنا حسین خواب تھا..... لیکن ان خوابوں کی تعبیر مجھے کیسے ملے گی؟“ شمس نے کمر سہلاتے ہوئے اپنے آپ سے سوال کیا..... وہ جانتی تھی کچھ سوالوں کے جواب خود ڈھونڈنے پڑتے ہیں اور وہ سوالوں کے جوابات ڈھونڈنا چاہتی تھی۔

بعض اوقات کوئی بات، کوئی چیز کسی کے لیے بالکل غیر اہم اور وہی کسی دوسرے انسان کے لیے آہستہ کی دوجہ رکھتی ہے۔ وہ چیزیں جو باجی اور ان کی بیٹی ڈسٹ بن میں ڈال دیتیں، استعمال شدہ لپ اسٹک، ہیر برش، بچے کچھ لوٹن والی بوتلیں اور بہت کچھ وہ سمیٹ کر گھر لے آتی..... لیکن اسے اب استعمال شدہ چیزوں کی ضرورت نہیں رہی تھی۔ وہ تو وہ عمدہ کوڈے دیتی۔

اسے اپنے حسن کی قیمت کا اندازہ ہو چکا تھا..... بڑے صاحب، چھوٹے صاحب سے لے کر ڈرائیور اور خانہ ماں سب کی عنایتیں اس پر جاری تھیں..... اور یہ تو بتانے کی ضرورت ہی نہیں کہ ان عنایتوں کے عوض وہ کس چیز کی ادائیگی کرتی تھی۔

☆☆☆

”یہ جوڑا، یہ کہاں سے آیا؟“ آج جب کام پر جاتے ہوئے اس نے بلیک شرٹ، فائن شلوار اور میروں سلک کے دوپٹے والا جوڑا پہن کر اپنی گہری سبز آنکھوں میں سیاہ کا جل لگا یا تو خناروں بی بی کا جانے کیوں دل کاٹا۔  
”اس کبخت مغفورے درزی سے کہا بھی تھا اتنا کس،

باجی، جی کے گھر میں وائی فائی کی سہولت موجود تھی، وہ سارا دن بہت ساری چیزیں جس میں نوے فیصد ڈیزائنرسٹ اور ریلپکا کی پچھڑ ہوتیں ڈاؤن لوڈ کرتی اور پھر جب وہ گھر آتی تو بستر پر لیٹ کر وہ سارے کپڑے اور زیورات دیکھتے، دیکھتے سو جاتی۔

☆☆☆

”ام..... آج میرا بالکل دل نہیں ہے گھر میں کھانا کھانے کا۔“ اس نے بہت ناز سے ہینڈم سے اس مرد سے کہا جو اس کا شوہر تھا۔  
”تو کوئی بات نہیں میری جان! نہ کھاؤ..... چلو باہر چلتے ہیں لاگ ڈرائیو پر اور پھر کسی اچھے سے ریسٹورنٹ سے کھانا بھی کھائیں گے.....“ ڈاکٹر علی نے محبت سے اس کے ہاتھ کو چوما۔

خوب صورت لان کا ڈیزائنر..... ایمر انڈرڈ بلیک سوٹ شولڈر پر میروں اور سیاہ باریک کڑھائی کی شال۔ ستواں ناک میں جھنگائی ہیرے کی لوگ، گلے میں جھولتا ڈائمنڈ کالاٹ، شانوں تک کا خوب صورت ہینز کٹ جن کو ہینڈ میں جکڑنے کی کوشش کے باوجود شہداء نکلیں اس کے چہرے کو چھو رہی تھیں۔ اس نے پرفیوم کا اسپرے کرتے ہوئے اپنے آپ پر ایک نظر ڈالی، سفید شرٹ اور بلیو جینز میں مسکراتے محبت برسانی آنکھوں سے دیکھتے ڈاکٹر علی کے عکس کو آئینے میں دیکھا تو ایک عجیب سے سحر انگیز سرور میں اس کا وجود دلہانے لگا۔

ڈاکٹر علی، جو ڈاکٹر ہونے کے ساتھ ماڈلنگ بھی کرتا تھا وہ اس کا تھا، اس کا دیوانہ تھا، اس کا شوہر تھا۔  
”میرا موڈ پائیز کھانے کا ہے۔“ ٹھنڈی صبح 8.30 میں سیٹ کی پشت سے ٹیک لگاتے ہوئے ناز بھرے خریلے لہجے میں اس نے کہا۔

”جو حکم بیگم صاحبہ..... ہمارا کیا ہے؟ ہم تو بس آپ کی خوشی میں خوش ہیں۔“

علی نے میوزک تیز کیا اور گاڑی میں مدھر آواز سحر پھیلانے لگی۔ علی پر مدھوش طاری ہونے لگی، روڈ پر برستی دھواں دھار بارش، پُر آسائش گاڑی، خوب صورت میوزک اور پہلو میں بیٹھی حسین من چاہی بیوی.....  
”دیکھ کر علی.....“ وہ ایک دم بچینی۔

اور رہنے والے بس چار..... ایک باجی، ایک ان کے میاں اور دو بچے..... سارا گھر ہر وقت ٹھنڈا رہتا ہے، چکنے فرش، قیمتی فرنیچر، بالکل ڈراموں جیسا گھر ہے..... اور وہ جو باجی کی بیٹی ہیں ناں حنا باجی..... ایک سے ایک کپڑے پہنتی ہیں، میرے خیال سے کوئی سوٹ دو بارہ نہیں پہنتیں، پتا ہے خود باجی بھی دس، دس ہزار کے لان کے سوٹ پہنتی ہیں۔ اللہ ج میرا بھی بڑا دل چاہتا ہے، میں بھی بڑی، بڑی شیشوں کے دروازوں والی دکان سے کپڑے خریدوں، میک اپ لوں اور پھر بالکل ڈراموں جیسے گھر میں رہوں۔“ شمس آنکھیں بند کیے بولے جا رہی تھی۔

”لیکن ہمارے ایسے نصیب کہاں..... ایسے خواب ہی کیوں دیکھتی ہے۔ جس کی تعبیر ناممکن ہو.....“ حمیدہ کا لہجہ رورہا تھا آج ہی اس کا رشتہ اس کے خال زاد کے ساتھ طے ہوا تھا جو موسم کے پھلوں کا ٹھیلہ لگا تھا..... بس نصیب میں اتنا فرق آتا تھا کہ ٹین کی چادروں والے گھر سے وہ سینٹ کی چادروں والے گھر میں جا رہی تھی۔

”کیوں؟ کیوں خواب کیوں نہ دیکھوں، اری حمیدہ یہ بڑی، بڑی گاڑیوں میں پھرنے والیاں، یہ اداکارائیں بالکل بھی خوب صورت نہیں ہوتیں، بس میک اپ، قیمتی، قیمتی کپڑے اور شاندار زیورات ان کو خوب صورت بنا دیتے ہیں..... میں تو ویسے ہی بہت خوب صورت ہوں۔“

”تم کو پتا ہے کہ تم کتنی خوب صورت ہو، تم کو تو کسی محل میں رانی کی طرح رہنا چاہیے۔“ شمس کے کانوں میں شیراز صاحب کی سرگوشی سرسرا رہی تھی جو انہوں نے اس کو موبائل تھماتے ہوئے اس کے کانوں میں کی اور ہلکی سی موبائل کی قسط بھی وصول کر لی۔ جسے ادا کرتے وقت شمس کو بالکل برائیں لگا۔

☆☆☆

”لاؤ میں اس میں ڈاؤن لوڈ کروں.....“  
حنا باجی نے whatsapp, fb اور دوسرے apps اس کے فون میں ڈاؤن لوڈ کر دیے۔ ”بس باجی مجھ کو تو بہت شوق ہے میں نے بیسی ڈال کر فون لیا ہے۔“ حنا باجی کے پوچھے بغیر شمس کے دل کے چور نے جھوٹ بولا۔

”ارے ہمارے ایسے نصیب کہاں؟“ شمس کا لہجہ رویا۔

☆☆☆

”بس کہا کریں اللہ کو کسی منظور تھا۔“ مختار بی بی نے ملل کے گلے دوپٹے سے آنسو پونچھتے ہوئے.....  
عبدالقدوس کی کٹی ہوئی ٹائنگ کو دیکھتے ہوئے کہا..... آنسو بہاتے عبدالقدوس کو کسلی دی۔

عبدالقدوس چند دن پہلے کام پر گیا تو راستے میں اس کا ایکسیڈنٹ ہو گیا اور جان تو بچ گئی لیکن ڈاکٹر کو ٹائنگ کا ٹی پڑی۔

بیٹا کوئی تھا نہیں..... مختار بی بی آج کل کام پر بھی نہیں جا پارہی تھی جبکہ اس کی باجی کی دفعہ بلوا چکی تھیں لیکن شوہر کو اس حال میں چھوڑ کر گھر سے نکلنا اس کے لیے بہت مشکل ہو رہا تھا۔

”تم کرو گی کام؟“ سرخ و سفید رنگت، خوب صورت کتابی چہرہ، سبز آنکھیں بغیر کتنے کیے بندھی بی بی سی چوٹی، چہرے پر بلا کی مصومیت اور اچھڑپن..... بیگم شیراز نے سر سے پیر تک اس لڑکی کا جائزہ لیا جسے اس کی ماں چھوڑ کر گئی تھی۔

”جی باجی جی.....“ آواز تھی یا کسی نے ساز چھیڑ دیا تھا۔

”گڈ ڈی میں لعل.....“ شیراز صاحب نے کن آنکھیں سے دیکھتے ہوئے دل ہی دل میں سراہا۔

”نہیں یہ نہیں چلے گی اس قدر خوب صورت لڑکی..... چلو جب تک کوئی اور نہیں ملتی اسی سے کام چلائی ہوں۔“ مسز شیراز نے گھبرائے ہوئے دل کو سمجھایا۔

”چلو منہ کیا تک رہی ہو اور آپ کیوں نہیں اٹھ رہے، جائیں آفس کے لیے تیار ہوں اور چلو لڑکی میں تم کو کام سمجھا دوں۔“ مسز شیراز نے ترختے ہوئے لہجے میں شیراز صاحب کو ڈانٹا اور پھر شمس کو لے کر کچن کی طرف چل دیں۔

”ارے میری موٹی بھدی بیگم، گھر میں موتیا کا پھول مہک رہا ہے، کس کا دل چاہے گا دفتر جانے کا۔“ ان کے دل نے دہائی دی۔

☆☆☆

”حمیدہ میں تجھ کو بتا نہیں سکتی کتنا بڑا بنگلا ہے

یہاں پر خریداری کرنے والی عورتیں کیا اسی زمین پر رہتی ہیں، خوشبو سے مہکتی، لمبی، لمبی گاڑیوں سے اترتی..... بے دریغ شاپنگ کرتی، کہیں پانچ سو کی گلدی ہاتھ میں پکڑی تل او کرتی اور کہیں کریڈٹ کارڈ دیتی خواتین کو دیکھ کر اس نے ایک حسرت سے سوچا.....

اسے بھی بہت اچھا لگ رہا تھا۔ وہ سوٹ پسند کر رہی تھی۔ اور اس کے پیچھے ہاتھ باندھے سلیز مین چل رہا تھا، وہ جس سوٹ کی طرف نظر اٹھا کر دیکھتی، سلیز مین لپک کر سوٹ اٹھا کر اسے دکھاتا۔ پھر اس کو ایک سوٹ پسند آ ہی گیا۔

آج خرم اسے اپنی ماں سے ملوانے لے کر جا رہا تھا۔ اسے یقین تھا وہ اتنی خوب صورت ہے کہ وہ ضرور پسند کر لی جائے گی۔ جب حمیدہ نے اس سے کہا کہ ایسا ناممکن ہے تو اس نے زوردار قہقہہ لگاتے ہوئے کہا۔ ”تو“ ساری زندگی کنویں کا مینڈک ہی رہے گی۔ میں نے بہت ساری فلمیں دیکھی ہیں اور ڈرامے بھی..... محبتوں کے آگے سب ہار مان جاتے ہیں، خرم کی

پیار کرتی، اس کی چھوٹی سی بیٹی نے، بیٹوں کی طرح گھر کی ساری ذمے داریاں سنبھال لی تھیں۔

”اب وہ دو گھروں میں کام کرتی ہے اسی لیے اسے اکثر دیر ہو جاتی ہے تو پریشان نہ ہوا کر۔“

مختار ان میاں کو سنبھاتی، وہ باپ تھا مرد تھا، چل نہیں سکتا تھا لیکن سوچ تو سکتا تھا ناں.....

گھر میں آسودگی آنے لگی تھی، شمی اکثر کھانا باجی کے گھر بے کھا کر آتی۔

”بہنی باجی بہت اچھی ہے ہر دو چار دن بعد 1000,500 دے دیتی ہے۔ شمی کو کہتی ہے اپنے ابا کے لیے فروٹ لے جاتا۔“

مختار ان نے سب کی قاشیں کاٹ کر میاں کو کھلاتے ہوئے عقیدت و احترام سے بتایا۔

”ہاں..... یار لے لو.....“ جب شمی نے خرم کو بتایا کہ اسے شمشے والی دکانوں سے ڈیزائنز کے اصلی سٹلے سلائے سوٹ خریدنے کا بہت شوق ہے تو خرم اسے ایک بہت بڑے شاپنگ مال میں لے آیا، یہ دنیا کون سی ہے

اور پھر دوسرے دن سے شمس پھر کام پر روانہ..... کسی کو مسکرا کر سلام کیا تو کسی کی شرارت پر کہنی ماری..... ڈراموں میں بھی تو لڑکیاں ایسے ہی کرتی ہیں۔

”وہ میرے جیسے کسی گھر کی لڑکی ہی تو تھی، جواب شہرت کی بلندیوں پر کھڑی ہے۔ ہائے کیا اسٹائل ہے اس کا.....“

اب وہ بہت سی باتیں صرف اپنے آپ سے کرتی..... حمیدہ سے بھی چھپاتی، بہت جلدی اس کو راز اور بات میں فرق سمجھ میں آ گیا تھا۔

☆☆☆

”لے لوں.....“ اس نے خرم سے پوچھا جو کئی دنوں تک موٹر سائیکل پر اس کا پیچھا کرتا رہا اور پھر بات چل ہی نکلی، ویسے بھی بڑی سی توند والے شیراز صاحب سے اس کا دل بھر گیا تھا۔ اس کے توند کو خون لگ گیا تھا، نئی، نئی دوستیاں اسے اچھی لگتی۔

”ویسے فلمی اداکاراں بھی تو ایسا ہی کرتی ہیں، سارے زمانے سے دوستیاں رکھتی ہیں اور پھر شادی بھی کسی امیر کبیر سے کر لیتی ہیں اور میں کیا کسی اداکارہ سے کم ہوں.....“ اس نے روز کی طرح اپنے آپ کو یاد کر لیا اب تو غفورے، شکورے ٹائپ لڑکے اسے اچھے بھی نہیں لگتے تھے۔ اس کا معیار بہت تیزی سے بدل رہا تھا۔ لیکن اب وہ سمجھدار ہو گئی تھی، تحائف بہت خاموشی سے ٹرک میں چھپا دیتی، گھر سے چادر اوڑھ کر نکلتی اور پھر جب موقع ملتا تو ان تحائف کو استعمال کرتی، اب تو اسے کافی بھی اچھی لگنے لگی تھی، چائے اسے غریبوں کا مشروب لگتی۔

جب اس کی فیورٹ ماڈل نے خوب صورت سا سوٹ پہن کر منہ میڑھا کر کے کافی کی تعریف کی تھی اس کے لیے یہی کافی تھا۔ اب اسے ڈیزائنز کے نام اور رینٹلورنٹ میں آرڈر دینا بھی آ گیا تھا۔

اور جو بھی، کوئی دیر تک روک لیتا تو وہ جا کر مزے سے مختار ان کے ہاتھ پر پانچ سو رکھتی اور کہتی باجی کے گھر مہمان آئے تھے ناں انہوں نے روک لیا تھا، یہ پیسے دیے ہیں اور اپنی گاڑی میں پھنسا دیا ہے۔

مختار ان ہاتھ اٹھا کر باجی کو دعا دیتی اور پھر شمی کو (شمسہ اب اپنے آپ کو شمی کہلاتی تھی) سینے سے لگا کر

کس کر تاپ لے رہا تھا۔ تاپ تو لے، لے لیکن سیو ڈرا ڈھیلا..... آپ اماں کو ہو گیا ناں ٹنگ.....“

”حتا باجی کا سوٹ ہے اماں.....“ اس نے نظریں چرائیں۔

”تو بکثت ایسا خوب صورت جوڑا جینز میں رکھ دیتی ناں..... تو بھی چڑھا کر کھڑی ہوگی۔“ وہ اس سوٹ میں کس حد تک حسین لگ رہی تھی مختار ان بی بی ماں بھی اور ماں کے دل کو اللہ جانے کیسے سب کچھ معلوم ہو جاتا ہے..... اس کے دل و دماغ میں گھنٹیاں سیخ رہی تھیں..... لیکن ہائے مجبوری..... بیمار شوہر..... گھر میں کوئی دوسرا امر نہیں کام پر کس کو بھیجے.....

”چل تو گھر بیٹھ، ابا کا خیال رکھ، آج سے میں جاؤں گی۔“ مختار ان نے سر پر چادر بھائی اور شمشے کے آگے کھڑی شمسہ کو ہنسی و قہقہہ کرنا باہر نکل گئی۔

☆☆☆

کلی کے کٹورہ لڑکا، جنرل اسٹور والا، جہاں وہ روز بیٹھ کر کوک پیتی تھی، انتظار میں کھڑا اور بڑی جوتقریباً روز خالی دکان میں اس کا انتظار کرتا، کبھی کوئی سوٹ دے دیتا اور بھی اس کے خرچے کے لیے پیسے، وہ جلوئی جس کی دکان سے اکثر وہ گلاب جاسن اٹھاتی تو شیرا جلوئی کے بیٹے کے ہونٹوں سے نکلتا..... جسے پونچھنے کی کبھی وہ اجازت دے دیتی کبھی اسے کھلتا ہوا چھوڑ جاتی۔

سب حیران تھے مختار ان بی بی کو دیکھ کر سب ہی کے چہرے مرجھا گئے اور گھر میں بیٹھی شمسہ اس طرح زار و قطار رو رہی تھی۔ جیسے کسی کا جنازہ اٹھا ہو۔

جنازہ اٹھا تو تھا، اس کی آزادی کا..... اس کے پر نکل آئے تھے، پنجرے میں وہ پھر پھنسا رہی تھی۔ بستر پر لیٹے باپ اور بس میں جاتی ماں کو پتا نہیں تھا اب پر کانٹے کا وقت آ گیا ہے۔

کاش.....!

☆☆☆

”وہ نہیں سمجھتی اب تم سے کام نہیں ہوتا تم اپنی بیٹی کو ہی بھیجو، دیکھو تم تو کپڑوں پر برش بھی نہیں لگا پا رہی ہو۔“ باجی جی قیص کا کارڈ دکھاتے ہوئے مختار ان بی بی پر برس رہی تو پڑیں۔

ڈھیر لگا دیتے ہیں، میری سمجھ میں نہیں آتا جس ملک کی آبادی کا ایک بڑا حصہ غربت کی لکیر سے نیچے زندگی بسر کرتا ہو، جہاں فی کس آمدنی 1800 روپے سے بھی کم ہو وہاں 12000 کالان کا سوٹ.....؟ جو ایک مخصوص کلاس ہی افرورڈ کر سکتی ہے..... سارے شہر میں پوسٹر اور بل بورڈز کیوں لگائے جاتے ہیں، ایک غریب ملک میں جہاں ایک مجبور عورت دوسروں میں یا صرف دس کلو آنے کے تھیلے کے لیے اپنی عزت بیچنے پر تیار ہو جائے..... جہاں دس سالہ بچہ کمرے میں سے کھانا چن کر کھاتے ہوئے شیشہ نکل جائے، جہاں ایسے بھی لوگ بستے ہوں جو بڑھاپے کی ولہیز پر آجانے تک بھی صرف جگہ نہ ہونے کی وجہ سے ٹائیکس پھیلا کر اپنی چھوڑیوں تک میں بھی نہ سوئے ہوں، وہاں حسین محلات نما گھروں میں ڈرامے قلمائے جاتے ہیں۔ جہاں حقیقت سے دور کہانیاں قلمائی جاتی ہوں، ارے جنتاب..... اب تو بہن، بھائی بھی ایشیئس کے حساب سے چلتے ہیں، اس معاشرے میں ایک رائٹر یہ لکھ رہی ہے کہ غریب ملازم کی بیٹی کو گھر کے مالکان عزت سے اس کے کچے کمرے محل میں بیاہ لائے ہیں..... تو جنتاب کچے گھروں کی لڑکیاں خواب بھلا کیوں نہیں دیکھیں گی..... خوب صورت، مالدار..... تعلیم یافتہ، شریف شہزادے کے لیے وہ اپنے کچے گھروں کی دیواریں کیوں نہیں پھلانگیں گی.....

”جن گھروں میں ملازمین گھر کے ریفریجریٹر کو ہاتھ نہیں لگا سکتے۔ ان گھروں میں دکھایا جاتا ہے کہ ایک یتیم لڑکی ایک ریاست کی رانی بن گئی..... تو مجھ سمیت ہر لڑکی رانی کیوں نہیں بننا چاہے گی..... لیکن معزز راج صاحبہ ایسا اگر ہوتا ہے تو صدیوں میں بھی ایک بار ہوتا ہے۔ یہ ڈرامے، یہ مہنگے ملبوسات کے اشتہارات، یہ سڑکوں پر براڈڈ کپڑوں میں ملبوس لڑکیوں کے بل بورڈ، یہ مہنگے فون سیٹ کا شوق، خوب صورت لمبی، لمبی گاڑیوں کے دکھاوے..... ایڈی وکیل نے کچھ لمحہ توقف کیا پھر راج صاحبہ کو مخاطب کیا۔

”بی لارڈ..... یہ سب..... یہ سب ہماری نئی نسل کو ذہنی مریض بنارہے ہیں، چیزوں کی طلب ہوس میں بدل رہی ہے۔ ہماری نوجوان نسل اعلیٰ تعلیم، خاندانی اقدار،

اٹھا کر الٹ پلٹ کر دیکھا پھر جلدی سے اپنے اندر سے انٹنی سٹانڈ سے گھبرا کر وہ بول اس طرح الماری میں چھپتی جیسے وہ کوئی سانپ ہو، خوب صورت بیگنوں سے جھانکتے رنگ، برنگے کپڑے اسے پھنکارتے ناگ لگے..... جو اس کے سارے وجود کو ڈس گئے تھے۔ اس نے پلٹ کر کمرے کی سیلن زدہ دیواروں کو دیکھا تو اس کا دل چاہا ان سیلن زدہ دیواروں سے لپٹ، لپٹ کر روئے جو ہمیشہ سے اسے اپنے بازوؤں میں لپیٹے حفاظت کیا کرتی تھیں۔ پھر اس نے کمرے میں موجود واحد دھندلے آئینے میں اپنے آپ کو دیکھا، آنکھوں کے گرد سیاہ حلقے اور..... اور سفید چہرے پر سرمئی چھائیاں یہ اس کا چہرہ تو نہیں تھا یہ تو کسی بیمار، لاغر، بوڑھی عورت کا چہرہ تھا۔

”بیٹا کپڑے بدل لے، ڈاکٹر اٹھ جائے گا۔“ اس کی اماں نے دوسری دفعہ کمرے میں چھانک کر اس سے کہا۔ اس کی ماں، کتنی فکر مند تھی..... اس نے پلٹ کر میلے دوپٹے کے پلو کو کھول کر نوٹ، گنتی ماں کو دیکھا اور پھر..... قطرہ، قطرہ آنسو اس کے دل پر گرنے لگے..... ایک دم اسے اپنے وجود کی کسی اور وجود کی سرسراہٹ محسوس ہوئی تو وہ لرز کر رہ گئی..... اس نے گھبرا کر ماں کو دیکھا اور پھر جلدی سے الماری کے دروازے کی آڑ میں ہو کر اپنے اندر کھلتا وجود کو جیسے اپنے آپ سے بھی چھپانے کی کوشش کی۔

”آئی اماں.....“

☆☆☆

”راج صاحبہ..... یہ ایک لڑکی کی خودکشی کا معاملہ نہیں ہے، یہ ایک معصوم لڑکی کا قتل ہے، بہت سارے قتل ایسے بھی ہوتے ہیں کہ اس میں نہ مقتول کے خون سے قاتل کے ہاتھ رنگتے ہیں، نہ گولی چلتی ہے، نہ سینے میں چاقو اترتا ہے لیکن قتل ہوتا ہے۔ یہ ایسا ہی ایک قتل ہے۔ یہ ایک بیمار..... لاچار..... باپ اور گھر، گھر بن مانتھی یاں کی خوب صورت، نوجوان، ارمانوں سے بھری بیٹی کا قتل ہے اور آپ جانتے ہیں قاتل کون ہے..... جنتاب عالیہ.....“ وہ لڑکی..... قاتل ہیں وہ ڈیزائنر جو ماڈل کو پیرس اور لندن لے جا کر مہنگے ترین ملبوسات پہنا کر ایک بناوٹی دنیا سجا کر..... ان غریب لڑکیوں کے دلوں میں حسرتوں کے

ساری انسانیت کا قتل ہے۔“ وہ ایک فلاحی ادارے سے وابستہ وکیل تھی۔ اس نے نفرت سے ہاتھوں میں ہتھکڑیاں لیے مجرموں کو دیکھا اور پھر سکتے ہوئے اس مرد کو تسلی دی جو اکیلا تھا، جو آج اپنی بیوی کو دفن کر آیا تھا، جو بیمار تھا، جو لاچار تھا، جو حسرت اور خوف سے مجرموں کو دیکھ رہا تھا اور سوچ رہا تھا کہ اس کے گھر کی ٹین کی چھت اتنی کمزور تھی اور وہ بے خبر تھا.....

☆☆☆

بے خبر تو وہ بھی تھی.....

”انتہی بڑی کوٹھی..... اتنے کمرے..... لیکن گھر میں کوئی نظر نہیں آ رہا.....“ وہ اپنے آپ سے پوچھ رہی تھی۔

”کیا سوچ رہی ہو؟ میری جان.....“ خرم اسے گیسٹ روم میں چھوڑ کر چلا گیا تھا اور وہ حیرت سے ادھر ادھر دیکھنے جا رہی تھی۔ خرم کمرے میں واپس آ کر اس کے بہت قریب کھڑا تھا۔ یہ پہلی دفعہ نہیں تھا کہ وہ اتنے قریب کھڑا تھا۔ لیکن نہ جانے کیوں آج اسے خرم سے عجیب سا خوف محسوس ہوا.....

”تمہاری امی اور بہنیں کہاں ہیں؟ کوئی نظر نہیں آ رہا؟“

”ارے سب یہی ہیں، یہ کوئی ایک کمرے کا کوارٹر تھوڑی سی کمرے سب ایک دوسرے پر چڑھے بیٹھے ہوں، یہ دو ہزار گز کی کوٹھی ہے میڈم جس کا ایک کمرہ مشرق میں ہے تو دوسرا مغرب میں..... بس سب آنے ہی والے ہیں۔“ اس کی گرفت ذرا سخت ہوئی..... اس کے منہ سے گھٹی گھٹی آواز میں نکلا۔

”نہیں خرم.....“ اور پھر جیسے اس کے وجود کے ساتھ، ساتھ اس کی آنکھیں بھی پتھر کی ہو گئیں..... اور وہ بے ہوش ہو کر خرم کے بازوؤں میں جمول گئی۔ وہ نشے میں دھت، بے ہنگم قہقہے لگاتے اوپاش نوجوان اسے نوج رہے تھے..... رات کا کون سا پہر تھا جب آنکھ کھلی، شاید اسے کوئی نشہ آور چیز کھلائی گئی تھی۔

”میک ریپ؟“

اس کے اندر کوئی چیخا، اس نے اٹھنا چاہا۔

☆☆☆

ساری الماری براڈڈ سوٹوں، شوز سے بھری پڑی تھی۔ اس نے ایک مہنگی برائنڈ کے پرفوم کی حسین بولٹ کو

تو کئی فیکٹریاں ہیں، اس نے اپنے گھروالوں کو منایا ہے‘ مونز سائیکل تو وہ شوقیہ چلاتا ہے، ورنہ اس کے پاس چار، چار لمبی، لمبی گاڑیاں ہیں۔“

”تو نے دیکھی ہیں؟“ حمیدہ کے سوال نے ایک لمحے کے لیے اسے چپ سا کروا دیا۔

اماں سے اس نے کہہ دیا تھا کہ ”آج اسے دیر ہو جائے گی اور ہو سکتا ہے وہ باجی کے گھر ہی رک جائے کیونکہ وہاں بہت بڑی دعوت ہے، باجی کہہ رہی تھی کہ اگر رات کو رو کا تو آگ سے پیسے دے دوں گی۔“

مختاراں خاموش رہی، اب اکثر باجی اسے رات کو روک لیتی تھیں۔ لیکن اتنے پیسے وہ ضرور لے آتی تھی کہ ہفتہ بھر کے لیے پھل اور دوائیاں آ جاتی تھیں۔

☆☆☆

”واہ! تم تو بالکل بدل گئیں۔“ جب وہ ڈیزائنر سوٹ اور نئی چپل پہنے ایک بہت بڑے پارلر سے پارٹی میک اپ کروا کر باہر آئی تو خرم کے منہ سے بے ساختہ نکلا۔

واقعی آج..... اسے اپنی حیثیت اور خوب صورتی کا احساس ہوا۔ جب پارلر کے فوڈ آدم آئینے میں اس نے اپنے آپ کو دیکھا تو اس کے دل سے بڑی باجی کے لیے دعا میں نکلن نہ وہ اماں کو رنگین فی وی دیتیں اور نہ ہی اس کی دنیا رنگین ہوتی..... کیا اس کی زندگی رنگین ہو گئی تھی۔

☆☆☆

”کچرا کنڈی میں کسی لڑکی کی کٹی پھٹی لاش پڑی ہے۔“ رات کے اندھیرے میں شور مچ گیا تھا۔ موذن صاحب اذان دینے مسجد جا رہے تھے کہ ان کا بچہ کچرا کنڈی کے قریب پڑی اس لاش پر پڑا تھا جو پھٹے پھٹے کپڑوں میں برہمن تھی۔ جس کے جسم پر سنگریٹوں کے داغ تھے..... غریبوں کا محلہ، دروازے سے دروازہ ملا، چند لمحوں میں پورا محلہ جاگ گیا، کوئی بھاگ کر نارنج لے آیا..... اور پھر جیسے سارے محلے کو سانپ سونگھ گیا۔ اور مختاراں بی بی چادر لینے کے لیے بے ساختہ اپنے گھر کی طرف دوڑی.....

☆☆☆

”میں آپ کے لیے انصاف مانگوں گی، میں عدالت کا دروازہ کھٹکناؤں گی، نہیں یہ ایک عورت کا نہیں

کردینے کے ذمے دار ہیں، میں ان مجرموں کی بات کر رہی ہوں، میں شمس کے اصل قاتلوں کی بات کر رہی ہوں۔ ”می لارڈ!“ بولتے، بولتے اس کی آواز بھرا گئی۔ عدالت میں بیٹھے لوگ حیرت زدہ تھے کہ یہ کس قسم کا مقدمہ تھا۔

☆☆☆

”ارے تمہارے اس کیس کا کیا ہوا تھا؟ جس نے سارے شہر کو ہلا کر رکھا تھا۔ ہر ناک شو، ہر اخبار میں اسی کی ہی بات ہو رہی تھی..... مجھے کینیڈا جانا پڑ گیا تھا۔ میں وہاں مصروف ہو گئی اب لوٹی ہوں تو سوچا تم سے معلوم تو کروں فیصلہ کیا ہوا تھا؟“

ایڈووکیٹ ندانے چائے کا سب بھرتے ہوئے اپنی کالج کی سیکلی ایڈووکیٹ نانکھ سے پوچھا تھا جواب پریکٹس چھوڑ کر گھر بیٹھ گئی تھی۔ نڈا سال بھر کے بعد وطن لوٹی تھی۔ اس دوران نانکھ سے رابطہ ہی نہیں ہو پایا تھا۔ آج ملاقات پر اسے مشہور زمانہ کیس یاد آیا تھا۔

”فیصلہ؟ فیصلہ کیا ہوا تھا جس قوم میں ظالموں کی پشت پناہی کی جائے وہاں بے گناہ یونہی بے دردی سے مارے جاتے رہیں گے۔ ہونا کیا تھا ایک دفعہ پھر کلاس کا فرق درمیان میں آگیا؟ غریب کی بیٹی بے مول ٹھہری اور انصاف بک گیا، قانون اندھا ہوتا ہے، یہ ہمیشہ سے سنتے آئے ہیں لیکن یہاں قانون، اندھا، گونگا اور بہرہ بھی ہے۔ یہ مجھے اب پتا چلا۔“

”اس کا حل کیا ہوگا؟“ ندانے اس کی بات کافی تھی۔ ”کیا اسی طرح ہر روز کسی نہ کسی گھر میں کوئی نہ کوئی شمس گلے میں پھندا ڈال کر خودکشی کرے گی اور اس کے قاتل وکٹری کا نشان بناتے ہوئے پروٹوکول میں اسے گھر چلے جائیں گے؟ اس کی ماں پاگل ہو کر سڑکوں پر ٹھوکتی پھرے گی اور اس کا معذور عزت دار باپ بھیک مانگے گا؟“

”ہاں یہی تو ہوگا..... یہی ہوتا ہے اور یہی تو ہوتا آیا ہے..... کہتے، کہتے نانکھ ہاؤس مار، مار کر روئے گی اور پھر آنسوؤں میں ایڈووکیٹ ندانے کے ساتھ اپنی چچی قبر میں سوئی شمس کے آنسو بھی شامل ہو گئے.....“



اعتدال پسندی، صبر و قناعت، محنت، کوشش اور تہذیب کو بھول کر ان مادی چیزوں کے پیچھے دوڑ رہی ہے۔ اور پھر..... اور پھر جناب عالیہ نتیجہ کیا نکلتا ہے۔ شریف گھروں کے لڑکے، تعلیم یافتہ مہذب لڑکے گمن لے کر روڈوں پر جا کھڑے ہوتے ہیں جو نا تجربہ کار ہوتے ہیں، وہ دھریے جاتے ہیں..... مشتعل عوام انہیں زندہ جلا دیتی ہے۔ میں کہتی ہوں ڈاکوہ نہیں بلکہ یہ لوگ ہیں جو ان کی آنکھوں میں خواب بھر دیتے ہیں..... خواب دیکھنا اچھی بات ہے لیکن زندگی کو جتنا آسان اور گیسرا کر کے یہ میڈیا پیش کرتا ہے، زندگی اتنی آسان نہیں ہے۔..... خوب صورت مالدار لڑکے کے ساتھ، مہنگے ترین مائر میں شاپنگ کرتی کالج یونیفارم میں لڑکی دکھاتے ہوئے، وہ کیوں بھول جاتے ہیں کہ ان کے گھر میں بھی بیٹی

موجود ہے جناب عالیہ میری گزارش ہے آج کٹہرے میں، ان تمام رائٹرز..... پروڈیوسرز..... اور ڈیزائنرز کو بلایا جائے اور پھر شمس کے قتل کا مقدمہ چلا جائے۔ شکریہ جناب عالی.....! مجھے اتنا ہی کہنا تھا۔“

نوجوان وکیل نانکھ نے اپنی بات مکمل کی..... اور ان چاروں لڑکوں کو گھورتی اپنی کرسی پر جاتی تھی۔

”تو آپ یہ کہنا چاہتی ہیں کہ یہ چاروں لڑکے جنہوں نے شمس بی بی بے بنت کرم دین کا گینگ ریپ کیا..... اور بالآخر اسے خودکشی کرنی پڑی۔ یہ بے تصور ہیں۔“ جج بھی ایک خاتون ہی تھیں، طنز بے مسکراہٹ سے انہوں نے ایڈووکیٹ نانکھ سے سوال کیا۔

”نہیں جناب عالیہ.....!“ ایڈووکیٹ نانکھ اپنی کرسی سے کھڑی ہوئی۔

”یہ تو مقدمے کے ہتھیار ہیں، یہ تو خنجر ہیں، یہ تو پستول ہیں جو قتل میں استعمال ہوئے..... میں عرض کر رہی ہوں اصل مجرموں کو کٹہرے میں لایا جائے، یہ چاروں تو آئینہ قاتل ہیں، میں عرض کر رہی ہوں ان ہاتھوں میں جھنڈیاں ڈالی جائیں جنہوں نے آئینہ قاتل استعمال کیا۔ ہم ایک موبائل چور کو پکڑتے ہیں تو اسے زندہ جلا دیتے ہیں لیکن وہ لوگ، جو ہماری نسلوں کو تباہ کر رہے ہیں جو لڑکیوں کو خودکشی اور لڑکوں کو گمن لے کر سڑک پر کھڑا



## انتقام

### شہلا جمال

”امی! میرے سینے میں درد ہو رہا ہے۔“ فرح نے کمرے میں داخل ہو کر اپنی طرف اشارہ کرتے ہوئے ماں کو مخاطب کیا۔ درد کے آثار اس کے چہرے پر واضح نظر آرہے تھے۔

”اچھا ٹھیک ہے چلو ہم ابھی ڈاکٹر کے پاس چلتے ہیں۔“ رابعہ بیگم فوراً تیار ہو گئیں۔

”بیٹا تم آفس سے دو دن کی چھٹی لے لو تاکہ یہ گروٹ لے لی ہوگی۔“ رابعہ بیگم نے تسلی دی۔

”نہیں امی، یہ درد مجھے کئی دن سے ہو رہا ہے مگر تمام ٹیسٹ ہو چکی ہیں جو ڈاکٹر صاحب نے لکھ کر دیے

کر کہ تم اس قابل ہو کہ اس بیماری کا اچھا سا علاج کرا سکو۔

”میرا دل کسی بات کو قبول نہیں کرتا میں کیا کروں۔“ فرح بہت بے چین تھی۔

”تم وہی کرو جو ڈاکٹر صاحبہ نے کہا ہے۔ تم آپریشن کے بعد بالکل ٹھیک ہو جاؤ گی۔ فرح اپنا نہیں تو اپنی اُمی کا خیال کرو، وہ کتنی ہمت سے کام لے رہی ہیں تاکہ تمہیں ہمت دلا سکیں۔ تمہارے دونوں بھائی تمہاری بیماری کا سن کر باہر سے فوراً آگئے ہیں۔ دیکھو سرد تمہارے ساتھ ہے سب ٹھیک ہو جائے گا۔ پرسوں تمہارا آپریشن ہے، تم اللہ سے دعا کرو اللہ نے یہ مشکل دی ہے تو وہی اس سے نکالے گا۔“

☆☆☆

آپریشن کے بعد کا مرحلہ بہت مشکل تھا۔ فرح ہوش میں آنے کے بعد کم صم تھی۔ کئی دن بعد اسپتال سے پھینٹی ملی۔ اس دوران اس کی پیاری سہیلی ثنا اس کے ساتھ، ساتھ ہی فرح کی اُمی اور دونوں بھائی دن رات اسی کوشش میں تھے کہ فرح کا علاج بہترین طریقے سے ہو۔ ابو کے انتقال کے بعد دونوں بھائیوں نے فرح کو کبھی کسی چیز کی محسوس نہیں ہونے دی اور اب اس بیماری کا علاج بھی بہترین اسپتال میں کرایا۔ ”یہ وقت اور زیادہ مشکل ہے، اس میں مریض آپریشن کے بعد ذہنی دباؤ کا شکار ہو کر مایوسی اور ناامیدی میں گھر جاتا ہے۔ ایسی کیفیت علاج میں رکاوٹ بھی ثابت ہو سکتی ہے۔ اسی لیے آپ فرح کو مایوسی اور ناامیدی سے بچائیے گا۔ اور اس کا پہلے سے زیادہ خیال رکھیے گا۔“ ڈاکٹر صاحبہ نے رابعہ بیگم کو تاکید کی۔

☆☆☆

”سنو میرے آپریشن کو چند دن ہو گئے ہیں سرد نہیں آیا؟“ فرح نے آج ثنائے پوچھا تھا۔ ”وہ جس دن تمہارا آپریشن تھا تاں تو اس دن سرد بھائی اسپتال آئے تھے وہ بہت پریشان تھے تمہارے لیے۔ دراصل ان کا ٹرانسفر ہو گیا ہے۔۔۔۔۔“

”جی آئی، میں اسے سمجھاتا ہوں۔“ سرد نے جواب دیا۔

”دیکھو فرح آپریشن کے بغیر کوئی چارہ نہیں ہے اور ہم سب تمہارے ساتھ ہیں۔“

”لیکن سرد یہ سب میرے ساتھ ہی کیوں؟ یہ اچانک کیا ہو گیا۔ میں نے تو بھی سوچا بھی نہیں تھا کہ اتنی بڑی بیماری مجھے ہو جائے گی۔ تم نہیں سمجھ سکتے جو مجھ پر ہمت رہی ہے۔ میں کیسے خود کو راضی کروں۔“

”فرح بیماری کسی کو نہیں دیکھتی۔ بے شک ایسی ہماری قبول کرنا تمہارے لیے بہت مشکل کام ہے مگر یہ ایک حقیقت ہے اور اس کا سامنا کرنا پڑے گا۔“ سرد نے اس کی ہمت بندھائی۔

”سرد میرے کچھ خواب ہیں، میرا کیریئر ہے ہمارا شادی اور ہمارا مستقبل۔۔۔۔۔ اس سچ یہ بیماری کہاں سے آگئی۔“

”فرح ہو سکتا ہے کہ اسی میں اللہ کی کوئی مصلحت ہو، ہم نہیں جانتے آگے کیا ہونے والا ہے۔ تم پریشان نہ ہو، میں تمہارے ساتھ ہوں۔“

”سرد بھائی میں اندر آ سکتی ہوں۔“ ثنائے کمرے میں جھانک کر پوچھا۔

”ہاں کیوں نہیں، دیکھو میں اسے سمجھا رہا تھا اب تم بھی کوشش کرو۔ مجھے کچھ کام ہے، میں چلتا ہوں۔“

”کیسی ہے میری دوست کچھ کھایا پیا۔“ ثنائے لڑے پارسے پوچھا۔

”ایسی زندگی سے تو موت بہتر ہے۔ اللہ کرے میں ہی مر جاؤں تاکہ اس بیماری سے نجات ملے۔“ یہ کہہ کر فرح پھوٹ پھوٹ کر رو پڑی۔

”ایسا نہیں کہتے فرح۔۔۔۔۔ زندگی قدرت کا حسین لمحہ ہے۔ اس میں اگر آزمائش آجائے تو دل نہیں ہارتے۔“ ثنائے اسے گلے لگا لیا۔

”میرے ساتھ ہی ایسا کیوں ہوا۔ یہ اچانک اتنی بڑی بیماری۔“

”سچ ہے موت کا کوئی وقت مقرر نہیں ہے۔ اسی طرح بیماریاں بھی بنا دستک کے آتی ہیں۔ اللہ کا شکر ادا

بیچیدہ ہو چکا ہے۔ آپریشن کر کے ایک چھاتی علیحدہ کرنی پڑے گی۔ تاکہ یہ باقی جسم میں سرایت نہ کر سکے۔“ ڈاکٹر صاحبہ نے جواب دیا۔ ”ویسے ہو سکتا ہے ایسا نہ بھی ہو مگر آپ کو سب بتانا ضروری ہے۔“

”مگر ڈاکٹر صاحبہ اس کا نکاح ہو چکا ہے چند مہینے بعد رخصتی ہے، وہ کیسے نارمل زندگی گزارے گی۔“ رابعہ بیگم بے حد پریشان ہو گئیں۔

”پریشانی کی بات نہیں ہے۔ آپریشن کے بعد وہ ایک نارمل زندگی گزار سکے گی، اس مرض کا علاج وقت طلب ہے۔ آپ فرح کی شادی ضرور کیجیے گا مگر مکمل علاج کے بعد۔۔۔۔۔ وہ شادی کے بعد ماں بنے گی ایک نارمل زندگی گزارے گی۔ آپریشن کا مقصد کینسر کو مزید سرایت کرنے سے روکنا ہے۔ آپ ماں ہیں، آپ کو فرح کو ذہنی طور پر تیار کرنا ہے اور بہت حوصلے سے کام لیتا ہے۔“ ڈاکٹر صاحبہ نے اپنی بات مکمل کی۔

”جی ڈاکٹر صاحبہ میں پوری کوشش کروں گی۔“ یہ کہہ کر رابعہ بیگم نے رخصتی لی۔ ان کا دل جانتا تھا کہ بیٹی کی بیماری کا سن کر انہیں کتنا صدمہ ہوا ہے مگر وہ بہت ہمت والی تھیں۔ ابھی دو سال پہلے ہی تو فرح کے ابو کا انتقال ہوا تھا۔

وقت نے انہیں مضبوط بنا دیا تھا۔ پچھلے سال ہی سرد اور فرح کا نکاح ہوا تھا۔ وہ تو اب شادی کی تیاریاں شروع کرنے والی تھیں کہ یہ ناگہانی بیماری اچانک نمودار ہو گئی۔

”میں کیسے فرح کو آپریشن کے لیے راضی کروں۔“ یہ سوچ کر ہی ان کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔

فرح نے دودن سے کچھ کھایا پیا نہیں تھا اور خود کو کمرے میں بند کر لیا تھا۔ رابعہ بیگم نے جب سے اسے آپریشن کی بات بتائی تھی وہ صدمے میں آگئی تھی۔ اسے یقین ہی نہیں آ رہا تھا کہ اتنی بڑی بیماری اس کے جسم میں پل رہی تھی۔

”بنا تم ہی اسے سمجھاؤ، ہم سب گھر والے کب سے اسے سمجھا رہے ہیں۔ آپریشن میں ہی اس کی بہتری ہے۔“ رابعہ بیگم نے سرد سے کہا۔

”جی ڈاکٹر صاحبہ میں پوری کوشش کروں گی۔“ یہ کہہ کر رابعہ بیگم نے رخصتی لی۔ ان کا دل جانتا تھا کہ بیٹی کی بیماری کا سن کر انہیں کتنا صدمہ ہوا ہے مگر وہ بہت ہمت والی تھیں۔ ابھی دو سال پہلے ہی تو فرح کے ابو کا انتقال ہوا تھا۔

وقت نے انہیں مضبوط بنا دیا تھا۔ پچھلے سال ہی سرد اور فرح کا نکاح ہوا تھا۔ وہ تو اب شادی کی تیاریاں شروع کرنے والی تھیں کہ یہ ناگہانی بیماری اچانک نمودار ہو گئی۔

”میں کیسے فرح کو آپریشن کے لیے راضی کروں۔“ یہ سوچ کر ہی ان کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔

فرح نے دودن سے کچھ کھایا پیا نہیں تھا اور خود کو کمرے میں بند کر لیا تھا۔ رابعہ بیگم نے جب سے اسے آپریشن کی بات بتائی تھی وہ صدمے میں آگئی تھی۔ اسے یقین ہی نہیں آ رہا تھا کہ اتنی بڑی بیماری اس کے جسم میں پل رہی تھی۔

ہیں۔“ رابعہ بیگم نے چیک اپ کے بعد فرح کو تاکید کی۔ ”امی آگس میں بہت کام ہے۔ اگلے ہفتے کوشش کر کے چھٹی لے لوں گی۔“

”نہیں بیٹا، جان سے بڑھ کر قیمتی کچھ نہیں ہوتا تم آج ہی چھٹی کے لیے بات کرو۔ ورنہ میں خود بات کروں تمہارے پاس سے۔“ رابعہ بیگم بیٹی کی کوئی بات ماننے کو تیار نہیں تھیں۔

”اچھا امی میں چھٹی لے لوں گی آپ پریشان نہ ہوں۔“ فرح نے آخر ہار مان لی۔ دونوں گھر آگئیں۔

”کیا کہا ڈاکٹر صاحبہ نے۔“ سرد کو پتا چلا تو اس کی خیریت معلوم کرنے لگا۔ سرد اس کا شوہر جس سے ابھی صرف نکاح ہوا تھا۔

”ڈاکٹر صاحبہ نے دوائیں دی ہیں، ایکسے، الٹرا ساؤنڈ اور مختلف ٹیسٹ کرانے کو کہا ہے دودن میں دواؤں سے درد میں کمی تو ہوئی ہے۔“ فرح نے جواب دیا۔

”دیکھو تم پریشان مت ہو سب ٹھیک ہو جائے گا اور یہ سارے ٹیسٹ جلد سے جلد کراؤ۔“ سرد نے اسے تاکید کی۔

☆☆☆

ٹیسٹ وغیرہ کی رپورٹ آنے میں تین دن لگ گئے پھر اس کے بعد ڈاکٹر صاحبہ کو دکھانے کا مرحلہ تھا۔

آج وہ پھر رپورٹس لے کر ڈاکٹر کے پاس آئی تھیں۔ ”دیکھیں رابعہ بیگم فکر کی کوئی بات نہیں۔ دراصل الٹرا ساؤنڈ اور دیگر ٹیسٹ میں فرح کو چھاتی کا کینسر تشخیص ہوا ہے۔ اس کا واحد علاج آپریشن ہے جو ہمیں جلد سے جلد کرنا پڑے گا۔“ ڈاکٹر صاحبہ نے رابعہ بیگم کو آگاہ کیا۔

”ڈاکٹر صاحبہ یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ میری بیٹی تو بالکل صحت مند ہے، بچپن میں بھی اسے کوئی ایسی بڑی بیماری نہیں ہوئی اور کینسر تو ہمارے خاندان میں آج تک کسی کو نہیں ہوا۔“ رابعہ بیگم رو ہانسی ہو گئیں۔

”کینسر مرض ہی ایسا ہے جس کی وجوہات کا مکمل تعین ابھی تک نہیں ہو سکا ہے۔ اور یہ کوئی موروثی بیماری نہیں ہے جو نسل در نسل چلے۔ فرح کا کیس کافی

مابنامہ پاکیزہ 206 دسمبر 2017ء

کے سلسلے میں ہے اور جناب یہ کوفتے، مچھلی، پلاؤ، پسندے، سٹکے، شامی کباب، کھیر، لب شیریں جانے کیا، کیا یہ سب تم نے خود بنایا ہے۔ ایسا لگ رہا ہے کہ میں کسی بڑے ہول میں آگئی ہوں۔“ ثناء اب اس کے ساتھ بچن میں تھی اور ڈشوں کا جائزہ لے رہی تھی۔

”ہاں جناب، یہ سب میں نے اور امی نے مل کر بنایا ہے اور تم یہ بتاؤ کسی چیز کی کمی تو نہیں ہے، میں چاہتی ہوں کہ سرد اور اس کے گھر والے اتنے دن بعد آ رہے ہیں تو ان کی خوب خاطر مدارات ہوں۔“

”سب کچھ بہت عمدہ ہے تم پریشان مت ہو۔“ اتنے میں ڈور بتیل ہوئی۔ رابعہ بیگم گیسٹ کی جانب بڑھیں اور یہ دونوں ڈرائنگ روم کے دروازے کی جانب۔

”ارے یہ کیا سرد، تم اکیلے آئے ہو باقی گھر والے کہاں ہیں؟“ رابعہ بیگم نے اسے دیکھتے ہوئے استفسار کیا۔

”آئی دراصل گھر والے چھوٹی بہن کی مسرال گئے ہیں۔ چلیں وہ پھر کبھی آجائیں گے۔“ سرد نے مدہم انداز میں جواب دیا۔ وہ اسے لیے اندر آ گئیں۔

”اچھا تم آؤ بیٹھو، میں فرخ کو بلاتی ہوں۔“ رابعہ بیگم نے سرد کو اکیلے دیکھا تو ایک دھڑکا سا لگا۔ ثناء اور فرخ ڈرائنگ روم میں ہی تھیں۔ سرد کو دیکھ کر دونوں نے سلام کیا۔

”فرخ مجھے تم سے بہت ضروری بات کرنی ہے۔“ سرد کچھ پریشان سا تھا۔ بھی اس نے سلام کا جواب دے بغیر فرخ کو مخاطب کیا۔ ثناء اور رابعہ بیگم ان دونوں کو ڈرائنگ روم میں چھوڑ کر باہر لاؤنج میں آگئی تھیں۔

”ہاں، ہاں، کو سرد میں ہمہ تن گوش ہوں۔“ وہ اس کا لہجہ محسوس نہ کر سکی تھی۔ ”تمہیں نہیں معلوم سرد کہ میں تمہیں یہاں اپنے پاس دیکھ کر کس قدر خوش ہوں۔“ ”فرخ میں تمہیں دکھ نہیں دینا چاہتا، تم ابھی اتنی بڑی بیماری سے نبرد آزما ہوئی ہو مگر جو حقیقت ہے..... اسے تسلیم کرنا ہی پڑتا ہے۔“ وہ انک، انک کر بات کر رہا تھا۔

”سرد اس بیماری نے مجھے بہت بہادر بنا دیا

آہستہ، آہستہ چیزیں اپنی اصل حالت میں آنے لگیں۔ فرح اپنے آپ میں تبدیلیاں محسوس کر رہی تھی۔

ان دنوں اور جلد کی رنگت سب بہتر ہونے لگا۔ یہ اس کے علاج اور گھر والوں کی توجہ و محبت سے ممکن تھا۔ اب فرح بھی اپنے آپ پر مکمل توجہ دے رہی تھی۔

اگر وہ جلد از جلد صحت یاب ہو اور سرد کے ساتھ زندگی شروع کرے۔ دونوں کے نکاح کو دو

ماہ ہو چکے تھے، یہ رشتہ دونوں کی پسند سے طے پایا۔ دونوں نے ساتھ تعلیم حاصل کی رشتے کے وقت ان کے گھر والوں کی طرف سے کوئی رکاوٹ نہیں لی۔ پہلے نکاح ہوا اور رخصتی چھ ماہ بعد رکھی گئی تھی مگر اب کی بیماری کی وجہ سے تاخیر ہوئی چلی گئی۔

”ماشاء اللہ کتنی پیاری لگ رہی ہو بالکل پہلے جیسا کہ تھا، میری بہت پیاری بہن اور دوست۔“ ثناء نے اس کو اوپر سے نیچے تک دیکھا اور گلے سے لگا لیا۔ وہ اس کی ضروری بہت اچھی لگ رہی تھی۔

”ہاں ثناء، یہ سب تمہاری اور میرے گھر والوں کی مدد اور محبت کی وجہ سے ممکن ہوا..... زندگی اپنی خوب اور تینوں اور بد صورتیوں کے ساتھ، ساتھ ہی چلتی چلی

آئی ہے اس لیے اس کے ساتھ، ساتھ چلنا ہی چاہیے۔ اگلے کون سا خوب صورت موڑ ہمارا منتظر ہو۔“ فرخ نے خوش دلی سے کہا۔

”اتنی مثبت سوچ یہ تم ہو فرخ؟“ ثناء نے حیرانی کا اظہار کیا۔

”ہاں اس مثبت سوچ میں تمہارا بہت بڑا ہاتھ ہے، میری پیاری دوست اور اچھی بہن.....“ فرخ نے اس کا ہاتھ پکڑ کر چوم لیا۔

”اچھا یہ بتاؤ آج کیا سر پر اڑ رہے جو مجھے لگا چکا ہے؟“ ثناء نے پوچھا۔

”بتا ہے آج سرد اور اس کے گھر والے آ رہے ہیں۔“ ثناء نے اتنا اہتمام کیا ہے اور جب تم میرے ہر دکھ

کا میرے ساتھ ہو تو کسکھ میں بھی میرے ساتھ شامل رہو۔“ فرخ نے خوش ہو کر کہا۔

”اچھا جی..... یہ سارا اہتمام سرد بھائی کی آمد

کے بارے میں ہی فکر مند ہوتے ہیں اس فکر مندی کے اظہار افسوس میں محبت کا جذبہ پنہاں ہوتا ہے۔ اس لیے بھی ہر ایک کا اپنا الگ انداز ہوتا ہے تم ان باتوں کو دل پر مت لیا کرو۔“ اس نے فرح کے ہاتھ پکڑ کر نرمی سے پکڑ کر تھپتھپاتے ہوئے کہا۔

”نتیجہ میری کتنی اچھی دوست ہو۔ تم نے مجھے ہمیشہ ساتھ دیا ہے اور اس بیماری میں تو بہت زیادہ

میں جانتی ہوں، امی، بھائی اور تم مجھے ہر وقت ملنے والے خیالات سے نکالنے کی کوشش کرتے ہو اور ہر بات میں مثبت پہلو تلاش کرتے ہو تاکہ میں ناامیدی اور ناپوی کا شکار نہ ہوں۔ میں تمہاری بہت احسان مند ہوں۔“ فرح کی آنکھیں نم تھیں۔

”احسان مندی کسی؟ تم میری صرف دوست ہو، نہیں بلکہ بہن ہو اور ہم سب ہمیشہ تمہارے ساتھ ہیں۔“ یہ کہہ کر ثناء نے فرح کو گلے لگا لیا۔ اتنے میں رابعہ بیگم چائے کے ساتھ دیگر لوازمات لیے کمرے میں داخل ہوئیں۔

”بہن تمہاری سرد سے بات ہوئی ہے کیا؟“ انہوں نے ٹرے ایک طرف رکھ کر فرح سے پوچھا۔

”جی امی، دو دن پہلے ہی بات ہوئی ہے۔ آج کل وہ بہت مصروف ہے، ابھی تو ٹرانسفر ہوا ہے اس کے گھر والے بھی اسلام آباد شفٹ ہو گئے ہیں۔ اور

ہاں نرمل کی شادی ہونے والی ہے۔“ فرح نے سرد کی بہن کے متعلق بھی بتا دیا۔

”حیرت ہے، نرمل کی شادی ہونے والی ہے اور ہمیں علم ہی نہیں۔ ہماری ان سے رشتے داری بھی ہے اور تمہاری رخصتی بھی تو تمہاری نند کے ساتھ ہی ہوئی تھی۔ ان لوگوں نے ہمیں آگاہ ہی نہیں کیا۔“ رابعہ بیگم نے حیرت اور افسوس کا اظہار کیا۔

”امی میری سرد سے اس بارے میں بات ہوئی تھی۔ اس نے کہا کہ میں مکمل صحت یاب ہو جاؤں تو پھر

شادی کی بات کریں گے وہ لوگ، آپ پریشان نہ ہوں۔“ جلد ہی کراچی آنے والا ہے۔“ فرح نے ماں کو تسلی دی۔

☆☆☆

اسلام آباد..... ایک ہفتے میں چلے گئے کہہ رہے تھے فون کریں گے۔ ویسے انہوں نے مجھ سے تمہاری خیریت پوچھی تھی۔“

”سرد نے اپنا ٹرانسفر کیوں کرایا؟ ہم نے تو طے کیا تھا کہ کراچی میں ہی رہیں گے۔ میری جاب بھی یہیں ہے۔“

”ہو سکتا ہے وہ خود نہ چاہتے ہوں اور ٹرانسفر ہو گیا ہو اب تمہیں فون کریں گے تو پوچھ لیتا۔“ ثناء نے اسے تسلی دی۔ جب سرد کا فون آیا تو فرح کو ہوش ہی کہاں تھا کچھ پوچھنے کا، وہ صرف روتی رہی اور سرد جلدی آنے کی تسلیاں دیتا رہا۔

☆☆☆

روز و شب ایسے ہی گزرتے رہے موسم گرما رخصت ہوا اور سردیاں شروع ہو گئیں اب فرح کی کافی طبیعت بہتر ہو چلی تھی۔ ڈاکٹر نے اطمینان کا اظہار کیا تھا اب اس نے آفس جانا شروع کر دیا تھا۔

”ثناء بیگم میرے بال کتنے گھٹے اور لمبے تھے اب سارے جھڑ گئے ہیں، میں تو بالکل جیسے جی سی ہو گئی ہوں۔ میری بھویں بھی جھڑ گئی ہیں۔ جلد کی رنگت بھی کتنی سیاہ پڑی ہے اور میرے ناخن تو بالکل بدرنگ ہو چکے ہیں آخر اللہ نے مجھے کس بات کی سزا دی ہے۔“

فرح رو باکی ہو گئی۔

”بھئی اس بیماری میں علاج کے دوران ایسا ہی ہوتا ہے میری خالہ جان کو بھی بریسٹ کینسر ہو گیا تھا اس لیے مجھے ان تمام باتوں کا علم ہے۔ سب آہستہ، آہستہ نازل ہو جائے گا۔ شکر کرو میڈیکل سائنس نے اتنی ترقی کر لی ہے کہ اب اس مرض کے علاج میں آسانیاں پیدا ہو گئی ہیں۔“ ثناء نے تسلی دی۔

”ثناء رو کوئی مجھ سے اظہار افسوس کرتا ہے اور طرح، طرح کے سوالات پوچھتا ہے۔ سب عجیب لگا ہوں ہے دیکھتے ہیں۔ میں کیا کروں۔“

”دیکھو غلط نہ سمجھو فرخ، سب تمہاری پروا کرتے ہیں، اس لیے افسوس کا اظہار کرتے ہیں ورنہ کوئی غمروں سے تو خیریت نہیں پوچھتا نا..... سب انہوں

## غزل

میری آرزو مری زندگی ترا حسن ہے ترا نام ہے  
تری خیر ہو مرے ہمو ترا حرف میرا کلام ہے  
ہے تیری طلب مری زندگی، تری جتو مری بندگی  
ہے شراب دید کی آرزو تری دید ہی مرا جام ہے  
ترا حرف، حرف ہے معتبر ترا رمز، رمز ہے باہر  
سبھی حکمتیں سبھی دہشتیں سبھی مہر تیرا پیام ہے  
پے درد عشق فرداں تری یاد سایہ گلن رہے  
تری قریب مری مج کو، تری دوریاں میری شام ہے  
پڑ جائے دل پہ یوں رقم پہ ورق، ورق تری یاد کے  
تو کہیں ہو مجھے یہیں کہیں نہیں دور تیرا مقام ہے  
درد دل پہ اے میرے ہم نشین میں بتاؤں کیا تجھے غمی حزن  
کبھی رزم ہے کبھی بزم ہے کبھی صبح ہے کبھی شام ہے  
شاعرہ - فریدہ ہاشمی بخٹی، کراچی

جو شخص نہیں ہوتے ان کی اصلیت اس وقت ظاہر ہو جاتی  
ہے اور یوں وہ خود بخود ہی آپ کی زندگی سے نکل جاتے  
ہیں۔“ رابعہ بیگم نے فرح کو بہت اچھی طرح سمجھایا۔  
”امی آپ سچ کہتی ہیں، مسائل اور پریشانیوں  
آپ کو بہت کچھ سکھاتے ہیں اور لوگوں کے اصلی  
چہرے بھی سامنے آ جاتے ہیں اس نے دکھ سے سرمہ  
کے بارے میں سوچا۔

”بنا مشکل میں ساتھ چھوڑنے والے اپنے نہیں  
ہوتے، اگرچہ مختصر وقت کے لیے ہماری زندگی  
میں آتے ہیں مگر گہرا گھاؤ دے جاتے ہیں مگر ایسے  
لوگوں کا نام کیوں کیا جائے جو آپ سے مخلص ہی  
نہیں۔ یاد تو ہمیشہ اچھے اور دل سے قریب لوگوں کو کرنا  
چاہیے ناں..... بیٹا!“ امی نے ہمیشہ کی طرح اس کا  
حوصلہ باندھا۔

”امی، چلیں آپ جیسا چاہتی ہیں وہاں ہی کیجیے  
مجھے کوئی اعتراض نہیں ہے۔“ فرح نے بات ختم کی۔

ایک سائیں رہتا، آگے بڑھتا جاتا ہے جہاں خوشی  
ارنگ وقت کے ساتھ، ساتھ پھیکا پڑتا جاتا ہے  
انہی کی شدت بھی مدہم ہوتی جاتی ہے۔  
”کیا میں سرمہ کو بھول چکی ہوں۔ اس روز خزاں  
کے اداس موسم میں وہ باہر ٹیرس پر کرسی ڈالے اپنی  
چونچ میں گم تھی۔

”نہیں بلکہ سرمہ سے جدائی کو میں نے اپنے اندر  
بھالایا۔ یہ سچ ہے کہ میں سرمہ کو ابھی تک بھلا نہیں پائی،  
اس نے مجھے ایسے وقت چھوڑا جب مجھے اس کی سب  
سے زیادہ ضرورت تھی۔ جب اسے میری زندگی میں  
رہائی نہیں تھا تو وہ مجھے ملای کیوں تھا۔ کیا صرف مجھے  
دکھ دینے کے لیے۔“ یہ وہ سوال تھا جس کا جواب فرح  
کے لیے ابھی تک حل طلب تھا۔

”بیٹا تمہاری خالہ جان نے ایک رشتہ بتایا ہے  
مکلی بیوی کا انتقال ہو چکا ہے۔ بچے جوان اور شادی  
لگے ہیں۔ انہیں اولاد نہیں چاہیے۔ تم کہو تو میں بات  
کروں۔“ رابعہ بیگم نے اس سے پوچھا۔  
”امی، میں اور آپ بہت پر سکون زندگی  
گزار رہے ہیں اور اب میں نے شادی کا خیال دل  
سے نکال دیا ہے۔ میں اکیلے ہی بہت خوش اور مطمئن  
ہوں۔“ فرح نے جواب دیا۔

”بیٹا میں ماں ہوں اور چاہتی ہوں تم بھی گھر  
بہالو۔ بھائی تمہارے ملک سے باہر رہتے ہیں۔ تمہاری  
مرہمی بڑھتی جا رہی ہے، میں جانے کب اس دنیا سے  
ہل جاؤں..... کیا تم ساری زندگی تنہا ہو گئی؟“ رابعہ بیگم  
اس کے پاس بیٹھ کر بہت فکر مندی سے کہہ رہی تھیں۔

”جی امی..... میں اکیلے رہ لوں گی ایک نامکمل  
لڑا اور عورت کو اکیلے ہی رہنا چاہیے۔“ فرح نے  
اس سے جواب دیا۔

”بیٹا ایسا نہیں کہتے۔ بیماری اور حادثات زندگی  
کے ساتھ، ساتھ جلتے ہیں۔ یہ انسان کو نامکمل یا ادھورا  
لگ کر دیتے بلکہ زندگی کا سامنا کرنا سکھاتے ہیں اور  
مضبوط بناتے ہیں۔ ان مسائل و حادثات میں جو رشتے  
آپ سے مخلص ہوتے ہیں وہ آپ کا ساتھ دیتے ہیں اور

زیادہ دکھ کا باعث ہوتی ہے مگر اس دکھ، درد میں  
فرح کے گھر والے اس کے ساتھ تھے۔

”چلو اب زندگی اکیلے ہی گزارنی ہے۔ بالکل  
عورت کو بھلا کر قبول کرتا ہے۔ مجھے اب اکیلے  
سلیقہ آچکا ہے اور میں اکیلے کہاں ہوں، میرے  
والے اور میری عزیز از جان دوست شاید میرے  
ہے۔ اس بیماری نے مجھے بہت مضبوط بنا دیا ہے اب  
اب میں ایک نئے عزم کے ساتھ زندگی گزاروں گی۔“  
”میڈم، آپ کو سرنے بلایا ہے۔“ چہرہ اسی کی  
آواز پر فرح اپنے خیالات سے چوٹی تھی۔  
”جی سر..... آپ نے مجھے بلایا؟“ فرح نے  
اپنے نئے پاس سلمان صاحب کے کمرے میں داخل  
کر کہا۔

”جی مس فرح، آپ کی فائل دیکھ رہا تھا آپ  
مہلک بیماری سے جنگ جیت کر آئی ہیں اور پھر اپنی  
ذمے داریاں دوبارہ سنبھال لیں۔ آپ کی ہمت  
میں بہت متاثر ہوا ہوں۔“ سر سلمان کے سامنے اس کی  
فائل میں موجود میڈیکل رپورٹ سامنے رکھی تھیں جس کی  
بنا پر اسے نوکری میں کچھ مراعات حاصل ہو گئی تھیں۔  
”سر اس میں میرا کوئی کمال نہیں، اللہ نے ہمارے  
دی اور گھر والوں نے ساتھ دیا اور آپ کے دفتر والوں  
نے بھی تو پھر ہی ممکن ہو سکا۔“ فرح نے جواب دیا۔

”میری امی اس بیماری کا شکار ہو کر پانچ سال  
پہلے ہی موت کی وادی میں چلی گئیں۔“ سلمان  
صاحب نے دکھ سے کہا۔  
”سر مجھے بہت افسوس ہوا۔“ فرح اور کیا کہہ سکتی  
تھی۔ کچھ دو چار رسمی باتیں کر کے وہ اپنی سیٹ پر واپس  
آ چکی تھی۔

☆☆☆

فرح نے کمرے کی کھڑکی کھولی تو دیکھا لالہ  
میں خزاں سے درخت کے سارے پتے جھڑ چکے ہیں یہ  
بہار کی آمد میں ابھی کافی وقت تھا۔ ٹاپ پھیلے مینے شام  
ہو کر باہر چلی گئی۔ فرح کے دونوں بھائی باہر ہی رہے  
تھے اب گھر میں صرف فرح اور رابعہ بیگم ہی تھے۔ وقت

ہے، تم کھل کر کہو کیا کہنا چاہتے ہو۔“ فرح جیسے کچھ بھی  
سننے کو تیار تھی۔

”فرح..... وہ دراصل..... میں تم سے شادی  
نہیں کر سکتا..... میرے گھر والے تمہاری بیماری کی وجہ  
سے اس رشتے کو ختم کرنا چاہتے ہیں اور انہوں نے  
میرے لیے..... وہ کچھ لمحے رکا۔“ انہوں نے میرے  
لیے ایک لڑکی پسند کر لی ہے..... اور تمہیں طلاق کے  
کاغذات جلد مل جائیں گے۔“ یہ کہہ کر سرمہ نے نظریں  
جھکا لیں۔

”اور تمہاری کیا مرضی ہے؟“ فرح نے بالکل  
سیدھے بیٹھے ہوئے گردن اٹھا کر مضبوط انداز میں اس  
سے سوال کیا تھا۔

”فرح..... وہ، میں تمہیں، تمہاری اس بیماری  
کے ساتھ قبول نہیں کر سکتا..... دراصل مجھے مکمل عورت  
چاہیے..... وہ.....“ سرمہ نے کچھ اور کہنا چاہا مگر فرح  
نے بات کاٹ دی تھی۔

”ٹھیک ہے سرمہ، تم اپنے فیصلے میں آزاد ہو۔  
اور الحمد للہ میں اپنی بیماری اور ادھورے پن کے ساتھ  
بہت مطمئن ہوں۔ اب تم جا سکتے ہو۔ آج مجھے سمجھ  
میں آیا کہ اللہ نے مجھے اتنی بڑی بیماری اس لیے دی تھی  
کہ تم جیسے شخص کی اصلیت سامنے آ جائے۔ اگر شادی  
کے بعد مجھے یہ بیماری ہو جاتی تو سرمہ تب تم مجھے چھوڑ  
دیتے۔“ وہ رو ہانسی ہوئی تھی اور سرمہ ایک لفظ بھی کہے  
بغیر وہاں سے چلا گیا تھا۔

”سرمہ کی محبت اتنی کمزور تھی کہ ایک بیماری نے  
اسے ختم کر دیا..... میرا اور اس کا ساتھ بس یہاں تک  
ہی تھا جو اب اچھا ہوا۔“ یہ سوچ کر فرح نے اپنی بیٹگی  
آنکھیں صاف کیں۔ سرمہ کے پول واپس چلے جانے  
سے امی بغیر کہے سننے ہی سب کچھ سمجھ گئی تھیں۔

☆☆☆

زندگی اپنی ڈگر پر چلنے لگی۔ فرح نے سرمہ سے  
جدائی کے مددے کو اپنے اندر چھپا لیا۔ رابعہ بیگم، بیٹی  
کی بیماری سے اتنا ناؤ حال نہیں ہوئی تھیں جتنا سرمہ کے  
فیصلے سے۔ رشتوں کی ٹوٹ پھوٹ کسی بھی پریشانی سے

## انتقام

اور اب پھر ایک اور رشتے کے لیے کہہ رہی ہوں بس مجھے اب سلمان پسند آیا ہے اور اس سے بڑھ کی اس کی باتیں..... اب تم اچھی طرح سوچ کر اپنا فیصلہ بتا دینا۔“

زندگی کے واقعات کسی کی دسترس میں نہیں ہوتے کچھ باتیں خود بخود ہوتی چلی جاتی ہیں۔ اچھا برا سب زندگی کا حصہ ہے۔ رات وہ دیر تک اسے کمرے میں بٹکتی رہی اور یہی سب کچھ سوچتی رہی۔ صبح اٹھی تو پھر سے یہی سوچ دماغ میں چکرانے لگی وہ کھڑکی کے ساتھ جا کھڑی ہوئی۔

”قدرت نے مجھے بیماری دے کر سرد کا اصل چہرہ دکھایا اور اب اس دکھ کو دور کرنے کے لیے سلمان کو بھیج دیا۔ کیا میں سرد کی یادوں کو بھلا پاؤں گی اور پھر سے کسی شخص خاص کے ساتھ محبت کرنے کے قابل ہوسکوں گی۔“ سرد کا خیال آتے ہی فرح کو دکھ نے گھیر لیا۔ ”مگر میں سرد کا غم تک مناؤں گی؟ وہ تو اپنی زندگی میں خوش ہوگا کبھی اس نے پلٹ کر مجھے پوچھا بھی نہیں؟“ انہی سوچوں میں منہمک اس کی نظر لان میں گئے درختوں پر مچی جہاں بہار نے سنے پتے اور پھول کھلا کر خزاں کو منادیا تھا۔ فرح نے اپنے سوال کا جواب پالیا تھا۔ اور پھر رابعہ بیگم کے آنگن میں خوشیوں نے پھر سے ڈیرا ڈال لیا تھا۔

شادی کی تمام تقریبات اتنی جلدی انجام پائیں کہ کچھ پتا ہی نہیں چلا۔ سب ایک خواب سا تھا۔ آج فرح، مہرسلماں بن کر سلمان کے ساتھ نئی مون کے لیے باہر جا رہی تھی۔ رابعہ بیگم بہت مسرور تھیں بہت عرصے بعد ان کی بیٹی کے چہرے پر اطمینان اور خوشی رقصاں تھیں۔ وہ ہر وقت خدا کا شکر ادا کرتیں کہ فرح کی خوشیاں قائم رہیں۔

سلمان کے سنک اس نے زندگی کے خوب صورت..... رنگوں اور خوشگوار لمحوں سے آگاہی حاصل کی تھی۔ وہ اپنے آپ کی شکر گزار تھی۔ اس نے سرد کی یادوں کو دل و دماغ سے کھرچ ڈالا تھا اور اب نہایت خلوص اور محبت سے سلمان کا ساتھ دینے کا عہد کیا تھا۔

”بیٹا کسی دیر..... آپ مجھے کچھ بتائیں تو سہی۔“ رابعہ بیگم نے سلمان کی گھبراہٹ سے محظوظ ہو کر کہا۔ ”میں فرح سے شادی کرنا چاہتا ہوں۔“ یہ کہہ کر سلمان نے سر جھکا لیا۔

”بیٹا کیا آپ جانتے ہیں کہ فرح کو بریسٹ کیفر ہو چکا ہے۔“ رابعہ بیگم نے بڑے دکھ سے کہا۔ ”آئی میں ہر بات جانتا ہوں۔ میری ایسی بیماری کا شکار ہو کر موت کے منہ میں چلی گئیں۔“

”پھر بھی تم فرح سے شادی کرنا چاہتے ہو۔ کیا تم یہ بھی جانتے ہو فرح کا نکاح بیماری سے پہلے ہو چکا تھا اور بیماری کے بعد سرد نے اسے ادھوری عورت کہہ کر چھوڑ دیا۔“ رابعہ بیگم کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

”آئی، میں اس بات پر یقین نہیں رکھتا کہ انسانی اعضا کی کمی سے انسان معذور یا ادھورا کہلائے۔ میں آپ کی بیٹی کو اس بیماری کے ساتھ قبول کرنا چاہتا ہوں کیونکہ میری والدہ نے یہ بیماری بھرتی ہے اور میں نے دیکھا کہ فرح نے بیماری کو شکست دے کر فرح اپنے نام کی ہے، مجھے اس کی ہمت اور بہادری نے متاثر کیا ہے۔“

رابعہ بیگم نے انہیں نظر بھر کر دیکھا اور سوچا ”شکل صورت میں سرد سے بھی اچھا ہے اور فرح کے جوڑ کا بھی ہے اور اس سے شادی کے لیے رضامند بھی ہے مگر اگر فرح سے پوچھنا بہت ضروری ہے۔“ اتنے میں اچالے آئی۔ چائے خاموشی سے پی گئی پھر رابعہ بیگم نے گلا کھٹکھا اچھے کچھ اہم کہنا چاہتی ہوں۔

”بیٹا، سلمان تم سے شادی کرنا چاہتے ہیں۔ میں انہوں نے بیٹی کو مخاطب کیا۔ فرح ہکا بکا رہ گئی تھی۔

”آئی آپ فرح کو کچھ وقت دیں فیصلہ کرنے کا۔ ان کا جو بھی جواب ہوگا مجھے قبول ہوگا۔“ یہ کہہ کر سلمان نے رخصت لی۔ رابعہ بیگم نے سر سلمان کے ہاتھ کی گئی گفتگو سے اسے آگاہ کیا۔

”بیٹا تم جو بھی فیصلہ کرو گی مجھے قبول ہوگا۔ یہ سوچنا کہ میں نے تمہاری شادی طے کر دی ہے۔“

”جی سر، یہ سب امی نے اچانک ہی طے کر دیا۔“ اس نے جواب دیا۔

”یعنی اس میں آپ کی مرضی شامل نہیں ہے؟“ سر نے پوچھا۔

”سرا ایک ادھوری اور نامکمل عورت کی کوئی مرضی نہیں ہوتی اور میں یہ شادی امی کی خوشی کے لیے کر رہی ہوں۔“ فرح نے جواب دیا اور جلدی سے ان کے آفس سے باہر نکل آئی۔

☆☆☆

شام کے سائے گہرے ہوتے جا رہے تھے۔ بہار کی آمد، آمد تھی درختوں پر سنے پتے آنا شروع ہو چکے تھے۔ فرح نے کمرے کی کھڑکی سے لان میں نگاہ دوڑائی۔

”میں نے سوچا تھا خود کو کبھی ادھورا تصور نہیں کروں گی مگر جانے کیوں سلمان صاحب کے سامنے اپنے اندر کے دکھ کا اظہار کر بیٹھی، مجھے ایسا نہیں کرنا چاہیے تھا۔“ فرح کو آج آفس میں سلمان صاحب کے ساتھ اپنی کئی گفتگو یاد آئی۔

”بیٹا تمہارے آفس کے کوئی سلمان صاحب آئے ہیں۔“ امی کی آواز نے فرح کے خیالات کے تسلسل کو توڑا وہ ہڑبڑا کر ڈرائنگ روم میں داخل ہوئی۔

”سر آپ یہاں، خیریت ہے؟“ اس نے حیرانی سے انہیں دیکھتے ہوئے کہا۔

”بہت مشکل سے آپ کے گھر کا پتا ملا۔ خیریت ہے، مجھے آپ کی امی سے کچھ بات کرنی ہے۔“ انہوں نے جواب دیا۔

فرح امی کو بلا لائی جو اسے بٹھا کر چائے بنانے لگا مٹی تھیں۔ اور خود اب کچن میں جا کر چائے بنانے لگی۔

”آئی مجھے آج فرح نے اپنی شادی کے بارے میں بتایا۔ میں آپ کے پاس پہلے ہی آئے اور

تھا۔ میری بڑی بہن جولا ہور میں رہتی ہیں ان کا اظہار تھا کہ کسی بڑے کو ساتھ لے کر آؤں مگر آج لگا بہت ہو گئی ہے۔“ سلمان نے رابعہ بیگم کو ایک سانس میں ساری بات بتا دی۔

فرح کو سرد اکثر یاد آتا تھا۔ اس کے ساتھ گزرے تمام لمحات ایک، ایک کر کے نظروں کے سامنے سے گزرتے تھے اور پھر آخری لمحہ ٹھہر جاتا تھا۔ جب وہ رشتہ توڑ کر گیا تھا۔ ”مجھے مکمل عورت چاہیے ادھوری نہیں۔“ اس جملے کی بازگشت فرح کو نہیں بھولی تھی۔ اس نے بھی سوچا بھی نہیں تھا کہ سرد اس کی زندگی میں نہیں ہوگا۔ سوچا تو اس نے اس بیماری کے بارے میں بھی نہیں تھا اگر کچھ چیزوں کے بارے میں وہم و گمان بھی نہیں ہوتا اور وہ اچانک زندگی کا حصہ بن جاتی ہیں اور پھر اچانک زندگی سے نکل بھی جاتی ہیں جیسے یہ بیماری اس کی زندگی میں داخل ہوئی اور اس کے نتیجے میں سرد اس کی زندگی سے نکل گیا۔ یہ سوچ کر فرح کی پلکیں جھپک جاتی تھیں۔

☆☆☆

”بیٹا شادی کی تیاریاں تو مکمل ہو چکی ہیں۔ اب تمہارے بھائی اپنے آنے کا بتائیں تو میں شادی کی تاریخ طے کروں، بیٹا تم نے شاکو شادی کی اطلاع دی؟“ رابعہ بیگم نے اس سے پوچھا۔

”جی امی، میں نے شاکو کو بتا دیا تھا وہ اگلے مہینے آرہی ہے۔“

”ٹھیک ہے تم بھی اپنی تیاریاں فائنل کر لو اور ابھی سے آفس میں چھٹی کی بھی بات کر لو۔“ رابعہ بیگم نے اسے مشورہ دیا۔

فرح نے اپنے ہونے والے شوہر کو دیکھا ہی نہیں تھا۔ ویسے بھی سرد کے بعد اسے کسی میں بھی دلچسپی نہیں محسوس ہوتی تھی، اس نے سب کچھ امی پر چھوڑ دیا تھا۔

یقیناً وہ جو کرتیں اس کے لیے بہترین کرتیں۔

”سر مجھے ایک مہینے کی چھٹی چاہیے۔“ فرح نے سلمان صاحب کو مخاطب کیا۔

”کیوں خیریت ہے؟“ انہوں نے حیرانی سے پوچھا۔

”جی سر، وہ دراصل میری شادی ہونے والی ہے۔“ فرح سنجیدگی سے جواب دیا۔

”آپ نے بتایا ہی نہیں اتنی اچانک۔“ سلمان صاحب نے پھر حیرت کا اظہار کیا۔

محبت، نفس کی تقسیم  
دُرِ صدِ ایمان

A black and white illustration. In the foreground, a woman with dark, wavy hair and large eyes looks directly at the viewer. She is wearing a light-colored dress with a dark, intricate floral pattern. In the background, to the left, a man with short hair and a woman with dark hair are looking towards the right. The man is wearing a light-colored shirt, and the woman is wearing a dark, textured top. The background also shows a doorway and some architectural details. The overall style is that of a classic comic book illustration.

دَرِ صَدَفِ اِيْمَانِ

ماہنامہ پاکیزہ 214 دسمبر 2017ء

بار، بار بار بی بی کا منٹس پر چلی جاتی ہیں وہ دل کی خواہش نظر انداز کر کے شاپنگ میں اور پری دھنسی غاہر کرتی رہی..... شاید آج کے دن سے لیہیا کی زندگی کا امتحان شروع ہو گیا پھر شاید کامران کی آزمائش.....

مال سے باہر نکل کر کامران گاڑی ریورس کر کے لیہیا کی طرف لا رہا تھا کہ ایک گاڑی آئی اور لیہیا کو نکر ماری چلی گئی۔

”لیہیا.....“ کامران کا ذہن ماؤف ہو گیا ہے۔ ہوش و حواس سے بیگانہ وہ سڑک پر بڑی تھی، ارد گرد لوگ جمع تھے..... لیکن کامران کو لگا کچھ نہیں باقی رہا زندگی میں.....

آئی بی یو کے باہر ادھر سے ادھر چکر لگاتے ہوئے بس ایک دھنسی۔

”یا اللہ میری لیہیا کو زندگی دے دے..... میری لیہیا کو زندگی عطا فرما دے.....“ جو مانگا ملا تھا..... زندگی مانگی تھی اور رب نے زندگی دے دی..... یہ صحت و زندگی مانگتا تو شاید یہ سننے کو نہ ملتا کہ جان بچ گئی..... لیکن وہ اب خود سے اپنا کوئی کام نہیں کر سکتی، انٹرنل انجری کے ساتھ، ساتھ ریزہ کی ہڈی کو شہید نقصان پہنچا تھا۔

کوئی پندرہ دن بعد اسے اسپتال سے گھر شفٹ کر دیا گیا تھا۔ وہ شدید چڑچڑی ہوئی تھی، کامران نے اس کے آرام و خیال میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھی تھی۔ دو، دو تریس رکھ لی تھی جو اس کا ہر طرح سے خیال رکھتی تھیں۔ کامران کی زندگی اور مصروف ہوئی پہلے صرف آفس کا کام ہوتا تھا اب لیہیا کی ذمہ داری بھی تھی..... اس کے علاوہ ذہنی اذیت الگ، ماں بہنوں کا ایک ہی مشورہ تھا شادی کرلو..... اور کامران کا وہی ایک جواب..... ”نہیں.....“

لیکن یہاں لیہیا نے بھی خود غرضی کی انتہا کر دی تھی..... وہ کامران کی دوسری شادی پر نہ راضی تھی اور نہ ہی ایسا چاہتی تھی بلکہ پہلے جو وعدہ وہ مہینوں میں لیتی تھی اب دن میں کئی بار یقین دہانی لیتی کہ کامران دوسری شادی نہیں کرے گا..... اور کامران کا نہیں جواب یہ کہ

”آپ وعدہ کریں بس.....“  
”اچھا ٹھیک ہے وعدہ..... اب تو چپ ہو جاؤ یا وعدہ مانے کا ارادہ ہے.....“  
”ٹھیک ہے..... پھر آئندہ ایسا مذاق نہیں کرنا میری بالکل مٹی تھی.....“

”ہاں بابا، نہیں کرتا ڈراہی دیا تھا تم نے مجھے.....“  
”ہل چائے پلاؤ گی یا نہیں؟“  
”جی میں چائے لاتی ہوں.....“  
”اُف یہ بیہوشی نہ پاگل ہے بالکل.....“  
☆☆☆

دن میں سال گزرتے گئے۔ یوں ان کی شادی کو ایک سال ہو گئے..... آنگن میں اب تک کوئی بھول نہیں لگا..... پہلے سوال دے، دے دے تھے..... اب کھلے الفاظ کے ساتھ پوچھا جاتا، مشورے دیے جاتے لیکن سب لہجہ کے بعد ڈاکٹر ز نے یہی کہا۔ ”رب کی رضا میں رہیں وہ جب چاہے نواز دے گا.....“ لیہیا کی اہاں میں شدت و گریہ زاری میں اضافہ ہو گیا، دوسری طرف کامران تھا جو اسے سمجھاتا کہ اللہ کی رضا میں راضی ہو کیوں اتنا پریشان ہوتی ہو..... اور وہ گھبراہٹ سی طراوت کے ساتھ مسکرا دیتی کیا بتاتی کہ اس کی ساس، اس سے یہ کہنے لگی ہیں کہ اپنی محبت تقسیم کر دے، کامران کو دوسری شادی کے لیے تیار کرے..... لیکن کامران سے جب انہوں نے یہ بات کی تو اس نے.....

”اگ الفاظ میں منہ نہ خراش کر دیا تو اس لیے وہ اب لیہیا پر زور دے رہی تھیں کہ وہ اسے تیار کرے۔“  
لیہیا کی زندگی میں جتنا سکون تھا۔ وہ ماں نہ بننے کے جرم میں جاہ و کسم پٹا کا کامران اس کے ساتھ خوش تھا اسے بھی خوش رہنے کی کوشش بھی کرتی۔

”بیہ آج تیار رہنا شاپنگ پر جائیں گے.....“  
امران آفس جاتے ہوئے کہہ کر گیا تھا۔ اس کا دل تو لہلہ چاہ رہا تھا پھر بھی تیار ہو گئی..... کامران نے اہرول شاپنگ کی اس کے لیے..... لیکن اس کی نگاہیں

لیہیا اگرچہ کچھ جذباتی تھی لیکن کامران کو اس پر کبھی کوئی اعتراض نہیں ہوا..... وہ اس کی شدت سے بھی واقف تھا..... اور اس بات پر وہ بہت خوش تھا کرتا تھا۔ وہ گیٹ سے ہی آوازیں لگاتا اندر آیا تھا۔  
”لیہیا، لیہیا کہاں ہو؟“

”آپ آج آگئے جلدی خیریت ہے؟“  
”ہاں خیریت ہے بس آج صبح آفس چلے ہوئے ایک لڑکی لگتی تھی..... بہت پرکشش تھی تہہ ہار جتنی خوب صورت تو نہیں پر کچھ تو کشش تھی اس میں.....“ وہ اسے پھیر رہا تھا۔

”کون تھی..... پہلے تھی بارلی آپ سے، کس جگہ ملی اور ایسا کیا تھا جواب تک یاد ہے.....“ لیہیا کے لیے میں شدید غصہ، تجسس، جھنجھلاہٹ اور شک تھا۔

”بس یار کیا بتاؤں لگتا ہے مجھے اس سے محبت ہو گئی ہے۔ اب کہاں ڈھونڈوں اسے۔“ کامران نے آنکھیں بند کیں اور صوفے کی پشت سے ٹیک لگائی..... جب کبھی آواز نہیں آئی تو آنکھیں کھول کر دیکھا۔

”لیہیا کیا ہوا.....“ سن بیٹھی لیہیا کے چہرے ا رنگ اس قدر پیل پڑ گیا تھا کہ وہ گھبرا گیا۔  
”ارے میں صرف مذاق کر رہا تھا.....“ جھلکا سے پانی کی بوتل لینے گیا واپس آیا تو چہرے ہاتھوں ہاتھ چھپائے وہ زور، زور سے روئی ملی۔

”میں سچ کہہ رہا ہوں صرف مذاق تھا، تم خود بتاؤ.....“  
میری زندگی میں تمہارے علاوہ کوئی آسکتا ہے.....“  
کے رونے میں کوئی کمی نہیں آئی تو اس نے ہاتھ جوڑ دیے۔ ”اچھا معاف کر دو پر اس آئندہ ایسا کچھ نہ کہوں گا.....“ یہ میری جان میری زندگی..... اسے اپنے لگاتے ہوئے تسلی دی..... ”بس چپ ہو جاؤ اب.....“

”آپ وعدہ کریں کوئی لڑکی آپ کی زندگی میں نہیں آئے گی، میرے جیسے جی آپ بھی شادی کر لیں گے دوسری.....“  
”تم پاگل ہو گئی ہو، ایک چھوٹے سے مذاق کو سیریس لے لیا.....“

”ارے یہ میری زندگی تم ہو..... اور اپنی زندگی کو بھی کوئی کیا الگ کر سکتا ہے اور ہاں میری محبت پر، میری زندگی پر صرف تمہارا حق ہے صرف تمہارا۔“ لیہیا کے چہرے پر سکون چھینے لگا۔  
”تھنکس آپ بہت اچھے ہیں۔“ احساسِ ممنونیت سے اس نے کہا۔

”اچھا کتنا اچھا ہوں؟ اتنا کہ مجھ سے ابھی طلاق کا کہا گیا؟“  
لیہیا نے چونک کر اس کے چہرے کی طرف دیکھا..... اتنی سنجیدگی وہ گھبرا گئی۔

”نہیں وہ تو..... وہ تو بس میں..... میں تیار ہی تھی کہ میں آپ سے کتنی محبت کرتی ہوں۔“  
”اچھا تو بتاؤ ناں کتنی؟“ کامران نے شوخ لہجے میں پوچھا۔

”اچھا تو مجھے بے وقوف بنا رہے تھے آپ۔“ لیہیا نے منہ بسور کے کہا۔

”ہے ہوئے کیا بنا نا..... میری جان.....“ لیہیا نے مزید منہ بسور لیا کامران کا تہقہہ کرے میں گونجا تھا۔  
لیہیا اور کامران دونوں کزنز تھے، بچپن میں ساتھ کھیلا کرتے تھے بڑے ہونے پر پسندیدگی ہوئی..... جو بعد میں محبت بن گئی، گھر والوں کو..... کوئی اعتراض نہیں تھا لیہیا بھی پڑھی لکھی خوب صورت لڑکی تھی، اسی طرح کامران بھی تعلیم یافتہ ہونے کے ساتھ اپنا کاروبار کرتا تھا..... لہذا جب گھر کے بڑوں کے سامنے بات آئی تو سب ہی خوشی، خوشی انہیں رشتہ ازدواج میں باندھنے کو تیار ہو گئے۔ دونوں نکاح جیسے خوب صورت رشتے میں بندھ کر اپنے آپ کو خوش نصیب ترین سمجھنے لگے..... اور یہ کچھ ایسا غلط بھی نہیں تھا..... دونوں ایک دوسرے کو سمجھتے تھے، عاداتوں سے پسندنا پسند سے واقف تھے، ان دونوں کے درمیان وہ سب کچھ تھا جو کسی بھی رشتے کو مضبوط بنانے کے لیے موجود ہونا چاہیے۔ دونوں نہ صرف ایک دوسرے سے محبت کرتے تھے بلکہ ایک دوسرے کی خواہش و جذبات کا احترام بھی کرتے تھے۔

چرسکون کر دیتا.....

☆☆☆

دن گزرتے رہے..... کامران کو بشری تقاضے ستانے لگے۔ وہ توبہ کرتا، نمازوں میں دعا مانگتا، روزے رکھتا..... لیہیا کی محبت لاکھ اس کے دل میں تھی لیکن وہ بھی جوان مرد تھا کیا کرتا.....

دو سال اور گزر گئے لیہیا جیل چیمبر کی عادی ہو گئی..... اور کامران کی طرف سے مطمئن بھی۔

کامران اب جب، جب رہنے لگا تھا..... ”سر وہ سیم کی بیٹی تھی آج میں لگی“ بظاہر تو اس نے عام سے لہجے میں کہا تھا مگر اس کا سراپا کامران کی۔ نکاہوں میں کھب گیا۔ اس نے سر جھکا کر لالچول پڑھی اور محض اتنا ہی کہا۔

”ہاں کل آجائیں گی۔“ اور وہاں سے اٹھ گیا۔

دن پردن گزر رہے تھے۔ نرس کا انداز بے باکانہ ہوتا جا رہا تھا..... پھر اس کا صل یہ نکالا کہ اسے فارغ کر کے دوسری نرس رکھ لی، اب کی بار بڑی عمر کی خاتون کو رکھا تو وہ مطمئن ہو گیا۔

آفس گیا تو معلوم ہوا کہ جس سیٹ کے لیے فی میل کی ضرورت تھی وہاں ایک ضرورت مند آگئی ہے..... چند ہی دنوں میں اپنے کام سے اس نے ثابت کر دیا کہ وہ اپنے کام سے مخلص ہے..... کامران سے اس کا زیادہ واسطہ نہیں پڑتا تھا..... ایک دن آفس وین خراب تھی..... کامران، سمیرا کی بہت عزت کرتا تھا کیونکہ آفس میں ریویشن اچھی تھی، محنتی تھی، شوہر نے طلاق دے دی تھی اس لیے ہمدردی بھی تھی..... جب باہر نکلا تو وہ بھی شاید بس کے انتظار میں تھی..... نہ جانے کیا سوچ کر اس نے لفٹ دے دی..... سمیرا نے بھی جھجکتے ہوئے قبول کر لی..... ایک بار اتفاق ہوا..... پھر بار، بار ہونے لگا..... ایسے ہی جب ایک اور دن ڈراپ کیا تو سمیرا نے بہت لگاؤ سے کہا۔

”سر چائے پی کر چلے جائیے گا.....“ اس نے اس انداز سے کہا کہ کامران چاہتے ہوئے بھی انکار نہیں کر سکا۔

ڈرائنگ روم میں بٹھا کر وہ اندر چلی گئی جب کہ دیر بعد آئی تو وہ جو آفس میں اسکا رُف لپیٹے ہوئے تھی اس وقت بہت ایزی انداز میں دوپٹا ایک طرف ڈالے ہوئے تھی..... کامران کو عجیب سا احساس ہوا..... اسی احساس کو زائل کرنے کے لیے اس نے پوچھا۔

”اور کون، کون ہوتا ہے تمہارے گھر میں؟“

”میری والدہ رہتی ہیں ساتھ..... آج وہ خالہ کے گھر گئی ہوئی ہیں رات تک آجائیں گی..... میں آپ کے لیے چائے لاتی ہوں.....“

کچھ ہی دیر میں سمیرا چائے لے آئی تھی اور پیالی دے دیتے وقت ایسے انداز میں جھکی کہ کامران کو سمجھنے میں دم نہیں لگی کہ وہ کس چیز کی دعوت دے رہی ہے؟ کشش جوان لڑکی اور تین سال سے نفس پر قابو.....

اس کے پسینے چھوٹنے لگے..... یہ مشکل اس نے چائے ختم کی..... سمیرا کی طرف دیکھا تو وہ عجیب انداز میں مسکرا رہی تھی جیسے اس کی حالت سے حظ اٹھا رہی ہو۔

کامران سب کچھ سمجھ گیا تھا..... اس وقت وہ بڑی آزمائش کا شکار تھا۔ ایک طرف نفسانی خواہش دوسری طرف ایہیہا سے محبت، وفاداری اعتبار اور پھر رب کی نافرمانی۔

نفس و تقویٰ کی جنگ جاری تھی..... شدہ جنگ..... دلائل، تاویلات..... لیکن شاید نفس جیت جاتا آخر کامران ایک انسان ہی تو تھا..... خطا کا پتلا.....

شیطان کو تالیاں بجانے کا موقع مل جاتا۔

کیا لیہیا کی خود غرض محبت نے کامران کو گناہ کی راہ دے کر جہنم کا راستہ دکھا دیا تھا.....؟ وہ سخت کش مکش کا شکار تھا۔ اگلے ہی لمحے وہ سر جھٹک کر سمیرا کے گھر سے تیزی سے نکل چکا تھا۔

ایک وفا شعار بیوی کے لیے وہ اپنا نفس کیسے ہار دیتا کیا اگر یہ سب اس کے اپنے ساتھ ہوتا تو لیہیا بھی یہی کرتی؟ بس اسی سوچ نے شیطان کی راہیں مسدود کر دی تھیں۔

## عروسی جوڑا

طیب عنصر محل



”مجھے نہیں کرنی عدن سے شادی آپ صاف“

صاف کہہ دیں ان لوگوں کو۔“ حور اعین نے غصے سے تپے ہوئے لہجے میں اسے کہا۔

”اللہ کا خوف کرو لڑکی۔ یہ کوئی وقت ہے شادی“

اسے انکار کا؟ اب جبکہ شادی میں محض پندرہ دن باقی ہیں تو ہم تمہاری اس غلطی سے بچنے کے لیے اپنی ناک کٹوائیں؟“

ای نے صدمے سے چور لہجے میں اسے ڈانٹا۔

”بس مجھے نہیں پتا، اگر آپ لوگوں نے میری بات

نہیں مانی تو میں کچھ بھی کر سکتی ہوں۔“ اس نے روتے ہوئے دھمکی بھی دے ڈالی۔

”حورالعین ہوش کرو۔ یہ تم کیسے باتیں کر رہی ہو؟ ہم نے کسی قسم کی کی نہیں کی۔ لڑکا بھی تمہارا دیکھا بھالا ہے بلکہ تمہارے ایما پر ہی ہم نے رشتے کے لیے ہاں بھری تھی اور پھر کی کیا ہے؟ پڑھا لکھا ہے، خاندان سے ہے، میری سگی خالہ زاد کا بیٹا ہے۔ اور تمہیں پسند بھی کرتا ہے برسرِ روزگار ہے اور کتنی مختصر فیملی ہے عدنان اور علیہ دو بہن بھائی ہی تو ہیں۔“ سلمیٰ بیگم نے اسے سمجھانے میں سارے مثبت پہلو گنوا دیے۔

”ہاں میں مانتی ہوں یہ سب ہے اور میں ہر چیز سے مطمئن بھی ہوں لیکن آپ کو پتا ہے ناں شادی زندگی میں ایک بار ہی ہوتی ہے اور میں چاہتی ہوں میری شادی صدیوں یاد رکھی جائے۔ کم از کم میرا عروسی جوڑا میری پسند سے ہو اور وہ بھی دولہا والوں کی طرف سے ہو۔ شادی اور ویسے کا جوڑا اتنا خوب صورت ہو، اتنا اٹو لکھا اور بہترین کہ پہلے ایسا کسی نے نہیں پہنا ہو۔ بس اتنی سی تو خواہش ہے میری۔“ حورالعین اب باقاعدہ روئے لگی تھی۔

سلمیٰ بیگم کا دل کچھلا لیکن وہ کیا کرتیں حورالعین کی ہر خواہش وہ شروع سے پوری کرتی آ رہی تھیں وہ اپنے والدین کی اکلونی اولاد تھی۔ متوسط طبقے سے تعلق رکھنے کے باوجود والدین نے ہمیشہ اس کے منہ سے نکلی ہر خواہش کو پورا کیا تھا اور کبھی، کبھی تو ایسا بھی ہوا تھا کہ حورالعین کی خواہش کو پورا کرنے کے چکر میں سلمیٰ بیگم اور رؤف احمد کو گھر کے اخراجات میں کمی پیش کرنی پڑی تھی۔

حورالعین نے جوانی کی دہلیز پر قدم رکھا ہی تھا کہ اس کے لیے متواتر رشتے آنے شروع ہو گئے تھے۔ خاندان اور خاندان سے باہر سے بھی لیکن سب رشتے ان کی طرح متوسط طبقے ہی سے آتے رہے تھے۔ عدنان کا رشتہ لے کر جب سلمیٰ بیگم کی خالہ زاد اعلیٰ خاتون آئیں تو سلمیٰ بیگم کو حورالعین کے چہرے سے کھلتی خوشی کی دھنک نے سمجھا دیا کہ انہیں عطیہ کو ہاں کرنے میں تامل سے کام نہیں لینا چاہیے۔ اور یوں دو سال پہلے عدنان اور حورالعین

کی منگنی کی رسم خوب دھوم دھام سے انجام پائی تھی۔ تب سے دونوں گھرانے شادی کی تیاریوں میں لگے تھے۔ اب جبکہ حورالعین گرجویشن کر چکی تھی تو دونوں گھرانوں کی باہمی رضامندی سے شادی کی تاریخ رکھ دی گئی تھی۔

سب کچھ بہت خوب صورت طریقے سے ہو رہا تھا۔ کزن ہونے کے ناتے عدنان کے دل میں حورالعین بہت پہلے سے براجمان تھی جبکہ منگنی کے بعد حورالعین کے دل میں بھی عدنان کے لیے جو ہلکی پھلکی پسندیدگی تھی وہ محبت میں ڈھل چکی تھی۔ منگنی کے بعد بھی دونوں کا ایک دوسرے کے گھر میں آنا جانا تھا اور اسی وجہ سے آمناسا منا ہونا بھی فطری امر تھا۔ کبھی، کبھی عدنان، حورالعین کو فون بھی کر لیا کرتا تھا لیکن دونوں کی اچھی تربیت نے ان کو کبھی اخلاقی دائرے سے باہر نہیں جانے دیا تھا۔ عدنان تو مرد ہونے کی وجہ سے کبھی کوئی ذہنی بات کہہ بھی دیا کرتا تھا لیکن حورالعین فطرتاً ایک باحیا لڑکی تھی۔

شاید یہ شادی بغیر کسی رکاوٹ کے بہت اہتمام سے تکمیل تک پہنچ جاتی اگرچہ حورالعین کی شادی کی تاریخ جو دو ماہ پہلے طے پائی تھی کہ بعد حورالعین کی فریڈ منجیا جمال کی شادی نہ ہوتی یا اگر ہوتی تھی تو حورالعین اس میں شامل نہ ہوتی۔ لیکن ہوتی کو تو ہو کر رہنا تھا سو ہو گیا۔

منجیا جو خود بھی ایک متوسط گھرانے سے تعلق رکھتی تھی، اس کا اور حورالعین کا دوستی کا رشتہ بہت گہرا تھا۔ اس لیے وہ منجیا کی شادی کے تمام فنکشنز میں بڑے اہتمام سے شریک ہوئی تھی۔ منجیا جو تین بہنوں میں دوسرے نمبر پر تھی اس کی شادی اپنے خاندان سے باہر طے پائی تھی اور حورالعین جو اب تک خاندان اور خاندان سے باہر اپنے جیسے لوگوں کی مختلف شادیاں ایشیڈ کر چکی تھی وہ سب کی سب شادیاں اسے ایک جیسی لگی تھیں۔ نزدیکی گراؤنڈ میں ٹینٹ لگا کر یا کسی ٹارنل سے شادی ہال میں بگھٹائی جانے والی شادیاں۔ لیکن منجیا کی شادی نے تو اس کے ذہن کے پردے پر ایسی چھاپ چھوڑی کہ اب تو وہ

دنگوں کی ایسی برسات چاہتی تھی جو منجیا کی شادی کے رنگوں کو بھی ماند کر دیتے۔

”حورالعین میرا تم سے وعدہ ہے کہ ایک بار شادی ہونے دو، میں تمہارا ہر ارمان پورا کروں گا لیکن اس وقت تم ضد چھوڑ دو۔ تم جانتی تو ہو تم متوسط طبقے کے لوگ اپنی گزر بسر کیسے کرتے ہیں۔ تم جانتی تو ہو کہ تیس ہزار، چالیس ہزار بھی کوئی معمولی رقم نہیں ہوتی اور تمہارا ویسے اور شادی کا جوڑا ملا جلا کے تقریباً ساٹھ ہسٹر ہزار لگے ہیں حالانکہ میں تو اتنے اسراف کے حق میں بھی نہیں تھا۔“ عدنان نے فون پر حورالعین کو سمجھانے کی اپنی سی کوشش کی۔

”عدنان شادی کے بعد مجھے کیا کرنا ہے اور تم کیا کرو گے میرے لیے وہ بعد کی بات ہے۔ تم اس اتنے خاص موقع پر میری فرمائش پوری نہیں کر سکتے۔ دیکھو بات پیسوں کی نہیں پسند کی ہے مجھے یہ عام جگہوں کے لپٹے نہیں چاہئیں بلکہ ڈیزائزڈ لہنگا چاہیے اور میچنگ کی سونے کی جیولری بھی۔“ وہ غصے سے پھٹ پڑی۔ ”بس دیکھ لی تمہاری محبت!“

”تم محبت کو دولت اور چیزوں کے پیمانے سے پرکھو گی یہ تو میں نے بھی سوچا بھی نہ تھا حورالعین۔ محبت تو ان چیزوں سے بہت الگ، بہت خاص جذبہ ہے۔..... لالچ سے پاک۔ محبت تو ایک دوسرے کے لیے قربانی دینے کا نام ہے۔ ایسا کیا ہے جو میرے گھر والے تمہارے لیے نہیں کر رہے؟ تم جانتی ہو انہوں نے میری شادی کے لیے پلاٹ بھی بیچ دیا ہے۔ سارا بینک بیننس بھی لگا دیا حالانکہ اس پر میری بہن علیہ کا بھی حق تھا۔ تمہارے لیے صرف جیولری ہی دس لاکھ کی ہے۔“ عدنان نے شکستہ لہجے میں تفصیل بتائی۔

”مجھے اپنے گھر کی مجبوریوں کی داستان مت سناؤ۔ اگر مجھ سے شادی کرنی ہے تو میرے خوابوں کی ویسی ہی تعبیر دو۔ میں نے تو صرف اپنے لباس کی ہی فرمائش کی ہے جبکہ بہترین شادی ہال، ڈیکوریشن اور جانے کیا، کیا تھا جو منجیا کی شادی میں، میں نے دیکھا۔ وہ تو میرے جتنی حسین بھی نہیں ہے۔“ حورالعین نے لہجے میں

### ذکر الہی اور اطمینان قلب

ذکر الہی سے انسان کو سکون ملتا ہے اور اس کا ایمان ترقی کرتا ہے۔ ذکر سے غافل رہنے والے نقصان اٹھاتے ہیں، وہ ہر معاملے میں پریشان رہتے ہیں اور اللہ تعالیٰ کے سوا ہر کسی سے ڈرتے ہیں۔ ان میں وہ اعتقاد، وہ جرأت، وہ بہت اور وہ ثابت قدمی پیدا نہیں ہوتی کہ جو دینی دنیاوی اعتبار سے کامیاب اور پرسکون زندگی کے لیے ضروری ہے۔ سرور کائنات سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے دریافت کیا گیا کہ اللہ کے بندوں میں قیامت کے دن کن لوگوں کا درجہ بلند ہوگا؟ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا۔ ”اللہ کا ذکر کرنے والے (لوگوں کا) چاہے وہ مرد ہو یا عورتیں۔“ ایک حدیث پاک میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا۔ ”اللہ کی یاد کرنے کی مثال اور یاد نہ کرنے والے کی مثال زندہ اور مردہ کی ہے۔“ یعنی یاد کرنے والا زندہ ہے اور یاد نہ کرنے والا مردہ ہے۔ سورہ 71 اب میں فرمان الہی ہے۔ ”اے ایمان والو! اللہ کا ذکر کرو اور بہت ذکر کرو۔۔۔۔۔ اور صبح شام اس کی پاکی بیان کرو۔۔۔۔۔“ از: عرشہ جنید، کراچی

جتنی خود غرضی نے پیچھے کھڑی سلمیٰ بیگم کے ہوش اڑا دیے۔ وہ اپنی بیٹی کو جانتی تھیں کہ وہ کتنی ہٹ دھرم ہے۔ شاید یہ بے جالا ڈیپار کا ہی نتیجہ تھا جو آج خود ان کو ہی بگھٹتا پڑ رہا تھا۔ اس سے آگے ان سے کچھ سنا نہ گیا اور وہ دبے پاؤں واپس لوٹ گئیں۔

”سلمیٰ اگر تم کو بتو تو میں بات کروں حورالعین سے۔“ عطیہ خاتون نے لالچت سے سلمیٰ بیگم سے کہا۔ ”نہیں آپ، میری بیٹی ہے وہ۔ میں اچھی طرح جانتی ہوں اسے۔ اگر کسی ضد پر اڑ جاتی ہے تو پھر اپنی ہی کر کے رہتی ہے۔ غضب خدا کا ہر روز اس کی ضد کا بخار بڑھتا جا رہا ہے۔ لاکھ دو لاکھ کے لپٹے تو ایک طرف اب تو اس کو شادی بھی فایو اشار ہوئیں میں چاہیے ہے اور پتا نہیں کیا الالہ۔ چلو اس کے لیے تو میں نے منع کر دیا کہ بھی ہم میں اتنا کرنے کی طاقت ہے نہ درواجن۔ لیکن ایک

1987ء سے خدمت میں مصروف

LEUCODERMA-VITILIGO

تقریباً جلدی بیماریوں کا موثر اور بے ضرر علاج

پھلجھری  
قابل علاج مرض ہے

STERIODS FREE MOST PROGRESSIVE TREATMENT

ایسل زیدی  
ایس او ایف  
ایس او ایف

ASIAN EXCELLENCE  
PERFORMANCE AWARD



AWARD  
PILLAR OF LEUCODERMA



اسلام آباد

9- اپریل 30 تا مئی  
9- اگست 30 تا ستمبر  
9- دسمبر 30 تا جنوری

ایس او ایف

2261636

لاہور

گلف سینٹر

14- فروری 27 تا فروری

14- جون 27 تا جون

14- اکتوبر 27 تا اکتوبر

0300-8566188

ملتان

پیشانی سلیو سینٹر

28 مارچ 6 تا اپریل

28 جولائی 6 تا اگست

28 نومبر 7 تا دسمبر

0300-8566188

کراچی

پیشانی سلیو سینٹر

13 مارچ 27 تا مارچ

13 جولائی 27 تا جولائی

13 نومبر 27 تا نومبر

0300-8566188

کھٹائی میں ہی سمجھو۔“ عطیہ آپا بڑبڑاتی ہوئی بیرونی دروازے کی طرف چل دیں۔ اور سلیٹی بیگم ”ارے آپا، ارے آپا!“ ہی کرتی رہ گئیں۔

”بس اب خوش ہو جاؤ تم؟ ہو گیا تمہارا منہ لہنگوں کا شوق پورا۔ ابھی تمہارے باپ کو کیا جواب دوں گی وہ پتیارے تو تک و دو میں لگے ہوئے تھے کہ کہیں سے بندوبست ہو جائے تو وہ تمہاری ساری ضدیں پوری کر سکیں۔ کیا ضرورت تھی بولنے کی؟“ سلیٹی بیگم نے اسے خوب لٹاڑا۔

کوئی بھی جواب دیے بغیر وہ روتے ہوئے اندر کی طرف چل دی۔ طے تو وہ بھی کچل چکی تھی کہ اب اسے عدن سے شادی نہیں کرنی۔ یہ سوچے بغیر کہ اس کی بے جا ضد اس کے والدین کو معاشرے میں کیسے کیسے سوالات سے نبرد آزما کرے گی۔

عدن کے کئی فون آئے اس نے ریسیو نہیں کیے؛ وہ خود آیا تو اس نے ملنے سے انکار کر دیا۔ دل تو سلیٹی بیگم کا بھی میلا ہو چکا تھا عطیہ آپا کی طرف سے کیونکہ انہیں علم ہو گیا تھا کہ وہ عدن کا رشتہ اپنے بھائی کی بیٹی ہانیہ سے طے کر رہی ہیں اور اسی مقررہ تاریخ پر شادی کر دینا چاہتی ہیں۔ اس لیے انہوں نے اپنی لاڈلی حورالعین پر بھی دباؤ نہیں ڈالا تھا۔

”تو بولیں بھی ہوتا ہے محبت و حجت کچھ نہیں ہوتی، محض وقتی کشش ہوتی ہے۔“ وہ اپنی تحقیر پر آنسو بہاتی تکیہ بھگور رہی تھی۔ آج عدن اور ہانیہ کی شادی ہو چکی تھی اور حورالعین کو انھیں لگنا تو فطری امر تھا۔ دوسال کی منگنی کا رشتہ کچھ تو دلوں کو قریب لے ہی آتا ہے۔ سلیٹی بیگم نے آہستہ سے اس کے قریب بیٹھ کر اس کے سر کو آہستہ سے اپنی گود میں رکھ کر بالوں میں پیار سے انگلیاں چلا گئیں۔

”بیٹا! تم اپنی ضد چھوڑ دیتیں تو اچھا ہوتا ناں۔“ وہ رسانیت سے بولیں۔

”امی! تو خالہ بھی تو انتظام کر سکتی تھیں ناں میری مرضی کے کپڑوں کا۔ کیسے دل توڑ دیا انہوں نے میرا۔“ ”میری چنداں... تمہیں بھی یہ سمجھنا ہوگا کہ ہم تو مٹا

بار پہنے جانے والے کپڑے اور لاکھوں کو آگ لگائی جائے۔ آگ لگے ایسے موئے فیشن کو۔“ سلیٹی نے اپنے من کی بھڑاس نکالی۔

”کہیں ایسا تو نہیں بچی کا رجحان کہیں اور ہو؟“ عطیہ خاتون نے دبی زبان میں خدشہ ظاہر کیا۔

”ارے نہیں آپا! کیسی باتیں کرتی ہیں؟ حورالعین ضدی ضرور ہے لیکن جو آپ سوچ بیٹھی ہیں ایسا کچھ نہیں۔“ اب کے سلیٹی بیگم کے لہجے میں ناگواری تھی۔

”تو آخر اوٹ کس کروٹ بیٹھے گا؟ اب تو کارڈ بھی بٹ گئے ہیں اور شادی میں محض دس دن ہیں۔ تم پھر صاف، صاف بتا دو۔ بدائی تو دونوں طرف کی ہے سلیٹی لیکن لڑکیوں کی عزت کا کچھ جیسی ہوتی ہے۔ اگر خداخواستہ یہ شادی نہیں ہو پائی۔ تو عدن کے لیے تو ہزار رشتے ہیں لیکن حورالعین کی طرف لوگوں کی انگلیاں جانے کس، کس انداز میں انھیں کی یہ سوچ لیتا تم۔“ عطیہ آپا نے اٹھتے ہوئے اپنی چادر درست کرتے سلیٹی بیگم کی ناگواری پر ان کو تلخ حقیقت کا ادراک کروانا چاہا۔

”خالہ آپ کو اپنے بیٹے کی شادی جہاں کروانی ہے کر ڈالیں لیکن میرے مستقبل کی پیش گوئیاں تو مت ہی کریں۔ ایک ذرا سی فرمائش کیا کر دی آپ نے تو میری کردار کشی سے لے کر اپنے بیٹے کی ڈیمانڈ کتنی ہے تک بتا ڈالا۔“ حورالعین جانے کب سے چائے کی ٹرائلی لاتے ہوئے ساری گفتگو سن چکی تھی اور اب روتے ہوئے بولے جا رہی تھی۔

”تم خاموش رہو حور! ہم بڑے موجود ہیں ناں! خالہ ہیں تمہاری، معافی مانگو ان سے۔“ سلیٹی بیگم نے حور کو جھڑک کر کہا۔

”ارے رہنے دو سلیٹی! بہت ہو گیا۔ گودوں کھلائی بچی آج منہ کو آ رہی ہے۔ یہ تو اچھا ہوا کہ اس نے ایک ضد کے پیچھے اپنا آپ دکھا دیا۔ شادی کے بعد تو نہ جانے کیا کیا، کرنی اور تم..... یہ تمہاری ہی شہ ہے جو لڑکی اتنی ضدی ہو گئی ہے۔ مجال ہے جو میری علیحدہ نے بھی چھوٹی سی ضد بھی کی ہو یا زبان چلائی ہو۔ میں تو چلی آپ تو یہ معاملہ

اور تاحی سے کھلا ہوا تھا۔

”ہاں بھابی کرایہ۔ یہ صرف کپڑے ہی نہیں بلکہ ہم سب نے جو آپ کی شادی کو یادگار بنانے کے لیے کپڑے پہنے تھے ناں وہ بھی کرایے کے تھے۔ کوئی پاگل تھوڑا ہی ہیں کہ لاکھوں روپے کے سوٹ ایک ایک بار پہننے کے لیے خرید لے اور اتنے پیسے برباد کر دے۔ ہمیں تو بوائے آپ کی شرائط بتادی تھیں تو ہم نے بالکل ویسے ہی شادی کر ڈالی۔ ویسے ان کپڑوں اور جیولری کا کرایہ بھی کچھ کم نہیں ہوتا ہے اور ایک راز کی بات بتاؤں! سب سے زیادہ کرایہ تو آپ کے برائڈل کا تھا کہ آپ نے تو وہ ڈیزائنرز آؤٹ فٹ... منجبت کر لیے جو ابھی مارکیٹ میں بھی نہیں آئے تھے اور شادی کے باقی اخراجات کو پورا کرنے کے لیے تو ہمیں اپنا آبائی گھر بھی بیچنا پڑا۔“ شزا اس کے اوپر انکشافات کے بہار توڑتی ہوئی ڈبے اٹھا کر نیچے چلی گئی اور حورالعین کی آنکھوں میں ویسے کے دن کا منظر پوری جزئیات سمیت گھونٹنے لگا۔

منجبتا سچ ہے اس کے پاس آئی تو بہت پیار سے حورالعین کی تعریف کی۔

”بہت پیاری لگ رہی ہو جو۔“

”ہاں پرتم نے کیا حلیہ بنا رکھا ہے؟ اپنی شادی پر تو کیا شان تھی آج بھی ڈھنگ کے کپڑے پہن کر آئی ناں؟“

”ارے! وہ شادی پہ، وہ میرے تھوڑی تھے۔ تو بتا، کتنے کرایے میں برائڈل جوڑا لائی ہے؟“ منجبتا کہہ کے زور سے ہنسی۔

”چل دفع ہو۔ میرے اپنے ہیں، میں کیوں بھلا کرایے پہ لوں؟“ اس کے لہجے میں نفرت تھی۔

”میرا تو دو لاکھ کا برائڈل ہے بالکل جدید ڈیزائنر۔“ اپنے خود کے الفاظ اس کے کانوں میں گونج رہے تھے اور وہ سوچ رہی تھی کہ کاش عروسی جوڑا سستا ہوتا مگر اپنا ہوتا تو کتنا اچھا ہوتا۔ کھلی الماری کا وہ خانہ اس کا منہ چڑا رہا تھا جہاں سے اس کے برائڈل جوڑے جا چکے تھے۔

بیگم کوسو نے کہا اور خود اس قرض کا سوچنے لگے جو ان کو سدھیانے کی برابری کرنے کے لیے لینا پڑا تھا۔

☆☆☆

سارے خاندان والوں میں خوب واہ واہ ہو رہی تھی کسی کی شادی نہ تو اتنے اونچے ہوٹلوں میں ہوئی نہ اس طرح سنگیت، مایوں، مہندی، شادی کی رسومات ہوئی تھیں جس طرح سے حورالعین کی ہوئی تھیں۔ اور واقعی اس کا شادی کا جوڑا تو اس قدر حسین تھا... جیسے سونے کے تاروں سے بنا ہو۔ بیش قیمت زیورات ہبروں سے مزین تھے۔ ویسے کی تقریب بے انتہا خوب صورت لان میں رکھی گئی تھی لیکن اس کی سجاوٹ اور معیار وہ نہیں تھا جو شادی والے دن کے لیے حورالعین کی سسرال والوں نے اس کے والدین سے ڈیمانڈ کیا تھا۔ لیکن شہر و کی سنگت میں سیاسی مائل بنز سنہری ڈیزائنرز لیکنے میں کسی شہزادی کی سی آن بان سے کار پٹ پہ چلی حورالعین ہواؤں میں اڑ رہی تھی۔ آس پاس ٹیبل پر بیٹھے سب مہمانوں کی نظریں خوبصورت دھواؤں پہ لگی ہوئی تھیں۔

☆☆☆

”حور بھابی، حور بھابی پلیر آپ وہ دونوں عروسی جوڑے اور زیورات مجھے دے دیں ماما نگ رہی ہیں۔“ حورالعین کی چھوٹی نند شزا نے پھولی، پھولی سانسوں سے اس کی شادی اور ویسے کے جوڑے اور زیورات مانگے۔

”کیا کوئی رشتہ دار آیا ہے اس کو دکھانے ہیں تو فو تو دکھا دو شزا! شادی کے ایک ہفتے بعد حورالعین نے الماری کھولتے ہوئے آہستہ آہستہ باہر نکالتے جوڑوں پر نظر ڈالی اور سوالیہ انداز میں اس سے پوچھا۔

”ارے نہیں بھابی! وہ ڈزاسا لگی۔“

”وہ دراصل یہ جوڑے ہم جہاں سے لائے تھے وہاں بس آج تک کا کرایہ ہی دیا تھا تو ابھی بہروز بھابی (دیور) نے واپس کرنے جانا ہے۔ تاکہ سیکورٹی کے پیسے واپس مل جائیں۔“

”کرایہ؟ پیسے... کیا مطلب؟“ حور کا منہ حیرت

اپنی لاڈلی کے منہ سے نکلی بات پوری کرتے آئے تھے۔ جلد ہی وہ ایک اعلیٰ سوسائٹی میں ایک خوب صورت اپارٹمنٹ میں منتقل ہو گئے تھے اور اپنا ذاتی گھر کرایے پہ دے دیا۔ اور جلد ہی بوائے رشتہ بھی ڈھونڈ نکالا۔

☆☆☆

کمرے کی ڈیکوریشن قابل دید تھی۔ ابھی ابھی ہنسی کھیلتی حورالعین کی نندیں اس کو تھکا دینے والی رسوم کے بعد اس کے شاندار کمرے میں چھوڑ کر گئی تھیں۔ حورالعین نے ان کے کمرے سے جانے کے بعد اپنے جہیز کے قیمتی بیڈ کے کراؤن سے ٹیک لگا کر کھل کر سانس لی تو تازہ پھولوں کی تیج اور اس کے بالوں میں لگے سبجروں اور پتھریلوں پر بھی مہندی کی خوشبو نے اس کے مشام جاں کو معطر کر ڈالا۔ اس نے آنکھیں کھول کر کمرے کا جائزہ لیا کہ تو سارے کا سارا اس کے قیمتی جہیز سے بھر پڑا تھا لیکن قابل دید تو اس کا اسٹاکش، جدید ترین ڈیزائن اور کام کا بیش قیمت لہجہ تھا جس کو اس کی نندیں پھیلا کر گئی تھیں۔ اس نے آئینے میں اپنے جھلملاتے ٹکس کو دیکھا تو اپنے حسین روپ کو نظر لگنے کے ڈر سے ڈرینگ ٹیبل کے شیشے سے نظریں چرائیں۔

☆☆☆

”شکر ہے اللہ کا ہم اپنی بیٹی کے فرض سے سبکدوش ہو گئے۔“ رؤف صاحب نے اللہ کا شکر ادا کر کے بیگم کی طرف دیکھا۔

”جی الحمد للہ! خیر سے حورالعین کی خواہش کے عین مطابق شادی بھی کتنی شاندار ہوئی۔ سچ پوچھیں تو مجھے حورالعین کی خواہشات کا جائزہ لگتی تھیں لیکن آپ نے دیکھا کیا شاندار طریقے سے ہماری بیٹی کی شادی ہوئی ہے کہ پورا خاندان دانتوں میں انگلیاں دبا کے بیٹھا ہے۔ اور آپا جو مجھے سو سوا تین سنا کے گئی تھیں وہ بھی بکا بکا دیکھ رہی تھیں۔ اوپر سے داماد بھی تو ہمارا ماشاء اللہ کتنا خوب رو ہے۔ عدن تو اس کے آگے پانی بھرتا نظر آیا۔“

”چلیں آگے بھی اللہ سب خیریت رکھے بیگم۔ اب سو جائیں کل ولید بھی ہے۔“ رؤف صاحب نے

طبقے کے لوگ ان سب خرافات کے متحمل نہیں ہو سکتے جن کی خواہش تم پال بیٹی ہو۔ میں یہ نہیں کہتی کہ آپ اپنے اچھا کیا لیکن تم نے بھی تو حد کر دی تھی۔“ سلمیٰ بیگم نے ٹھنڈی آہ بھری۔

”حد کیوں امی؟ اگر متوسط طبقے والے یہ سب نہیں کر سکتے تو منجبتا بھی تو متوسط طبقے کی تھی! اس کی سسرال والے بھی امیر زادے نہیں تھے پھر بھی اس کی کیا شاندار شادی ہوئی آپ بھی تو میرے ساتھ گئی تھیں ناں شادی میں، کیا میں غلط کہہ رہی ہوں؟“ اس نے سوالیہ انداز میں ماں کو دیکھا۔

سلمیٰ بیگم نے اس کے سوال کو نظر انداز کر دیا کیونکہ اس کے سوال کا جواب ان کے پاس بھی نہیں تھا لیکن اس کے سوال نے ان کے اندر بھی بہت سے سوالوں کو جنم دے دیا تھا۔

☆☆☆

”بوا مقیم! آپ بس کوئی ایسا رشتہ ڈھونڈ نکالیں جو کھاتے پیتے گھرانے کے ہوں اور آج کل کے رواجوں کے مطابق ہماری بیٹی کی خواہشات کے مطابق بری لائیں اور اچھے سے انداز سے شادی کریں۔“ سلمیٰ بیگم نے مسوسوں والی پلیٹ بوا کی جانب بڑھائی۔

”ارے بھیا! میں تو خدا کی قسم کی ایسے رشتے تو بہت ہیں میرے کتنے۔ لیکن تم بھی ہم پلہ جہیز دے پاؤ گی؟ لڑکے کو ہیرے کی انگوٹھی، سونے کے جھمکے ساس کو... اور...“ بوائے منہ میں مسوسے ٹھوسا۔

”ہاں، ہاں آپ فکر مت کریں ہماری اکلوتی بیٹی ہے ہم تو جتنا بھی کریں کم ہے۔ میں نے کون سا دس اولاد دیں بیٹائی ہیں۔“

”تو بھیا! پہلے تو اس محلے سے کوچ کر دو کسی سوسائٹی ٹاؤن میں گھر لے لو چاہے کرایے پر لو اور جگہیں محلوں میں کاہے کو آئیں گے ایسے رشتے کرنے والے؟“

”ٹھیک ہے بوا۔ میں رؤف صاحب سے بات کر کے بتاتی ہوں آپ کو۔“

اور پھر رؤف صاحب نے کیا کہنا تھا وہ تو ہمیشہ سے

مکمل ناول

## تیر کی چاہ سے سدرۃ المنتہی



”زندگی محض نین کے ڈبے پر گرتے پانی کے  
چند قطروں جیسی ہے۔“  
اس نے کھڑکی کے ساتھ پٹ کے نیچے کھڑکی کی  
چوکھٹ پر سر رکھا ہوا تھا۔ اور برسات کے قطروں کے نین  
تھا۔ ہلکی سی روشنی اور نیم اندھیرے کا کس  
”ہلکی روشنی اور نیم اندھیرے میں مجھے تمہاری

ماہنامہ پاکیزہ 226 دسمبر 2017ء

”تو پھر ٹھیک ہے، میں اپنے کمرے میں چلا جاتا ہوں۔“  
”تو پھر ٹھیک میں چننا شروع کر دیتی ہوں۔“  
”مجھے جذباتی طور پر بلیک میل کرنا کب چھوڑو گی؟“ اس نے غصے سے گھورا۔

”جب آپ مجھے تنگ کرنا چھوڑ دیں گے۔“  
”میں نے کب تمہیں تنگ کیا۔ دل کرتا ہے ایک تھپڑ بڑ دوں اگر بڑی نہ ہوگی تو کب کا جڑ دیتا۔“  
”آپ کو نہیں لگتا آپ کو آج کل بہت زیادہ غصہ آنے لگا ہے۔“

”تمہیں نہیں لگتا کہ تم نے میرا ناک میں دم کیا ہوا ہے۔“ وہ اٹھ کر بیٹھ گیا۔  
”ابا..... آدم جی.....“ وہ اسے چڑانے کے لیے آدم جی کہتی تھی۔ ماں، باپ نے اس کا نام آدم رکھا تھا۔ اسے خود اپنے نام کے ساتھ کوئی جذباتی کیفیت نہیں محسوس ہوتی تھی۔

آدم..... ایک دم روکھا پکا..... سخت سانا..... جیسے صرف کام کرنے کے لیے پیدا کیا گیا ہو۔ جیسے صرف لکڑیاں سیدھی کرنے کے لیے..... جیسے صرف خشک بنا کر کتابیں پڑھنے کے لیے..... مگر وہ اس کی چیپٹی بیٹی تھی جس نے کہا تھا، جیسے جنگل میں چوں اور لکڑیوں سے گھر بنانے کے لیے جیسے چرواہا بننے کے لیے.....

مکراٹلے ہی لمحے وہ اس سے لپٹ کر کہنے لگی۔  
”یہ نام آپ کی شخصیت پر ذرا سوٹ نہیں کرتا ابا جی۔“  
آخر آدم کہہ کر وہ اسے چڑاتی، اس سے پہلے وہ اسے کچھ اٹھا کر مارنے لگتا، وہ قہقہے لگاتی قہقہوں کی طرح جھگڑاتی ہوئی ہنسی کا جلتیجنگ بجاتی، ادھر ادھر..... لکڑے لگاتے فریج کے ساتھ یا الماری کے پیچھے چھپ جاتی اور اس کی چڑچڑاہٹ ہسکر اہٹ میں بدل جاتی۔  
”ابا.....!“

”ہوں.....؟ اب کیا.....“ وہ دوبارہ لیٹ گیا۔  
”رونا آرہا ہے۔“  
”کس لیے.....؟“ روکھا سا انداز لیے وہ بولا۔  
”کام نہیں کیا اس لیے..... ابا میں کانٹا نہیں جانا جانتی۔“  
”تو میں کیا کروں؟“

کوئی نیارنگ نہ دیکھا..... پہلے پڑھنا پھر پڑھنا..... چلو کوئی تو بہانہ تھا تو جھبھی سی..... زندگی اپنی طرف کھینچ تو میں اور وہ.....

وہ اب بھی ٹین کے ڈبے پر وہی جو کچرے کا ڈبا تھا۔ جس پر ہلکی سی برسات کی پوندیں گر کر چپ فضا میں ناپسندیدہ آواز پیدا کرتی تھیں۔ اور ساتھ میں گنگنا تے ہوئے چمچر کھڑکی سے اس پر کود پڑتے۔

وہ جھلا کر سر جھٹک کر کھڑکی کا ایک پٹ بند کر کے کچھ ان کو، کچھ خود کو کوٹی ہوئی..... جہاں پر کاٹ پڑتی وہاں ایک زبردست طہا پڑتا۔ خود ہی ران کم بخت چمچروں کی وجہ سے تشدد و جبری بن جاتی۔ بچی بھتیجی سونی بن جاتی اور اوپر سے وہی کھوں کھوں کھاسی کی آواز..... وہی ٹھنکنا..... وہی شیشوں کا گرانا، متوجہ کرتا اور وہی بے بسی..... اور اس کا جھلا کر اٹھ کر بیڑھیاں چڑھ جاتا..... زندگی بس ایسی ہی تھی وہی گزرتے رات دن کی کہانی.....

☆☆☆

”ابا جی.....!“  
”ہوں.....“  
”جاگ رہے ہیں؟“  
”شاید.....“  
”اچھا.....“ وہ ہلکی سی ہنسی۔  
”کیا لطیف سنایا ہے میں نے؟“  
”نہیں..... اس سے کم..... آپ کو اپنے جاننے کا یقین نہیں؟“

”ہمیں زندگی میں بہت ساری باتوں کا یقین نہیں ہوتا۔ خود اپنے ہونے کا بھی نہیں.....“ یہ جملہ آہستہ سے کہا گیا۔

وہ اٹھ کر ان کے پاس آ کر بیٹھ گئی۔  
”کیا ہے..... یہاں کیوں آئی ہو؟“ ابا رات کے وقت بہت چڑچڑاہوا جاتا تھا۔  
”میری مرضی..... میرا گھر ہے، میرا کرا.....“  
”سب کچھ میرا ہے جہاں دل چاہے بیٹھوں۔“

وہ اسے غصے سے گھورنے لگا تھا۔

”کیا.....؟ یہ سمندر تھوڑی ہے، ایک ٹب ہے۔ ڈھونڈ کر دکھاؤ۔“

اس نے ٹب کے میلے پانی کو کراہیت سے دیکھا۔ جس میں سرف، صابن میں کچڑ کی ملی جلی بو تھی۔ وہ اٹھ کر چلا گیا۔

”کیا ہو گیا..... کہاں گیا نیل.....؟ چائے بنانی تھی میں نے۔“ اماں کپ لے کر باہر آئی۔  
”چلا گیا روٹھ کر۔“

”تم نے خفا کر دیا اسے..... چڑا دیا بلا وجہ.....“  
”وہ خود ہی چڑ جاتا ہے۔ میں کیا کروں؟“  
”تمہیں ذرا سا احساس نہیں ہے اس بات کا کہ وہ روٹھ گیا تو کیا ہوگا۔“

”کچھ نہیں ہوگا اماں۔“ وہ بڑبڑائی۔  
”چھوڑ کر چلا جائے گا ناں جب پتا چلے گا۔“  
”چھوڑ کر چلا جائے۔“ وہ دل کڑا کر کے بولی اور اپنے کمرے کی طرف مڑی۔

”کوئی نہیں بیانے آئے گا تجھے ان کتوتوں کے ساتھ۔ اب پورا ایک کپ ضائع ہو گیا۔“ یہ بڑبڑاتے ہوئے اس نے چائے کا کپ ڈھک کر رکھ لیا کہ شوہر آئے گا تو گرم کر لے گی۔ پتا بھی تھا کہ وہ ذائقہ پہچان لیتا ہے ذرا بھی ذائقہ خراب ہو تو..... کپ اٹھا کر دے مارتا ہے فرخ پر۔ اور تب یہ سر پکڑ کر بیٹھ جاتی۔ کپ ضائع ہونے پر چار دن ماتم کرتی وہ بھی اس کے سامنے۔

”اچھا ہوا تو مرگئی اماں.....“ کہتے ہی آنکھ میں آنسو آگئے..... اور حلق بد ذائقہ.....

”زندگی بہت بری ہے اماں..... تیرے اندازوں اور میری تشبیہوں سے بھی کہیں زیادہ بری..... مگر اس کے باوجود بھی اسی زندگی کو جینا ہوتا ہے۔ ہر روز برا سوچ کر سو جانا۔ جھوٹی امید کے ساتھ اٹھنا..... صبح سویرے کام سمیٹ کر کالج کے لیے نکل جانا۔“

اسکول اور پھر کالج سے آگے اس کی زندگی نے

صرف آنکھیں نظر آتی ہیں امبر.....“ کسی کے کہے جیلے ذہن میں ابھرے۔ وہ اسے پیار سے امبر کہا کرتا تھا۔ جبکہ ماں، باپ نے ہمیشہ اسے پورا نام لے کر ہی مخاطب کیا تھا۔

امبرین کے نام کی مختلف اوقات میں مختلف لہجوں کے ساتھ پکار پڑتی تھی۔ ”امبرین چوٹھے کے پاس لکڑیاں نہیں ہیں۔“

”امبرین..... بارش کے پانی میں کوئلے سیلے ہو جائیں گے۔ اکٹھے کر کے کہیں رکھ دے۔“

”امبرین بستر اندر کر لے بھیگ جائیں گے۔“  
کوئلے، بلکڑیاں، بستر، چار پائیاں، تار پر لٹکے کپڑے..... ایک امبرین اور چیزیں اتنی زیادہ جو استعمال کے وقت اتنی کم نظر آتی تھیں..... جیسے جھاڑو دیتے وقت کچرا پتا نہیں کہاں سے آ جاتا ہے اور..... اور کپڑے دھوتے وقت میلے کپڑوں کا ڈھیر لگ جاتا ہے اور پہننے وقت ہمیشہ کی ہوئی..... یا پھر جھوٹے برتن.....

”یہ چھت سے لٹکے پٹکے کے پروں پر کتنی جلدی میل چڑھ جاتی ہے۔“ اس پر جھلاٹ طاری ہوتی۔ تب ہی اس نے سوچا تھا۔ ”اس دنیا میں ساری بری چیزیں اتنی کثیر تعداد میں کیوں ہوتی ہیں..... اور اچھی چیزوں کی تعداد کم رکھی گئی ہے۔“ ماں کا خیال تھا۔ ”یہ بچت پیک خاص غریبوں کے لیے تیار ہوتا ہے۔“

وہ جو کہتا تھا..... ”تمہارے پاس کیا زندگی کے لیے کوئی اچھی تشبیہ نہیں ہے، کوئی اچھی امید، کوئی خوب صورت جملہ کچھ تو اچھا ہو۔ مگر میں ماں، بہنوں کی چیخ، چیخ اور ادھر تمہاری بد صورت باتیں..... تھک گیا ہوں۔ سہہ، سہہ کر۔“ ایک روز اس نے اس کی باتوں کو بد صورت کہہ ہی دیا۔

”تم تو کوری کیوں نہیں ڈھونڈتے نیل.....؟“  
”سمندر میں سوئی ڈھونڈنا آسان ہے نوکری ڈھونڈنا مشکل.....“

”چلو تو پھر اور آسان کام کرو۔“ اس نے پانی کے ٹب میں سوئی پھینک دی۔

”ہاں..... بہت زیادہ.....“  
 ”مطلب کہ وہ ٹھیک کہتا ہے۔“  
 ”بھلا..... کیا؟“  
 ”کہ آپ ہم دونوں سے جلتی ہیں۔“  
 ”پاکل ہو تم لوگ..... میں جلوں گی وہ بھی تم لوگوں سے۔“

وہ پھر سے ہنس دی تھی۔  
 ”آپ بچوں کی طرح بار بار میرا مذاق اڑا رہی ہیں۔“  
 ”کاش تمہیں الفاظ استعمال کرنے کی تیز نبی ہوتی۔“ وہ دل میں سوچ کر رہ گئی۔

”ارے بھیا کیا ہوا..... اودہ..... اگے آگے پانی ہے۔“ اس نے رکشہ کتے ہی دیکھا۔  
 ”جی بی بی اس طرف بہت پانی ہے، نہیں جاسکیں گے۔“ وہ اسے اس کے گھر چھوڑنے کی جارہی تھی۔  
 ”چلو تو گھر لے چلو تمہیں۔“  
 ”جی بہتر.....“

”میں آپ کے گھر کیوں چلوں گی؟“  
 ”اس لیے کہ جو سڑک تمہارے گھر کی طرف جاتی ہے وہاں پر بہت پانی ہے۔ برسات بھی تو بہت تیز ہے۔“  
 ”دیر سے پہنچنے پر میرے ابا خفا ہوں گے۔ ان کا بھروسہ ٹوٹے گا۔“

”نہیں ٹوٹے گا، میرے گھر پر فون ہے، تم انہیں بتا دینا بلکہ میں بھی بات کرلوں گی تاکہ تسلی ہو جائے۔“  
 ”ان کو پھر بھی برا لگے گا۔“  
 ”اس سے پھر بھی کم ہی اگر تم اس لڑکے کے ساتھ نکل جاتیں۔“

”میں اس پر بھروسہ کرتی ہوں۔“  
 ”اس سے زیادہ تمہارا باپ تم پر کرتا ہے تو وہ بھروسہ زیادہ جیتی ہے۔“

”وہ میرے بارے میں کیا سوچے گا۔“  
 ”اور تمہارا باپ تمہارے بارے میں کیا سوچتا؟“  
 ”کچھ نہیں..... بلکہ وہ پوچھتے تو میں بتا دیتی عماد کے بارے میں۔“  
 ”بہت برا طریقہ تھا متعارف کرانے کا.....“

”تمہارا باپ ایک اچھا آدمی ہے، اس نے کالج والوں کو تمہارے بارے میں خاص ہدایت کی ہے۔“  
 ”اس لیے کہ وہ مجھ سے بہت پیارے کرتے ہیں۔“  
 ”ہاں، مجھے پتا ہے انہیں بہت فکر ہے تمہاری۔“  
 ”میں اب بچی نہیں ہوں۔“  
 ”مگر حرتیں بچوں جیسی ہیں۔“

اس نے بہت بے بسی سے اس کی طرف دیکھا تھا۔ جیسے اگر بس چل جاتا تو جانے کیا کر ڈالتی۔  
 ”تمہارے دیر سے گھر جانے پر وہ کافی پریشان ہوتے ہیں اور بھگتا کالج کی انتظامیہ کو پڑتا ہے۔“  
 ”مجھے پتا ہے۔“

”تم کیا اپنے باپ سے ذرا نہیں ڈرتیں۔“  
 ”ہاں، مجھے صرف ان کی پروا ہے۔“  
 ”اچھا..... اچھی بات ہے۔ میں تمہاری عمر میں تو اپنے باپ سے بہت ڈرتی تھی۔“

”اب کیوں نہیں ڈرتیں آپ؟“  
 ”تم سمجھتی ہو مجھے اب بھی ڈرنا چاہیے؟“  
 ”جی بالکل!“ عجب اعتماد تھا لہجہ میں۔ ”اب ضرورت نہیں ہے۔“ وہ ہنس پڑی۔  
 ”نہ چاہتے ہوئے بھی انہیں مجھ پر بھروسہ رکھتا ہے۔ کیونکہ میں اس تمہاری والی بچکانہ عمر سے نکل آئی ہوں۔“

”میرے ابا مجھ پر بھروسہ کرتے ہیں۔“ وہی اعتماد.....  
 ”ہاں..... جیسی تم ان کے اعتماد کو ٹھیس پہنچانے چلی تھیں، تمہیں ذرا بھی اندازہ ہے کہ اگر تم اس لڑکے کے ساتھ نکل جاتیں تو وہ کتنے ٹوٹ جاتے۔“  
 ”وہ لڑکا عماد آپ کا اسٹوڈنٹ ہے۔ آپ جانتی ہیں وہ کتنا اچھا ہے۔ گھر چھوڑنے جا رہا تھا مجھے وہ۔“

”بے وقوف ہو تم..... لڑکیوں کو عقل آتے، آتے پتا نہیں کیوں ایک عمر گزر جاتی ہے۔“  
 ”مجھے اتنا برا بھلا پتا ہے۔“

”صرف پتا ہے مگر..... دیکھو تم ابھی بہت چھوٹی ہو۔“  
 ”ستر حواں لگ گیا ہے اس سال..... چھوٹی نہیں ہوں۔“  
 ”تو بڑی بھی نہیں ہو۔“ وہ بلاوجہ ہی ہنس دی۔  
 ”مجھے روک کر آپ کو خوشی ہوتی ہے ناں.....“

شادی کے لیے جوڑے ہیں وہ ادھر ادھر گھومنے پھرنے میں ضائع نہیں کر سکتا۔ قطعی نہیں۔“  
 ”آپ میرے ساتھ وہی ظلم کریں گے جو آپ کے ساتھ ہوا؟“

اور اسے پتا نہیں تھا کہ عنقریب وہ خود ان سے یہ فرمائش کرنے بیٹھ جائے گی۔

☆☆☆  
 ”زندگی آئینوں کی طرح شفاف ہے اور اس میں تمہاری صورت ایک پری وشن جیسی.....“

یہ عمر چھپ چھا کر خوب صورت سے جملے بڑھنے کی تھی۔ اس نے دیکھ لیا تھا۔ ٹیٹا کے چہرے پر خوب صورت پھیلتی چلی جانی مسکراہٹ سے اور ہونٹ دانتوں تلے دبانے کی حرکت سے لے کر چوری چوری چٹ پڑھ کر مٹھی میں دبائینے تک سب وہ جو دیکھا جاتا ہے۔ جواز خود نظر میں آ جاتا ہے۔

چھوڑتے بچپن کو پیچھے پلٹے بغیر دیکھے بنا جوانی کی دلہیز پر قدم رکھتے ہی نئے احساسات سے ہمکنار ہونے کے بعد ہونٹوں پر اچانک چل جانے والی مسکراہٹ ثبت ہو گئی۔

اسے تیزی سے یہ احساس جاگا کہ وہ یہ عمر پیچھے بہت پیچھے چھوڑ آئی تھی۔ اور اب پیچھے پلٹ کر دیکھنا ایک حماقت تھی۔ ٹیٹا گراؤنڈ سے نکلتے ہوئے آنکھوں کا پیغام بڑھ کر گیت تک گئی تھی۔

مگر وہ..... جو عمر کے مکر و فریب میں پھنس جانے والے دور سے واقف تھی، اس سے پہلے ہی اس کی تاک میں کھڑی تھی۔

”بارش ہونے والی ہے۔ چلو میں تمہیں گھر چھوڑ دوں..... میرا رکشا آ گیا ہے۔“

”م..... میں..... چلی جاؤں گی۔“

عماد اسے اس طرف آتا دیکھ کر ہٹ گیا تھا۔ اس کا موڈ بری طرح خراب تھا۔

اور ٹیٹا..... جیسے کوئی چوری پکڑے جانے پر..... جب چاپ نہ چاہتے ہوئے بھی اس کے اشارے پر رشتے میں بیٹھ گئی تھی۔ موڈ تو ادھر اس کا بھی آف تھا مگر اسے آن کرنا آتا تھا۔

”مجھے کالج سے نکلو ادیں۔“  
 ”پھر گھر میں بیٹھ کر کیا کرو گی..... کھیاں مارو گی؟“  
 ”ہاں، ماروں گی۔“  
 ”کیومت.....“

”آپ چاہتے ہیں میں زبردستی پڑھوں؟“  
 ”ہاں، میری خواہش تھی کہ تم بہت سارا پڑھو۔ دیکھو تمہاری ماں ماسٹرٹی ہے اس سے تو آگے نہیں پڑھنا چاہیے۔“  
 ”میں آپ پر مبنی ہوں ناں اس لیے۔“  
 ”مجھے تو موقع ہی کم ملا۔“

”ایسے تو نہ بولیں، آپ کو پڑھنے کا شوق ہی نہیں تھا۔“  
 ”نہیں، مجھے میٹرک تک بہت شوق تھا۔ پھر اچانک اڑ گیا۔ اس کے باوجود بھی میں نے سیکنڈ ایئر اچھے نمبروں سے پاس کیا۔“

”وہ تو آپ کی قسمت تھی۔ چلیں میں بھی سیکنڈ ایئر اچھے نمبروں سے کر لوں گی۔ ایک مہینہ ہی تو ہے ایگزیم میں..... اچھا آپ نے بی اے پارٹ ون میں کیوں چھوڑ دیا؟“

”بس دل خراب ہو گیا تھا میرا۔“  
 ”تو سمجھیں میرا ابھی دل خراب ہو گیا ہے۔“  
 ”تمہارے ساتھ کیا برا ہوا ہے؟ میرے ساتھ تو بہت برا ہوا تھا۔“

”اگر نہ ہوتا تو میں کہاں سے آتی بھلا۔“ وہ کھلکھلائی۔  
 ”تم میرے نصیب میں نہیں اس لیے آگئیں۔“  
 ”ابا، کیا آپ کو سلیکس ہو رہا ہے؟“  
 ”نہیں، سلیکس ہونا چاہیے مگر نہیں ہوا۔“  
 ”خالی افسوس ہو رہا ہے؟“

”شاید..... ہاں..... شاید نہیں..... اچھا چلو سو جاؤ..... سر نہ کھاؤ..... کل کام پر بھی جانا ہے مجھے۔“  
 ”ابا.....؟“

”اب کیا؟“ وہی پھاڑ کھانے والا انداز.....  
 ”کچھ اچھا ہو۔“  
 ”مثلاً؟“

”کہیں گھومنا پھرنا.....“  
 ”نہیں ہرگز نہیں..... جو پیسے میں نے تمہاری



نہیں تھم جاتی..... اور تمہیں یہاں ہی رہنا ہوگا.....  
میرے پاس۔“

”اللہ... کتنی گرمی ہے یہاں پر۔“  
”چلو میں تمہیں پکھا چلا دیتی ہوں..... اُدھر آؤ۔“ لاؤج کے ساتھ ایک چھوٹا کمرہ تھا جیسے بے بی کاٹ کے لیے بیڈروم کے ساتھ جگہ بنی ہوئی ہے بالکل اسی طرح کا۔ لاؤج کے ساتھ بڑا ہوا چھوٹا سا کمرہ لکڑی کی چارپائی پر نرم بستر بچھا تھا۔

اور ایک پٹ والی الماری، ساتھ میں چھوٹا سا اسٹول نما میز اور سیف رکھا ہوا تھا۔ بیچ میں دو قدم دھرنے کی بہ مشکل جگہ تھی۔ وہ چپل اتار کر بستر پر چڑھ گئی۔ امبرین نے ہاتھ بڑھا کر کھڑکی کھول لی، جس سے کچھ تازہ ہوا بارش کی پھوار کے ساتھ اندر آئی تھی تو کچھ ٹھنڈک کا احساس ہوا تھا۔

چھوٹا سا چار جگہ والا پکھا دیوار پر ٹانگ دیا گیا تھا جس کا سر جگہ ہوا تھا چارپائی کی طرف۔ اس نے وہ چلا دیا۔ ایک چھوٹا سا پکھا چھت سے بھی لٹکا ہوا تھا جو غالباً بجلی سے چلتا تھا۔ اگر بجلی ہوتی تو.....

چھوٹے سے کمرے میں تازگی کا احساس بھر گیا۔  
”بات سنو میری الماری کھولو، کوئی بھی دھلا ہوا جوڑا نکال کر پہن لو اور آرام سے سو جاؤ۔ تمہارے ابا جب آئیں گے تو اٹھا دو گی تمہیں۔“

”آپ کہاں جا رہی ہیں؟“ وہ پہلی بار یہاں اکیلے رہنے کے ڈر سے خوفزدہ ہو کر گھبرائی تھی۔

یہ اس کی عادت تھی سونے سے پہلے سو بار ابا سے تصدیق پتا جاتی کہ وہ جاگ رہے ہیں تو جا کر اسے نیند آتی تھی۔ یہ تب کی عادت تھی جب ماں اسے بستر میں سوتا چھوڑ کر چلی گئی تھی اور وہ ڈر گئی تھی۔ یہ عادت اب فطرت ہی بن چکی تھی اس کی۔

”مجھے ابا کو دیکھنا ہے..... انہیں سلا کر آ جاؤ گی۔“

”میں آپ کے ساتھ چلوں؟“

”نہیں، تمہیں وہاں مزہ نہیں آئے گا بلکہ الجھن ہوگی۔“ وہ سر ہلا کر رہ گئی۔

مگر اس کے جاتے ہی اس کے پیچھے بھاگی تھی،

اور پر جاتی میٹریوں کی رینگ کے ساتھ ایک کمرہ تھا۔ جس کا دروازہ ادھ کھلا تھا۔ رینگ کے ساتھ ہی ایک بڑی سی کھڑکی تھی۔ وہ کھڑکی کے ساتھ لگ کر کھڑکی تھی مگر زیادہ دیر تک نہ کھلی گئی تھی۔ اس نے اسے متوجہ کیا۔

جس میں مردانہ سیلے پڑے پڑے تھے۔ اور شاید برسات کی وجہ سے ان میں۔ گیلا ہٹ اور بسا نہ ہو مگر یہ پورا دیر تھی..... اسے الٹی آنے لگی۔ وہ منہ پر ہاتھ رکھ کر پیچھے کی طرف دوڑی، جب امبرین نے ادھ کھلے دروازے سے اسے تیزی سے میٹریاں اترتے دیکھا۔

پھر دو اینیوں کی وہ شیشیاں جو الٹا دی گئی تھیں وہ اٹھائیں۔ ایک سیرپ تھا وہ کل ہی لائی تھی۔ شیشی کی کرجی ٹوٹنے کے ڈر سے اس نے ایک کھلے برتن میں وہ سیرپ چھان لیا اور پھر دوسری خالی شیشی میں بھر لیا تھا۔ اور پھر اسے اوپری طاق میں رکھ دیا۔

اسے پتا تھا ان سے بھی کچھ بھی کہنے کا مقصد تھا مزید غصہ اور شور..... جس کا نتیجہ بے سکونی تھی وہی روز کی بے سکونی..... روز کی جھلاہٹ اور بے بسی..... وہ آخر کتنے آنسو بہاتی اس لیے خود کو بہادر کر لیا تھا۔ ان کے بستر کے ساتھ کھڑا چار جگہ پکھا انا دم کھو چکا تھا۔ تب تک وہ انہیں ہاتھ کا پکھا جھل کر ہوا دیتی رہی۔ جب تک کہ بجلی نہ آگئی۔

اور تب ان کی نیند بھی گہری ہو گئی تھی۔ کھیں نکال کر ان کے اوپر ڈال کر وہ دروازہ بند کر کے نیچے آگئی تو وہ اس کا نیلے رنگ کا سوٹ پہنے آؤ کھاری تھی۔ یہ آؤ پڑوس والی سیما اس کے لیے لائی تھی جب وہ صبح کاغ جا رہی تھی اور تب اس نے وہیں رکھ دیا تھا۔

اسے آؤ کھانا برائیاں لگا جتنا اپنے نئے جوڑے کا مگر بیان آؤ کے رس کے قطروں سے تر دیکھ کر لگا تھا۔  
”کیا.....؟“ آپ نے کہا تھا جو جوڑا اچھا لگے وہ پہن لیتا۔“ وہ اس کی نظروں کا پیغام سمجھ گئی تھی۔

”تم بہت بری طرح کھاتی ہو، گدھوں کی طرح.....“ میز پر کن تاثرات سے وہ بولی۔

”مہمان کے ساتھ اس طرح کا سلوک کون کرتا

ہے جیسا کہ آپ کر رہی ہیں۔“

”مہمان کو اس قدر بھی کوئی سر نہیں چڑھاتا جتنا میں چڑھا رہی ہوں۔“

”تو مت چڑھائیں۔“ وہ آؤ کھا کر ہاتھ صاف کرنے لگی اس کا بس چلتا تو دوپٹے کے پلو کو رنگین کر کے اسے مزید تاؤ دلانی مگر حرم آگیا اس کی صورت پر کبھی بے بسی سے ساتھ میں بھر پور مسکراہٹ جو بالکل کوئی کی طرف جاتے ہوئے ہلکی ہنسی میں بدل گئی تھی۔

وہ سر جھک کر بستر پر بیٹھ گئی۔ پھر اسے آتا دیکھ کر اپنے لیے کرسی سیدی کی اور ٹھیک کر چارپائی کے ہاتھی کے ساتھ لگا دی۔

اسٹول سے کتابیں اٹھا کر گود میں رکھیں اور ٹائیکس دراز کر لیں..... اب وہ بچوں کے نوٹس چیک کر رہی تھی۔

اور یہی وہ وقت تھا جب اس کے جامنے کی تسلی کر کے وہ بستر پر دراز ہو گئی اور سوتی بن گئی۔ چند منٹ میں ہی وہ گہری نیند میں ڈوبی ہوئی تھی۔ اور امبرین نے اس کی بے فکر نیند اور بھولے سے چہرے کو نیم اندھیرے میں دیکھا۔

بجی اس کی نیند بھی بے سکون ہوا کرتی تھی۔ اس نے ٹھنڈی سانس بھر کر نوٹس کی فائل سینے سے لگائی اور ٹائیکس مزید دراز کیں..... کرسی کی پشت سے تکیہ لگائے سر لگا دیا۔ اور آنکھیں موند لیں جیسی اوپر سے کچھ پھینکنے کی آواز آئی۔

”مطلب وہ جاگے تھے، کتنی بار کہا ہے ٹھنڈی بجا دیا کریں..... مگر سننے نہیں ہیں۔“ وہ جھلائی بڑبڑاتی ہوئی کمرے سے نکل کر پڑھیاں چڑھ گئی۔ یہی تھی بس اس کی زندگی مر جھانی ہوئی..... اور لکھائی ہوئی.....

بدرنگ دیوار سے اکھڑ کر گرتے ہوئے پلستر اور جھڑتے ہوئے روغن کے اندر سے جھانکتی سفید چوکنے کی سی۔

☆☆☆

صبح امبرین کے ساتھ وہ کالج چلی گئی تھی، اس کے ابا وہیں پر آگئے تھے، کچھ دیر ویننگ روم میں بیٹھے

دنیا کے کسی بھی گوشے میں اور ملک بھر میں

گھر بیٹھے

جاسوسی ڈائجسٹ، سسپنس ڈائجسٹ  
ماہنامہ پاکیزہ ماہنامہ سرگزشت

باقاعدگی سے براہ حاصل کریں اپنے دروازے پر

ایک رسالے کے لیے 12 ماہ کا زر سالانہ  
(بشمول رجسٹرڈ ڈاک خرچ)

پاکستان کے کسی بھی شہر یا گاؤں کے لیے 800 روپے

امریکا، نیپال، آسٹریلیا اور نیوزی لینڈ کے لیے 9,000 روپے

بقیمت مالک کے لیے 8,000 روپے

آپ ایک وقت میں کئی سال کے لیے ایک سے زائد رسالے کے خریدار بن سکتے ہیں۔ رقم اسی حساب سے ارسال کریں۔ ہم فوراً آپ کے دیے ہوئے پتے پر رجسٹرڈ ڈاک سے رسالے بھیجنا شروع کر دیں گے۔

یاد رکھیں! طلبہ اپنے طلبہ کے پتے پر بھیجنا چاہتے ہیں۔

یہ دون ملک سے قارئین صرف ویسٹرن یونین یا پی گرام کے ذریعے رقم ارسال کریں۔ کسی اور ذریعے سے رقم بھیجنے پر بھاری چیک فیس عائد ہوتی ہے۔ اس سے گریز فرمائیں۔

رابطہ: شمر جاس (فون نمبر: 0301-2454188)

جاسوسی ڈائجسٹ پبلی کیشنز

C-63 نیو 11 سسٹیمس، ایف س سٹریٹ، انٹرنیٹ مین کوئی روڈ، کراچی

فون: 021-35895313 فیکس: 021-35802551

”تو پھر اب ایسی بات آئندہ مت کرنا۔“  
”نہیں کروں گی..... بس وہ ذرا مسکین سی نظر آئیں تو میں نے کہا۔“

”یہ فکر ہو جاؤ، میں کسی لڑکی کو مفت میں لا کر تمہاری بدتمیزیوں کا نشانہ نہیں بنادوں گا۔ پہلے تمہاری شادی کروں گا اور پھر مجھے کرنا ہوگی تو خود کروں گا۔“  
”ارے واقعی.....؟ وہ خوشی سے اچھلی۔  
”تو پھر کوئی لڑکا دیکھو؟“

”خبردار جو ایسا سوچا بھی تو..... میں ہوں اس کا کام کے لیے..... خود ہی ڈھونڈ لوں گا۔“

”میں نے اگر ڈھونڈ لیا تو کیا ہو جائے گا؟“ وہ آہستہ آہستہ اپنی ذہنی طور پر تیار کر رہی تھی۔

”تمہیں ذرا شرم نہیں آتی، اپنے باپ کے سامنے ایسی باتیں کرتے ہوئے۔“

”آپ میرے دوست بھی تو ہیں ناں.....“

”اس طرح کی باتوں کے لیے میں تمہارا دوست بن جاتا ہوں۔ اور ویسے کیا دشمن ہوں۔ کوئی ایک بات نہیں مانتی تم میری۔“

”مانتی تو ہوں..... اب اور کیا کروں.....“

دیکھیں اب آپ نے کہا انٹرسٹنس میں کروں..... میں نے آپ کی بات مانی۔“

”ہاں میں نے کہا تھا مجھے امید تھی کہ تم اچھے مارکس لاؤ گی اور میں تمہیں میڈیٹن پڑھاؤں گا۔“

”حالانکہ آپ کو پتا ہے میں خون دیکھ کر ہی ڈرجاتی ہوں۔ انجکشن کسی اور کو لگتا ہے، درد مجھے محسوس ہوتا ہے خواہ خواہ میں میرے دو سال ضائع کروا دے۔“

”چلو اب تو خوش ہونا اپنی مرضی کے مضامین لے کر۔“

”اب بس میں نے گریجویشن کے بعد نہیں پڑھنا۔“

”تم فکر مت کرو، میں عنقریب تمہاری شادی کرنے کا سوچتا ہوں۔“

”ہائے اب آپ کتنے اچھے ہیں۔“ وہ ایک دم کلک لگ گئی۔

”اتنی بے شرم لڑکی میں نے اپنی زندگی میں نہیں

لوں گا کچھ وقت اپنے کام کے ساتھ اور کچھ اپنی کتابوں کے ساتھ مگر نہیں.....“

وہ ڈھٹائی سے آکر بیٹھ گئی تھی ان کے بستر پر۔  
”اب یہاں کیوں بیٹھی ہو؟“

”میں ہوں آپ کی..... کیا نہیں بیٹھ سکتی؟“  
”اٹھو اور صوفے پر سو جاؤ۔“

”ابا، نہیں ناں..... اکیلے سوتے ہوئے ڈر لگتا ہے مجھے۔“

”منہ توڑ دوں میں تمہارا، دل تو یہی چاہتا ہے۔“ وہ منہ بنا کر بیٹھی ہوئی تھی۔

”کب بڑی ہوگی تم؟“ وہ جھلا کر ایک طرف لیٹ گیا۔

”ابا، میں آپ کا ہاتھ پکڑ لوں؟“  
”گو د میں ہی آ جاؤ۔“ وہ سختی سے کہنے لگا۔

”اچھا ابا..... باتیں کریں ناں.....!“  
”یہ کام تم بہت اچھا کرتی ہو۔“ وہ جھلایا۔ ”اچھا ابا فوش ہو جائیں، چلیں میں آپ کی شادی کر ادیتی ہوں۔“

”اچھا۔“ وہ جیسے لطیفہ سن کر ہنسا تھا۔  
”ہاں تو اور کیا.....؟“ وہ اٹھ کر بیٹھ گئی۔

”اتنی ساری لڑکیاں ہیں میرے کالج میں، آپ کوئی ایک پھنسا لیں، اتنے بیک تو ہیں آپ؟“

”شرم کر دساری میری بچیاں ہیں، تمہاری عمر کی.....“  
”چھوڑیں اب ابا، کوئی نہیں بچیاں۔ اچھا چلیں، یہ بتائیں میں امبرین کسی ہیں؟“ دل کی بات وہ زبان پر لے آئی تھی۔

”اب اگر دوبارہ تم نے یہ بات کی تو میں واقعی تمہارا منہ توڑ دوں گا۔“

”ارے واہ..... کیوں اتنی بری ہیں کیا وہ؟“  
”بری نہیں ہیں بیٹا، بیٹا وہ بہت شریف ہیں عزت دار ہیں۔“ وہ اسے سمجھاتے ہوئے بولے۔

”اور آج تیری بابت نے ان کا اس حوالے سے نام لیا ہے انہیں معلوم ہوا تو کتنا دنگی ہوں گی وہ کہ ہم ان کے بارے میں ایسی باتیں کرتے ہیں۔“

”انہیں معلوم ہو تب ناں۔“

☆ ☆ ☆

”سنیں، میں آپ کے کمرے میں آ کر جاؤں؟“ اس نے کھڑکی سے جھانک کر پوچھا۔  
وہ اٹھا اور ناگوار سی سے دروازہ کھولا۔

”آ جاؤ، کبھی سکون کے ساتھ رہنے نہیں دیا مجھے۔ سوچا تھا تم بڑی ہو جاؤ گی تو میں سکون کی سانس

”ویسے آپ آج بہت اچھے لگ رہے تھے۔“  
”مجھے تعریف سننے کا کوئی شوق نہیں ہے۔“

”کوئی اور لڑکی کرتی تو اچھا لگتا..... بیٹی کی کہا اچھی لگے گی۔“

”بہت ذہن خراب ہو گیا ہے تمہارا۔ فضا بولنے لگی ہو۔“

”آپ کو تو میری صلاحیتیں کبھی نظر نہیں آئیں۔“  
”اب میرا منہ مت کھلو اؤ تم۔“ گاڑی اشارہ ہو چکی تھی۔

آگے جا کر وہ سٹپل پر رکی۔ اور ساتھ میں گاڑی تھی وہ شاہینہ اس کی ماں کی تھی۔

شاہینہ نے بیٹا کو دیکھ کر بات کرنا چاہی تھی۔ مگر بیٹا نے دوسری جانب گردن کر کے یہ ظاہر کیا کہ اسے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔

”وہ تمہاری ماں تھی..... تم سے بات کرنا چاہ رہا تھی۔“ گاڑی جب آگے بڑھی تو آدم نے اسے ڈانٹا۔

”مجھے نہیں فرق پڑتا۔“  
”تم کافی عرصے سے ملنے بھی نہیں گئیں اس سے بلکہ اب تو پورا سال ہونے کو آیا ہے۔“

”اس سال میں انہوں نے میری خیریت کتنی بار پوچھی ہے؟“

”مجھے لگتا ہے اسے تمہاری فکر رہتی ہوگی۔ آخر کوم اس کی بیٹی ہو۔“

”رہنے دیں.....“ اس نے بے پروائی سے سر جھٹکا۔  
”میں نے بھی تمہیں اس کے خلاف نہیں کیا۔ پتا نہیں کہاں سے تمہارے دل میں اتنی نفرت آ گئی ہے۔“

”نفرت نہیں ابا..... محبت بھی نہیں ہے۔ کچھ بھی نہیں ہے بلکہ.....“ وہ اس کی بات پر کچھ نہیں کہہ سکا تھا۔

☆ ☆ ☆

”سنیں، میں آپ کے کمرے میں آ کر جاؤں؟“ اس نے کھڑکی سے جھانک کر پوچھا۔  
وہ اٹھا اور ناگوار سی سے دروازہ کھولا۔

”آ جاؤ، کبھی سکون کے ساتھ رہنے نہیں دیا مجھے۔ سوچا تھا تم بڑی ہو جاؤ گی تو میں سکون کی سانس

رہے تھے، اس کی چھٹی کے انتظار میں..... اسے پتا تھا وہ گھر جا کر اس کی کلاس لیں گے معلوم نہیں مس امبرین نے کیا کیا ہوگا۔ وہ اپنے اکلوتے دوست کی کھٹار گاڑی لائے تھے۔ جس کا ہمیشہ کی طرح ٹائر پچھڑ ہو گیا تھا۔

”یہ کھٹار لانے کی کیا ضرورت تھی ابا..... میں رکشے میں نہیں آ سکتی تھی کیا۔“

”مجھے پتا تھا تم یہی ہوگی۔ مگر مجھے دو ایک کام اور بھی تھے۔“

”تو مجھے گھر چھوڑ کر پھر کام کے لیے نکلے گا۔ میں اتنی گرمی میں گاڑی میں بیٹھنا پسند نہیں کرتی۔“ وہ جب غیر ضروری بولی تھی تو وہ چپ ہی رہتے تھے۔

”آخر یہ گاڑی بھی ہمارا سڑک پر خراب کیوں نہیں ہوتی؟“ وہ اسے ناگوار سی سے دیکھتے رہے۔

”کبھی لگتی ہیں آپ کو مس امبرین؟“

”اچھی انسان ہیں۔“

”پھر کیا خیال ہے؟“

”کس سلسلے میں.....“ حالانکہ وہ اس کی ٹون سمجھ رہے تھے۔

”بکومت، عورت ہو کر عورت کی عزت نہیں کرتی ہو۔ تمہاری یہ باتیں سخت بری لگتی ہیں مجھے۔“

”میں تو بس یونی۔“

”ہاں تم تو بس یونی مت ہانکا کرو۔“ وہ اتنی دیر میں ٹائر بدل چکے تھے۔ اسے یہی فکر تھی مس امبرین نے کچھ کہہ نہ دیا ہوا نہ سے۔

”ابا..... بات سنیں۔“

”جو تمہارے دل میں ہے وہ کہہ دو بیٹا۔“

”مس امبرین نے آپ سے میری کوئی شکایت تو نہیں کی؟“

”کس قسم کی شکایت۔“ وہ تاسف سے بولے۔

مگر پھر اسے مشکوک سے انداز میں دیکھنے لگے۔

”مطلب کہ کوئی کارنامہ کیا ہے تم نے؟“

”میں نے تو کچھ نہیں کیا، مطلب انہوں نے بات نہیں کی اس نے شکر کی سانس لی۔

”وہ تو مجھے معلوم ہے۔“ انہوں نے سر جھٹکا۔

دیکھی۔ کیسے شادی کی بات پر خوش ہو رہی ہے۔“ وہ مسکراہٹ دبا کر بولا۔

”یہ کانفیڈنس آپ نے ہی دیا ہے مجھے۔“  
”کانفیڈنس اور بے حیائی میں واضح فرق ہوتا ہے بچے۔“

”تو بے ابا..... کبھی دوست نہ بننا۔“  
”دوست بن، بن کر تو تمہارا دماغ خراب کیا ہے۔ ابا باپ بن کر دکھاؤں گا تو مزہ آئے گا۔“

”اچھا چلیں غصہ نہ کھائیں..... خند کھائیں۔“  
وہ کروٹ لے کر لیٹ گئی تھی۔

”ابا..... ایک بات پوچھوں؟“ کچھ دیر بعد وہ پھر بولی۔ آدم نے جان بوجھ کر آنکھیں بند کر لیں جیسے سو گیا ہو۔  
”ابا مجھے پتا ہے، آپ جاگ رہے ہیں، سنیں ناں۔“  
”اب پھوٹو بھی کون سا میرے منہ سے گزرتا ہے؟“

”وہ آپ کی میز کی دراز میں “ان” کی فوٹو کیوں پڑی ہے؟“

”وہ تمہاری ماں ہے بیٹا۔“  
”مجھے پتا ہے ضرور ہوں گی..... مگر آپ نے اب

تک وہ فوٹو کیوں رکھی ہے۔“  
”اگر تمہیں لگتا ہے کہ نہیں رکھنی چاہیے تو تم ہٹا دینا۔“  
”ابا، آپ کو ان سے محبت ہو گئی تھی کیا؟“  
”اب یہ ساری بیکار باتیں ہیں بیٹو۔ اس لیے تم سو جاؤ پلیز۔“

”ابا..... آپ بہت اچھے ہیں..... انہوں نے اپنے نصیب کو خود مقرر کیا۔“

”نہیں بیٹا..... وہ بہت خوش ہے شاید اس نے ایسا کر کے اچھا کیا۔ دیکھو اتنا اچھا گھر ہے، ہر سہولت ہے اس کے پاس اتنی بڑی پوسٹ پر اس کا شوہر تیرینات ہے۔ دو بیٹے ہیں اور کیا چاہیے۔“

”چھوڑیں ابا..... وہ تب بھی اتنی خوش نہیں ہیں۔“  
”تمہیں کیسے پتا؟ تم نے بات کی ہے کیا اس سے؟“  
”نہیں..... وہ تو مجھے بہت کم عقل اور بے وقوف سمجھتی ہیں۔“

”ویسے سمجھتا تو میں بھی تمہیں یہی ہوں۔“ اس نے کافی سنجیدگی سے کہا تھا۔

”کتنے ہم خیال ہیں آپ دونوں۔“  
”نہیں..... ہاں ویسے ہم خیال تو تھے ہم مگر.....“  
”مگر..... کیا؟“

”تم بہانے، بہانے سے مجھ سے باتیں اٹھاتی ہو، ہے ناں؟“

”نہیں تو میں تو صرف پونہی پوچھتی ہوں۔“  
”اور میرے خیال سے تمہیں نہیں پوچھنا چاہیے۔ کیونکہ اس سب کا اب کوئی فائدہ نہیں ہے۔ دیکھو ہر

انسان کو اپنی زندگی کا اختیار ہوتا ہے۔“  
”انہوں نے میرے لیے ایسا کیوں نہیں سوچا۔ آپ نے بھی تو میرے لیے دوسری شادی نہیں کی۔“  
”دیکھو مجھے تو کوئی ایسی لڑکی ہی نہیں ملی۔ اسے اس کا آئیڈیل مل گیا سو اس نے کر لی۔“ وہ مزید کچھ پوچھنے کو مٹی مگر اس نے ڈانٹ کر سلا دیا تھا۔

☆☆☆  
اگلے دن وہ خود امبرین کے گھر چلا آیا تھا۔ اسے کچھ عجیب بھی لگ رہا تھا مگر اس کے سوا اس کے پاس کوئی چارہ نہیں تھا۔ وہ کئی مرتبہ اس کا نمبر ڈائل کر چکا تھا جو کئی دنوں سے بند جا رہا تھا۔

کالج میں اتنے آرام سے بات ہو نہیں پاتی تھی، میٹنگ روم میں ان کے علاوہ بھی چند لوگ موجود ہوتے تھے۔ اور بار بار اس سے میٹنگ کرنا اسے برا لگ رہا تھا۔ وہ ایک اچھی لڑکی تھی اور وہ نہیں چاہ رہا تھا اس کی وجہ سے اسے کوئی مسئلہ ہو۔ باہر ملنے کے لیے کہنے کا بھی کوئی جواز نہیں تھا لہذا وہ بڑی سوچ بچار کے بعد اس کے گھر آ گیا۔  
”وہ میں نہیں آتا چاہتا تھا مگر..... دراصل..... وہ..... آپ سے کچھ بات کرنی تھی مجھے۔“

”جی آپ بات کریں۔“ وہ تانجی سے بیٹھ گئی تھی۔  
”جی علیک سلیک کے بعد آدم نے پہلا جملہ بولا تھا۔ مجھے آپ سے بیٹا کے متعلق بات کرنی ہے۔“  
”تو اس نے کچھ کہا آپ سے؟“ امبرین نے ٹھنڈی سانس لی۔ اچانک اوپر سے کچھ چیزیں گرنے کی آواز آئی۔ اور چمکانے کے ساتھ ایک بول گرنی

ہوئی سیڑھیوں کے نیچے لڑکھ کر زخمی ہو گئی۔ اور محلول بوتل سے آزاد ہو کر سیڑھیوں پر بہتے ہوئے میڑھے، میڑھے راستے کی شکل اختیار کر گیا۔

امبرین نے شرمندگی چھپاتے ہوئے بغیر اس کی طرف دیکھے ”میں آئی ہوں“، کہا اور سیڑھیوں پر عیزی سے چڑھتی چلی گئی۔

”کیا ہو گیا ہے آپ کو..... حد کرتے ہیں..... یہ طریقہ ہے کیا بلانے کا..... اس طرح کسی کو آواز دی جانی ہے۔“

اس کی جھلائی ہوئی آواز نیچے تک آ رہی تھی۔  
”آدم نے کوفت بھری صورت حال محسوس کرتے ہوئے خود کو کوسا مگر سمجھ نہ آیا کئی الفاظ اٹھے یا انتظار کرے۔“  
”چلیں اٹھ کر بیٹھیں..... کوشش کریں۔“  
ایک دو لمبی آوازوں کے بعد کچھ لمحوں تک صرف چڑوں کی کھنکھناتی آوازیں آنے لگیں۔ وہ اٹھا مگر سمجھ نہ آیا کہ کیا کرے۔

سیڑھیوں کی رینگ سے نیچے جھانک کر امبرین نے اسے مخاطب کیا۔

”آدم صاحب..... ذرا اوپر آئیے گا۔“ وہ تیزی سے سیڑھیاں چڑھتا ہوا اوپر چلا گیا۔

مگر دادائیوں کی بو سے بھرا ہوا تھا۔ وہ اندر گیا تو دیکھا ایک بوڑھا آدمی بے حال چار پائی پر لیٹا ہے، اس کے منہ سے رال بہہ رہی ہے۔ وہ بے سدھ پڑا تھا مگر ہاتھ حرکت کر رہے تھے۔ وہ بے ساختہ آگے بڑھا۔

”کیا ہوا انہیں؟“  
”پتا نہیں ابھی تو حرکت میں تھے..... میں نے مدد کار کرنا چاہا تو لڑکھ سے گئے۔“

”آپ بڑوس سے کسی کو بلالائیں انہیں اسپتال لے جانا ہوگا۔“ آدم نے اس کی حالت دیکھ کر کہا۔ وہ انہیں قریبی سرکاری اسپتال لے گئے اور امیر جنسی میں داخل کرادیے۔

حالت کچھ بہتری ہوئی تو انہیں وارڈ میں شفٹ کیا گیا۔ وہاں امبرین کا کھڑا ہونا دشوار تھا۔ میل وارڈ میں طرح، طرح کے مریض اور ان کے حصار دار تھے۔ امبرین کا دم

## تیری جاہ سے

وہاں گھٹا جا رہا تھا۔ آدم نے اسے باہر جانے کا کہا تھا۔ اور خود اندر ہی ٹھہرا ہوا۔ وہ کچھ دیر بعد باہر آیا اسے نیچے پر بیٹھے دیکھا تو آکر کچھ فاصلے پر بیٹھ گیا۔

”کب سے ہے ان کی یہ حالت؟“  
”کئی سالوں سے مگر پچھلے ایک سال سے زیادہ خراب ہو گئی۔ کبھی ان کو غشی کا دورہ پڑتا ہے تو کبھی ایسے ہی بے دم ہو جاتے ہیں۔ بس ٹکڑے ٹکڑے دیکھتے رہتے ہیں۔ ان کو پتا نہیں چلتا..... اور کپڑے گندے ہو جاتے ہیں۔“

”اوہ میرے اللہ..... پھر کون آپ کے کام آتا ہے ان کی دیکھ بھال میں آپ کی مدد کرتا ہے؟“  
”اب کوئی نہیں آتا..... میں خود ہی.....“ وہ کہتے، کہتے رو پڑی تھی۔ خاموش آنسوؤں سے آدم نے ایک گہری سانس لی۔ کتنی مشکل حالت تھی۔

”کوئی بات نہیں ایک وقت ہوتا ہے جب ماں، باپ بچے کو پالتے ہیں۔ اور پھر وہ وقت بھی آتا ہے جب بچے ماں، باپ کو..... میری دادی کے اوپر بھی یہ وقت آیا تھا..... میری ماں کا انتقال ہو چکا تھا۔ میری سابقہ بیوی شاہینہ میری چچا زاد تھی۔ چچا، چچی دوسرے شہر میں تھے، میں اور ابا دادی کی دیکھ بھال کرتے تھے۔ اس دوران ابا اور چچا کی مرضی سے میری اور شاہینہ کی شادی کر دی گئی۔ شاہینہ مجھ سے آٹھ سال عمر میں بڑی تھی۔ میں اٹھارہ سال کا تھا جب شادی ہوئی تھی۔ اسی سال دادی کا انتقال ہو گیا۔ اور اس سے اگلے سال بیٹا کی پیدائش ہوئی۔“

”آپ دونوں میں علیحدگی کیوں ہوئی آدم؟“  
امبرین نے پچھتاتے ہوئے پوچھ..... ہی ڈالا۔

”یہ ایک مس صبح تھا شاید..... شاہینہ کو ایک سمجھدار آدمی درکار تھا۔ مجھے میں شاید سمجھ کی کمی تھی..... مگر شاید یہ اس کے بہانے تھے۔ دراصل جب کوئی آپ کو اچھا لگتا ہے تو بس لگتا ہے اپنی تمام تر خامیوں کے ساتھ بھی..... اور جب کوئی اچھا نہیں لگتا تو اس کی کوئی بھی خوبی آپ کے لیے اہمیت نہیں رکھتی۔ بیٹا ساڑھے تین سال کی تھی جب شاہینہ کو اپنا آئیڈیل مل

اس کا..... دوسرا ٹیٹا کے حوالے تھا اب اور تیسرا ابھی اس کی دادی کا ہوا کرتا تھا۔ جس میں اب ضروری اور غیر ضروری کا ٹھکے کاڑ جمع تھا۔ اسے شروع سے پرانی چیزوں کو نیا کرنے کا شوق تھا۔ پہلے جب اس کی جنگلات کے شعبے میں نوکری ہوئی تھی تو لکڑی سے فرنیچر اور ہر چیز بنانے کا وقت نہیں مل پاتا تھا۔ شاہینہ سے مکمل علیحدگی کے بعد اور اس کی شادی کے بعد جب ٹیٹا کی ذمہ داری مکمل طور پر اس پر پڑی تو اسے یہ ملازمت چھوڑنی پڑی اور اس کے بعد تو جیسے سرکاری ملازمت نہ ملنے کی حد تک گئی۔ وہ دوڑ، دوڑ کر تھک گیا اور تب دوبارہ اسے اپنے ہنر نے پناہ دی۔ اور وہ دوبارہ فرنیچر کی دکان پر جا بیٹھا۔ جہاں سیٹھ اس کی کمائی آدھی تو ہضم کر جاتا تھا۔ اس کے عمدہ کام کی مانگ بہت ہوتی تھی اور سیٹھ اس سے فائدہ اٹھاتا تھا۔ ایک بار لکڑی کی کٹائی کے دوران آرا اس کے بازو پر جا لگا اور گوشت چڑ گیا۔ اس کے بعد ٹیٹا اس کا پیٹ میں بھڑا بازو تھام کر روتی رہی تھی اس نے اپنی بچی کی خاطر یہ کام چھوڑ دیا تھا۔ کچھ تو اسے بھی وہم ہونے لگا تھا کہ آرا چلائے گا تو لکڑی کی جگہ بازو، ٹانگیں، پیر سب آجائیں گے۔ ہاتھ زخمی ہو جائیں گے، یہی وجہ تھی کہ دادی کے پرانے فرنیچر کی مرمت سے ہار کر اس نے لکڑی کا شاہی پلنگ دادی کے کمرے میں رکھ دیا۔ اور برآمدے کی آدھی جالی کار گیر کو بلوا کر مکمل کروائی اور اس کے بعد پھر سے ملازمت ڈھونڈنے لگ گیا۔ پھر اسے لائبریری کی جاب ملی اور وہیں سے اس کو کتابیں پڑھنے کی عادت پڑی۔ کئی ہزار کتابیں پڑھ کر اور اپنی پسند کی چند سو کتابیں جمع کر کے وہ خوش تھا۔ لائبریری اب کچھ سالوں سے بند تھی۔ اور اب وہ پرائیویٹ جابز پر گزارہ کر رہا تھا۔ اس کی دلی خواہش تھی کہ وہ ٹیٹا کے لیے ایک اچھی سی گاڑی لے سکے مگر اس کی جیب نے بھی اسے یہ اجازت نہیں دی۔ ٹیٹا کو بچپن سے گاڑیوں کا بہت شوق تھا۔ اور ہر بار وہ اپنے دوست سمیل کی کھٹار لے آیا کرتا تھا۔ رات دیر تک بستر پر لیٹا وہ بیٹی کے متعلق سوچے گیا۔

”آپ نے اسے سیل فون نہیں دیا؟“  
”نہیں، ابھی تک تو نہیں..... اسے خود بھی زیادہ شوق نہیں تھا؟“  
”ویسے اسے پڑھائی کا بھی شوق نہیں ہے۔“ وہ ہلکے کرتے ہوئے بولی۔  
”اسے صرف انگریزی فلمیں دیکھنے کا شوق ہے اور مجھے باتوں میں ہرانے کا۔“ وہ ہنستے ہوئے کہنے لگا۔  
”دونوں باتیں کرتے ہوئے میں اندر وارڈ میں آئے تھے۔ رات گئے ان کی طبیعت کچھ سنبھلی۔ ڈاکٹر زنے دواؤں کے نسخے لکھے اور انہیں ڈسچارج کیا۔ وہ ایوبنس میں گھر تک اس کے ساتھ آگیا تھا۔“  
”اب یہ کافی دیر سوتے رہیں گے۔ آپ فکر نہیں کیجیے گا۔“

”یہ سارا دن تو سوتے ہیں۔ دن میں کام والی ماسی کو پیسے دے کر یہاں بیٹھا جاتی ہوئی سچی کالج جاپانی ہوں۔ ڈاکٹر کہتے ہیں ان کی ہڈیوں کا آئرن ختم ہو گیا ہے۔ پیچھے پڑے کمزور ہیں، گردے بھی متاثر ہیں۔ ان میں بھی کھار بولنے کی بھی طاقت نہیں ہوتی۔“ وہ کمرے سے باہر آ کر تھکے ہوئے انداز میں اسے بتا رہی تھی۔  
”اللہ نے آپ کو بہت ہمت دی ہوئی ہے۔ مزید حوصلہ رکھیں۔ حالانکہ جانتا ہوں کہ لفظی تسلی کچھ نہیں دیتی۔“  
”آپ بہت اچھے ہیں آدم۔“ وہ صاحب کہتے، کہتے رہی۔  
”اللہ آپ کو خوش رکھے۔“ وہ اس دعا پر کھوکھلی ہنسی ہنس دیا۔  
اور اسے جواباً تسلی دے کر اپنا پرسٹل فون نمبر دے کر کہا..... ”اگر بھی ضرورت ہو تو فون کر لیجیے گا میں حاضر ہو جاؤں گا۔“  
وہ لفظوں سے اس کا شکریہ ادا نہیں کر پا رہی تھی۔  
☆☆☆  
وہ رات دیر سے گھر آیا تو ٹیٹا کو سوتا ہوا پا کر اپنے کمرے میں چلا آیا۔  
یہ تین کمروں کا اک درمیانہ گھر تھا۔ ایک کمرہ

”اب مجھے جو سوچنا ہو گا میں سوچوں گا۔ آپ کہہ دیں ایسے ہی جیسے میں نے آپ کو کتنے مرے سے کڑوی باتیں بتا دیں۔“  
”یہ فون تو آپ کو خیر آتا ہے..... مگر..... بات ہے کہ وہ ایک لڑکا ہے..... اب اس عمر کی پسند کے بھی کیا کہنے بس زیادہ ڈراے فلمیں دیکھ کر بچے، بچیوں کا دماغ خراب ہو جاتا ہے۔“  
”ایک لڑکا ہے..... اس کے بعد۔“ آدم اسے بنیادی بات کی طرف خود لے آیا۔  
”جی ایک لڑکا ہے جو ٹیٹا کو بقول اس کے پسند کرتا ہے۔ میں نے ایک دو بار اس کی چٹ پکڑی ہے۔ اور مجھے لگتا ہے کہ ٹیٹا بھی اس میں غیر ضروری دلچسپی لے رہی ہے۔“  
”یہ کب سے ہے؟“  
”شاید پچھلے نو سالوں سے۔ ویسے آپ پہلے وعدہ کریں کہ آپ گھر جا کر ٹیٹا کو ڈانٹیں گے نہیں؟ اس طرح وہ مجھے مزید برا سمجھے گی۔ پہلے ہی اس نے مجھے باتوں، باتوں میں بہت کچھ جتایا ہوا ہے۔“  
”آپ فکر نہ کریں..... میں بس اس سے بات کر لوں گا۔“  
”ٹھیک ہے کر لیجیے گا مگر جذباتی ہو کر نہیں۔“  
”میں اسے سر چڑھا کر پچھتا رہا ہوں۔“  
”اوہو، میں نے آپ کو فکر مند کر دیا ناں۔“ وہ پریشان ہو گئی تھی۔  
”نہیں..... بلکہ خوش کر دیا۔“  
”آپ طنز کر رہے ہیں؟“  
”نہیں، مذاق کر رہا ہوں۔“  
”جلس میں ابا کو دیکھ لوں۔“ وہ انھی۔  
”میں بھی ساتھ چلتا ہوں..... ویسے انہیں غنودگی کی دوا دی گئی ہے، وہ سو رہے ہوں گے۔“  
”آپ کو اب جانا چاہیے آدم صاحب..... ٹیٹا گھر پر اکیلی ہوگی۔“  
”اسے آج میں نے اس کی ماں کے گھر بھیجا ہے ملنے کے لیے رات تک لوٹے گی۔“

گیا۔ اور اس نے مجھ سے علیحدگی کا مطالبہ کر دیا۔ میں یہ کیسے گوارا کرتا کہ وہ میرے ساتھ رہ کر ناخوش ہو..... اور مجھے کوئی رہے اور مجھے برا بھلا کہتی رہے۔ مجھے بس اس سے یہ شکایت تھی کہ اس نے ٹیٹا کو سوتا چھوڑ دیا تھا۔ پھر بعد میں کچھ دن اپنے ساتھ رکھا۔ مگر ٹیٹا میرے بغیر بھی نہیں رہ سکتی تھی۔ کچھ مہینے اسی کشمکش میں گزرے پھر اس کی شادی ہو گئی۔ اور میں ٹیٹا کو اپنے ساتھ لے آیا۔ ٹیٹا بہت روتی اس کے لیے..... کئی دن روتی رہی..... بڑی مشکل سے سنبھلی تھی۔ اور شاہینہ تو جیسے سب کچھ بھول بیٹھی تھی۔ پھر شاہینہ تو کئی سال تک اسے بالکل بھول ہی گئی۔ اس کے ہاں بیٹا ہوا..... اس کے بعد اس کی پوسٹنگ دوبارہ اسی شہر میں ہوئی وہ فیملی کے ساتھ یہاں شفٹ ہو گئی۔ ایک دو بار اسکول میں ٹیٹا سے ملنے آئی تھی بس اب تو مہینوں بعد اسے یاد آتا ہے بیٹی سے ملنا..... اور مجھے ٹیٹا کو ہر دفعہ بہت سارا سمجھنا پڑتا ہے۔ میں نہیں جانتا کہ اس کے دل میں ماں کی طرف سے نفرت بیٹھے۔“  
”آدم..... آپ نے دوسری شادی کیوں نہیں کی؟“  
”ٹیٹا کے لیے..... میں کبھی اس کے ساتھ یہ زیادتی نہیں کر پاتا، میں اسے خوش رکھنا چاہتا تھا۔ میرے زیادہ لاڈ پیار اور دوستی نے اسے کچھ چلبلا سنا دیا ہے۔“  
”ٹیٹا کے بارے میں کیا سوچا ہے آپ نے؟“  
”کہتا تو اسے روز ہوں مگر حقیقت یہی ہے کہ ابھی وہ بہت چھوٹی ہے۔“  
”آپ ٹھیک کہتے ہیں..... مگر مجھے آپ سے کچھ پوچھنا تھا اس کے بارے میں۔“  
”جی پوچھیں۔“ اس کی آنکھیں خشک ہو چکی تھیں مگر دھیان اس کا اب بھی وارڈ کی طرف ہی لگا ہوا تھا۔  
”وہ دراصل..... دیکھیں یہ حیرت کی بات تو نہیں ہے مگر..... اب آپ یہ نہ سمجھیے گا کہ وہ..... وہ یقیناً ابھی بچی ہے مگر دیکھیں آج کل کے حالات بھی تو.....“ وہ کہتے ہوئے جھجک رہی تھی۔  
آدم بے اختیاری سے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے مسکرایا۔

کی ضرورت نہیں ہے۔“  
 ”دیکھیں گے، ان لوگوں کو تو آجانے دیں۔ پھر دیکھتے ہیں۔ آپ چھوڑیں یہ بتائیں کہ ابا کیسے ہیں آپ کے؟“ یہ پوچھتے ہی وہ نرم ہو گیا تھا۔  
 ”وہ ویسے ہی ہیں۔“  
 ”امبرین..... ایک بات کہوں؟ آپ اپنے لیے بھی کچھ سوچیں۔“  
 ”بھلا کیا سوچوں؟“  
 ”شادی کر لیں۔“  
 ”وہ کھوٹا ہنسی۔“  
 ”آپ زیادتی کر رہی ہیں اپنے ساتھ.....“  
 ”اس کا وقت نہیں ہے فی الحال.....“  
 ”وقت کسی کا انتظار نہیں کرتا امبرین۔“  
 ”مجھے پتا ہے آدم صاحب..... مگر میں اپنے باپ کو تنہا نہیں چھوڑ سکتی۔ میں اگر ان کی جگہ ہوتی تو یقیناً سوئیچوں کے بعد بھی وہ مجھے جتنے مجھے اپنے ساتھ رکھتے اور میرا سہارا بننے۔ میں نے کچھ غلط نہیں کیا..... اور کچھ الگ بھی نہیں..... وہی جو والدین ہمارے لیے کرتے ہیں، اس سب کا کچھ حصہ ہی۔“  
 ”اگر ٹھیک وقت پر شادی ہو جاتی تو آپ اس امتحان میں نہ کھڑی ہوتیں..... یا پھر یہ کہ آپ کو آسانی ہو جاتی..... کسی کا ساتھ..... یا پھر..... حوصلہ، ساتھ پا کر۔“  
 ”اگر شادی ہو چکی ہوتی تو کیا ہو جاتا..... زیادہ سے زیادہ اپنے بچے پال رہی ہوتی..... اس حسرت میں کہ یہ بڑے ہو کر میرا سہارا بنیں گے۔ تو وہ کیوں نہیں جو تب میرا سہارا تھا، جب میں سمجھتی تھی۔ چھوٹی تھی..... ان کا کیا تصور کہ کوئی اور ان کا سہارا نہیں ہے۔“ وہ بڑے پتے کی بات کہہ رہی تھی۔ ”چلتی ہوں..... ابا بلارہے ہیں۔“ پھر بیڑھیوں سے ٹپن کے ڈبے کی لڑکتی ہوئی ٹھن ٹھانٹھن کی آوازیں تھیں اور وہ تھی۔ وہ فون رکھ کر چلی گئی۔  
 اور اس کے کانوں میں ٹھن، ٹھن کی آوازیں گونجتی گئیں۔ اس نے فیصلہ کیا اپنے بڑھاپے سے پہلے اپنی بیٹی کو بیاہ دے گا، وہ بھی اپنے بڑھاپے کا بوجھ اس

”کہوں گی۔“  
 ”کس حوالے سے؟ آپ کو کہنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے ابا..... ابا نے کہا ہے عمار کی فیملی کو بلالو.....“  
 ”اوہ.....“ وہ پریشان ہو گئی۔ ”اور وہ آئیں گے، میرا مطلب ہے عمار فیملی لائے گا؟“  
 ”ظاہر ہے یہ اب اس پر ہے۔“ وہ ذرا بے پروائی سے کہہ کر نکل گئی تھی۔  
 گھر جا کر اس نے فوری طور پر آدم کو فون کیا تھا۔  
 ”عمر نہیں ہے اس کی آدم، آپ نے بہت زیادتی کی ہے۔“  
 ”اس کے زلزل وہ خود بخوتے گی تو ہی سدھرے گی۔“  
 ”اور اس کے پیچھے وہ تھکے گی۔ فرض کریں وہ آجاتے ہیں اور آپ کو یہ رشتہ کرنا پڑ جاتا ہے.....؟“ وہ فکر مند تھی۔  
 ”عمار کے پیچھے کچھ نہیں ہے..... باپ اس کا سرکاری ملازم ہے۔ بڑی مشکل سے بیٹے کو پڑھایا ہے، اب تک وہ پاؤں پر نہ کھڑا ہو جائے دشوار ہوگا۔“  
 ”اسے خود دیکھنا چاہیے سب۔“ آدم نے کہا۔  
 ”ایسا نہیں ہوتا..... بچی ہے وہ ابھی..... مسائل کا سامنا نہیں کر پائے گی۔“  
 ”پہلے بھی تو چھوٹی عمروں میں لڑکیوں کی شادیاں ہو جاتی تھیں اب بھی ہوتی ہیں، اس کی عمر تو اچھی بھلی ہے۔“  
 ”تب بھی وہ معصوم ہے آدم صاحب۔“ اس کے لہجے میں آزدگی تھی۔ ”میں آپ کو بتا رہی ہوں کہ کوئی انتہائی قدم نہ اٹھائیے گا فوراً اسے۔“  
 ”آپ ناحق پریشان ہو رہی ہیں امبرین۔“  
 ”میں بالکل ٹھیک پریشان ہو رہی ہوں۔ مجھے تو لگتا ہے کہ میں نے آخر بتایا کیوں آپ کو۔“  
 ”اب اگر میرا رویہ اس کے برعکس ہوتا تو آپ فون کر کے مجھے یہ سمجھا رہی ہوتیں کہ زندگی اس کی بے وقوفی پر مشتمل ہے، مجھے اعتراض نہیں کرنا چاہیے۔ اپنا“  
 ”میں بس آپ کو ہی سمجھا رہی ہوں کہ اتنی جلدی

”شٹ اپ.....“ وہ چلا یا۔  
 ”آپ شاد کر کے لگے ہیں، ابھی باپ ابا نہیں کرتے۔“  
 ”بکومت..... اچھی بیٹیاں بھی ایسا نہیں کرتیں میں کہہ رہا ہوں صاف، صاف بتاؤ، پسند کرتی ہوں۔“  
 ”وہ چپکی رہی۔ چپ کو بھی تو رضامندی سمجھا جاتا ہے۔“  
 ”شرم نہیں آئی، پڑھائی تو مکمل ہونے دی ہوئی۔“  
 ”میں نے کیا کیا ہے بھلا؟“ وہ چائے کا آدھا کپ چھوڑ کر اٹھی۔  
 ”کالج جاری ہوں دیر ہو جائے گی۔“ اتنا کہہ کر وہ نکل گئی۔  
 وہ دروازے تک گیا۔ اسے چھوڑ کر دروازہ بند کیا۔ اور میز تک واپس آیا۔ اسے سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ مسئلہ کیسے حل ہوگا۔ آگے بڑھے گا یا رک جائے گا۔ وہ چاہتا تھا کہ وہ پڑھے۔ وہ اپنی ماں سے مختلف تھی۔ اس پر تو کام، ترقی اور پڑھائی کا بھوت سوار رہتا تھا۔ کسی سطح پر اس نے اپنی بیوی کو آئیڈیالائز بھی کیا تھا۔ اس میں بہت معاملہ بندی تھی۔  
 سوائے اس کی ذات میں دلچسپی کے وہ ہر معاملے میں اچھی تھی۔ یہی ایک فالت تھا، جس نے رشتے میں خللی برقرار رکھنے نہیں دی۔  
 اگلے دن اسے امبرین سے بات کرنے کا موقع مل گیا تھا۔  
 ”آپ کا شکریہ ادا کرتا تھا۔“  
 ”کس سلسلے میں؟“  
 ”ابا سے بات ہوئی تھی..... آپ نے تو میرا کام ہی آسان کر دیا۔ جو بات کہنے کے لیے مجھے دقت تھی، وہ آپ نے بتا کر میری جان چھڑائی۔“  
 ”امبرین اس کے لہجے کے طنز کو اچھی طرح محسوس کر رہی تھی اسی لیے اس کی بات پر ٹھیک سے یقین نہیں کر سکتی تھی۔  
 ”انہوں نے تمہیں ڈانٹا۔“  
 ”نہیں..... قطعاً نہیں۔ وہ تو خوش ہوئے تھے۔“  
 ”خوش تو نہیں ہوئے ہوں گے۔ میں انہیں

”وہ کب اتنی بڑی ہوئی..... کہ اسے کوئی پسند کرنے لگا یا پھر وہ کسی کو.....“ سوچتے ہی عجیب لگتا..... بھی وہ صبح ناشتے پر اسے بغور دیکھے گیا۔  
 ”رات کب آئے تھے ابا؟“ وہ چائے بنا کر لائی تھی۔  
 ”کانی دیر ہو گئی تھی۔“  
 ”تقریباً؟“ وہ پہلے سے ہی چڑھائی کر لیتی تھی۔  
 ”تقریباً ڈھائی، تین بج چکے تھے شاید۔“  
 ”ویسے بتائیں آپ رہ کہاں گئے تھے؟“  
 ”ضروری نہیں سمجھتا، تم اٹھو اور کالج کے لیے تیار ہو جاؤ، دیر ہو رہی ہے۔“ ناشتا کر سیکنے کے بعد وہ اٹھ گیا۔  
 اسے میں دین کا بارن سنا دیا تھا۔  
 ”تو مطلب آپ نہیں بتائیں گے؟“  
 ”عمار کون ہے؟“ اس نے ٹیٹا کی بات نظر انداز کرتے ہوئے پوچھا۔  
 ”نیچر کے ہاں گئے تھے نا؟“ اس نے ٹھنڈی سانس لی۔  
 ”بولو عمار کون ہے؟“  
 ”میرے ساتھ پڑھتا ہے۔“  
 ”اس کے علاوہ؟“  
 ”کچھ نہیں۔“  
 ”تم نے مجھ سے جھوٹ نہیں بولا کبھی۔“  
 ”آپ نے بھی کبھی نہیں بولا تھا آج سے کچھ دیر پہلے۔“  
 ”وہ جھوٹ نہیں تھا۔ میں نے کہا میں بتانا ضروری نہیں سمجھتا۔“  
 ”مگر میں بھی یہی کہوں؟“  
 ”نہیں کہہ سکتیں، میں تمہارا باپ ہوں۔“  
 ”اور میں آپ کی بیٹی ہوں۔“  
 ”صاف، صاف بتاؤ۔“  
 ”اس نے کہا میں تمہیں پسند کرتا ہوں۔“  
 ”اور کیا کہا؟“  
 ”اور کچھ نہیں.....“ اب جیسے حلق میں ٹوسٹ کا پیس اٹکنے لگا تھا۔  
 ”چٹ لکھی؟“  
 ”اس حد تک بات ہوئی لن سے؟“ وہ چونک گئی۔

”اور اب کیا ہے ابا؟“  
 ”اب کچھ نہیں ہے بیٹا۔“  
 ”آپ شادی کر لیں۔ اب میں بڑی ہو گئی ہوں۔“  
 ”میرے پاس کچھ نہیں کسی کو دینے کے لیے۔ یہاں تک کہ دل بھی نہیں۔“  
 ”آپ ایسے کیوں ہو گئے ہیں، ابھی تک تو چالیس کے بھی نہیں ہوئے آپ۔“  
 ”اس کے لیے عمر نہیں، حالات اور واقعات کا قصور ہوتا ہے۔“  
 ”چھوڑیں ناں۔۔۔ کوئی اچھی بات کریں۔“  
 اور پھر وہ جب تک باتیں کرتے رہے، جب تک ٹینا کو نیند نہیں آگئی۔

☆☆☆

وہ اس کی آواز اتنے سالوں بعد بھی پہچان گیا تھا۔  
 ”شاہینہ؟ خیریت ہے؟“  
 ”آدم۔۔۔ سب خیریت ہے؟“ وہ رک، رک کر بولی تھی۔  
 ”کیسے نوں کیا؟ ٹینا کا لُج مچی ہوئی ہے۔“  
 ”معلوم ہے اس وقت وہ کالج میں ہوئی ہے، تم سے کچھ بات کرتی ہے۔“  
 ”سن رہا ہوں۔“ کتنا خالی لہجہ تھا۔  
 ”پلیز کوئی پرانی بات نہیں ہوگی۔“ آدم نے اس کے بولنے سے پہلے ٹوک دیا تھا۔  
 ”تم کیسے ہو؟ اب یہ مت کہنا کہ جو کہتا چاہتی تھیں وہ کہو کیونکہ اس کے لیے تم مجھے منع کر چکے ہو۔ ٹینا۔۔۔ کسی لڑکے کو پسند کرتی ہے۔ تمہیں بتایا ہوگا اس نے؟“ اسے یہ گفتگو بے معنی سی لگی۔

”ہاں بتایا تھا اس نے۔۔۔ پھر۔۔۔؟“  
 ”پھر تمہارا کیا خیال ہے؟“ وہ بولی۔  
 ”یہ پوچھنے کے لیے تم نے وقت نکالا ہے کہ میرا کیا خیال ہے؟“

”میں مانتی ہوں میں نے ماضی میں تمہارے

”ٹینا!“ آواز پوچھل تھی۔  
 ”جی ابا۔۔۔۔۔!“  
 ”ماں کی کمی محسوس ہوتی ہے کیا؟“  
 ”ہاں نہیں۔۔۔ شاید وہ ہوتیں تو آپ مجھ سے اتنا پیار نہیں کرتے۔“  
 ”میں ہر حالت میں تم سے پیار کرتا رہے۔“  
 ”ابا آپ ابھی تک ان سے محبت کرتے ہیں ناں۔۔۔۔۔“  
 ”شاید۔۔۔ کھوکھلا لہجہ لگا۔  
 ”ایک راز کی بات بتاؤں؟“  
 ”ہوں۔۔۔۔۔ بتاؤ۔“  
 ”وہ بھی کرتی ہیں۔“ اس کا ٹینا کے سر پر ہتھکتا ہاتھ رک گیا۔

”ہاں یہ سچ ہے ابا۔“  
 وہ چپ تھا۔۔۔ اندر کہیں جیسے کچھ ٹوٹا پھر بڑا۔۔۔ پھر ٹوٹ گیا۔ عجیب کیفیت تھی۔  
 ”اس نے تم سے کہا؟“  
 ”سب کچھ کہنا نہیں ہوتا ابا۔۔۔ کچھ تو محسوس بھی کیا جاسکتا ہے ناں۔۔۔۔۔!“

”ایک بات پوچھوں؟“ بڑی دیر بعد وہ بولا۔  
 ”پوچھیں؟“

”تمہیں عماد بہت پسند تھا؟“  
 ”بس پسند تھا۔۔۔ بہت کا نہیں پتا۔“  
 ”تمہاری اس سے شادی کروادوں؟“  
 ”نہیں ابھی نہیں۔۔۔۔۔“

”تمہیں یقین ہے وہ لوٹے گا۔“  
 ”پتا نہیں۔۔۔۔۔ اس کا یقین شاید خود اسے بھی نہیں۔۔۔۔۔ اچھا اگر اس کا یقین آپ کو نہ ہو تو کیا انتظار کرنا چاہیے۔“

”یقین اور انتظار الگ ہیں کیا؟ جب یقین ہوتا ہے جب ہی تو انتظار کیا جاتا ہے ناں۔۔۔۔۔“ وہ اس کی بات سمجھنا چاہتا تھا۔

”یقین اور انتظار الگ نہ ہوتا تو۔۔۔۔۔ اماں کی۔۔۔۔۔ دل کا یقین یا کر بھی آپ ان کے پلٹنے کا انتظار نہ کرتے۔“  
 ”ہاں مگر یہ انتظار اب رک چکا ہے ٹینا۔“

”مجھے شادی نہیں کرنی ابا۔“  
 ”پھر کیا کرتا ہے؟“  
 ”پڑھنا ہے۔۔۔۔۔ بس پڑھنا ہی ہے فی الحال۔۔۔۔۔“  
 ”سوچ لو۔۔۔ پھر کوئی ابا خال م ساج نکلا۔“  
 ”نہیں کہوں گی۔۔۔ بلکہ ابا تو اس سے بھی چار ہاتھ آگے نکلا۔۔۔۔۔“  
 ”ہیں۔۔۔۔۔؟“ مصنوعی حیرت سے پوچھا۔  
 ”جی۔۔۔۔۔“ مسکراہٹ روکی۔  
 ”چھ۔۔۔۔۔ وہ مسکرایا۔  
 ”تمہیں کیا پتا تمہاری یہ۔۔۔ مسکراہٹ مجھے کتنی عزیز ہے۔“ وہ اسے نکلے گیا۔  
 ”عماد کو کیا کہا؟“

”اسے کہہ دیا جا کر پڑھو اگر ملازمت ملنے کے بعد تم میرے گھر آئے تو پکا۔۔۔۔۔ ورنہ تم پرزدنیں۔۔۔۔۔ بیچارہ مجبور ہے۔“  
 ”تو مطلب کہ بھوت اتر گیا؟“ وہ اٹھ کر بیٹھ گیا۔  
 ”مطلب کہ یہ سب آپ کی حال تھی؟“  
 ”نہیں بھئی، میں نے تمہیں فیصلے کا اختیار دے دیا ہے۔“

”آپ گوٹ میری جیب میں ڈال کر مطمئن ہیں؟“ اس نے شکایت کیا۔  
 ”تمہارا ابا ہوں۔“  
 ”میں بھی بنی ہوں آپ کی۔۔۔۔۔“  
 ”پتا ہے مجھے۔۔۔۔۔ مجھ سے کم کبھی ہوئی ہو۔“  
 ”چار ہاتھ آگے ہوں آپ سے۔۔۔۔۔ ہاں۔“

”ہاں صرف زبان چلانے میں۔۔۔۔۔ عقل۔۔۔۔۔“  
 ”مان مئی آپ کو ابا۔۔۔۔۔ منہ بسور کروہ لیٹ گئی۔“  
 ”سب تمہارے لیے ہی کرتا ہوں۔۔۔۔۔ مانو یا نہ مانو۔“  
 ”بڑے سازشی ہیں آپ۔۔۔۔۔“

”پھر سے ابا کو الزام دے رہی ہو۔۔۔۔۔“  
 ”میں تو بھی تم ہی آپ صرف میرے آدم، میرے دوست ہیں۔ بار بار ابا نکل آتے ہیں۔“  
 ”میں تمہارا دوست بھی ہوں اور ابا بھی سمجھیں۔“  
 ”اور آپ میری ماں بھی ہیں۔“

پر نہیں ڈالے گا۔ یہی سوچ تھی جس کے تحت اس نے عماد کے گھر والوں کو بلایا مگر مطمئن نہ ہو سکا تھا۔  
 فی الحال بات آئی گئی ہو گئی۔ ان سے وقت لیا گیا۔ انہوں نے بھی کہا تھا کہ عماد کی تعلیم مکمل ہو جائے اور ملازمت کے بعد ہی وہ شادی کر پائیں گے۔ وہ ٹینا کو گھر میں چھوٹے، چھوٹے کام خود سکھانے لگا، وہ سب کام جو ایک ماں اپنی بیٹی کو سکھاتی ہے۔ کھانا پکانا، روٹی بیلنا، مسالا پینا۔۔۔۔۔ یہاں تک کہ گھر کی صفائی اور کپڑے دھونا وغیرہ۔ جو ہمیشہ اس نے خود کیا یا کروایا تھا۔  
 ”ارے کپڑے ٹھیک سے نہیں ڈالے، اوہو کھٹکا لے بھی نہیں۔۔۔۔۔ دیکھو صابن کا پانی ٹپک رہا ہے۔ اور کپڑے تار پر ڈالنے کا بھی طریقہ ہوتا ہے۔ اس طرح تو لباس سوکھے گا کم اور سڑے گا زیادہ۔“  
 ”آف ابا۔۔۔۔۔ مجھے نہیں کرنا یہ سب۔“  
 ایک دن تو وہ رو پڑی۔ ”مجھے شادی نہیں کرنی۔ کبھی نہیں کرنی۔“

”کیوں۔۔۔۔۔ کیا ہوا؟“  
 ”شادی کرنے کے لیے اگر صبح سے لے کر بستر پر جا بے تک کتوں کی طرح کام کرنا پڑے گا تو مجھے معافی دیں۔“  
 ”مثال ملت دی تم نے۔۔۔۔۔ کتے تو آوارہ گھومتے ہیں۔ گدھے کام کرتے ہیں۔“ وہ اطمینان سے آکر بیٹھ گیا۔  
 ”مجھے گدھے سے کتنا بننا منظور ہے۔“

”انسان بنو انسان۔۔۔۔۔“  
 ”ابا۔۔۔۔۔ پلیز۔۔۔۔۔ ان کے کندھے سے سر نکال کر وہ رو پڑی۔  
 ”مجھ سے ایسا سلوک مت کریں کہ مجھے گتے میری ماں نہیں ہے۔“  
 وہ خود بھی رو پڑا تھا۔

”میں تمہیں یہ سب اس لیے سکھانا چاہ رہا تھا کہ تمہیں آگے جا کر دقت نہ ہو۔ تم کہیں یہ نہ سوچو کہ ماں ہوئی تو سب کچھ بتاتی، سکھاتی، تمہیں اب پتا لگا مائیں ایسا کیوں کرتی ہیں۔“ وہ اپنے آنسو پوچھنے لگا۔ پھر اس کی آنکھیں صاف کیں۔

اور کچھ راشن کے بیک ڈبے۔  
”میں اداہنگی کروں گی۔“ امبرین نے اودھ  
کھلے منہ سے جھانکتی اشیاء کے پیکٹس دیکھ کر اندازہ لگایا۔  
”بیٹھے کے لیے نہیں ہوگی؟“ وہ اس بات پر ہنس دیا۔  
”کھنے کی کیا ضرورت ہے؟ بیٹھ جائیں۔“

نیل دونوں کے درمیان کوئی تعلق دریافت  
کرنے کی سوچ میں خاموش کھڑا دیکھ رہا تھا۔ اسے  
امبرین نے ابھی تک بیٹھنے کے لیے نہیں کہا تھا۔  
آدم بیٹھ گیا تھا۔ مگر نیل کی موجودگی کو اب محسوس  
کر کے وہ مزید کچھ نہ بولا۔

”میں بھر آؤں گا۔“ نیل نے اتنا کہا اور جانے کو بڑھا۔  
”کسی چیز کی ضرورت ہو تو بتا دیتا۔“ نہ چاہتے  
ہوئے بھی امبرین کے چہرے پر اس کے جملے سے طنز یہ  
مسکراہٹ کھیل گئی۔ اس کے چاتے ہی اس نے دروازہ  
بند کر دیا اور اسی طرف آگئی جہاں آدم بیٹھا ہوا تھا۔

”تم بیٹھنا بس دو منٹ میں آتی ہوں۔“  
”میں چلوں ساتھ، ان کے پڑے تبدیل کرنے  
ہوں گے؟“ وہ اٹھا۔

”نہیں اس کی ضرورت نہیں۔“ وہ پھیکا سا  
مسکرائی۔ ”تم بس بیٹھو میں ابھی آتی ہوں۔“ وہ  
سیڑھیاں چڑھ گئی۔

وہ خاموشی سے بیٹھ گیا اور سامنے پڑا ہفتہ پرانا  
باسی اخبار اٹھا کر پڑھنے لگا۔

وہ آئی تو آدم اخبار پڑھنے میں متنبہک تھا۔۔۔  
اس نے اس کے لائے ہوئے سامان پر تعصیلی نظر ڈالی  
اور انہیں جگہوں پر رکھنے لگی اس نے اندازہ لگایا، کوئی  
مہینے بھر کا راشن تو ضرور تھا۔

”تم اتنی چیزیں لائے ہو۔۔۔ میں کیا کہوں تمہیں۔“  
”کچھ مت کہو۔۔۔ بس دوست سمجھ کر رکھ لو۔“

”دوست۔۔۔“ ابھی تک اس کے ساتھ ہوئی  
ملاقاتوں میں وہ اپنے اور اس کے درمیان کے  
ہمدردانہ تعلق کو کوئی نام نہیں دے سکتی تھی۔

”دوست! اچھا ہے یہ۔“ زرباب دہرا کر وہ مسکرائی۔  
”اس ایک لفظ میں کتنی پناہ ہے، کتنی آسودگی ہے۔“

اُدھر۔۔۔ اور ہم سمجھتے ہیں کہ ہم چھوڑ آئے ہیں جبکہ گزرا  
ہوا ہر لمحہ ہمارے ساتھ ہی سفر کرتا ہے۔

ظاہری طور پر کوئی زندگی سے چلا گیا پر اندر  
کہیں۔۔۔ کچھ نہ کچھ رہ جاتا ہے۔ انسان خود کو مکمل میسر  
کیوں نہیں ہوتا۔ اسے خود سے بھی اس سوال کا جواب  
نہیں ملتا تھا۔

☆☆☆

وہ نیل تھا، امبرین کے دروازے پر آیا تھا۔  
اتنے سالوں بعد، وہ پوچھنا چاہتی تھی کہ کیا اپنے  
کے لیے آئے ہو مگر صرف اتنا ہی کہہ سکی۔ ”اندرا جاؤ۔“  
”کیسی ہو؟“ وہ نظر ملائے بغیر پوچھ رہا تھا۔  
”کیسے آتا ہوا؟“ اس کا سوال نظر انداز کرتے  
ہوئے اس نے خود سوال کر لیا۔

”خالو اب کیسے ہیں؟“ پوچھ کر اب وہ اندرا چکا تھا۔  
”کوئی ضروری بات کہی ہے تو بتا دو؟“ اس کے  
انداز میں سرد مہری تھی۔ نجی اس کے سوال کا جواب نہ دیا۔  
”تم سے۔۔۔ معافی مانگتی تھی۔“  
”کس لیے۔۔۔؟“

”میں نے تمہیں چھوڑ دیا تھا۔“

”بہت پرانی بات ہے یہ۔۔۔“ اس نے سر دآہ بھری۔  
اوپر کھٹکا ہوا۔۔۔ وہ ابھی۔۔۔ بغیر کچھ کہے اوپر  
پلی گئی۔ وہ بیٹھا رہا۔

دروازے پر دستک ہوئی تھی۔

وہ اٹھا اور دروازہ کھولا تو آدم کھڑا تھا دونوں  
ایک دوسرے کے لیے اجنبی تھے۔  
”جی۔۔۔؟“

”وہ امبرین صاحبہ۔۔۔ شفٹ کر گئیں شاید۔۔۔“

زرباب بڑبڑایا۔۔۔ نجی امبرین سیڑھیوں سے اترتی ہوئی  
لکائی دی۔ اس نے آدم کو دیکھ لیا تھا۔ مسکرا کر سلام کیا  
اور اندر آنے کو کہا۔

وہ ایک تھیلے لے اندر آیا۔ ساتھ فروٹ باسکٹ تھی۔  
”اس کی کیا ضرورت تھی!“ امبرین شرمندہ سی  
ہوئی۔ اس نے بغیر کچھ کہے میز پر باسکٹ رکھی، تھیلے  
میں کچھ ضروری چیزیں تھیں، کچھ کھانے پینے کا سامان

”آدمی عمر تو نکال چکا ہوں، اب تعریف ملے  
ہوئے خوشی نہیں ہوتی، بس آ جاتی ہے۔“

”نہیں۔۔۔ تم بیک ہو۔۔۔ شادی کر لو۔“

”شکر یہ!“ وہ ہنسا۔۔۔ ”پہلے بیٹا اپنے گھر کی  
ہو جائے پھر دیکھیں گے۔“

”تو تم بیٹا کی شادی کر کے گھومنے چلے جانا۔  
یا دے تمہاری ورلڈ ٹریڈنگ کو اپنا پیشہ۔“  
”اتنے پیسے میں بھی نہیں لاسکتا۔“

”ایک دنیا ہمارے اندر ہوتی ہے جو تم گھوم چکے  
ہو دیکھ چکے ہو، سمجھ چکے ہو۔“

”تمہیں خوش کرنا آ گیا ہے۔“ وہ پھر سے ہنس  
دیا، وہ بھی ہنسی۔

”اپنا خیال رکھنا۔“

”رکھتا ہوں۔۔۔ مجھ سے زیادہ بیٹی رکھتی ہے۔ تم  
بھی رکھنا اپنا خیال۔۔۔“

”کوشش تو روز کرتی ہوں۔“

”اللہ حافظ۔۔۔!“ وہ ہنس نہ سکی۔

دوسری طرف سے بھی اللہ حافظ۔۔۔ کہتے ہوئے  
فون لائن ساکت ہو گئی۔

دل بو جھل تھا۔۔۔ زندگی شاید کبھی ہاتھ نہیں آتی۔  
اور اگر آ بھی جائے تب بھی کتنی مشکل ہوتی ہے۔ سب  
اپنے جیسے دوسرے انسانوں کے لیے ہی جیتے  
ہیں۔۔۔ تب بھی ایک دوسرے کو دکھ دیتے ہیں۔۔۔ اور  
نہیں ایک دوسرے کی خوشی کے لیے جیون تک ہار  
دیتے ہیں مگر تب بھی ہاتھ خالی ہوتے ہیں۔

وہ سمجھ نہیں سکا کہ اتنے عرصے بعد انسان اگر  
پلٹ کر ایک دوسرے کو دیکھتا ہے تو کیا چاہتا ہے؟ کچھ  
خود سے دینا۔۔۔ یا کچھ اس سے لینا۔۔۔ اور جب دے  
بھی نہ سکو۔۔۔ اور لے بھی نہ سکو۔۔۔ ہاتھ بھی خالی ہوں  
اور دل بھی۔۔۔ ذہن لٹی کر رہا ہو تب بھی دھیان کی  
میں انک گیا ہوتا ہے۔ اور جہاں انکا ہوا ہوتا ہے۔  
وہاں پھنس ہی جاتا ہے۔ نکالنا چاہو بھی تو ٹوٹ  
پھوٹ کر لکھتا ہے۔ چھوٹ نہیں پاتا۔۔۔ بٹ جاتا  
ہے۔ تقسیم ہو جاتا ہے۔ آدھا، آدھا۔۔۔ آدھا

ساتھ بہت زیادتی کی تھی مگر۔۔۔“ کہتے ہوئے وہ رکی  
مگر کیوں یہ وہ پوچھ نہ سکا۔

اور وہ بتا بھی نہ سکی۔

”آدم۔۔۔!“ جیسے دل خالی تھا۔۔۔ بل میں  
بھرنے لگا، پرانی باتوں کے غبار سے۔۔۔ وہ کچھ کہتا  
چاہتی تھی۔۔۔ اور کچھ کہتے، کہتے بہت کچھ بھی جاتی۔  
زندگی میں کبھی انسان رنجش کو دھونا بھی چاہے تو  
وقت کو کیسے پلائے۔ معافی یا تلافی۔۔۔ کچھ نہیں۔۔۔  
بس دل کا بوجھ ہٹانا ہوتا ہے۔

”بیٹا نے شاید تمہیں بتایا نہیں کہ معاملہ آگے تک  
گیا تھا۔ اور پلٹ بھی گیا۔۔۔ تفصیلات اسی سے پوچھ  
لیں۔ وہ وقت سے پہلے زندگی کا بار اٹھانے جارہی  
تھی۔ عماد کم بہت بھی ہے، کم عمر بھی۔۔۔ انہیں وقت  
دینا ہے سو وقت دے دیا ہے۔ میں بھی اپنی بیٹی کی  
خوشیوں کی راہ میں رکاوٹ نہ بنا ہوں نہ بنوں گا۔ خود  
سے زیادہ اس کی پروا رکھتا ہوں۔ تمہیں فکر کرنے کی  
ضرورت نہیں ہے۔“

”ہاں! رشتے نباہنے کے اہل ہو تم۔۔۔“

”بس کوشش کر رہا ہوں، ایک رشتہ ایسے سے نباہ لوں۔“

”تم بہت ایچھے باپ ہو۔۔۔ پیش ابھی ماں نہ بن سکی۔“

”صرف بیٹا کے لیے۔“ وہ جتنا نہیں چاہتا تھا،

بتانا چاہتا تھا۔

پن جھلکا۔

”کہہ دو جو کہتا ہے۔“ وہ بے بس ہو کر کہہ بیٹھا۔

”تم سے معافی کے لیے الفاظ نہیں ہیں آدم۔“

”معاف کر دیا۔۔۔“

”بس اتنی آسانی سے؟“ وہ تو بہت کچھ کہتا اور  
سننا چاہتی تھی۔

”آج میں اکیلی ہوں۔۔۔ شوہر اور دو بیٹوں  
کے ہوتے ہوئے بھی۔“

”اللہ تمہارے بیٹوں کو تمہارے لیے نرم  
کر دے۔“

”تم بہت حوصلے والے ہو آدم۔۔۔“

## پھلوں کا رس ایک نعمت

- 1۔ پھل عام طور پر زود ہضم ہوتے ہیں۔
- 2۔ پھلوں میں عام طور پر پانی کا حصہ زیادہ ہوتا ہے جبکہ شکر اور کچھ وٹمنات بھی پائے جاتے ہیں۔ یہ اجزاء جسم انسانی کی نشوونما اور توانائی کے لیے بہت اہم ہوتے ہیں۔ پھلوں کے رس کے ذریعے سے ملنے والی شکر (فرکٹوز) دوسری شکر کے مقابلے میں زود ہضم اور لذیذ ہوتی ہے۔ آج کل پھلوں کا رس بہت آسانی سے مل جاتا ہے اور گھر میں بھی نکالا جاسکتا ہے۔
- 3۔ پھلوں کا جوس..... پیاریوں میں بہت فائدہ مند ہوتا ہے جیسے ناشپاتی، نارنگی، امرود، پیپے اور کیلے میں قبض سے نجات دلانے کی قدرتی صلاحیت ہوتی ہے۔ اگر قبض شدید ہو تو انجیر، خوبانی، انگوٹھے قبض کشا پھل مفید ثابت ہوتے ہیں۔
- 4۔ قدرت نے پھلوں کے رس میں خون صاف کرنے کی بڑی صلاحیت رکھی ہے۔ جو لوگ پھلوں کا رس استعمال کرتے ہیں ان کی رکت سرخ و سفید اور پتھر و باروتی نظر آتا ہے اور وہ ظاہری حسن کے لیے کسی معنوی کریم کے محتاج نہیں ہوتے۔ فروزا اور کیو کو پیجیے، اس کے باقاعدہ استعمال سے خون کے فاسد مادے خارج ہو جاتے ہیں، جلد کارنگ ٹھکرتا ہے اور یہ پھل خوب صورت پیدا کرتے ہیں۔ ان کے استعمال سے داغ، کیل، جھمپیاں وغیرہ جاتے رہتے ہیں۔ جو لوگ خون کی کمی کا شکار ہیں، ان کے لیے پھلوں کا رس بہترین دوا ثابت ہوتا ہے کیونکہ پھلوں کے رس سے خون کی قدرتی طور پر پوری ہوتی ہے۔ پھلوں کا رس چہرے پر بھی لگایا جاتا ہے۔ اعصابی کم زوری اور جاتین کی کمی کے شکار افراد اور بچے کے بجائے پھلوں کے رس سے فائدہ حاصل کر سکتے ہیں۔ قدرت نے پھلوں میں جاتین کا بھرپور خزانہ رکھا ہے۔ ایسے پھل جن میں ترشی ہوتی ہے، جلدی امراض اور فساد خون جیسی شکایات میں مفید ثابت ہوتے ہیں۔ ایسے اصحاب کو کیو، مالے، گھنٹے اور لیموں استعمال کرنا چاہیے۔ البتہ مرض ذیابیطس میں پھلوں کا بکثرت استعمال مفید نہیں ہوتا تاہم اس کے مریض جاسن خوب استعمال کر سکتے ہیں۔
- 6۔ پھلوں کا رس بدن میں زوری چستی پیدا کرتا اور طبیعت میں فرحت لاتا ہے، دل و دماغ کو سکون ملتا ہے، پھلوں کا رس عام صحت مند انسان اور مریض دونوں کے لیے یکساں مفید ہے۔

از: زرینہ خان، بہارہ بہو

میرا رکنا مناسب ہوتا تو رک جاتا۔ بڑی مشکل سے آپا ہوں، ڈر لگتا ہے تمہارے بارے میں کوئی غلط بات نہ کہہ دے۔“ وہ خاموشی اور بے بسی سے بیٹھی تھی۔

”میرے لیے ایک کام کرو آدم۔“

”ان کے لیے دعا کرو کہ اللہ اب ان کے لیے آسانی کر دے۔“

وہ اس کے لرزے ہاتھ کو اپنے ہاتھ میں لے کر قلی بھی نہ سکا تھا۔ دل کو کمر و سرا پایا تو اٹھ گیا۔ اور میڑھیاں اترتا ہوا بیر ونی دروازہ کھول کر باہر چلا گیا۔ وہ وہیں میڑھیوں پر بیٹھی..... بے نام آنسوؤں سے خاموش رونے لگی..... پتا نہیں کون، کون سا درد دیا تھا۔

☆☆☆

”یہاں اٹھو۔ چلو میں تمہیں امیرین کے گھر چھوڑ دوں۔“

”خیریت ہے ابا۔“

”وہ پریشان ہے بیٹا..... اس کا باپ زندگی اور موت کی کشمکش میں ہے اور اس صورت حال میں وہ اکیلی ہے۔“

”مگر ابا میں؟“

”ہاں دیکھو تم..... دیکھو میں تو نہیں رک سکتا ہاں، تم ہی چلی جاؤ۔“

”آپ رکنا چاہتے ہیں؟“

”تمہیں ہر سوال کا جواب کیوں چاہیے ہوتا ہے۔“

وہ بہت تھکا ہوا لگ رہا تھا۔

”اپنے کپڑے اٹھا لو۔“

”میں رات کو لوٹ آؤں گی ابا۔“

”ہرگز نہیں..... تم کچھ دن وہیں رہو۔“

”مجھے وہاں نیند نہیں آتی۔“

”بکومت..... میں تمہیں آرام کرنے کے لیے

میں اس کا ساتھ دینے کے لیے بھیج رہا ہوں۔ وہ کئی راتوں سے سوئی نہیں ہوگی۔“

”تو آپ کا مطلب ہے وہ سو جائیں اور میں اس

بھوت بھیکے میں جاگتی رہوں۔“

”بھئی تو بھتہ دار بن جایا کرو۔“

وہ اٹھی۔ ”میں اوپر جاؤں گی تو تم چلے جاؤ گے؟“

”نہیں، میں تمہارے ساتھ چلتا ہوں۔“

وہ سیب کی قاش توڑ مروڑ کر اس کا رس ان کے منہ میں ڈکا رہی تھی۔

”پتا نہیں،“ وہ سرسری سا بولی۔ سیب کا رس ان کے منہ میں جا کر باجھوں پر پھیل رہا تھا۔

ان کے جسم میں ہلکا سا ارتعاش تھا مگر اس جیسے بے سدھ تھے۔

”انہیں اسپتال لے چلیں؟“ ان کی حالت اسے تشویش ناک لگی۔

”نہیں، اس کا کوئی فائدہ نہیں ہے۔“ آدم نے دیکھا سر ہانے بیخ سورہ رکھا تھا۔

”یہ تم پر بھتی ہو؟“

”ہاں.....“ وہ پلٹ کر دہ بارہ اٹھی اور کمرے سے باہر آئی۔ آدم کو لوگا وہ کچھ کہتا چاہتی ہے۔

”کیا ہوا امیرین؟ مجھے بتاؤ۔“

”صرف سانس چل رہی ہے آدم..... بس..... صرف سانس۔“ اس کی آواز کسی گہری کھائی سے آتی ہوئی معلوم ہو رہی تھی۔

”ڈاکٹر ز نے کہا ہے ان کے لیے دعا کرو۔“

آسانی ہو جائے، مجھے بتاؤ آدم..... میں اپنے باپ کی موت کی دعا کس منہ سے کروں..... اس کی آنکھوں میں پانی تھا۔ وہ میڑھیوں پر بیٹھ گئی۔

”آج یا کل..... پرسوں یا ہفتے کو..... ڈاکٹر ز کہتے ہیں اب بچاؤ ناممکن ہے۔ بس دعا کریں جتنی جلدی ہو سکے..... انہیں رہائی ملے..... میں تو ان کی صحت ہی کی دعا کروں گی ناں.....“ وہ اس کے ساتھ وہیں میڑھیوں پر کچھ فاصلے پر بیٹھ گیا۔

”رات بہت خوف ناک ہو جاتی ہے اور دن تھا دینے والا..... مجھے لگتا ہے میں ایک زندہ لاش کے ساتھ

کھڑی ہوں۔ بیٹھی ہوں..... خوف سے سو بھی نہیں پاتی۔“

”میں آج رات بیٹا کو یہاں چھوڑ جاتا ہوں اگر

تو تم میرے دوست ہو؟“ وہ اتنی اچانک آپ سے تم پر آئی تھی کہ خود اسے بھی پتا نہیں چلا تھا۔

”اور تم بھی؟“

”ہاں..... شاید۔“ وہ ہنس پڑی تھی ہلکے سے۔

”تمہیں اندازہ ہو گیا کہ میں اس بار پیسے ختم کر چکی ہوں۔“ دونوں اب مل کر سامان رکھ رہے تھے۔ امیرین نے برنیاں اور مرتجان نکال کر بچن کاؤنٹر پر رکھ دیے تھے۔ سارا سامان رکھ کر اب وہ فروٹ باسکٹ کی طرف بڑھی تھی۔

”وہ میرا سابقہ منگیتہ تھا..... اسے چھ سال بعد خیال آیا کہ مجھ سے معافی مانگ لے۔“

اسے پتا تھا آدم سوچ رہا ہوگا مگر پوچھے گا نہیں اس کے متعلق.....

”لوٹ آیا ہے..... تو قبول کر لو اسے۔“ آدم نے یہ بات اسے دیکھتے بغیر کی تھی۔

وہ سیب پھیلنے ہوئے رک کر اسے دیکھنے لگی۔

”سوری..... مجھے لگا تمہارے دل میں اس کے لیے جگہ ہوگی۔“

”میرے دل میں اب کسی کے لیے کچھ نہیں..... خود اپنے لیے بھی..... ویسے وہ شادی کر چکا تھا..... اور اسے اولاد نہیں ہوئی۔ اب اس کی ماں کو احساس ہوا ہوگا کہ مجھے منالے اور.....“

”پھر تو سوچا جاسکتا ہے اگر گنجائش نکالو تو.....“

”نہیں آدم..... اب نہیں.....“

”تو پھر کب؟“

”کبھی نہیں۔“

”پاکل مت بنو..... ویسے میں سوچ رہا تھا تمہارے لیے کوئی اچھا سارشتہ ڈھونڈوں..... کیا خیال ہے؟“

”ایسا کام نہ کرنا۔“ وہ اس کی بات پر ہر جھٹک کر مسکرائی۔

”کیوں نہ کروں..... جب تم اپنے لیے نہیں سوچتیں تب کوئی تو سوچے گا ہی۔“

”میں ابا کو یہ کھلاؤں؟“ وہ سب پھیل چکی تھی۔

”بے شک کھلا دو..... مگر..... میری بات مت ٹالو۔“

”اچھا، وقت پڑا ہے ابھی سوچیں گے۔“ کہہ کر

”اچھا چلی جاتی ہوں مکررات کو ڈر لگا تو چیخیں ماروں گی۔“

”خبر دار۔۔۔ دیکھو اسے میری درخواست سمجھو پلیز۔۔۔ کسی کا مشکل میں ساتھ دیتے ہیں ٹینا۔“

”کسی کا۔۔۔“ وہ لفظ چبا کر کہتے ہوئے کپڑے نکالنے لگی تھی۔

”کوئی بد تیزی نہیں چلے گی۔۔۔ سمجھیں۔“

”پرانی بیٹی کے لیے اپنی بیٹی کو مشکل میں ڈال رہے ہیں۔“

”ٹینا۔۔۔“ وہ اسے گھورتے ہوئے باہر تک لایا، رکشا کھڑا تھا۔

”مجھے تو پہلے سے ہی شک تھا کہ کچھ کالا ہے۔“

”حکومت۔۔۔ اور وہاں جا کر کوئی ایسی ویسی بکواس مت کرنا۔“

”میری ماں بھی تو اکیلی ہے کبھی ان کے پاس تو نہیں چھوڑا آپ نے مجھے۔۔۔“ وہ بیٹھے کے بعد بھی بول رہی تھی۔

”اس کے پاس اس کے بیٹے ہیں، شوہر ہے۔“

”شوہر نہیں ہے۔۔۔ اور بیٹے بھی شوہر کے ہیں۔ ان کے ساتھ صرف چھوٹا رہتا ہے، بڑا اپنے ابا کے ساتھ ہوتا ہے۔“

”وہ دونوں الگ رہنے لگے ہیں؟“

”ان کی طلاق ہو گئی ہے ابا۔۔۔“

”کب؟“ وہ حیرانی سے پوچھنے لگا۔

”سال ہو گیا۔“

”اور تم مجھے اب بتا رہی ہو یہ بات۔۔۔“ اسے اچنبھا ہوا۔

”انہوں نے منع کیا تھا۔“

”اور تم نے ہضم کر لیا۔۔۔ حد ہے۔“

”آپ کو کیا فرق پڑتا ہے کہ ان کی زندگی میں کیا ہوتا ہے اور کیا نہیں۔“

”ہاں، ٹھیک کہتی ہو، مجھے کسی کی بھی زندگی سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔“

”کسی کے لیے تو خیر پڑتا بھی ہے۔“

”رکنا بھیا، یوٹرن لے لو، گھر واپس چلو۔“ وہ رکشے والے سے مخاطب ہوا۔

”کیا ہوا۔۔۔؟“

”نہیں بلکہ گولڈن ٹاؤن چلو۔۔۔“ وہ جیسے الجھ گیا تھا۔

”اب وہاں کیوں؟ آپ مجھے وہاں چھوڑ رہے ہیں؟“

”ہاں کیونکہ تمہاری ماں اکیلی ہے ناں۔“

جب جی بھر جائے تب لوٹ آنا۔“

”تا کہ آپ آرام سے وہاں رہ سکیں۔“

”کہاں۔۔۔؟“ وہ بے یقینی سے دیکھنے لگا۔

”یہ تو آپ کو خود بھی جانتے ہیں۔“

وہ بہت دکھ سے اسے دیکھ گیا۔

”جی کر رہا ہے چار جڑوں نہیں۔۔۔ میری بیٹی ہو کر کس حد تک گری ہوئی سوچ ہے تمہاری۔۔۔ دکھ ہو رہا ہے مجھے۔۔۔“

”مجھے گولڈن ٹاؤن نہیں جانا۔“

”دفع ہو جاؤ۔۔۔ جہاں جانا چاہو، جاؤ۔“

”ارے بھیا، بی بی جہاں کہیں انیس ڈراپ کر دو۔“ اس نے رکشا روکا اور ایڈوائس کرا یہ ادا کر دیا۔

”مجھے کہیں نہیں جانا ہے۔ آپ بیٹھے پلیز ابا۔“ وہ اسے خونخوار نظروں سے گھورتے ہوئے سڑک کے کنارے ہو گیا۔

”بی بی کہاں جانا ہے آپ نے؟“ رکشا ڈرائیو، پوچھنے لگا۔

”گولڈن ٹاؤن لے چلو۔“ اس نے اپنی ماں کے گھر کا پتا سمجھایا اسے، آدم نے دوسرے رکشے میں ان کا پیچھا کیا، جب رکشے کو گولڈن ٹاؤن کے اندر ولی گیٹ سے داخل ہوتے دیکھا تو تسلی سے سمت بدلی۔

زندگی بھی کتنی سخت ہے، دنیا تو دنیا خود اپنی اولاد بھی سوال کرتی ہے۔۔۔ کچڑا چھاتی ہے۔۔۔ تنگ کر لی ہے، رات دیر ہو گئی۔۔۔ اس کے دل میں امبرین کے لیے پریشانی تھی۔ ادھر ٹینا کا رویہ اور باتیں، مجھب حالت تھی اس کی۔

وہ تھکتا جا رہا تھا اور سمجھ کچھ نہیں آ رہا تھا، کہا کرے۔۔۔ زندگی نے ایک عجیب دورا ہے پر لا کھو!

کیسا تھا۔ شاہینہ کی علیحدگی۔۔۔ ٹینا کا اس کی طرف پلٹنا۔۔۔ امبرین۔۔۔ ایک بے سہارا۔۔۔ تنہا۔۔۔ سبھی ہوئی خاموش تو ابھی مدھم مدھم گفتگو کرتی ہوئی نیم ملائم روٹی جیسی معصوم سی لڑکی۔۔۔ معاشرہ۔۔۔ اور جی۔۔۔ اس سب میں دل کہاں تھا۔۔۔ اسے کچھ پتا نہیں چلا۔۔۔ بس سوچے گیا۔۔۔ اور جتنا سوچتا اتنا الجھتا ہی جا رہا تھا۔

☆☆☆

اس کی ماں کسی سمینار میں گئی ہوئی تھی۔ وہ اسی وقت گھر لوٹ گئی تھی، اندازہ تھا کہ ابا گھر میں ہی ہوگا۔ مگر نہیں تھا۔ اس نے امبرین کے گھر فون کیا۔۔۔ ایک دو تین، چار بار تیل جا رہی تھی مگر کوئی اٹھا نہیں رہا تھا۔

رات بہت ہو چکی تھی۔۔۔ اسے اکیلے گھر میں خوف آتا تھا۔ چاہے اپنا ہی کیوں نہ ہو۔ وہ گھر سے باہر نکلی۔۔۔ اس وقت تو کسی سواری کا ملنا بھی محال تھا۔ اسے فکر سی ہوئی، اندازہ تھا کہ باپ ناراض ہو کر گیا ہے۔ اور یہ بھی کہ اس نے غلط طریقہ استعمال کیا ہے، صبح وہ تیار ہو کر کالنگی گئی تو اسے مس امبرین کے والد کے انتقال کی خبر ملی تھی۔

وہ چھٹی کے بعد سیدھی امبرین کے گھر چلی گئی تھی۔ وہاں محلے کے لوگ تھے مگر اس کا باپ نہیں تھا۔ وہ کوئی افسوس نہ کر سکی۔ تھوڑی دیر بیٹھی رہی پھر گھر آ گئی۔ شام ہو چکی تھی۔

گھر آئی تو وہ لکڑیاں آرے سے صاف کر رہا تھا۔

”آپ نے پھر سے یہ کام شروع کر دیا ابا۔۔۔“ وہ کتابیں رکھ رکھ کر آئی۔ وہ خاموشی سے اپنا کام کرتا رہا۔

”اگر پھر سے اللہ نہ کرے کچھ لگ گیا تو؟“ وہ اب بھی چپ تھا۔

”میں نے دیر کر دی۔۔۔ آپ کچھ پوچھیں گے نہیں؟“

”اب تم جوان ہو، اپنی مرضی کی مالک ہو، جو چاہے کرو، جو چاہے بولو، جو جی چاہے سوچو۔۔۔“ اس کے کچھ میں افسوس تھا۔

”آپ کہاں تھے رات؟ مس امبرین کے پاس گئے؟“

نیری جاہ سے

”اب اس کا نام تم نہیں لوگی اپنے منہ سے سمجھیں؟“

”کیوں۔۔۔؟“

”میں کسی امبرین نامی خاتون کو نہیں جانتا۔۔۔ اور تم کوئی بات گھر پر آ کر نہیں کرو گی کالج کی۔۔۔ سمجھیں۔“

”ان کے والد کا انتقال ہو گیا ہے۔“

وہ آرا چلاتے ہوئے رکا۔۔۔ آرا زمین پر پھینکا۔ دو لمحے بعد اسے ایک زبردست گھوری ڈالی غصے سے اور کپڑے جھاڑ کر اٹھا، فیض، چینی اور کف چڑھا تا ہوا باہر نکل گیا۔

”اب اس میں میرا تو کوئی قصور نہیں ہے۔ رکیں ناں۔۔۔“

”ابا۔۔۔۔۔۔“ وہ دروازے تک گئی۔

”آپ کا تو کسی کے ساتھ کوئی تعلق نہیں ہے ناں پھر؟“

آدم نے کٹناک سے باہر دروازہ بند کیا اور نکل گیا۔ وہ اندر آ کر کبھی سانس لے کر بیٹھ گئی۔

”پتا نہیں آپ مجھے کب ٹھیک سمجھیں گے۔“

کچھ دیر بعد اس کی ماں کا فون آ گیا تھا۔ اور اس نے ساری بھڑاس فون پر نکال دی پھر جب دل خالی ہوا تو یاد آیا ان سے پوچھ لے کر فون کیسے کیا۔ وہ اس کے سوال پر ہنس دی۔

”آپ ہنسی کیوں؟“

”تم فطرت میں کچھ، کچھ ہماری دادی پر مگی ہو ٹینا۔ وہ بھی سب کچھ کہنے کے بعد پوچھتی تھیں کہ اگلے بندے کو بھی کچھ کہنا ہے۔“

ٹینا شرمندہ سی ہو گئی۔

”آپ بھی آدم جی کی طرح مجھے فضول سمجھنے لگی ہیں۔“

”تم اپنے باپ کا اس طرح نام مت لیا کرو ٹینا۔“

”ای۔۔۔ آپ نے مجھے کیوں چھوڑ دیا تھا۔“ وہ اچانک اس کے شکوے پر چپ ہو گئی۔

ٹینا کو اچانک ہی رونا آ گیا۔ ”مجھے پتا ہے میں بہت بری ہوں۔ شاید میں پوری طرح آپ کی دادی پر مگی ہوں شاید ان سے بھی لوگ ایسے ہی پڑتے ہوں گے۔“

”ٹینا میری بات سنو میری جان۔“

”مجھے کچھ نہیں سننا۔۔۔ میں ہمیشہ اپنی بات کہتی ہوں، مجھے کسی اور کی پروا نہیں ہوتی۔ بس اب میں نے

کسی کو تنگ نہیں کرتا۔“ وہ کہہ کر فون رکھ چکی تھی۔  
اور ادھر شاہینہ نے اپنا سر ہاتھ مام لیا تھا۔

☆☆☆

”اس میں ایسا کیا برا تھا کہ میں نے یہ خواہش دل میں رکھ لی کہ میری ماں اور باپ ایک چھت کے نیچے میرے ساتھ زندگی گزاریں۔“ وہ آیا تھا اپنی چیزیں درست کر رہا تھا۔ خود کمرے کی صفائی کی۔

”ایک بات میری کان کھول کر سنو بیٹا اور وہ یہ کہ دنیا کی کوئی بھی چیز چالاکی سے نہیں جیتی نہیں جاسکتی۔ ہوشیاری سے نہ ہی ذہانت سے دنیا کی کوئی بھی چیز..... اگر چیز نہیں تو انسان اور اس کا دل صرف اور صرف سچائی سے جیتا جاسکتا ہے۔“

”آپ کے کہنے کا مطلب ہے کہ میں چالاک ہوں، مکار ہوں۔“

”مگر ہونے کی پوری کوشش کر کے دکھائی ہے تم نے۔“

”آپ میرے ساتھ بہت کئی سے پیش آتے ہیں۔“

”میں تمہارا باپ ہوں کچھ تیز کے ساتھ پیش آؤ۔“

”اب میں رو دوں گی آدم.....“

”رو دو..... سب سے آسان اور بزدلی والا یہی کام ہے۔“

”آپ میری بات نہیں سنیں گے کیا؟“

”تم مطلب کی بات کرو تو سنوں..... بات کو

ہیشہ سوطریقوں سے سمجھا کر کرتی ہو۔“

”میرا صرف یہ تصور تھا کہ میں نے چاہا کہ آپ اور

ای دوبارہ ایک ہو جائیں۔ مجھے جیسے ہی محسوس ہوا کہ

آپ مس امبرین کی طرف بڑھتے جا رہے ہیں، مجھے

خوف سا آنے لگا کہ آپ ان سے کہیں شادی نہ کر لیں۔“

”اور اسی لیے تم یہ ساری بکواس کر رہی تھیں۔“

”جی.....“ اس نے بالآخر خرابت کو بکواس تسلیم کر

ہی لیا تھا۔

”ایک رشتہ حسن سلوک کا بھی ہوتا ہے بیٹا۔ ہم

جب سارے انسان ایک دوسرے کے ساتھ رہتے ہیں

ایک دنیا میں اور ایک جیسے حالات سے نبرد آزما ہوتے

ہیں تو آپس میں ہمدردانہ رشتے جڑ جاتی ہیں۔ اگر

ایسا نہ ہو تو کوئی کسی کو نہ پوچھے کوئی کسی کے کام نہ آ سکے۔  
وہ لڑکی مشکل میں تھی..... اس سے جا کر پوچھ لینا یا

تھوڑی سی ہمدردی دکھانا کیا غلط ہے؟ اس دن اگر تم

راستے میں تماشا نہ کھڑا کرتیں تو میں تمہیں چھوڑ

آتا..... کم از کم ایک رات ہی سہی..... ہم اس کے تم

میں حصہ لے لیتے..... اسی رات اس کے والد کا انتقال

ہوا اور وہ لڑکی اکیلی تھی۔ اگلے دن شام کے بعد مجھے پتا

چلا..... اور میں اس کے کچھ کام نہ آ سکا..... معلوم نہیں

اس نے کیسے اپنے باپ کے نفن کا بندوبست کیا

ہوگا؟ کیسے سب کیا ہوگا..... وہ اکیلی عورت آنے

جانے والوں کو دیکھ رہی تھی۔ جو انیسویں کرنے کے لیے

آ رہے تھے..... وہ بظاہر کتنی مضبوط تھی مگر اندر سے کتنی

نڈھال ہوگی جو کئی دن سے سوئی نہ ہوگی..... نہ کھانا

ڈھنک سے کھایا ہوگا جسے ہر وقت یہ فکر ہوگی اچانک کسی

وقت پیسے ختم ہو جائیں گے اور اگر ایسا ہوگا تو کیا

ہوگا.....“

”آپ کو کتنا احساس ہے ان کا.....“

”تم نے پھر بات کو غلط رنگ دے دیا بیٹا۔“ وہ

بیچارگی سے اسے دیکھنے لگا۔ ”تم کب سمجھو گی حقائق کو۔“

”میری ماں..... جس کی دوسری شادی اس عمر

میں آ کر ٹوٹ گئی..... جس کا بڑا بیٹا ان سے باقی ہے اور

چھوٹا ساتھ رہتے ہوئے بھی شکایتیں کرتا رہتا ہے۔ کیا ان کا

حق نہیں ہے کہ وہ بے فکری کی زندگی گزاریں؟“

”اس نے رشتوں کو اتنا اہم کب سمجھا تھا۔ اس

کے سامنے تو بس، کام، ترقی، نام، پیسہ، اشیا کی اہمیت

تھی۔ وہ سب اسے مل گیا۔ اس شخص نے اگر اس عمر

میں آ کر اسے چھوڑا ہے تو میں اس سب کا تصور وار

صرف اسے نہیں ٹھہرا سکتا۔ اس سب میں شاہینہ کا بھی

ہاتھ ہوگا۔“

”ٹھیک ہے جو بھی ہے مگر اب تو موقع ہے ناں.....“

”تم اس کے ساتھ رہنا چاہو تو رونا کھونچے اعتراض

نہیں ہے، میں آ کر مل لیا کروں گا تم سے۔“

”آپ تو ان سے محبت کرتے تھے ناں.....“

”کرتا ہوں..... مگر دوبارہ شادی کی غلطی نہیں

کروں گا۔“

”اگر وہ خود آپ کو کہیں جب بھی.....؟“

”مجھے یقین نہیں آ رہا کہ میری بیٹی اتنی بڑی ہو گئی

ہے کہ جذباتی طور پر مجھے گھبرانے کی صلاحیت آزما سکتی ہے

میں نے نہیں یہ سب چیزیں تو نہیں کھائی تھیں بیٹا۔“

”آپ سب مجھے برا سمجھتے ہیں۔“

”اور اب تمہیں رونا آ رہا ہوگا..... ہے ناں.....“

تو رولو.....“

”آپ پہلے والے باپ نہیں رہے۔“

”اور نہ ہی تم پہلے والی بیٹی رہی ہو۔“

”آپ کو میرے رونے کی بھی پروا نہیں رہی.....“

پہلے تو آپ میری ذرا سی تکلیف برتتے تھے۔“

”بے وقوف تھا.....“ کہہ کر وہ کمرے سے نکلا۔

”آپ مجھے پھر سے چھوڑ کر جا رہے ہیں..... یاد

رکھیں میں اب اے کے پاس گئی تو لوٹ کر نہیں آؤں

گی۔“ اس پر اس کی کسی بلیک میلنگ کا اثر نہیں ہوا تھا۔

وہ اپنی جائے کاپ ختم کر چکا تھا۔ والٹ اٹھایا، گھڑی

پہنی، سیل فون جیب میں رکھا اور نکل گیا۔

اس کے جاتے ہی وہ دھپ دھپ کرتی اندر چلی

گئی اور ماں کو فون ملایا۔

☆☆☆

امبرین گھر پر اکیلی تھی اور باہر سے تالا لگا ہوا تھا

اس کے وہاں کھڑے رہنے پر پڑوسی نے آ کر جھڑکا تھا۔

وہ دیکھ رہا تھا گھر کے اندر ہی جلی ہے اور جھری

سے وہ نظر بھی آ گئی تھی۔

”یہاں تالا کیوں لگایا ہے؟“

”تاکہ کوئی چور اچکا نہ گھس جائے۔“

”یہ زیادتی ہے..... اندر گھر میں ایک اکیلی لڑکی

بیٹھی ہے۔ اسے کسی بھی چیز کی ضرورت پڑ سکتی ہے۔

اس کے باپ کو گئے ہوئے چوتھان ہے اور آپ لوگوں

نے یہ ظلم شروع کر دیا ہے۔“

”پہلی بات کہ اس کے ساتھ مٹلے کی ایک عورت

ہے دوسری بات یہ کہ اگر وہ اکیلی بھی ہو تو تجھے کیا..... تو

کیا لگے اس کا بیٹا.....“

تیری جاہ سے

”میں نہیں لگتا تو آپ کیا لگتے ہیں؟“

”زیادہ بک، بک نہ کر..... ویسے بھی چند دن

میں اس کا نکاح ہو رہا ہے میرے ساتھ۔“

”تمہارے ساتھ؟“ آدم نے اسے سر تاپا دیکھا۔

وہ جو چار چھ بچوں کا باپ، اسٹھ، ساٹھ کی عمر کا بدلا

چٹلا سا مرل، بڑی..... اس کا خون کھول گیا..... دو چار

دکھیں دے ڈالیں جب اندر سے کوئی جواب نہ ملا تو

لوٹ آیا اور اسے اس وقت سے کال ملا رہا تھا مگر وہ اٹھا

نہیں رہی تھی۔ رات کے نو بجے تھے، جب وہ گھر کی

طرف جا رہا تھا۔ تب اس کی کال آ گئی۔

”ہیلو امبرین..... کہاں ہو..... کیسی ہو تم؟“

”ٹھیک ہوں.....“ ٹھکی ہوئی آواز تھی۔

”میں آیا تھا..... کسی نے دروازہ نہیں کھولا۔“

”میں سوئی ہوئی تھی۔“

”جھوٹ مٹ بولو امبرین.....“

”پھر کیا کروں..... سچ بولنے سے بتاؤ کیا مل

جاتا ہے؟“

”امبرین تم یہ سب تماشے دیکھ رہی ہو؟ اور

برداشت کر رہی ہو۔“

”تو پھر کیا کروں..... لڑنے کی طاقت نہیں ہے

اب آدم.....“

”تو کیا تم اس آدمی کے ساتھ شادی کر لو گی؟“

وہ چپ رہی۔

”اس سے تو بہتر تھا کہ تم نیل کو بلا لیتیں۔“

”اس کا نام مٹ لو.....“

”پھر کس کا نام لوں.....؟“

”بتاؤ کون ہوگا جو مجھے بے سہارا کو اپنائے گا۔“

”تم اتنی کم ہمت تو نہ تھیں امبرین۔“

”اب ہو گئی ہوں آدم..... ساری زندگی لڑو لڑو کر

انسان تھک جاتا ہے۔ اب تک میں سمجھتی رہی کہ میں اپنے

باپ کا سہارا ہوں یہ بھول گئی تھی کہ میرا باپ کمزور باپ

نہیں میرا سہارا تھا چاہے نام کا ہی..... پر تھا تو.....“

”امبرین تھوڑا..... وقت لے لو..... کوئی راستہ

نکالتے ہیں یار.....“

ہو گا تم ہی سناؤ گی۔“ وہ بولا۔

”اب آپ میری باتوں کا براہمانہ لگے ہیں۔“

”اب تم میری باتوں کے لئے کوشش مت کرو ٹیٹا۔“

”بڑے بڑا راز آئے ہوئے ہیں مجھ سے۔“

”وہ تو کئی سالوں سے ہوں۔“ اب وہ اس کی

ٹون میں بات کرنے لگے تھے۔

”پہننے لگی، سمجھ گئی تھی۔“

”چلیں وہ بیچاری سو رہی ہے۔“

”تم اسے بیچاری نہیں کہو گی۔“

”چلیں نہیں جانتی، مگر ایک بات پوچھوں؟“

”پوچھئے کے بعد عمل کرو گی؟“

”نہیں، یہ تو آپ بھی جانتے ہیں۔“ اچھا میری

بات سنیں۔۔۔۔۔ آپ اماں سے محبت کرتے تھے ناں۔۔۔۔۔؟“

”تمہیں۔۔۔۔۔“ وہ کہہ کر رک گئے۔۔۔۔۔“ بڑا بے

وقتی سوال ہے یہ۔“

”مجھے جواب پتا ہے آپ کرتے ہیں۔۔۔۔۔ مگر

آپ ان کے ساتھ رہ نہیں سکتے تھے یا پھر وہ۔۔۔۔۔ میں

بھی ان کے ساتھ محبت کرتی ہوں ابا۔۔۔۔۔ پر میں بھی ان

کے ساتھ نہیں رہ سکتی۔۔۔۔۔ یا پھر وہ۔۔۔۔۔ اس سے پہلے کہ وہ

مجھے کہتیں اپنے باپ کے پاس جاؤ میں خود

آگئی۔۔۔۔۔ معلوم ہے وہ مجھ سے تھک جاتی ہیں۔“

”تم نے اسے تنگ کیا ہو گا؟“

”نہیں ابا۔۔۔۔۔ تنگ تو صرف آپ کو کرتی ہوں۔“

ان کے ساتھ تو رہتی ہوں، ان سے توجہ چاہتی ہوں

اور۔۔۔۔۔“ وہ رک گئی تھی۔

”اور۔۔۔۔۔ اور کیا؟“ وہ بولا۔

”وہ جب چاہتی ہیں تو دے دیتی ہیں۔ جب

نہیں چاہتیں تو۔۔۔۔۔ ان کے پاس صرف ان کی اپنی قدر

ہے۔“ وہ اسٹول سے نیچے اتر آئی۔۔۔۔۔ برتن سنک

میں رکھے۔

”میں نے سوچا تھا ان کو دکھ ہو گا آپ کی شادی

کا سن کر مگر نہیں ہوا۔۔۔۔۔ یا پھر وہ خود پر قابو رکھنا جانتی

ہیں، میں انہیں سمجھ نہیں پائی ابا۔“

”میں بھی اسے سمجھ نہیں سکا تھا۔“

”نہیں۔۔۔۔۔ کیونکہ امی کو کہیں جانا تھا۔“

”وہ تمہارے لیے کھانا بنا کر جا سکتی تھی ٹیٹا۔“

”مگر نہیں بنایا۔۔۔۔۔ انہیں دیر ہو رہی تھی۔ انہوں

نے کہا تھا میں باہر سے کچھ منگوا لوں۔۔۔۔۔“

”تم انہیں بتائے بغیر آئی ہو۔ وہ پریشان ہو گئی۔“

”وہ نہیں ہوتیں اتنی معمولی سی باتوں پر پریشان،

یہ آپ کو بھی پتا ہے۔“

”تب بھی انہیں فون کرو ٹیٹا۔۔۔۔۔“ اب وہ کھانا

گرم کرنے لگا تھا۔

”وہ جب لوٹیں گی اور مجھے نہیں دیکھیں گی تو سمجھ

جائیں گی۔“

”تم سچ، سچ بتاؤ کیوں آئی ہو اس طرح۔۔۔۔۔ تم

نے تو کہا تھا تم مہینہ بھر ہو گی ان کے پاس۔“

”مہینے میں چار ہفتے ہوتے ہیں ابا۔۔۔۔۔ ایک ہفتہ

رہ لیا ناں بس بہت ہے۔ البتہ یہ الگ بات کہ آپ کو

میری موجودگی اچھی نہ لگے۔“

”بکومت اس بات پر میں تمہیں کس کر تھپڑ مار

سکتا ہوں۔“

”مادر۔۔۔۔۔“ وہ اسٹول پر چڑھ کر بیٹھ گئی۔

آدم نے بریانی گرم کر کے پلیٹ میں ڈال کر

ساتھ راستہ اور سلاہ رکھ کر رے اسے دی۔

”آپ کی بیوی اچھا کھانا پکاتی ہے۔“

”وہ تمہاری بیچر بھی ہے۔۔۔۔۔ اور اب تم ایسے

بات کرو گی۔“

”تو پھر کیسے کروں؟ آہا، باجی کہوں اسے یا امی جی۔“

”کچھ نہیں امبرین ہی کہو۔“

”ویسے ہیں کہاں وہ؟“

”سو رہی ہے بیچاری۔“

”اوہ بیچاری!“ وہ ہنسی تو والہ لگا۔

”بڑی بات ہے ٹیٹا۔“ آدم نے اسے پانی تھمایا۔

”بیچاری کسی کا عزت دار لقب کم، ہمدردانہ

زیادہ ہوتا ہے۔“

”بڑی ہمدردیاں ہیں بھئی۔“

”مجھے پتا ہے دنیا مجھے نہیں سنائے گی، جو سنا نا

ہے۔“

نے جوڑ دیا تھا۔ وہ اسے اپنے ساتھ لے جا رہا تھا جو صبح

اجنبی تھا، شام ایک خیال تھا۔

اور رات شروع ہونے تک اس کے لیے آسرا

بن گیا تھا۔ اس کا سنا بن گیا تھا۔

☆☆☆

”آپ نے امبرین سے شادی کر لی ہے؟“

وہ پورے ہفتے بعد گھر لوٹی تھی۔ وہ بھی آدم کے

دس مرتبہ کال کرنے پر۔

”ہاں۔۔۔۔۔ میں نے اس سے شادی کر لی ہے۔“

وہ اسے اندر آنے کے لیے جگہ دے کر ہٹا تھا۔

”اگر یہ ارادہ تھا تو مجھے بتانے میں کیا قیامت تھی۔“

”تمہیں پتا ہے کہ پہلے میرا ارادہ ایسا نہیں تھا۔“

”آپ کے دل میں تو تھا ناں۔۔۔۔۔“

”تمہیں شکایت ہے؟ کیا مجھے اس سے شادی

نہیں کرنی چاہیے؟“

”مجھے صرف یہ شکایت ہے کہ آپ نے خود کو مجھ

سے چھپایا اگر یہ خواہش تھی تو مجھ سے کہتے، میں

کروادیتی، میں تو خود آپ کو یہ کہتی تھی اور تب آپ

میرے سامنے بیٹے تھے۔“

”بیٹو میں تمہارے لیے چائے بناتا ہوں، اب

یہ بحث تو چلتی ہی رہے گی۔“

”مجھے بچوں کی طرح مت بہلائیں ابا۔۔۔۔۔“

”میرا اگر ارادہ ہوتا یا چلو میرے دل کا تو مجھے پتا

ہوتا اور میں تم سے قطع نہیں ڈرتا تمہیں۔۔۔۔۔ مگر میں

تمہاری پروا کرتا ہوں۔۔۔۔۔ اس لیے ضرور بتاتا۔

امبرین کے کیا حالات تھے یہ تو تم جانتی تھیں مگر کیا

ہو گئے تھے یہ تمہیں نہیں پتا تھا۔“

”آپ خوش ہیں یہ شادی کر کے؟“

”یہ شادی میں نے اپنی خوشی کے لیے نہیں

کی۔۔۔۔۔ البتہ میں مطمئن ضرور ہوں۔“

وہ کچن میں آگیا۔

”مجھے چائے نہیں چاہیے۔ کھانا، کھانا ہے۔۔۔۔۔“

”تم کھانا کھا کر نہیں آئیں؟“ اسے توجہ ہوا۔

شام ہو رہی تھی اور اس وقت وہ صرف چائے پیتی تھی۔

۔۔۔۔۔

”فون کرنے کا شکریہ، آدم!“ یہ کہہ کر فون رکھ

دیا تھا۔ وہ ایک دو بار ملتا رہا۔۔۔۔۔ مگر نا کام رہا ایک

طرف شاہینہ بھی جس کے لوٹنے کا ایک عمر اس نے

انتظار بھی کیا تھا۔۔۔۔۔ اور وہ اب لوٹ رہی تھی۔ ٹیٹا بھی

جو خوش رہ جیتی تھی ماں کے آنے سے۔۔۔۔۔ اس کا کیا

قصور تھا کہ جب موقع ملا تب بھی وہ اس کی نہ سنتا۔۔۔۔۔

زندگی کبھی انسان پر آسان نہیں ہوتی۔۔۔۔۔ ہمیشہ

غیر یقینی اور کشش کی صورت حال رہتی ہے۔ اور اب یہ

لڑکی۔۔۔۔۔ اکیلی، بے آسرا۔۔۔۔۔ وقت کے ہاتھوں تھکی

ہوئی۔۔۔۔۔ اور اب ایک اور امتحان اس کے سر پر کھڑا

تھا۔۔۔۔۔ اس نے کچھ لمحے سوچ بچار کی نذر کیے۔ پھر

پھرتی سے محلے کی مسجد کے مولوی صاحب کے پاس

گیا۔ شواہد لیے، دو چار افراد کے ساتھ محلے کی ایک

خاتون کو لیا، اس کے گھر تک آیا مولوی اور لوگوں کے

پریشر سے اس آدمی نے باہر کا تالا کھولا اور وہ لوگ اندر

چلے گئے۔۔۔۔۔ آدم سے نکاح کا پوچھ کر مولوی کھٹکا کر

کے اس کے کمرے میں چلا گیا۔

جہاں وہ نماز سے فارغ ہو کر بیٹھ کر رہی تھی۔

مولوی صاحب کرسی پر بیٹھے اور اسے فائل تھما کی اور آدم

ابن احمد شکیل کے نکاح میں آنے کی قبولیت پوچھی۔۔۔۔۔

عورت نے اس کے پاس بیٹھ کر اس کے سر پر ہاتھ

رکھا۔ پہلے تو وہ حواس باختہ انہیں دیکھتی رہی پھر قبولیت

کی ہاں دے کر دستخط کیے۔

مبارک کی بجنھناہٹ تھی۔۔۔۔۔ دو چار افراد میں

مٹھائی بانٹی گئی۔

آدم نے اسے سامان سینے کا کہا۔ اس نے اپنا

مختصر سا کچھ سامان کپڑے، چند ضرورت کی اشیاء تھیلے

میں ڈالیں۔ گاڑی باہر کھڑی تھی، سامان رکھوا کر وہ

اندر آیا۔ امبرین پڑوسی خواتین سے ملی، شکر یہ ادا کیا

اور گاڑی میں آ بیٹھی۔

سب کچھ اتنی اچانک ہو گیا تھا کہ نہ کچھ اسے سمجھ

آ رہا تھا نہ ہی آدم کو۔۔۔۔۔ مگر بس اتنی تسلی تھی کہ اب کی بار

جو شخص اس کی زندگی میں آیا تھا وہ اس کا ہمدرد تھا۔ اس

کا سامھی تھا اور دوست تھا۔۔۔۔۔ دوستی کو ایک پختہ تعلق

۔۔۔۔۔



اختر شجاعت

شیخ الحدادی

## شان ختم نبوت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم

کے بدلے آپ سب سے زیادہ علم و حکمت کے جاننے والے..... سب سے زیادہ محترم، سب سے زیادہ متعفف، حلیم و بردبار، پاک دامن، صبر و تحمل کا پیکر..... سب سے زیادہ حسین، بہادر اور فیاض..... تمام تر جملہ جسمانی اور روحانی کمالات کے جامع اور خوب صورتی اور نیک سیرتی کے حامل تھے۔

آج ہم مسلمانوں کی بہتی کی وجہ یہ ہے کہ ہم میں سے کچھ ایسے ہیں جو دین کی راہ سے بھٹک گئے ہیں اور کچھ ایسے ہیں جو دین کی راہ پر تو ہیں لیکن اپنے خورکی پیمان بھول گئے ہیں۔ جس طرح راستے سے بھٹک جانے والا شخص تمام عمر چلتا رہے تو بھی اپنی منزل مقصود تک نہیں پہنچ سکتا، اسی طرح دین کے محور کو فراموش کر دینے والا شخص ساری زندگی عبادت، ریاضت اور مجاہدے میں گزار دے مگر اپنی منزل تک نہیں پہنچ سکتا اس کے لیے سب سے اہم یہ ہے کہ اپنے محور کو پہچانے اور پھر اس کی معرفت حاصل کرے اور جب یہ معرفت حاصل ہو جائے گی تو پھر عبادت، ریاضت، نتیجہ خیز ثابت ہوں گی.....

اور وہ مرکز و محور حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ذات مبارک ہے..... اور اس کی اصل اساس آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے نسبت و تعلق ہے جو حقیقتاً ایمان ہے، یہ تعلق مضبوط و مستحکم ہو تو ایمان کامل ہوگا۔

یہی وجہ ہے کہ اللہ اور اس کے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی محبت میں جس نے جس قدر ذوق بکایا لگائیں وہ اتنا ہی دھلا اتنا ہی ٹھہرا..... اور پھر اس سند سے بیش قیمت لعل و گوہر سینے..... ساحل پر بیٹھ کر لعل و گوہر نہیں ملنے اس کے لیے عشق و محبت کے سند میں اترنا پڑتا ہے..... ذوق بجا ہوتا ہے جب ہی کچھ حاصل ہوتا ہے۔

آؤ دے دو جہاں صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ہم کم، کس شان، کس کس نفیلت کا ذکر کریں کہ ہر شان و فضیلت ایک سے

یا صاحبُ الجمال و یا سیدُ البشر  
من وجہک المسمی لقد نور القمر  
لایمکن النشام کما کان حقدہ  
بعد از خدا بزرگ توی قصہ مختصر  
☆☆☆

تمام تر حمد و ثناء اور تمام تعریف کا سزاوار خدا کے بزرگ و برتر توی ہے۔ توی ہر شے کا مالک حقیقی اور قادر مطلق ہے۔

حق یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی حمد اس کے حبیب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے سوا کون کر سکتا ہے اور حضور اقدس صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے مقام اور رفعت شان کون ان کے خالق ان کے رب کے علاوہ کون جان سکتا ہے۔ جس کو جولا نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی اتباع اور حضور ہی کے صدقے میں ملا..... آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی محبت سے ہی اسرار قرآن کھلتے ہیں اس کے بغیر نہ علم، علم ہے نہ عمل، عمل ہے۔ (اپنے پڑھنے والوں سے گزارش ہے کہ ایک بار درود شریف پڑھ لیں)

حضور اکرم سید عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ذات بابرکات اعلیٰ صفات، آپ کے اوصاف، آپ کے فضائل آپ کی شان عظمت، شان نبوت، شان رسالت اور شان ختم نبوت ان تمام کا احاطہ کرنا اور بیان کرنا انسانی قدرت و طاقت کے باہر ہے کیونکہ جس بستی کی تعریف خود پروردگار کرے تو پھر بات ہی ختم ہو جاتی ہے۔

اللہ تعالیٰ نے اخلاق و عادات کی تمام خوبیاں اور کمالات اور اعلیٰ صفات حضور اقدس صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ذات گرامی میں جمع فرمادیں۔ اللہ تعالیٰ نے آپ کو اولین و آخرین کے علوم سے جو آپ کے شایان شان تھے بہرہ مند فرمایا تھا۔ آپ کو کائنات ارضی کے خزانوں کی کنجیاں پیش کی گئیں مگر آپ نے آخرت کو ترجیح دی۔ دنیاوی مال و متاع

”دچلو اٹھو چائے پیو گی۔“  
”ہاں اور وہ بھی آپ کے ہاتھ کی بنی ہوئی۔“  
”دیکھو بھئی میں تو دودھ پتی کی بناتا ہوں، ہاتھ کی سون بناتا ہے۔“  
”دہی کدہ رہی ہوں۔“ چل بسنتے ہوئے وہ اٹھی۔  
”ٹینا اٹھے گی تو شام کے بعد گھونٹے چلیں گے۔“  
ڈنر بھی باہر کریں گے۔“  
”ٹینا سے پوچھ لیجیے گا۔“  
”وہ گھونٹے پھر نے کے لیے ہر وقت تیار رہتی ہے۔“  
”میں ذرا فریش ہو جاؤں۔“ وہ کپڑے نکالنے سے الماری سے۔  
”اور میں تمہارے لیے چائے بنانے جاتا ہوں۔“  
”میں چاہوں گی آپ ہمیشہ میرے لیے اسی طرح بناتے رہیں۔“ وہ آنکھ مار کر بولی۔  
”ہمیشہ بناؤں گا۔“ مسکراہٹ دبا کر وہ باہر نکلا۔  
”میں آپ کے ساتھ بہت خوش ہوں آدم۔“  
دروازے سے جھانک کر کہا تھا۔  
”جس دن چائے نہ بناؤں اس دن یہ جملہ کہنا۔“  
”پھر سوچتا پڑے گا۔“ کہتے ہوئے وہ ہنسی اور کپڑے لے کر واش روم میں گھس گئی۔  
زندگی ٹپ، ٹپ کرتے ہوئے گرتے پانی کے چند قطرے جیسی شفاف اور دھلی ہوئی سی تھی۔ پانی کے قطرے جب بوند، بوند گرتے ہوئے ایک چھوٹا سا تالاب بنا لیتے ہیں۔

انسان کی زندگی بھی تقدیر سے بوند، بوند لے کر خوشیاں جمع کرتی ہے چھوٹی، چھوٹی..... مگر دل کو سنبھالا دینے والی خوشیاں چھوٹے، بڑے دکھوں کو سیٹ لینے والی پسینوں خوشیاں ایک تصویر میں مقید ہو گئی تھیں جو اس کی سنگار میز کے تاج پر رکھے ہوئے فریم میں جڑی تھی، جس میں دائیں طرف آدم، بائیں امبرین اور بیچ میں ٹینا تھی۔  
ایک جان دار مسکراہٹ ان کے آپس کے تعلق کو بیان کر رہی تھی۔

”ابا..... امبرین اچھی لڑکی ہے..... آپ نے بہت اچھا کیا۔“  
”تم جب اتنی سیدی ہو جاتی ہو تو مجھے رج کے تعجب ہوتا ہے ٹینا۔“  
”ابا..... میں تھک گئی ہوں..... مغرب تک سو جاؤں؟“  
”سو جاؤ..... پھر میں اپنی بچی کے لیے بہت اچھی سی چائے بناؤں گا۔“  
”ابا..... میری اگر امبرین سے دوستی نہ ہو سکی؟“  
”کوئی بات نہیں..... امبرین تمہیں جانتی ہے..... اور اب تو یہ بھی میں نے اسے بتا دیا ہے کہ تم مجھے پیار میں آدم جی غصے میں اسے آدم سناؤ اور دل سے ابا ہتی ہو۔“  
”مگر اب اس کے سامنے میں آپ کو ابا ہی کہوں گی۔“

”اچھا فیصلہ ہے قائم رہنا اس پر۔“  
”سو گراٹھوں گی تو چائے بنی ہوئی چاہیے۔“  
”اچھا بھئی سن لیا۔“  
کہتے ہوئے اندر آیا تو امبرین اٹھ چکی تھی۔  
”تمہاری نیند پوری ہوئی؟“  
”پوری تو نیند کبھی نہیں ہوتی۔ البتہ کچھ تو ہو گئی ہے آج کے لیے۔“  
”تم بھی ٹینا کی طرح جواب دیتی ہو کبھی بکھار.....“  
”ٹینا آئی ہے؟“  
”ہاں مگر اپنے کمرے میں سونے کے لیے گئی ہے۔“  
”تم نے اسے کچھ کہا تو نہیں آدم؟“  
”میں کیا کہوں گا اسے؟“  
”دیکھو میرے ساتھ جس طرح بھی رہنا چاہیے۔“  
”مجھے پتا ہے بھئی..... اور وہ ہے بھی ایسی۔ تم فکر مت کرو.....“  
”وہ خوش ہے؟“  
”اس سے خود پوچھ لیتا تم۔“  
”ڈرنی ہوں بھئی.....“  
”کب سے؟“  
”شروع سے ہی۔“ وہ ہنس پڑا اس کی بات پر.....

بڑھ کر ایک ہے۔ امام ابراہیم جوہریؒ فرماتے ہیں۔ ”جس کسی نے حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اوصاف بیان کیے بطور تمثیل ہی کیے ہیں اور ان کی حقیقت اللہ کے سوا کوئی دوسرا نہیں جانتا۔“

حضرت امام قسطلانیؒ فرماتے ہیں۔ ”اسلاف نے آقا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اوصاف کا جو تذکرہ کیا ہے یہ بطور تمثیل ہے ورنہ آقا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ذات اقدس اور مقام اس سے بہت بلند ہے۔“

نو قلم میں اتنی سکت ہے کہ ذات مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی شان تحریر کر سکے اور نہ ہی زبان کو بیان کرنے کا یارا ہے۔ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اول و آخر ہیں سب سے پہلے نبوت آپ کو عطا ہوئی آپ خود فرماتے ہیں کہ ہم اس وقت نبی تھے جب حضرت آدمؑ اپنی آب و گل (مٹی) میں جلوہ گر میں تھے۔

آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے پہلے جو انبیا اور رسول تشریف لاتے رہے بنی نوع انسان کی ہدایت کے لیے وہ ایک خاص قوم کی طرف آیا کرتے تھے مگر حضور اقدس صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم قیامت تک تمام جنات اور تمام انسانوں اور تمام قوموں اور قبیلوں اور تمام زبانوں اور تمام مکانات کے بسنے والوں کے لیے رسول ہیں اور نبی ہیں۔ دیگر انبیا کے مقابلے میں جس قدر خصائص آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو عطا ہوئے ہیں۔ وہ متعدد معتبر حدیثوں میں خود زبان اقدس سے ادا ہوئے ہیں۔

حضرت جابرؓ سے مروی ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا۔ ”مجھے پانچ چیزیں ایسی دی گئی ہیں جو مجھ سے پہلے کسی پیغمبر کو نہیں دی گئیں۔ مجھے رعب اور دھاک کے ذریعے سے فتح و نصرت دی گئی۔ میرے لیے تمام زمین سجدہ گاہ بنائی گئی۔ غنیمت کا مال میرے لیے حلال کیا گیا۔ مجھے شفاعت کا مرتبہ عطا ہوا۔ مجھ سے پہلے انبیا خاص اپنی اپنی قوموں کی طرف مبعوث ہوتے تھے۔ اور میں تمام عالمین کے لیے مبعوث ہوا۔ اور حضرت ابو ہریرہؓ نے آنحضرتؐ کی زبان پر چھ باتیں گونوائی ہیں۔

- 1۔ مجھے جامع کلمات عطا کیے گئے ہیں۔
- 2۔ رعب کے ساتھ میری مدد کی گئی ہے۔
- 3۔ مال غنیمت میرے لیے حلال کر دیا گیا ہے۔
- 4۔ روئے زمین کو میرے لیے مسجد اور پاک کرنے والی بنا دیا گیا ہے۔

5۔ مجھے تمام مخلوق کی طرف مبعوث کیا گیا ہے۔  
6۔ اور مجھ پر نبیوں کا سلسلہ ختم کر دیا گیا ہے۔  
قرآن مجید میں آقا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی دو خصوصیتیں مذکور ہوئی ہیں۔ وہ ان سب کو جامع ہیں۔ یعنی تمکیل دین۔ اور ختم نبوت۔

☆☆☆

اسلام کا صحیفہ قرآن مجید جو اجماع الکلام ہے کہ اس کی ایک، ایک آیت کے اندر سیکڑوں اسرار معانی لطائف ہیں۔۔۔۔۔ جب یہ صحیفہ ایسا جامع ہے تو یقیناً وہ دین بھی جس کو لے کر وہ آئے کامل ہوگا۔

قرآن مجید نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے وصال کے قریب مسلمانوں کے عظیم اجماع کے دن جنبہ الدواہر پر اعلان عام کیا۔

”آج کے دن میں نے تمہارے لیے تمہارا دین کامل کر دیا۔۔۔۔۔ اور تم پر اپنی نعمت پوری کر دی اور اسلام کو دین کی حیثیت سے میں نے تمہارے لیے پسند کیا۔“ اسلام قرآن کے عقیدے کے مطابق اس صحیح مذہب کا نام ہے جو اپنے اپنے وقت میں پیغمبر کو عطا ہوا اور عہد بعید دنیا کی عمر کے ساتھ مختلف پیغمبروں کے بقاوں سے تکمیل کو پہنچتا رہا یہاں تک کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی دعوت و تبلیغ کی تکمیل پر وہ اپنے معراج کمال کو پہنچ کر تمام ہو گیا۔۔۔۔۔ اور یہ منصب خاص صرف آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ذات پاک کے لیے روز ازل سے مقدر ہو چکا تھا آپ نے فرمایا۔

”میں پیغمبر آخر تھا اور آدم علیہ السلام ابھی آب و گل میں پڑے تھے۔“  
آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ایک بلیغ تمثیل میں اسلام کی تکمیل دین کی تشریح فرمائی ہے۔ فرمایا۔ ”میری اور دوسرے انبیا کی مثال یہ ہے کہ ایک شخص نے بوا حسین و جیل اور کامل مکمل مل بنایا۔۔۔۔۔ مگر اس میں ایک اینٹ کی جگہ چھوڑ دی پس لوگ اس محل کے رکھو گئے اور اس کی عمدگی پر تعجب کرتے اور یہ کہتے ہیں کہ کاش اس اینٹ کی جگہ بھی پُر کر دی جاتی۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا۔ تو میں وہ آخری اینٹ ہوں۔۔۔۔۔ عمارت دین و نبوت ہے اس کی ایک، ایک اینٹ ایک، ایک پیغمبر کا وجود اور اس کا دین و شریعت ہے اور اس کی تکمیل کا آخری پتھر نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا وجود اقدس ہے۔  
قرآن و دین کا کامل صحیفہ خاتم الانبیا کی وحی اور داعی

معجزہ بن کر آیا۔ تو یہ تکمیل دین یہ آیات میں خود اس بات کے دلائل ہیں کہ آپ کے وجود اقدس پر تمام پیغمبرانہ نعمتوں کا خاتمہ ہو گیا اور نبوت و رسالت کا سلسلہ منقطع ہو گیا اور اب دنیا میں کوئی نیا پیغمبر نہیں آئے گا۔۔۔۔۔ اسی لیے سورہ مائدہ میں تکمیل کی بات کی گئی۔ اور سورہ احزاب میں ارشاد باری تعالیٰ ہے کہ

”محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) تمہارے مردوں میں سے کسی کے باپ نہیں لیکن خدا کے پیغمبر اور تمام نبیوں کے خاتم ہیں۔“ تو شان نبوت، ختم نبوت اسلام کا نہایت اہم اور بنیادی عقیدہ ہے اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی شان ختم نبوت قرآن و سنت کے قطعی۔۔۔۔۔ نصوص سے ثابت ہے کہ نبوت و رسالت کا سلسلہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر ختم کر دیا گیا۔۔۔۔۔ آپ سلسلہ نبوت کی آخری کڑی ہیں۔ آپ کے بعد کسی شخص کو منصب نبوت پر فائز نہیں کیا جائے گا۔

حافظ ابن کثیرؒ آیت خاتم النبیین کے تحت لکھتے ہیں۔ ”اور ختم نبوت پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے احادیث متواترہ وارد ہوتی ہیں۔ جنہیں صحابہ کرام کی ایک بڑی جماعت نے بیان فرمایا ہے۔“ اور علامہ سید محمود آلوسیؒ اپنی تفسیر میں لکھتے ہیں کہ ”آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا خاتم النبیین ہونا انکی حقیقت ہے جس پر قرآن ناطق ہے اور احادیث نبویہ نے اس کو واضح طور پر بیان فرمایا ہے اور امت کا اس پر اجماع ہے۔ پس جو شخص اس کے خلاف کا مدعی ہو اسے کافر قرار دیا جائے گا اور اگر اس پر اصرار کرے تو اس کو کفر کیا جائے۔“ (روح المعانی) حدیث مبارکہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت علیؓ کرم اللہ وجہہ سے فرمایا۔ ”تم مجھ سے وہی نسبت رکھتے ہو جو ہارون (علیہ السلام) کو موسیٰ (علیہ السلام) سے تھی مگر میرے بعد کوئی نبی نہیں۔“ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا۔ ”میرے پانچ نام ہیں۔ میں محمد ہوں، میں احمد ہوں، میں مامی ہوں کہ خدا میرے ذریعے سے کفر کو مٹ کرے گا، میں حاشر ہوں کہ خدا میرے پیچھے سب کو جمع کرے گا۔ اور میں عاقب آخری ہوں جس کے بعد کوئی نبی نہ ہوگا۔“

آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مگر انبیا کے مقابلے میں اپنے جو مخصوص فضائل گنوائے ہیں ان میں ایک خاص ختم نبوت بھی ہے۔

حضرت ابو ہریرہؓ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے

## شمع ہدایت

بیان کرتے ہیں کہ حضور اکرمؐ نے فرمایا کہ بنی اسرائیل کی سیاست خود ان کے انبیا کیا کرتے تھے جب کسی نبی کی وفات ہوتی تھی تو ان کے بعد دوسرا نبی آتا تھا لیکن میرے بعد کوئی نبی نہیں۔“

آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بعد انبیا کی آمد بند ہے البتہ مجددین امت ضرور آئیں گے جیسا کہ حدیث میں آیا ہے کہ

”بے شک اللہ تعالیٰ اس امت کے لیے ہر صدی پر ایسے لوگوں کو کھڑا کرے گا جو اس کے لیے دین کی تجدید کریں گے۔“

حضرت ثوبانؓ سے روایت ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ میری امت میں میں جمع ہوئے پیدا ہوں گے ہر ایک یہی کہے گا کہ میں نبی ہوں۔۔۔۔۔ حالانکہ میں خاتم النبیین ہوں، میرے بعد کوئی قسم کا نبی نہیں۔“

☆☆☆

خلیفہ اول حضرت ابو بکر صدیقؓ سے مروی ہے کہ مسلمہ کذاب کے بارے میں جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے کچھ نہیں فرمایا تھا اس وقت تک لوگوں میں اس کے بارے میں چرچا کیا ہو رہی تھی۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ایک روز خطبہ دیا اور حمد و صلوة کے بعد فرمایا۔ ”یہ شخص جس کے بارے میں تم لوگ رائے زنی کر رہے ہو وہ تمہیں کذابوں میں سے ایک کذاب ہے جو دجال اکبر سے پہلے نکلیں گے۔“

حضرت انس بن مالکؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا۔

”رسالت و نبوت ختم ہو چکی ہے پس میرے بعد نہ کوئی رسول ہے اور نہ نبی۔“

آقا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا۔ ”میرے بعد کوئی نبی نہیں اور میری امت کے بعد کوئی امت نہیں۔“

حضرت ابو ذرؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا۔

”نبیوں میں سب سے پہلے نبی حضرت آدم (علیہ السلام) ہیں اور آخری نبی محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) ہیں۔“

شان ختم نبوت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم انسانیت کے لیے عزت و رحمت ہے کیونکہ سلسلہ نبوت کے خاتمے سے انسانی ملائحتیں اور قوتیں اس خطرے سے محفوظ ہو گئیں کہ تمہوڑے، تمہوڑے وقتے اور دور کے فاسلے پر ایک



ماضی قریب کس کا مایہ ناز

افسانہ نگار اور آج کے دور

کس کا میاب ذرا مانگار

سینا خان

کی خوشگوار آمد سے سچی ہماری خوب صورت بزم

موسم سرما کا لطف اٹھاتے پیارے، پیارے قارئین کی خدمت میں غلوس بھرا سلام..... آج کی بزم آپ کی پسندیدہ ڈراما نگاری کی گرامر ماہرین سے پُر حدت ہو رہی ہے جی ہاں یہ محترمہ کبھی باقاعدگی سے افسانے لکھا کرتی تھیں بڑی اپنی تحریری صلاحیتیں اسکرپٹ رائٹنگ پر صرف کر رہی ہیں اللہ کرے زور قلم اور زیادہ ہو اور ہماری پیاری پابنر اور با صلاحیت سیما صنف افسانہ نگاری کی جانب واپس لوٹ آئیں، آمین۔ آج کی محفل سیما کے

کا..... ہر غبار آلود بے سہارا یتیم کا..... اس بیٹی کا جس کا وجود باعث شرم تھا۔ وہ جو رحمت ہے نباتات کے لیے جمادات کے لیے انسانوں کے لیے..... حیوانوں کے لیے غلاموں کے لیے، شاہوں کے لیے، رحمت کا سائبان سب پر ہے..... اس کی تعلیم سب کے لیے، وہ انسان کامل ہے، ہر اعتبار سے کامل، ہر پہلو سے کامل، ظاہر و باطن کے اعتبار سے، اخلاق و ملکات کے اعتبار سے..... وہ جو محبوب ہے صحابہ کرام کا..... اہل اللہ کا صدیقین و صالحین کا، اہل علم کا اور سب سے بڑھ کر رب کبریا کا..... ایسی عظیم الشان، ہستی سے محبت کیوں نہ ہو؟ عشق کیوں نہ ہو؟ ایسے عظیم پیغمبر خاصہ کائنات کے نام و ناموس پر اپنی جان کا آخری قطرہ خون کیوں نہ بہا دیا جائے۔

سچی اور حقیقی محبت رسول آخرین صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا نام ہے..... سچی پُر خلوص اور بے دیا اطاعت و بندگی کا نام ہے۔ آئیے بارگاہ الودود جل جلالہ میں دست دعا دراز کریں۔ قلب حزیں اور غم آنکھوں سے نفسانی اور شہوانی محبت کے بجائے سچی، حقیقی، ایمانی اور روحانی محبت کی التجا کریں..... اُلٹی ہمیں اپنی محبت عطا کر اور اس عمل کی محبت دے جو ہم کو تجھ سے قریب تر کر دے..... آمین۔

حرف آخر:

یا اللہ یا رحمن دیا رحیم! اے میرے رب یہ محض تیرا کرم اور فضل عظیم ہے کہ تو نے اس عاجز و گناہ گار کو بے نوا بے مایہ علم و عمل کو اپنے محبوب نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی شان اقدس میں چند سطریں لکھنے کی توفیق و سعادت عطا کی..... تو اے میرے پروردگار اس ناچیز کو اپنی بارگاہ اور اپنے محبوب اور ہمارے آقا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی کربیمانہ نگاہ میں شرف قبولیت عطا فرما..... اس میں جہاں کوئی غلطی یا کوتاہی سرزد ہوگئی ہو تو میرے رب مجھے معاف فرما دینا۔ اور دونوں جہاں میں سرفرازی عطا فرما..... اور یا اللہ جن نفوس قدسیہ کی تبرک کتاہوں سے میں نے استفادہ کیا ان پر اپنی خاص رحمتوں کا نزول فرما..... ان کے درجات بلند فرما دے..... اور اس تجریر کے مطالعہ کرنے والوں کو بھی اس کے تمام علمی و عملی منافع عطا فرما اور اطاعت و اتباع اسوۂ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی توفیق عطا فرما..... (آمین) اور اسے ہم سب کے لیے سرمایہ نجات و آخرت بنادے..... آمین یا رب العالمین.....

☆☆☆

نے نبی یا دعوت کا ظہور ہو اور وہ سب ضروری کام چھوڑ کر اس کی حقیقت معلوم کرنے اور اس کی تصدیق و تکذیب کا فیصلہ کرنے میں لگ جائیں تو اس آزمائش سے بچا لیا گیا۔ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا..... ”کوئی بندہ اس وقت تک مومن نہیں ہو سکتا جب تک میں اس کے نزدیک اس کے خاندان اس کے مال اور انسانوں سے زیادہ محبوب نہ ہو جاؤں۔“

اسرائیلیات میں مروی ہے کہ ایک آدمی دو سو برس تک اللہ تعالیٰ کی نافرمانی کرتا رہا اور اللہ تعالیٰ کی نافرمانی و سرکشی میں بڑھ چڑھ کر جرات و دیدہ دلیری دکھا تا رہا۔ جب وہ مر گیا تو بنی اسرائیل نے اس کی ٹانگ پکڑی اور اسے گھسیٹ کر ایک کوڑے پر ڈال دیا۔ اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو نبی فرمایا کہ ”اس کو غسل دے کر کفن پہناؤ اور تمام بنی اسرائیل کو لے کر اس کی نماز جنازہ پڑھو.....“

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے ایسے ہی کیا..... اس بات پر بنی اسرائیل کو تعجب ہوا اور لوگوں نے کہا کہ بنی اسرائیل میں اس سے بڑھ کر اللہ تعالیٰ کا کوئی سرکش اور زیادہ نافرمان نہ تھا۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا..... ”میں جانتا ہوں مگر اللہ تعالیٰ نے مجھے اس کا حکم دیا ہے۔ انہوں نے کہا اپنے رب سے ہمارے لیے معلوم کریں حضرت موسیٰ علیہ السلام نے پروردگار سے التجا کی اور کہا اے پروردگار! تو جانتا ہے جو یہ کہہ رہے ہیں..... اللہ تعالیٰ نے وی فرمائی..... ”انہوں نے سچ کہا اس نے دو سو سال تک میری نافرمانی کی مگر اس نے ایک روز توبہ و توبہ کر کے کھول کر اس میں میرے حبیب محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا نام لکھا دیکھا تو اس کو بوسہ دیا اور دونوں آنکھوں سے لگا لگا..... میں نے اس کے اس عمل کی قدر کی اور اس کے گناہ بخش دیے.....“ سبحان اللہ! آقا کا کیا مقام ہے پروردگار کے نزدیک۔

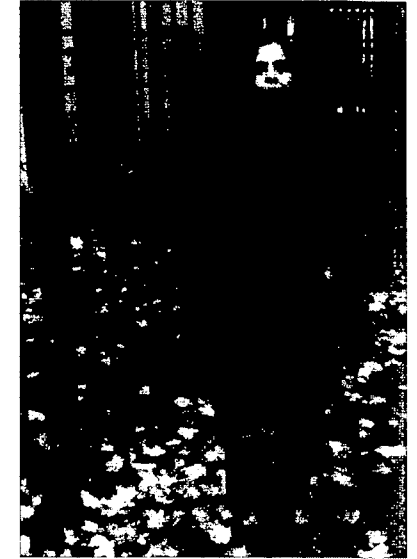
☆☆☆

خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ذات سے عشق و محبت رگ مسلم میں سرایت کیے ہوئے ہے..... آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے والہانہ محبت و عقیدت ہی ایک مسلمان کا اصل سرمایہ حیات ہے..... اور پھر یہ محبت کیوں نہ ہو؟ وہ جو آقا سے میرا اور آپ کا..... کالے اور گورے کا، عربی و عجمی کا، عالم اور جاہل کا، شہری اور بدوی کا، قطب اور ابدال کا، وہ جو حسن ہے ہر قسم رسیدہ مظلوم کا..... ہر نئی ہوئی بیوہ

نام..... تو آئیں قارئین انکشافات سے پُر اور خاصی دلچسپ بات چیت کا آغاز کرتے ہیں۔

پاکیزہ ✨..... جی جناب آج ہم آپ کو پروڈکشن ہاؤس سے بالآخر پہنچ ہی لائے، کیا کہیں گی اس بارے میں؟

سیما مناف ✨..... بہت شکریہ زہبت..... اس



محبت و عنایت کا..... پروڈکشن ہاؤس سے تو میرا تعلق بہت بعد میں بندھا ہے، لوگوں کے سامنے میری پہلی پہچان ڈائجسٹ رائٹر کی ہے۔ (بہت خوب، بالکل درست کہا) پاکیزہ ✨..... ارے بھی کچھ لگتا تو محاورہ تھا کہ دیا برا مت منائیے گا، ہم نے تو اپنی بزم کو رونق بخشنے کے لیے آپ کو باقاعدہ مدعو کیا ہے ٹھیک ہے ناں.....؟

سیما مناف ✨..... سچے اس میں برامانے والی کون سی بات ہے، یہ تو عزت افزائی ہے میری۔

پاکیزہ ✨..... جی تو اب سوال پر سوال ہوتا جائے گا آپ تیار ہیں ناں.....؟

سیما مناف ✨..... جی میں بالکل تیار ہوں آپ کہیے۔ (شکریہ جی!)

پاکیزہ ✨..... ماشاء اللہ آج آپ جانی پہچانی اور نہایت مصروف اسکرپٹ رائٹر ہیں، کیا لگتا ہے؟

سیما مناف ✨..... اللہ کا بہت بڑا احسان ہے اور میری امی کی وعائیں ہیں..... میں اللہ کی بہت شکر گزار ہوتی ہوں کہ اللہ تعالیٰ نے اتنی عزت دی ہے۔ بہت اچھا لگتا ہے جب لوگ ایک کامیاب رائٹر کی حیثیت سے یاد کرتے ہیں..... لیکن اس میں میرا کوئی کمال نہیں، سب اس رب کی مہربانی ہے۔ (جی تو ہے، یہ سب رب کی دی ہوئی صلاحیتیں ہیں)

پاکیزہ ✨..... ابھی ڈائجسٹ اور رسالوں کی دنیا سے تو آپ بظاہر دور ہو گئی ہے ناں اب تو پروڈکشن ہاؤس، پروڈیوسرز، ڈائریکٹرز، ایکٹرز اور ناظرین تو ایسے میں قارئین کی یادیں آتی؟

سیما مناف ✨..... بالکل آتی ہے، جب میں صرف ڈائجسٹ رائٹر تھی اور لوگ میرے افسانوں کو سراہتے تھے، تب بھی اچھا لگتا تھا، کبھی کسی افسانے یا ناولٹ کی اگلے مہینے تعریف ہوتی تو دل بڑا ہوجاتا تھا۔ میرا ناول بہاراں ہے، جو پاکیزہ میں قسط وار شائع ہوا اور اسے لوگوں نے بے حد سراہا۔ بعد میں اس پر میرا ڈراما میرا یقین بنا جو میرا ایک کامیاب ڈراما کہلاتا ہے۔ تو یہ میرے قارئین کی پسندیدگی تھی جس نے اسے کامیاب بنایا۔

پاکیزہ ✨..... رسالوں کے لیے لکھنا جو چھوڑ دیا تھی تو پوچھ رہے ہیں اسکرین کی دنیا اتنی بھاگتی؟

سیما مناف ✨..... میں نے لکھنا نہیں چھوڑا۔ میں لکھنا چھوڑ ہی نہیں سکتی، ہاں بس میڈیا تبدیل ہو گیا ہے۔ (جی تو رسالوں کے لیے لکھنے کی بات کی تھی ڈیر)

پاکیزہ ✨..... اس کا مطلب ہے آپ بڑی اسکرین کے لیے بھی بہت جلد لکھیں گی..... کوئی آفر ہے؟

سیما مناف ✨..... ہاں ایک بار آفر ہوئی تھی سرسری سی..... لیکن ابھی میں خود کو اس قابل نہیں سمجھتی فلم کا اسکرپٹ ایک الگ فارمیٹ ہے..... مستقبل کا کہہ نہیں سکتی، اگر کوئی اچھی آفر ہوئی تو شاید کوشش کر ڈالوں (جی ضرور)

پاکیزہ ✨..... سیما چلیں ذرا اپنے لکھنے کا لفظ

آغاز تو ہمارے قارئین سے شیئر کریں۔ کب پہلی تحریر لکھی؟

سیما مناف ✨..... میں نے پڑھنا تو بہت بچپن میں ہی شروع کر دیا تھا۔ گھر میں کتابوں کا ایک ڈھیر تھا۔ ادبی، مذہبی ہر طرح کی کتابیں گھر میں موجود تھیں۔ گھر میں بچوں اور بڑوں کے کم و بیش دس بارہ رسائل ہر ماہ آیا کرتے تھے۔ امی کو پڑھنے کا بہت جنون تھا۔ بس پڑھ، پڑھ کر لکھنے کا شوق پیدا ہو گیا۔ فرسٹ ایئر میں تھی تو پہلا افسانہ لکھا۔ جو بعد میں پڑھا تو بہت برا لگا۔ لیکن پھر کھتی رہی جمع کرتی رہی اور بی اے فائنل کرتے ہی پہلا افسانہ شائع ہوا۔ (بہت خوب، پھر تو ماشاء اللہ سلسلہ چل پڑا)

پاکیزہ ✨..... اس فلمی سفر میں کیا، کیا مشکلات پیش آئیں کوئی ایک دو یادگار لمحے بتائیں؟

سیما مناف ✨..... اللہ کا شکر کوئی بھی مشکل پیش نہیں آئی..... گھر کا ماحول بہت ادبی تھا، سب بہن، بھائیوں اور امی کو پڑھنے کا شوق تھا۔ عقلمندی یہ کہ پہلا

افسانہ ہی لکھ کر فوراً شائع ہونے نہیں بھیج دیا۔ بلکہ بار بار لکھتی رہی..... میں اپنی تحریروں کی بہترین

نفاذ تھی۔ مجھے معلوم تھا کہ یہ ابھی اس قابل نہیں ہے۔ پھر دہیڑہ ڈائجسٹ کو پہلا افسانہ بھیجا جس کا عنوان تھی دامان

تھا اور جب وہ پہلا افسانہ ہی شائع ہو گیا تو بتا نہیں سکتی، پیر زمین پر

نہیں تک رہے تھے۔ پورے گھر میں شور مچا کر اپنی یہ خوشخبری سب کو سنائی

اور سارے گھر والے میری اس خوشی میں خوش تھے۔ (بالکل جی، سب کا یہی

حال ہوتا ہے)

پاکیزہ ✨..... رسالوں میں لکھتے لکھتے ڈراما نگاری کی طرف کیونکر

دھیان گیا؟

سیما مناف ✨..... کبھی، کبھی کوئی ڈراما دیکھنے سے متاثر ہو جاتا تھا

وہ آئے بزم میں

لگتا، رائٹر کو سراہتی..... لیکن کچھ ڈرامے دیکھ کر مجھے لگتا..... بغیر کسی میسج کے کیسے یہ ڈراما آن اسکر ہو گیا..... پھر مجھے لگا میں بھی لکھ سکتی ہوں..... مجھے بھی کوشش کرنی چاہیے، سو کر ڈالی۔ (ماشاء اللہ کوشش کامیاب رہی)

پاکیزہ ✨..... کیا اس کامیابی کی دوڑ میں کسی نے آپ کا ساتھ دیا؟

سیما مناف ✨..... جی بالکل ڈائجسٹ

میں لکھتے وقت میری امی میری بہترین ناقد تھیں..... مجھے گھر میں لکھنے کا ماحول فراہم کرتی تھیں آج اس کامیابی کے

وقت وہ اس دنیا میں نہیں ہیں۔ جس کا مجھے بہت دکھ ہے۔ وہ ہوتیں تو بہت خوش ہوتیں۔ میرے بہنوئی اور علی رومی

بھائی نے میرے افسانوں کو ڈائجسٹ کے اداروں تک پہنچانے کی ذمہ داری لی ہوتی تھی۔ پھر میرے شوہر

جاوید نے بھی یہ ذمہ داری بڑی خوش اسلوبی سے اٹھائی





سیما مناف کی اپنے بچوں، شوہر و دیگر اہل گھر کے ہمراہ بھرپور سیلفی

سیما مناف ❖..... جی ہاں میرے دونوں قسط وار ناول بہاراں ہے اور کہہ میں کرن، کتابی شکل میں آچکے ہیں۔

پاکیزہ ❖..... آپ نے اتنا لکھا تو اس میں یکسانیت بھی آئی ہوگی، کس طرح ہر کہانی کو منفرد رکھنے کی کوشش کرتی ہیں؟

سیما مناف ❖..... کوشش تو کرتی ہوں کہ یکسانیت نہ آئے۔ کیونکہ میں کہانیاں عموماً اپنے مشاہدے اور قریبی لوگوں سے ہی لیتی ہوں۔ میرے کردار مانوق الفطرت نہیں ہوتے اسی دنیا سے ہوتے ہیں۔ (ویسے اب پریوں اور جنوں پر بھی کہانیاں ہونی چاہئیں)

پاکیزہ ❖..... پاکیزہ سے تاناکہ جڑا.....؟

سیما مناف ❖..... پاکیزہ سے میرا تانا میری لکھاری دوست دلشاد نسیم کے کہنے سے جڑا..... میں نے ان دنوں دوسرے رسالوں میں ہی لکھا تھا۔ دلشاد نے مجھے مشورہ دیا کہ کہیں پاکیزہ میں بھی لکھنا چاہیے۔ یہ لوگ معاوضہ بھی اچھا دیتے ہیں اور پاکیزہ کا ایک نام ہے۔ میں نے اپنا ایک افسانہ ”دریچوں میں چاندنی بھی نہیں“ پاکیزہ میں بھیجا جو اگلے ہی ماہ دسمبر 1989ء میں شائع ہو

آئے سے کیوں جھجکتے ہیں؟

سیما مناف ❖..... جی..... اس کی ایک وجہ شاید معاوضے کی بے حد کمی بھی ہے۔ اس کو بہتر بنایا جانا چاہیے تاکہ اچھے رائٹرز انجمنوں میں بھی اسی خوشی سے لکھیں۔ صرف شہرت سے کسی بھی ادیب کا پیٹ نہیں بھر سکتا..... نہ ہی وہ اپنے گھر والوں کی ضروریات پوری کر سکتا ہے۔ (ڈیڑ ماہ تو وہ بیوی سے بھی اتنا کمزور ہوتا ہے تو ڈائجسٹ جو اس کی پہلی درس گاہ ہے تو اس سے تو اتنا ڈیڑ ماہ تک نہیں ہوتا چاہیے نا.....!)

پاکیزہ ❖..... چلیں اگر اسی سچ پر گفتگو ہوتی رہی تو کافی سچ بھی ہو سکتی ہے آپ بتائیں اپنی لکھی ہوئی کہانیوں کی بھی ڈیڑ ماہی تشکیل کی کہ نہیں؟

سیما مناف ❖..... جی ہاں میرے دونوں ناول جو پاکیزہ میں ہی شائع ہوئے ان پر ڈراما ”کہر“ اور ”میرا یقین“ بن چکے ہیں اور میرے کافی ناول اور افسانوں پر بھی ڈراما سیریل بن چکے ہیں۔ سمجھیں چلے ہوئے کار تو سچا رہی ہوں۔ (اوہ یہ تو آپ نے خود ہی کہہ دیا)

پاکیزہ ❖..... کتابی شکل میں بھی آپ کی تحریریں آئیں؟

نے ان سے کہا کہ یہ تو سیما مناف کے ایک ایسے افسانے پر ہے جسے اب وارڈ ملا ہے۔ فصیح اور موثر شنید نے اس ڈرامے کو فوراً رکویا جس پر میں ان کی بہت شکر گزار ہوں۔ بعد میں، میں نے اس کہانی پر ڈراما بے خودی لکھا جو بہت مقبول ہوا..... اسی طرح میرے دو افسانوں پر دو مشہور رائٹرز نے سیریل بنالئے۔ دونوں بہت پسند کیے گئے اور میں منہ دیکھتی رہ گئی۔ مجھے لوگوں نے بہت اکسایا کہ تم اس بارے میں اخبار میں لکھو لیکن میں کوئی بھڑکنا نہیں چاہتی تھی۔ اس لیے صبر کر لیا۔ لیکن لوگوں کی ہمت پر مجھے بہت حیرت ہوتی ہے کہ وہ کیسے یہ چوری اتنے دھڑلے سے کر لیتے ہیں (ارے بچاری بہت سی رائٹرز نے یہ شکایت کی ہے)

پاکیزہ ❖..... آپ کا ذاتی تجربہ کیا کہتا ہے؟ اگر تو سچ ہے تو پھر ڈائجسٹ رائٹرز کو وہاں نہیں جانا چاہیے کیوں ٹھیک ہے نا؟

سیما مناف ❖..... اپنا تجربہ میں بتا چکی ہوں، یہاں بہت کچھ ہو رہا ہے لیکن ان کا ہاتھ پکڑنے والا کوئی نہیں ہے لیکن ضمیر میں بھی تو ایک عدالت لگتی ہے۔ کیا اس میں بھی وہ لوگ خود کو اتنی آسانی سے بری کر دیتے ہیں؟ (ضمیر صاحب کو سلیپنگ پلو پر رکھا جاتا ہے)

پاکیزہ ❖..... ویسے کرسٹل انٹرنیشنل ٹور شیعے میں ہے اور معاشی طور پر مضبوط سے مضبوط تر ہونا ہر ایک کا حق ہے مگر اندھا دھند دوڑنا کیا کہلاتا ہے؟

سیما مناف ❖..... دیکھیں کرپشن بھی تو ہر شعبے میں ہے اور ہم کسی کا ہاتھ نہیں پکڑ سکتے، معاشی طور پر بھی مضبوط ہونا ہر ایک کی خواہش ہوتی ہے لیکن اس کے لیے ہر جائز ناجائز طریقہ استعمال کرنا بالکل بھی ٹھیک نہیں ہے۔ اسی لیے تو آج ہمارا ملک اس سچ پر پہنچ گیا ہے۔ اس کی روک تھام اور پکڑ ہونی چاہیے۔ (سیما اگر اپنی ذات میں ہم خود راست باز ہوں تو آگے ان برائیوں کی نوبت ہی نہیں آئے، ہر کوئی اپنا احتساب خود ہی کر لے)

پاکیزہ ❖..... اچھا یہ بتائیں کہ ماہناموں اور رسالوں سے شہرت پانے والے آج ڈائجسٹ میں واپس

اور میری بہت حوصلہ افزائی کی۔ ڈراموں کی دنیا میں پہلے قدم پر میرا ساتھ میری دوست رفعت سراج نے دیا اور میری بہت حوصلہ افزائی کی۔ انہوں نے مجھے نو راجدائی شاہ کے پاس بھیجا..... جن سے میں نے بہت کچھ سیکھا..... نور نے مجھے ہم ٹی وی کے فصیح باری خان کے پاس بھیجا، جہاں سے فصیح نے مجھ سے قصوں کی جادو کے لیے ایک سنکھل پلے ٹھن لکھوایا۔ فصیح نے بھی اسکرپٹ رائٹنگ میں میری بہت حوصلہ افزائی کی۔ ان کا کہنا تھا کہ میں مستقبل میں آپ کو ایک کامیاب رائٹر کی صورت میں دیکھ رہا ہوں..... اور سب سے آخر میں، میری جان سے عزیز دوست ”ماما ملک“ جسے آپ ایک کامیاب رائٹر کے نام سے جانتے ہیں۔ اس نے مجھے مشہور ڈائریکٹر اور پروڈیوسر بابر جاوید کے پاس بھیجا..... جہاں سے میرا پہلا سوپ سیریل ٹوٹے ہوئے پر پیش کیا گیا۔ پھر بس آگے کا سفر شروع ہو گیا۔

پاکیزہ ❖..... تو پھر واپس افسانے اور ناول کی دنیا میں کیوں نہ آئیں؟

سیما مناف ❖..... بس ڈراما رائٹنگ میں..... بلکہ اپنا مصروف ہونے کے باعث نا، ہم ہی نہیں مل پاتا لیکن افسانہ نگاری کا ایک الگ حسن ہے، کوشش کر رہی ہوں کہ اس کے لیے وقت نکالوں۔

پاکیزہ ❖..... ہم نے تو مختلف النوع آراء، تجربات اور خیالات اسکرپٹ رائٹنگ کے حوالے سے سن رکھے ہیں۔ مثلاً آئیڈیا یا پلاٹ چرائینا، بلاوجہ آپ کے خیال کو رد کر کے کسی اور سے ڈرامائی تبدیلی کر کے لکھو لینا وغیرہ، وغیرہ.....

سیما مناف ❖..... بالکل میرے ساتھ ایسا ہوا ہے۔ جب میں ڈراما نگاری کی حیثیت سے مشہور نہیں ہوئی تھی۔ فصیح باری خان نے مجھے ہم ٹی وی بلایا، انہیں مجھ سے کوئی ٹیلی فلم لکھوانی تھی۔ میں نے جب انہیں اسٹوری بتائی تو وہ حیران رہ گئے۔ ایک مشہور ڈراما رائٹر نے ان کو اس پر ٹیلی فلم لکھ کر دی تھی۔ فصیح نے انہیں فون کیا تو انہوں نے معصوم بن کر کہا کہ مجھے یہ کہانی کسی نے سنائی تھی۔ فصیح



ماشاء اللہ سدا سلامت رہے یہ جوڑی، آمین

برداشت کرنی چاہیے، اس سے بعض مرتبہ ہم اپنی تحریروں میں بہت بہتری لاتے ہیں (جی ہاں، بالکل)

پاکیزہ ✨..... ڈیر سید شایہ پہلی دفعہ آپ اتنا تفصیلی انٹرویو دے رہی ہوں گی تو سوالات تو مختلف نوعیت کے ہوں گے..... کیا لگ رہا ہے؟

سیما مناف ✨..... بہت اچھا لگ رہا ہے، بہت دوستانہ انداز میں بہت خوب صورت سوالات کا جواب دیتا۔ بہت سی ایسی باتیں ہیں جو میں اپنے دوستوں، اپنے گھر والوں اور اپنے پڑھنے والوں سے کرنا چاہتی تھی، اس انٹرویو کے ذریعے کر رہی ہوں۔ اس کے لیے بہت شکریہ ڈیر نزہت.....! (آپ کا بھی شکریہ مصروفیات سے وقت نکالنے کا اور ہمارے جیسے سوال برداشت کرنے کا)

پاکیزہ ✨..... اچھا دوستی کے بارے میں بات ہو جائے آج بھی نوجوانی کی دوستیاں، ناتانے قائم ہیں؟

سیما مناف ✨..... دوستی ایک بہت مضبوط رشتہ ہے لیکن دوستی کبھی یکطرفہ نہیں ہوتی اور دوست ہوتا نہیں ہر ہاتھ ملانے والا..... ہاں میرے بہت سے پرانے دوست ابھی تک رابطے میں ہیں۔

پاکیزہ ✨..... آج آپ اپنی اس مصروفیات

ہاں سب ہی تعریف کرتے ہیں۔ شاید منہ دیکھے ہاں..... (اچھا ایسا ہے)

پاکیزہ ✨..... انسان کی فطرت ہے تنقید مشکل سے برداشت کرنا ہے..... آپ کیا کہتی ہیں؟

سیما مناف ✨..... نہیں میں ہر تنقید بہ آسانی برداشت کر لیتی ہوں..... بشرطیکہ وہ واقعی تعمیری تنقید ہو۔ میرے ڈرامے بے خودی..... پر شروع میں ہی تنقید ہونے لگی کہ سیما مناف کو کیا ہو گیا۔ ایک rapist کو روڈ بینک ہیرو کے طور پر پیش کیا ہے۔ میرا کہنا ہے کہ جب تک اس کا اینڈ نہ ہو جائے اس پر تنقید کرنا بالکل بھی جائز نہیں اور جب بے خودی ختم ہوا تو تحریروں کے انبار لگ گئے۔ لوگوں نے اس ڈرامے کو لکھنے کا میرا مقصد سمجھ لیا تھا۔ اللہ کی حمد و کو پار کرنے والے کی سزا اسی دیا میں شروع ہو جاتی ہے۔ اس لیے ایسے ناقدین سے ہماری گزارش ہے کہ تھوڑا صبر سے کام لیا کریں۔ اور آخر تک اسے دیکھ کر تنقید کریں۔ (مگر بیچارہ رائٹر بھی تو صبر کا پائہ لبریز نہ کروانے ناں ڈیر!)

پاکیزہ ✨..... تنقید برداشت نہ کرنے والے کس طرح بہتری کی راہ کی طرف جاسکتے ہیں؟

سیما مناف ✨..... تنقید اگر تعمیری ہو تو ضرور

ماہنامہ پاکیزہ

سیما مناف ✨..... آج آپ اپنی اس مصروفیات

دم ہی گھٹ جائے گا۔“ میں اتنی چھوٹی بچی کے منہ سے یہ بات سن کر رنگ رہ گئی تھی۔ پھر میں نے اس بات سے متاثر ہو کر ایک افسانہ بند کھڑکیاں لکھا۔ مجھے آج تک یاد ہے کہ ہمارا کوکب بخاری نے اس افسانے کی بہت تعریف کی تھی اور کہا تھا کہ عنوان اتنا منفرد تھا کہ میں پڑھنے پر مجبور ہو گئی اور افسانے کے اختتام پر میرے منہ سے بے ساختہ نکلا واہ.....“ میرے اس افسانے کا موضوع بھی یہی تھا کہ عورت کے لیے گھر بنانا کافی نہیں ہوتا اسے تازہ ہوا کی بھی ضرورت ہوتی ہے۔ آج کل میں ہم ٹی وی کے لیے اس پر ایک سیریل لکھ رہی ہوں اور انتہائی دکھ کی بات یہ ہے کہ اپنے بچپن میں اتنی گہری بات کرنے والی میری جان سے پیاری بھانجی کا صرف 30 سال کی عمر میں برین ٹیمبرج سے ڈھائی سال پہلے انتقال ہو گیا۔ صرف بند کھڑکیوں کی وجہ سے..... (اوہو، بہت افسوس ہوا جان کر)

پاکیزہ ✨..... سنا ہے رائٹرز..... پروڈیوسر اور فنائرسز کے ہاتھوں یوں مجبور ہوتے ہیں کہ وہ جو چاہیں لکھوائیں؟ کیا ایسا ہی ہے؟

سیما مناف ✨..... نہیں ایسا نہیں ہے۔ میں اپنی مرضی سے لکھتی ہوں جس کہانی پر میرا دل و ذہن رضا مند نہ ہو اسے مجھ سے کوئی نہیں لکھوا سکتا۔ ہاں میرے دو ڈراموں کے ساتھ ایسا ہوا کہ ان کو بوہانے کے لیے اس میں مزید سبز (scences) ڈالے گئے۔ جس پر میں بہت خفا ہوئی اور پھر اس پروڈکشن ہاؤس کے معافی مانگنے اور یہ یقین دہانی کرانے پر راضی ہوئی کہ آئندہ ایسا نہیں ہوگا۔ مجبور یہ ہے کہ رائٹر کے پاس کوئی کافی رائٹ کا حق نہیں ہے۔ (آپ سب رائٹرز مل کر کچھ سوچیں ناں مگر..... آہم م م م)

پاکیزہ ✨..... آج آپ کے ڈرامے گھر والے کتنے شوق سے دیکھتے ہیں اور تنقید لگتی کرتے ہیں؟

سیما مناف ✨..... میرے ڈرامے شروع، شروع میں میرے گھر والوں اور بہن، بھائیوں نے بہت شوق سے دیکھے..... پانچ ڈراموں تک یہ سلسلہ چلا کہ پہلی قسط پر میرے بہن، بھائی تحائف اور مٹھائی وغیرہ لے کر وہ

گیا پھر پاکیزہ سے ایک مضبوط تعلق بن گیا۔ (بہت شکریہ تعلق بنانے کا اور نبھانے کا)

پاکیزہ ✨..... چلیں اب مطالعہ تو رہتا ہی ہوگا۔ پاکیزہ کے متن و مضامین پر کیا کہیں گی؟

سیما مناف ✨..... کافی عرصے سے کسی ڈائجسٹ میں نہیں لکھا اس کے باوجود پاکیزہ مجھے آج بھی اسی طرح ملتا ہے۔ جس کے لیے میں عذرا رسول کی شکر گزار ہوں، پاکیزہ کے افسانے اور مضامین منفرد ہوتے ہیں۔ اور یقیناً ان سے قارئین بہت کچھ سیکھتے ہیں۔

پاکیزہ ✨..... اپنے طالب علمی کے دور کی کوئی خوشگوار یاد، کوئی ناقابل فراموش، واقعہ؟

سیما مناف ✨..... ہائے..... کیا یاد دلادیا نزہت..... میں نے اسکول اور کالج میں بہت فعال زندگی گزاری ہے۔ ڈرامے، ٹیبلو، نعت خوانی، بیت بازی کوئی شعبہ نہیں چھوڑا۔ ہمارا سات لڑکیوں کا گروپ تھا کالج میں..... فرزانہ، شاہین، عذرا، شانہ، عائشہ، صبیحہ اور میں..... شرارتی ٹولہ مشہور تھا ہمارا..... مجھے اسکول اور کالج دونوں کی فیز ویل پارٹی میں شرارتوں پر ٹانگل ملے..... آج سب سہیلیاں ادھر ادھر پھرنے لگیں۔ بہت یاد آتی ہیں، ان میں سے چار تو ملک سے باہر ہیں۔ باقی کہاں ہیں پتا نہیں وہ شاید آج یہ پڑھ کر رابطہ کریں..... لیکن ان دوستوں کی کمی آج میری رائٹرز دوستوں سے پوری ہو جاتی ہے۔

پاکیزہ ✨..... اپنے مشاہدے، تجربے، کس حد تک اپنی تحریر میں ڈالے؟ اور اب ڈراموں میں بھی اپنے ارد گرد کا ماحول کس حد تک نمایاں کرتی ہیں؟

سیما مناف ✨..... میں ذاتی مشاہدے، انسانی نفسیات، لوگوں کے رویوں، ارد گرد کے ماحول سے متاثر ہو کر ہی لکھتی ہوں۔ مجھے یاد ہے کہ ایک بار ہم سب گھر والے پکنک پر گئے تھے۔ اپنی بھانجی حرا کے کہنے پر میں نے اس کے لیے ریت سے ایک گھر وندا بنایا تو اس میں کھڑکیاں بنانا بھول گئی۔ وہ اس وقت شخص جھ، سات سال کی ہو گئی کہنے لگی ”کا کا! آپ نے اس گھر میں کھڑکیاں تو بنائی ہی نہیں..... اس میں تو جو رہے گا اس کا تو

الفطرت نہیں۔

پاکیزہ ♣..... بڑھنے میں کیا ترجیح رکھی مطلب مطالعہ تو آج بھی کرتی ہوں گی؟

سیما مناف ♣..... ہاں مطالعہ کیے بغیر تو میں رہ ہی نہیں سکتی۔ اچھی ادبی اور مذہبی کتابیں اور رسائل ہمیشہ میرے زیر مطالعہ رہے ہیں۔ لیکن جب سے قرآن پاک کو ترجمے اور تفسیر سے پڑھنا شروع کیا سب کچھ پیچھے رہ گیا۔ قرآن زندگی کے ہر پہلو کا احاطہ کرتا ہے یقین کریں ایک مرتبہ اسے سمجھ کر پڑھنا شروع کر دیں۔ پھر کسی اور چیز کی ضرورت ہی نہیں رہے گی۔ (جی بالکل درست کہا)

پاکیزہ ♣..... اپنی ہم عصر رائزر رابطے میں رہتی ہیں یا اب بس ڈراما نگاران سے ہی دوستی ہے؟

سیما مناف ♣..... میری ہم عصر رائزر تو میری زندگی کا حصہ ہیں۔ ہم سب اکثر کہیں نہ کہیں جمع ہونے کا بہانہ ڈھونڈتے ہیں۔ سب اتنی پیاری ہیں۔ سب سے مل کر میں جتنی طور پر فریٹ ہو جاتی ہوں۔ صبیحہ شاہ، عذرا رسول، منزہ سہام، غزالہ رشید، شائستہ عزیز، سیمارضا، رضوانہ پرنس، شگفتہ شفیق، عقلمند حق، دلشاد نسیم، انجم انصار، فرزندانہ آغا میری بہت اچھی دوست ہیں۔ جن سے رابطہ رہتا ہے۔ (کسی کا نام لینا بھول گئی ہوں تو معذرت) کئی ڈراما رائزر سے بھی اچھی بات چیت ہے۔ لیکن میری جان عزیز دوست ماہا ملک ہے جسے میں مصروفیت یا کسی اور وجہ سے فون نہ کر پاؤں تو چوتھے دن مجھے یقین ہوتا ہے کہ اس کا فون ضرور آجائے گا اور یقین کریں آجاتا ہے۔ وہ جتنی اچھی رائزر ہے اتنی ہی پیاری شخصیت اور خوب صورت دل کی مالک ہے۔ میری راز دار، نمکسار اور ہمدرد بے حد پیاری سی دوست، جس سے دوستی کو فقط آٹھ سال بیٹے ہیں لیکن لگتا ہے ہم ہمیشہ سے ایک دوسرے کے دوست ہیں۔ مجھے اس کی دوستی پر فخر ہے۔ اللہ اس دوستی کو ہمیشہ قائم رکھے، آمین۔ (اللہ ایسے دوست سب کو دے سیما) صبیحہ شاہ میں مجھے دوست سے زیادہ ایک بہن نظر آتی ہے۔ بہت ڈیسنٹ، مخلص اور محبتوں سے بھر پور، عذرا رسول کا کیا کہوں..... جب سے ان سے دوستی ہوئی ان کی گرم جوشی اور محبت مجھے سرشار کر دیتی ہے۔ اور جب وہ یہ

پاکیزہ ♣..... اپنی فیملی کا بھی مختصر تعارف کروائیں؟

سیما مناف ♣..... جاوید مسعود میری زندگی کے ساتھی ہیں اور میرے بہترین دوست، میرے دو بیٹے ذہیب اور طہ ہیں۔ دونوں شکاگو امریکا میں زیر تعلیم ہیں، ہماری چھوٹی سی فیملی میں بہت یگانگت ہے۔ بچوں کے دور جانے سے زندگی بہت ٹھہر گئی ہے لیکن جب ہم ان سے ملنے جاتے ہیں تو یقین کریں پتا نہیں چلتا وقت کیسے بیت گیا..... ہم چاروں میں بہت دوستی ہے اور ہم ایک دوسرے کے ساتھ بہت انجوائے کرتے ہیں۔

پاکیزہ ♣..... بچپن کی یادیں، باتیں، شرارتیں، کوئی ایک ہم سے بھی شیئر کریں؟

سیما مناف ♣..... بچپن میں بہت شرارتیں کزنز اور دوستوں کے ساتھ کیں۔ ہم سارے کزنز ایک دوسرے کے بہت قریب تھے۔ خوب انجوائے کرتے تھے۔ مجھے آج تک جنوری کی وہ صبح بستہ رات یاد ہے جب ہم سب چھت پر فولڈنگ بیڈ بچھا کر لٹاؤڑھے کھلے آسان کے نیچے باتیں کر رہے تھے۔ رات دو بجے ارادہ کیا کہ آؤس کریم کھائی جائے۔ سب اسٹوڈنٹ تھے۔ بڑی مشکل سے پیسے جمع ہوئے۔ میرا کزن لالی اور گڈو آؤس کریم لے کر آئے اور ہم نے دانت بجاتے ہوئے وہ آؤس کریم کھائی..... سوچتی ہوں تو ہنسی آتی ہے۔ آج ہمارے بچے یہ حرکت کریں تو ہم انہیں کتنا ڈانٹیں گے۔ جاوید کو یہ واقعہ ایک دن سنایا تو انہوں نے فوراً کہا ہم لوگ ہاں ہی تھے۔

پاکیزہ ♣..... جب آپ رسالے میں لکھتی تھیں تو کیا موضوعات چنتی تھیں اور اب ڈرامے میں کیا نوکس کرتی ہیں؟ ظاہر ہے دونوں فیلڈز میں فرق ہے آپ اپنے مجربے کے حوالے سے واضح کیجیے؟

سیما مناف ♣..... میں جب ڈائجسٹوں میں لکھتی تھی تب بھی میرا موضوع رشتے ہوا کرتے تھے اور آج بھی میں رشتوں کو بہت اہمیت دیتی ہوں۔ میرے کردار ہمیشہ اسی دنیا کے باسی ہوتے ہیں۔ مافوق

اور مین سے بنی ساری چیزیں پسند ہیں۔ اس کے علاوہ چائیز، خوشبو، موتیا کے پھول کی عشق کرنے کی حد تک پھول بھی موتیا کا، لباس شلوار قمیص دوپٹا، تمام پہاڑی مقامات، موسم برف باری اور بارش کا، رشتے سب پیارے ہوتے ہیں اگر وہ سچے ہوں..... لیکن ماں کی محبت کا مقابلہ کوئی نہیں کر سکتا..... کتاب قرآن سے بہتر کون سی کتاب ہو سکتی ہے۔ اسے درست بخوبی، ترجمہ اور تفسیر سے پڑھیں کہ یہی اس کا حق ہے۔ اس کے علاوہ ادبی کتابوں کی ایک لمبی لائن ہے۔ خلیل جبران کی نوٹے ہوئے پر، صدیق سالک کی یاراں دوزخ، اور مشتاق احمد یوسفی کی آب گم وغیرہ، شاعری میں احمد فراز، فیض، ابن انشا، پروین شاکر بہت پسند ہیں۔ لیکن ضروری نہیں کہ کوئی بھی اچھا شعر صرف ان کا ہی ہو۔ کوئی بھی شعر کسی بھی وقت اچھا لگ سکتا ہے۔ شعر تو اتنے یاد ہیں کہ آپ کا پورا ڈائجسٹ ختم ہو جائے گا۔ شعر ختم نہیں ہوں گے۔ بیت بازی کے مقابلوں میں حصہ لیتی رہی ہوں ناں (ارے کوئی ایک شعر تو سنا دیتیں)

پاکیزہ ♣..... اچھا خود بھی دیگر کئی وی ڈرامے دیکھتی ہیں یا بس لکھتی ہی رہتی ہیں؟

سیما مناف ♣..... نہیں جو بھی اچھا ڈراما ہو میں بہت شوق سے دیکھتی ہوں۔ خلیل الرحمن قمر اور عمیرہ احمد میرے پسندیدہ رائزر ہیں۔ پہلے اشفاق احمد اور حسنین کے ڈرامے بہت شوق سے دیکھا کرتی تھی۔

پاکیزہ ♣..... آخری پاکستانی، مودی کب اور کون سی دیکھی؟

سیما مناف ♣..... ہر فلم نہیں لیکن کوئی بہت اچھی فلم ضرور دیکھتی ہوں جو بس دل کو اچھی لگ جائے لیکن فی زمانہ ایسی اچھی فلمیں بن نہیں رہی ہیں۔

پاکیزہ ♣..... کیا بھی اس غرض سے بھی کہ دیکھتی ہیں کہ کوئی نیا آئیڈیل بن جائے؟

سیما مناف ♣..... نہیں کبھی سوچ کر تو ایسا نہیں کیا کیونکہ میرے لکھنے کا ایک اپنا انداز ہے..... اور میں اس ڈگر سے ہٹ کر دوسروں کو کاہلی نہیں کر سکتی۔

میں گھر والوں کو رشتے داروں کو اور دیگر ملنے جلنے والوں کو کس حد تک وقت دے پاتی ہیں؟

سیما مناف ♣..... مجھے لوگوں سے ملنا جلنا اچھا لگتا ہے۔ میں رشتے داروں، دوستوں سب سے ملتی رہتی ہوں۔ مصروفیت اپنی جگہ، لیکن رشتے بھی بہت اہم ہوتے ہیں۔ (جی..... تو ہے انہی سے تو ہمیں ہمت ملتی ہے)

پاکیزہ ♣..... پرخلوں اور سچے دوست کی کیا تعریف ہے؟

سیما مناف ♣..... وہ دوست جس سے آپ اپنے دل کی ہر بات بلا جھجک، بنا کسی خوف کے کر سکیں۔ جو آپ کی خوشی میں خوش ہو اور آپ کے کڑے وقت میں آپ سے کندھا ملا کر کھڑا ہو اور جس سے بات کر کے آپ کو گلے کہ ماحول کی ساری گرانی، خوشگوار ماحول میں تبدیل ہو گئی ہے۔ (واہ کیا خوب صورت وضاحت کی ہے)

پاکیزہ ♣..... اچھا تو ان خصوصیات پر ہم خود بھی اپنے آپ کو پڑھتے ہیں؟ یا صرف توقعات ہی رکھے چلے جاتے ہیں؟

سیما مناف ♣..... ٹھیک کہا آپ نے..... ہم لوگوں سے تو توقعات رکھ لیتے ہیں اور خود ان کی توقعات پر پورا نہیں اترتے۔ لیکن میرے دوست احباب اس بات کے گواہ ہیں کہ میں ہر ممکن کوشش کرتی ہوں کہ ان کی توقعات پر پوری اتروں..... کہیں انجانے میں کوئی کوتاہی ہو جائے تو اس کے لیے پیشگی معذرت.....

پاکیزہ ♣..... سیما مناف ایک افسانہ، ناول، ناول نگار اچھی ہے یا ایک ڈراما رائزر..... آپ خود کو کیا سمجھتی ہیں؟

سیما مناف ♣..... اس کا جواب تو میرے قارئین اور ناظرین ہی دے سکتے ہیں، میں خود سے کیا کہہ سکتی ہوں۔ (چلیں یہ قارئین سے پوچھ لیتے ہیں)

پاکیزہ ♣..... اپنی کچھ ذاتی پسند ناپسند سے بھی آگاہ کریں؟ مثلاً پسندیدہ کھانا، خوشبو، ذائقہ، کتاب، کوئی یادگار جملہ، کوئی شعر وغیرہ، وغیرہ.....

سیما مناف ♣..... کھانے میں سب کچھ صبر و شکر سے کھا لیتی ہوں..... ویسے تمام سبزیاں، تمام دالیں

# جانے انجانے میں سرزد ہونے والی سال رواں کی دلچسپ حقائق

## شائستہ زریں

گویا سال کے آخری ماہ میں ادارہ پاکیزہ کی جانب سے مسکراہٹوں اور ہنسی کی سوغات پیش خدمت ہے۔ جب بات حماقتوں کی چل نکلی ہے تو کیوں نہ آغاز خود اپنی ہی کسی حماقت سے کر لیا جائے۔

کل ہی کی بات ہے۔ ظہر کی نماز پڑھ کے امی آرام کرنے کی نیت سے لیٹی تھیں۔ میں بھی امی کے برابر تخت پر لیٹ گئی۔ تخت فرش سے کافی اونچا ہے۔ اس خیال سے کہ فون کی گھنٹی کی آواز سے امی.... بے آرام نہ ہوں، دونوں موبائل تخت کے نیچے پھٹی چاندنی پر رکھ دیے۔ اور خود کتاب کے مطالعے میں مصروف ہو گئی، یکا یک موبائل ایک تسلسل سے پر زور آواز میں بجنے لگا۔ موبائل کی آواز فوری بند کرنے کے لیے وہیں لیٹے، لیٹے میں نے موبائل اٹھانے کی کوشش کی اور پلٹ کراہی کو بھی دیکھنے لگی کہ امی کی آنکھ تو نہیں کھل گئی۔ امی کسمسا رہی تھیں۔ بدحواسی کے عالم میں چہرہ امی کی جانب اور میں ہاتھ نیچے کیے تخت کے نیچے سے موبائل اٹھانے کی کوشش کر رہی تھی۔ اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے ہاتھ کے ساتھ، ساتھ میں خود پوری کی پوری تخت کے نیچے جلدی سے ہاتھ بڑھا کر موبائل بند کر کے امی کو دیکھا امی سوئی جا گئی کیفیت میں تھیں۔ کیا ہی اچھا ہوتا اگر میں موبائل کی آواز کم کر دیتی۔ یا تخت سے اتر کر فوری موبائل کی آواز بند کر دیتی۔ مگر حواس ٹھکانے پر ہوتے تب ناں۔ (باہا با)

## اقبال بانو

(مصنفہ و اسکرپٹ رائٹر بول چنل)

انسان خطا کا پتلا ہے۔ اور ایسا تو ہو ہی نہیں سکتا کبھی کوئی غلطی نہ ہوئی ہو۔ غلطیاں تو بار بار ہوتی ہیں۔ جیسے چند ماہ پہلے بازار میں بہت باریک چینی آئی

یہ بجا کہ بسا اوقات انسان اپنی غلطیوں اور حماقتوں سے وہ سبق حاصل کر لیتا ہے جو علم و دانش کی کتابیں کھول کر پینے کے باوجود نہیں سیکھ سکتا۔ غلطیوں کی بھی کئی اقسام ہوتی ہیں دانستہ غلطی، نادانستہ غلطی، تنہین غلطی، سادہ سی غلطی، بڑی غلطی، چھوٹی غلطی وغیرہ اور بعض غلطیاں تو ایسی دلچسپ اور معصومانہ ہوتی ہیں جو جب بھی یادوں کی دلیلیز پر دستک دیتی ہیں تو بے اختیار ہنسنے پر مجبور کر دیتی ہیں۔ ہم خواتین سے تو ایسی معصومانہ غلطیاں اکثر سرزد ہو جاتی ہیں۔ بالخصوص اس وقت جب کم سے کم وقت میں زیادہ سے زیادہ کام نھنا ہو، ذہن نمی ستوں میں سفر کر رہا ہو یا ایک سے زائد کام ہاتھ میں ہوں اور وہ بھی باورچی خانے سے وابستہ امور..... ایسے میں خواتین کی ایسی ایسی بدحواسیاں منظر عام پر آتی ہیں کہ عام حالات میں وہ ان کا تصور بھی نہیں کر سکتیں۔ گویا خواتین سے سرزد ہونے والی بیشتر حماقتوں اور غلطیوں کی آماجگاہ ان کے گھر کی رونق، جی ہاں باورچی خانہ ہی ہوتا ہے لیکن یہ مخصوص کاپی نہیں، دلچسپ غلطی یا حماقت کہیں بھی سرزد ہو سکتی ہے۔ ہنمادی شرط بروقت حواس بحال نہ رکھنا ہے۔

2017ء رخصت ہونے کو ہے۔ ہم نے سال بھر گاہے بے گاہے مختلف موضوعات پر سروے رپورٹس پیش کیں۔ سال کا آخری مہینہ ہے ہم نے سوچا کیوں نہ رواں سال کو خوشگوار طریقے سے رخصت کریں۔ اپنی سوچ کو عملی جامہ پہنانے کے لیے ہم نے آپ کے لیے ایک دلچسپ سروے رپورٹ کا اہتمام کر کے خواتین سے معلوم کیا کہ.....

سوال: سال رواں میں جانے انجانے میں آپ سے سرزد ہو جانے والی کوئی دلچسپ غلطی یا حماقت جو اب بھی یاد آ جائے تو بے اختیار ہنسی آ جائے؟

ڈرامے میں آپ کو کوئی مثبت پیغام ملے..... اسے ضرور اپنائیے۔ اللہ، اس کے رسول اور وطن سے محبت کیجیے..... اپنے گھر والوں کے لیے وقت نکالے، اور بچوں کی تربیت پر خاص توجہ دیجیے..... حقوق اللہ کے ساتھ، ساتھ حقوق العباد کو بھی نظر انداز نہ کریں، کسی کا حق کبھی نہ ماریں۔ اپنے ہر مسئلے کا حل قرآن و سنت کی روشنی میں تلاش کریں۔ زندگی کبھی آپ کو مایوس نہیں کرے گی۔ (بے شک)

پاکیزہ ✨..... ہماری بزم میں آپ تشریف لائیں کیسا لگا یہاں آنا؟

سیما مناف ✨..... بہت، بہت، اچھا..... مجھے نہیں لگا کہ میں کوئی انٹرویو دے رہی ہوں۔ نہ بہت آپ کے سوالات بہت دلچسپ اور زندگی سے بھرپور تھے۔ (نوازش بہت، بہت،) پاکیزہ کا شکریہ کہ اس نے مجھے اس قابل سمجھا اور اظہار کا موقع دیا۔ پاکیزہ سے میرا رشتہ اٹوٹ ہے۔ عذرا ہمیشہ محبت سے مجھے بلاتی ہیں اور میں اسی محبت سے دوڑتی چلی آتی ہوں جیسے آج چلی آئی۔ (دوڑتی ہوئی آئی تھیں۔ جیسی تقریب میں اول نمبر پر تھیں، ہے ناں.....!)

☆☆☆

سیما مناف آپ کا بہت، بہت شکریہ ادا کرتے ہوئے دعا گو بھی ہیں کہ آپ کی یہ خوب صورت مصروفیات سدا آپ کو اور آپ کے چاہنے والوں کو محفوظ کرتی رہیں۔ ہمیں بہت ہی اچھا لگا سیما کہ آپ نے بھرپور جوابات دیے اور سیر حاصل باتیں ہوئیں۔

قارئین اجازت..... وقت اور صحت نے مہلت دی تو اگلے ماہ پھر یہ بزم سناں گے۔ سدا خوش رہیں اور اپنے پیاروں کو خوش رکھیں، آمین!

اللہ ہم سب کا حامی و ناصر ہو۔

جنوں کے راستے یوں تو کھن سے لگتے ہیں مگر یہ راستے منزل تک لگتے ہیں زمانہ ہر قدم پہ راہ روکنے والا عزائم پختہ ہوں جن کے وہ کب جھٹکتے ہیں

☆☆☆

کہتی ہیں کہ سیما مناف تم سے ملنا بہت اچھا لگتا ہے (بہت سی باتیں آف دی ریکارڈ ہیں) کیونکہ میں چاہتی ہوں ہماری دوستی کو نظر نہ لگے اور یہ دوستی ہمیشہ قائم رہے تو یقین کریں میں بے انتہا خوش ہو جاتی ہوں۔ منظرہ ہام کوٹ سی، بہت پیاری صورت والی ہنس لڑکی..... میری گڈ لک میں سفر بہت ہے۔ شائستہ عزیز اور میری دوستی جب ہوئی جب ہمیں ایک ساتھ پہلا ایوارڈ ملا..... اور یہ دوستی آج تک قائم ہے۔ اللہ اسے قائم رکھے، آمین۔ (بہت، بہت اچھا لگا پُر خلوص اور پیاری، پیاری دوستوں کے متعلق جان کر..... اللہ آپ کو اور ان سب کو صحت و سلامتی سے رکھے، آمین۔)

پاکیزہ ✨..... بنی لکھنے والیاں کیا لکھ رہی ہیں، آپ کوئی مشورہ، کوئی گرائڈ بتائیگی؟

سیما مناف ✨..... اپنی جانب سے ہم سب ہی اپنا بیسٹ دینے کی کوشش کرتے ہیں، نئے لکھنے والوں کو میں صرف یہ بتا دینا چاہوں گی کہ محنت کریں، تا کام بھی ہو جائیں تو بھی محنت اور کوشش کرتے رہیں۔ ہمیشہ سچ لکھیں، عام فہم لکھیں اور اپنی کہانی میں کوئی نہ کوئی معاشرتی یا مذہبی پیغام ضرور دیں، یقین کریں کامیابی آپ کے قدم چومے گی۔

پاکیزہ ✨..... پاکیزہ کے لیے اپنے قیمتی خیالات، جذبات کا اظہار بھی کیجیے؟

سیما مناف ✨..... پاکیزہ ایک صاف ستھرا جریہ ہے جو بہت ذوق شوق سے پڑھا جاتا ہے۔ میں نے سالوں پہلے ڈائجسٹوں میں لکھنا چھوڑ دیا۔ لیکن یہ آج تک مجھے اسی طرح ملتا ہے۔ اللہ اسے مزید کامیابی و کامرانی عطا کرے، آمین۔ (چلیں اب جلدی سے اپنی تازہ ترین تحریر سے بھی نوازیں ڈیئر سیما!)

پاکیزہ ✨..... اپنے قارئین سے کیا کہنا چاہیں گی؟

سیما مناف ✨..... ڈیئر قارئین و ناظرین..... آپ کی تحنیں ہی میرا سرمایہ ہیں۔ جب آپ لوگ میری کسی تحریر کو سراہتے ہیں، دل خوشیوں سے بھر جاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ ہمیشہ آپ کو خوش و خرم رکھے..... اور جب بھی کسی افسانے یا

272 دسمبر 2017ء

مزاح نگاری، کمال کی صنف ادب ہے کہ جس میں وہ بات بھی بہ آسانی کہہ دی جاتی ہے کہ جسے سوچنے میں زمانہ لگیں..... مگر ایسی نشتر زنی بخاطر اصلاح کا فن بھی کسی کسی کو آتا ہے۔ ورنہ مزاح نگاری کو عامیانہ طرز تحریر بننے میں دیر نہیں لگتی۔ ممتاز مزاح نگار شفیق الرحمن کا شمار ملک کے معروف و مقبول اساتذہ مزاح نگاروں میں ہوتا ہے۔ اس ماہ انہی نامور مزاح نگار کی کتاب ”پرواز“ سے انتخاب پیش کیا جا رہا ہے۔ جس سے یقیناً آپ جیسے باذوق قارئین ضرور محظوظ ہوں گے۔

”جی نہیں.....!“ وہ شرما کر بولے۔ ”میں ٹیلر ماسٹر ہوں۔“

میرے ایک دوست جو موٹروں کے ورکشاپ کے مالک تھے اور مدت سے موٹروں کا علاج معالجہ کر رہے تھے، موٹریں اور پرزے ان کے دماغ پر اس قدر چھا گئے تھے کہ بعض اوقات وہ سوتے سوتے چلا کر کہتے۔ ”بریکیں لگاؤ..... اسٹارٹ کرو۔“

ایک دفعہ ہم دونوں اونٹ پر سوار ہوئے۔ میں آگے تھا اور مہار میرے ہاتھ میں تھی۔ ہم ایسی جگہ سے گزر رہے تھے جہاں پانی ہی پانی تھا۔ اونٹ کچھ تیز ہو گیا، ایک جگہ تو پھسلے، پھسلے بجا..... میرے دوست گھبرا کر بولے..... ”بھئی اونٹ گونبرٹو میں لے آؤ۔“ ایک وقفے کے بعد بولے۔ ”میرا مطلب ہے ذرا آہستہ چلاؤ۔“

اس اونٹ کی طبیعت میں کچھ ایسی بے نیازی تھی کہ جو ہدایات میں اسے دیتا وہ ذرا پروا نہ کرتا..... جب ہم اسے روکنا چاہتے تو وہ رکتا ہی نہیں۔ ایک جگہ میرے دوست بولے۔ ”اس اونٹ کی بریکیں خراب ہیں۔“ میں نے پیچھے مڑ کر دیکھا تو وہ جلدی سے کہنے لگے۔ ”یعنی اسے روکنا چاہو تو بہت دیر میں رکتا ہے۔“ اور ساتھ ہی ایسی نگاہوں سے مجھے دیکھا گویا کہہ رہے

**محبوبیان**  
ایک روز ایک اجنبی حضرت اپنا رومان انگیز افسانہ دکھانے لائے تاکہ اسے پڑھ کر اپنی رائے دے سکوں۔ وہ افسانہ یوں شروع ہوتا تھا۔

”وہ دیر سے کھڑا نظارے سے لطف اندوز ہو رہا تھا۔ اس کے پاؤں تلے سبزہ نعل کی طرح بچھا ہوا تھا جس پر طرح، طرح کے پھولوں نے سلی ستارے کا کام کر رکھا تھا۔ اس کے دل میں خیالات اس روانی کے ساتھ آرہے تھے جیسے کوئی اعلیٰ درجے کی سنگر مشین چل رہی ہو یا کوئی تیز چینی کٹر، کٹر چل رہی ہو۔ بعض اوقات کوئی پرندہ دفعتاً آج اٹھتا اور اس کے خیالات کا سلسلہ یوں منقطع ہو جاتا جیسے دھماکا ٹوٹ جائے یا ایک سوئی چھب جائے۔ وہ اپنی نگاہوں کے گز سے قدرت کا ناپ لے رہا تھا۔ سر پر آسمان نیلے رنگ کی اسٹک پہنے ہوئے تھا جس میں بادلوں کے چھوٹے، موٹے ٹکڑے سفید بٹنوں کی طرح جڑے ہوئے تھے۔ اگلے کا بہتا ہوا پانی سفید ملل کے کھلے ہوئے تھان کی طرح معلوم ہو رہا تھا۔ جس میں سورج کی نارنجی لہاؤں نے گونا گونا گاری کا کام.....“

”معاف کیجیے.....“ میں نے پوچھا۔ ”آپ کس درجے کی تو نہیں ہیں؟“

سروے

یاد آجائے تو بے اختیار ہنسی آجاتی ہے لیکن ساتھ ہی ندامت بھی بہت ہوتی ہے۔

☆☆☆

عزیز قارئین! جیسا کہ میں نے ابتدائے میں لکھا تھا کہ خواتین سے اکثر غلطیاں باور چلی خاے میں سرزد ہوتی ہیں۔ سروے میں شریک بعض خواتین کی حماقتیں اس کا ثبوت ہیں۔ مجھ سمیت جتنی بھی خواتین کی حماقتیں یہاں مذکور ہیں بدحواسی ان غلطیوں کا نقطہ آغاز تھی۔ چشمانی حماقتوں کے واقعات نے مجھے اپنی ایک اور حماقت کی یاد دلادی جو میں ہنستے ہوئے تحریر کر رہی ہوں۔ بھابی کے ساتھ خریداری کر کے گھر لوٹی، چشمہ نکالنے کے لیے پرس کھولا لیکن چشمہ تو وہاں تھا ہی نہیں، چشمے کے بغیر پردھوں کی کیسے؟ کل کو سروے رپورٹ بھی ارسال کرنی ہے کا پانی جانی ہے۔ کیونکہ کروں گی؟ میرے اپنے ہی سوالات مجھے ہولارہے تھے۔ میری جان پر بن آئی تھی۔ خوب ڈھونڈنا پڑا۔ میرے ساتھ گھر والے بھی چشمہ تلاش مہم میں حصے دار بن گئے۔ اچانک امی نے کہا۔ ”تم کس کا چشمہ تلاش کر رہی ہو؟“ میں نے خاصی پریشانی سے کہا۔ ”تو پھر یہ کس کا چشمہ لگایا ہوا ہے؟“ میرا جواب سن کر امی نے میری آنکھوں پر لگے چشمے کی جانب اشارہ کیا۔ ”ارے میرا چشمہ مل گیا۔“ میں خوشی سے چلا اٹھی ”بھلا کہاں سے ملا؟“ میری بے حد سنجیدہ مزاح امی نے مسکراتے ہوئے پوچھا تو وہاں موجود افراد کے قہقہوں سے کمر اٹھا اور ایک بیک میرے حواس بحال ہو گئے۔ اب ان قہقہوں میں میری جھینپی، جھینپی ہنسی بھی شامل ہو گئی تھی رواں سال اپنے اختتام کی جانب تیزی سے بڑھ رہا ہے لیکن اپنی یہ حماقت یاد کر کے اب بھی میں بے اختیار ہنس دیتی ہوں۔

سوقارین اکرام! اتنی ہی شدید مصروفیت اور پریشانی کیوں نہ ہو ہمیشہ حواس برقرار رکھیں ورنہ اپنی حماقتوں کی وجہ سے آپ اپنی ہی نہیں اوروں کی ہنسی کا سامان بھی فراہم کر دیں گے۔

☆☆☆

سے ختم ہو چکے تھے ہم نے سوچا تھا کہ صرف کباب ہی لیں گے اور ہمارے پیچھے تک وہ ختم ہو چکے تھے۔ جب ہم واپس مڑے تو ایک میز پر سلا، چٹنی اور رائے کی ڈسٹر تھیں اس کے ساتھ ہی ایک بڑی پلیٹ میں بہت سارے کباب پڑے تھے۔ میری کزن نے اشارہ کیا تو میں نے اٹھا کر دو کباب اپنی پلیٹ میں ڈال لیے۔ ایک ایک کباب بھاری بھر کم خاتون پیچھے سے آن دھمکیں اور میرے چنگی بھر کر کہنے لگیں ”یہ میری پلیٹ ہے جی، میں روٹی لینے کی گئی تھی۔“ میری آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں مارے خفت کے میرے منہ سے صرف سوری ہی نکل سکا۔ میرا اور میری کزن کا ہنس، ہنس کے برا حال تھا۔ مجھے رہ، رہ کر اپنی حماقت پر ہنسی آرہی تھی کہ بنا پوچھے میں نے کباب لیے ہی کیوں؟ لیکن کبھی، کبھی خیال آتا ہے کہ یہ ہماری غلطی تھی یا ان خاتون کی جو پلیٹ بھر کباب اپنے لیے رکھ کر روٹی لینے چلی گئی تھیں۔ جب بھی یہ واقعہ یاد آتا ہے خاتون کی چنگی کی کک بھی محسوس کرتی ہوں، ہنچی میں۔

### سیدہ ایمن ریحان (پاکیزہ قاری، گھریلو خاتون)

میری ماموں زاد بہن کی شادی تھی۔ میں ماموں کے گھر گئی ہوئی تھی۔ دس افراد کی چائے بنائی تھی اور مجھے کچن کی چیزوں کا علم نہیں تھا۔ غلطی سے چائے میں چینی کی جگہ نمک ڈال دیا میں بہت شرمندہ ہوئی رہی تھی کسر میری کزن نے پوری کر دی بجائے اس کے کہ وہ چائے پھینک کر تھی بنائی اس نے اسی چائے میں خوب ساری چینی ملا کر مہمانوں کو پلا دی۔ لیکن اس دن کی غلطی کا یہ فائدہ ہوا کہ پھر کسی نے مجھ سے چائے بنوانے کی فرمائش نہیں کی۔ اپنی اور اپنی کزن کی حماقت در حماقت اب بھی



تھے وہ بھی آپ کی، ہماری طرح ہی تھے۔ غصے کے خلاف فرمانے والے نوکروں پر اس قدر خفا ہوتے تھے کہ آپ سے باہر ہو جاتے تھے۔ لڑائی جھگڑے کی برائیوں کے متعلق فرمانے والے مار پیٹ میں سب سے آگے رہتے تھے۔

قرض کے نقصانات پر فرمانے والے اکثر مقروض رہتے تھے۔

وہ سب کے سب ہم آپ جیسے انسان تھے۔ باقی رہا فرمانا سو فرمت کے وقت جب کبھی دور کی سوچتی ہوگی تو فوراً فرمادیتے ہوں گے۔ ممکن ہے کہ فرمانے کے بعد بالکل بھول جاتے ہوں کہ کیا فرمایا تھا۔ ڈاکٹر جاسن فرماتے ہیں کہ ”جو شخص صبح دیر سے اٹھتا ہے وہ زندگی بھر کوئی معرکہ کا کام نہیں کر سکتا۔“ حالانکہ ڈاکٹر جاسن خود زندگی بھر عملی الصباح نہیں اٹھے، ہمیشہ دیر سے اٹھتے تھے۔

☆☆☆

دنیاے ادب و صحافت میں تیزی سے اپنا نام بنانی باصلاحیت تحریر نگار

دردانہ نوشین خان

کا حاصل حیات ناول

صفحہ 9

عقرب پا کیزہ صفحات کی زینت بننے جا رہا ہے

یہ روایتی ہیرو، ہیروئن کی کہانی نہیں بلکہ عورت کے متعلق اٹھتے سوالات و جستجو کی تضحی ہے

عورت کے مقام کا تعین کرائی ایک سچی ماقصد اور دلچسپ کہانی، باذوق پاکیزہ قارئین کی نذر

حوالہ دیا ہے نہ اس پر عمل کرتا ہے۔“ فرماتے ہیں کہ ”معتقد ہنسنے ہنسانے سے منکر ہوتے ہیں کیونکہ حکیم بوعلی سینا نے فرمایا ہے کہ جو زیادہ ہنستے ہیں وہ جلد روئیں گے۔ دوسروں پر ہنسا وہ گناہ فحش سمجھتے ہیں کیونکہ چندر گپت موریہ صاحب فرماتے ہیں کہ کسی شخص پر ہنسنے سے پہلے یاد رکھو کہ اگر تم اس کی جگہ ہوتے تو کیا محسوس کرتے۔“

اگر چوری ہو جائے تو چور کا سراغ لگانے کی زیادہ کوشش نہیں کرتے کیونکہ تانا فر نو لیس صاحب نے فرمایا ہے کہ ممکن ہے کہ اس چیز کی چور کو تم سے زیادہ ضرورت ہو۔

غرضیکہ ایسے حضرات کی گفتگو میں گفتگو کم ہوتی ہے اور ”فرماتے ہیں“ زیادہ.....

وہ ”فرماتے ہیں“ کا ایک فائدہ بھی ہے۔ وہ یہ کہ کبھی، کبھی اس کے استعمال سے آپ دوسروں کو متاثر کر سکتے ہیں۔

سگریٹ نوشی کے خلاف باتیں ہو رہی ہوں تو فوراً کہہ دیجیے کہ لاڈلہ کرزن صاحب فرماتے ہیں کہ ”سگریٹ بننے سے بہتر تو یہ ہے کہ انسان زہری لے۔“ اور اگر سگریٹ نوشی کی تعریفیں ہو رہی ہوں تو کہہ دیجیے کہ مہا کوئی کا لید اس فرماتے ہیں کہ تمباکو ہی ایک ایسا نشہ ہے جو نشہ بھی اور نہیں بھی۔“

یونہی کسی کا نام لے کر جو جی میں آئے کہہ دیجیے۔ اب رہے بڑے آدمیوں کے نام سو جہاں کچھ فہم ہو یا اور نام یاد نہ آتے ہوں تو وہاں فوراً ٹیکسیئر کا نام لے دیجیے۔ کسی کی کیا مجال جو آپ کو ٹوک دے۔ ٹیکسیئر نے دنیا کے ہر موضوع پر، ہر پہلو پر کچھ نہ کچھ رد فرمایا ہے۔

اس کا نام آپ جب چاہیں بلا جھجک پلے سکتے ہیں۔ اگر حساب لگایا جائے تو سب سے زیادہ ٹیکسیئر صاحب فرماتے ہیں۔ دوسرے نمبر پر سعدی صاحب اور تیسرے نمبر پر گوئے، کنفیو شس اور نطشے آتے ہیں۔ جہاں تک ہمارا خیال ہے جو حضرات فرماتے

کرتے ہیں، دل کھول کر غصہ کرتے ہیں یہاں تک کہ کافی زہر معلوم ہوتی ہے۔ اور سارا دن بری طرح گزرتا ہے۔

☆☆☆

کتابوں میں غصہ، چوری، غریبی، ناکامی، غم، غرور ہر موضوع پر لوگ اکثر فرمایا کرتے ہیں۔ ایک صاحب فرماتے ہیں۔ ”اگر نا کامیاں نہ ہوں تو نا کامیاں کی قدر کیونکر معلوم ہو۔“ کیا ہے کی بات کہی ہے۔ دوسرے صاحب فرماتے ہیں۔ ”دنیا کی تکتہ چینی سے تم تب ہی بچ سکتے ہو، جب تم بت بن کر بیٹھ جاؤ۔ نہ کچھ سوچو، نہ کچھ کہو، نہ کچھ محسوس کرو، یہاں تک کہ تم کچھ بھی نہ ہو۔“ یہ بڑھ کر ہم داد دے بغیر نہیں رہ سکتے۔ ایک بزرگ فرماتے ہیں۔ ”اگر تم ہوائی قلعے بناتے رہتے ہو تو کوئی حرج نہیں، فقط ان کے قلعوں کے نیچے بنیاد رکھنی شروع کر دو۔“

پھر نک اٹھتے ہیں، اش اش کرنے لگتے ہیں۔ ایک اور حضرت نے فرمایا ہے کہ کسی چیز سے محبت کرنے کی ترکیب یہ ہے کہ ہر وقت یہ فرض کرتے رہو کہ وہ چیز تم سے غریب چھن جائے گی۔“

جہاں تک فرمانے کا تعلق ہے، دنیا میں تین قسم کے آدمی ہیں، ایک تو وہ جن کو چوبیس گھنٹے یہی خواہ رہتا ہے۔ جو اپنا نام ٹیکسیئر دوسروں کے فرمانے کے مطابق بناتے ہیں۔ کھانا کھاتے وقت نیولین کا حوالہ دیں گے کہ اس نے کہا ہے کہ بالکل آہستہ، آہستہ کھاؤ، ایک نوالے کو چالیس بار چباؤ، طلوع وقت بقرطاط کا ذکر ہوگا۔ اس نے آہستہ، آہستہ چل کر کہا ہے۔ حجامت کے سلسلے میں پھر نیولین کی رائے بیان کی جائے گی۔ اس کا قول ہے کہ اپنی حجامت ملے بناؤ۔ حجام کا ہرگز اعتبار مت کرو کیونکہ اس کے ہاتھ میں تیز استرا ہے اور تمہاری گردن نزدیک ہے۔ نیولین نے یہ بھی کہا تھا کہ رات کو در تک جاگے رہو۔ اس سے دماغ روشن رہتا ہے۔ (لیکن نپولین تو گھوڑے پر بیٹھے، بیٹھے سو جایا کرتا تھا۔ اس کا نہ کوئی

ہوں کہ میں مجبور ہوں، میں جانتا ہوں کہ اونٹ میں نہ گھیر ہوتے ہیں نہ برکیں ہی ہوتی ہیں لیکن میں اپنی عادت سے مجبور ہوں۔

☆☆☆

فرماتے ہیں

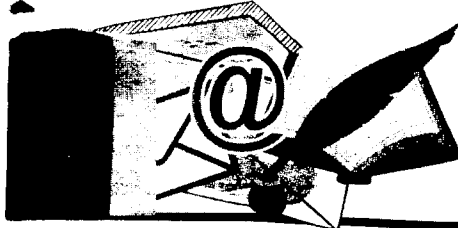
سعدی صاحب (فارسی زبان کے مشہور و معروف شاعر شیخ سعدی شیرازی) فرماتے ہیں کہ ”غصہ کبھی مت کرو، غصیل دکاندار کے شہد پر کھیاں بھی نہیں بیٹھتیں۔“

فرصت ہو، آرام کرسی پر لیٹے ہوئے ہوں۔ ایک ہاتھ میں سگریٹ ہو، دوسرے میں کتاب۔ پڑھتے، پڑھتے یہ فقرہ آجائے تو واللہ سرور آجاتا ہے۔ کیا بات ہے، خوب فرمایا ہے۔ اس قدر متاثر ہوتے ہیں کہ اسی وقت ایک وزنی کی قسم کھاتے ہیں کہ آئندہ ہرگز غصہ نہیں کریں گے۔ اگر کبھی غصہ آیا بھی تو سعدی صاحب کا یہ فقرہ یاد رکھیں گے۔

اگلے روز کسی کیفے میں بیٹھ کر کافی اور سینڈ وچز کا آرڈر دیتے ہیں۔ میرا نہ جانے کہاں مر جاتا ہے یوں غائب ہو جاتا ہے جیسے یہاں کبھی تھا ہی نہیں۔ طبیعت میں پہلے بیزاری سی آتی ہے پھر چڑچڑاہٹ پھر خون گرم ہوتا ہے اور کچھ دیر میں باقاعدہ کھولنے لگتا ہے۔ نتھن پھرنے لگتے ہیں، جی میں آتا ہے کہ یا تو میرے کو قتل کر دیں یا کیفے کے منیجر کو۔ اسی وقت منیجر سے شکایت کی جاتی ہے، میرا پھر بھی نہیں آتا۔ صدیوں کے بعد آتا ہے اور ابھی آیا کہہ کر غائب ہو جاتا ہے۔ تب اصلی غصہ آتا ہے اور نہ جانے کیسے، کیسے خیالات دل میں آتے ہیں۔ اس وقت ”سعدی صاحب“ یاد تو آتے ہیں، ان کی نصیحت بھی یاد آتی ہے۔ لیکن پھر خیال آتا ہے کہ سعدی صاحب نے ہرگز ایسے فضول کیفے میں بیٹھ کر کافی اور سینڈ وچز کا آرڈر نہیں دیا ہوگا۔ اور اگر دیا ہوگا تو اس قدر مست اور کام چور میرے سے واسطہ نہیں پڑا ہوگا۔

تب ہم اپنے آپ کو حق بجانب سمجھ کر خوب غصہ

# بہنوں کی محفل مدبرہ



خط کتابت کے لیے پی او باکس 662 جی پی او کراچی 74200 ای میل: jdpgroup@hotmail.com

آپ ہمیں جس طرح فون کاٹر اور خطوط کے ذریعے مسلسل میرا حوصلہ بڑھاتے ہیں، اصلاحی تنقید کے ساتھ قابل عمل تجاویز اور مشورے بھی دے رہی ہیں اس کے لیے جزاک اللہ..... ان سب سے یہی محسوس ہوتا ہے کہ آپ کس قدر دلی وابستگی رکھتی ہیں ہم سے بھی اور ہمارے پائیزہ سے بھی..... اللہ آپ سب کو ایسی طرح جنتا بستا رکھے، آمین..... آپ کو ہر لمحہ خوش آمدید کہنے کو ہماری ٹیلی فون لائنز مستعد ہیں۔ نزہت اصغر موبائل نمبر- 03316266612۔ پاکیزہ آفس نمبر- 02135802552-107-02135386783 Ext 122 منیج کرتے ہوئے اپنا نام اور شہر ضرور لکھیں۔

اب مختلف خبروں اور سرگرمیوں پر نظر ڈالنے سے قبل ایک بار خلوص دل سے درود ابراہیمی اور اس کے بعد تین بار آیت کریمہ ضرور پڑھ لیں اور اپنی دعاؤں میں اپنے پیاروں کے ساتھ، ساتھ تمام اہل وطن کو بھی ضرور یاد رکھیں۔

## مصنفات، شاعرات اور قارئین پاکیزہ بہنوں کی تازہ بہ تازہ سرگرمیاں

☆ ہماری پیاری مصنفہ، شاعرہ اور معروف ریڈیو براڈ کاسٹر سیما رضا روانے پاکیزہ میں اپنے حالیہ اختتام پر ہونے والے لمنی ناول ہم کو عبث بدنام کیا کہ سلسلے میں بیچ لکھواری ہوئی، کراچی میں ایک باہی بی کا اہتمام کیا۔ جس میں ماہنامہ پاکیزہ کی روح رواں محترمہ عذرا رسول نے بطور خاص شرکت کی۔ اس پروگرام تقریب میں انجم انصار، عظمی آفاق، غزالہ رشید، رضوانہ پریس، عقیدہ حق، سیما مناف، مجید شاہ، منظرہ سہام، ہابیک، گلشنہ شفیق، مسرت بانو، عزیزین حبیب عزیز، ربیعہ علی، سائرہ غلام نبی، شاعوری، فرح دیبا اور ہم (نزہت اصغر) بھی شریک تھے۔ تقریب میں سیما رضا کی ادبی خدمات، ان کی پرتو خف شخصیت اور حالیہ ناول پر بطور خاص گفتگو ہوئی۔ سیما رضا کی پُر تکلف ضیافت سے سب بہت لطف اندوز ہوئے۔ (جیتی رہیں سیما اور کامیابیاں سیتی رہیں)

☆ مصنفہ میمونہ صدف، راول پنڈی کی شادی گزشتہ دنوں بخیر و خوبی انجام پائی (مبارک باد)

☆ نامور صحافی، مصنف اور مدبرہ بی این ای فیاض شاہد کی تصنیف ”امی جان“ کا دوسرا ایڈیشن شائع ہو گیا ہے، کتاب جیسا کہ عنوان سے ظاہر ہے فیاض شاہد کی باہمت والدہ مرحومہ کے حالات زندگی ان کی شخصیت اور ان کی زندگی کے حیرت انگیز و متاثر کن حقائق سے پُر ہے۔ کتاب کا ٹائٹل بھی بہت نفیس ہے اور صفحات بھی بہت عمدہ اور معیاری ہیں۔ اس کے علاوہ اس میں فیاض شاہد کے جوان سال م جو فرزند عدنان شاہد کی المناک موت پر لکھے گئے کالمز بھی شامل ہیں، کتاب کی قیمت صرف 500 روپے ہے، ملے کا پتا قلم فاؤنڈیشن انٹرنیشنل، بیٹرب کالونی بینک اسٹاپ والٹن روڈ لاہور کینٹ ہے۔ فون نمبر 0300.8422518/0300.0515101

☆ مستقل قاری مسرت پرویز، کراچی کے بیٹے کی شادی کی تیاریاں چل رہی ہیں۔ (مبارک باد) مسرت کے حوالے سے دوسری خبر یہ ہے کہ ان کی پیاری بیٹی فریال چائنیز لیکچوئنگ کا دوسرا کورس کرنے اسکا لرشپ پر چین گئی ہے۔ (بے حد مبارک باد)

☆ نگینہ فیاض بنگش، کراچی کی پیاری بیٹی صاحبہ فیضانے نویں جماعت کے امتحان میں A1 گریڈ سے کامیابی حاصل کی ہے۔ (بہت، بہت مبارک ہو) نگینہ فیاض کے حوالے سے دوسری خوشخبری یہ ہے کہ ان کی چھوٹی بہن نایاب منہاج گلش کی پشاور میں داؤد خان سے منگنی ہو گئی ہے۔ (مبارک باد)

## دعائے صحت کی التماس ہے

☆ پاکیزہ کے بے حد سینئر قاری عصمت، اوکاڑہ کی بھانجی ناہیدہ اصغر بریٹ میں کٹھنی کی تکلیف کا شکار ہو گئی ہیں، ان کی صحت و سلامتی کے لیے خصوصی دعا کی درخواست ہے سب خاندان والے بے حد پریشان ہیں، (اللہ آپ کی یہ پریشانی فحیرت سے ٹل جائے، آمین)

☆ مستقل قاری، تازہ بہ، راول پنڈی کے گیارہ سالہ بیٹے کی صحت کے لیے خصوصی دعا۔

☆ مستقل تبصرہ نگار فرخندہ جمعفری کی مکمل صحت یابی کے لیے خصوصی دعا۔

☆ معنفہ اور شاعرہ پروین عذرا ایشہ کی طبیعت ان دنوں ناساز ہے۔

☆ مستقل قاری نبیلہ، اوکاڑہ کی طبیعت کافی خراب ہے۔

بہت پیاری پاکیزہ بہنو! السلام علیکم رحمۃ اللہ وبرکاتہ! تمام تعریفیں اس رب العزت اللہ جل شانہ کو زیبا جو کل عالین کا پروردگار ہے..... یکتا و وحدہ لا شریک ہے..... اور لا تعداد درود و سلام حبیب خدا، حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ذات اقدس پر کہ جن کو تمام مخلوقات کے لیے رحمۃ اللعالمین بنا کر بھیجا۔ اللہ پاک سے دعا ہے کہ ہم سب کا خاتمہ ایمان کامل پر ہو..... دنیا و آخرت میں کامیابی ملے اور ہمارے عزیز وطن کو سدا اہمی حفظ و امان میں رکھے..... آمین۔

## کچھ باتیں اپنی بہنوں سے

پیاری بہنو! السلام علیکم.....! پُر خلوص دعاؤں کا تحفہ لیے ایک مرتبہ پھر آپ کی اس پیاری محفل میں حاضر ہوں..... کہنے کا حال ہیں؟ امید ہے آپ موسم سرما سے بھر پور لطف اٹھا رہی ہوں گی اور سرما کے خاص پکوانوں کا اہتمام بھی کر رہی ہوں گی..... جیسے نت نئے مزیدار طواغیت اور مختلف قسم کے ساگ وغیرہ..... اگر آپ کے علاقے کے یا خاندان کے کوئی خاص پکوان ہوں ان کی رہنمائی ہم سے بھی ضرور شیئر کریں۔

”آج پہلا ڈکڑا لڑکھو! سے ہماری بے حد دیرینہ قاری منیہ بیگم کا کرتے ہیں کہ جنہوں نے ہم سے مان بھر اٹکھو کیا ہے۔ فون کرنے والوں میں ہمارا بھی ذکر کر دیا کریں ہم بھی تو آپ کو فون کرتے رہتے ہیں۔“ منیہ بہن آپ کا شکوہ سرائے گھوڑا، اس طرح تو مجھے بہت ساری بہنوں کا ذکر کرتا پڑے گا۔ جیسے ہماری تسنیم ماہیار، عقیدہ حق، طیبہ عصیری دوست بائیں وغیرہ کہ وہ وقتاً فوقتاً رابطہ کر کے اپنی، اپنی رائے اور مشورے دیتی رہتی ہیں، اس طرح نام بنام ہر دفعہ سب کا ذکر کرنا ممکن نہیں رہتا..... میں دل سے ان سب کی مشکور ہوں جو مجھے فون کر کے حوصلہ بھی دیتی ہیں اور اپنی خدمات بھی پیش کرتی ہیں کہ پاکیزہ کے سلسلے میں ہمارے لائق کوئی بھی کام ہو تو بلا تکلف آپ ہم سے کہہ سکتی ہیں۔ اس سلسلے میں، میں رضوانہ پریس کی بہت شکرگزار ہوں کہ اس کی پُر خلوص ٹیلی فون کال نہ صرف میرا موڈ خوشگوار کرتی ہے بلکہ بھر پور توانائی بھی پہنچاتی ہے۔ رضوانہ تمہارا بے حد شکریہ ہمیشہ خوش رہو۔

آپ ہمیں پاکیزہ کے لیے تجاویز اور رائے دیتی رہتی ہیں جس کے لیے شکریہ..... اچھا بہنو بشرط زندگی اگلے ماہ پھر باتیں ہوں گی..... اب اجازت..... اپنا، اپنے گھر والوں کا اور اپنے پاک وطن کا بے حد خیال رکھیں..... اللہ حافظ.....! دعا گو عذرا رسول

☆☆☆

جی عزیز بہنو.....! عذرا صاحبہ تو موسم سرما کے پکوانوں کا ذکر کیا جیسا کہ آپ کو معلوم ہے ملک بھر میں سردی کی ہلک بارش اور پہاڑی علاقوں پر برف باری بھی ہو چکی ہے۔ جہاں پکوانوں کا اہتمام وہیں سردی سے بچاؤ کی ترکیبیں بھی اور سب سے بڑھ کر بدلے موسم کی سوغات یعنی نزلہ، زکام، کھانسی، بخار، فلو، جسم میں درد اور بخش اور جانے کیا، کیا اس کے لیے تو ساتھ ساتھ گھریلو نوکریں ضرور استعمال کریں جو صدموں کے آزمودہ حلے آ رہے ہیں۔ ماہ دسمبر اور موسم سرما افسانہ نگاری اور شاعری کی آمد کے لیے بڑا موزوں وقت ہے۔ تخلیق کاروں کی صلاحیتیں سچ قرطاس پر بھرے گئے ہیں کیوں ٹھیک کہا ناں..... اس اس دسمبر کے گزرنے سے پہلے اپنی یادوں کو جمع ضرور کیجیے جو بھی سرمایہ حیات بھی بن جایا کرتی ہیں۔



پیاری اور مدد بر آئی ہیں کہ میں بارہ بار ایک گھنٹے سے صرف تصویریں دیکھ رہی ہوں۔ (اچھائی) محترمہ عذرا رسول صاحبہ کی اپنی ہی معصومیت ہے لگتا نہیں کہ وہ ماشاء اللہ جوان بچوں کی ماں ہیں، اللہ تعالیٰ انہیں اور معراج رسول کو صحت تندرستی دے، ان کے بچوں کو سلامتی دے، آمین۔ کاش میں کراچی میں ہوتی تو شاید نہتہ اصغر صاحبہ مجھے بھی دعوت میں بلا لیتیں۔ (بجی ضرور) احوال کلیوں کی مہک کارخ جو بدی نے اپنے معطر قلم سے بہت خوب صورت الفاظ میں لکھا ہے۔ پھر تمام رائرز نے اپنی، اپنی تجاویز اور اچھی، اچھی رائے دی ہے۔ جو نیئر رائرز کی واقعی حوصلہ افزائی ہوئی چاہے۔ اور اچھے سوال پر چھوٹا موٹا انعام بھی دیتا چاہے۔ شرم فضل حق نے اکو شادی کا احوال خوب لکھا ہے۔ کسی کو کسی جسمانی نقص کے ساتھ قبول کرنا اچھی بات ہے اب اکو اور شہزادی انجمن کل کر نوکری کریں اپنا، مگر الگ بنائیں، بہنوں کے کمروں پر نظر نہ رکھیں۔ (واہ بھی) نیلم احمد بشیر بہت سینئر اور اچھی رائرز ہیں ان کی کہانیاں ہمیشہ حقیقت کے قریب ہوتی ہیں واقعی 2005ء والا زلزلہ قیامت..... سے کم نہیں تھا۔ مگر کہانی کہانی کی حد تک ٹھیک تھی، اس کو حقیقت کا روپ نہیں دے سکتے گستاخی معاف۔ عقیدت درد، تکلیف، ودھن حقیقت قلم صاحبہ جو بھی قصتی ہیں لا جواب لکھی ہیں، واقعی زخم بھر جاتے ہیں، تکلیف دور ہو جاتی ہے۔ مگر جن کو اپنے گھٹے دکھ دیتے ہیں، وہ دھن تیر تک ساتھ جاتی ہے۔ کہانی بہت محنت سے لکھی گئی ہے۔ ہامیک، زنجیر جنوں، ہاجرہ ریحان، جام بیٹا، بحر ساجد، عنان گیر، صید صیافت، نگہت سیما نے تانی کا کردار بہت برا پیش کیا ہے مگر سب تو ایسی نہیں ہوں..... تمام تانیاں ناراض ہو گئی ہیں۔ بہر حال تمام کہانیاں بہت اچھی اور محنت سے لکھی گئی ہیں، ڈاکٹر ذکیہ بلگرامی صاحبہ نے قرآن شریف کی تمام سورتوں آیات ان کے شروع اور آخر حروف کے بارے میں بہت تفصیل سے لکھا ہے یہ ان کی بہت بڑی کاوش اور لگن ہے۔ (بجی بالکل) اللہ تعالیٰ ہم سب کو ان کے نقش قدم پر چلنے کی توفیق عطا فرمائے، آمین۔ اما قادری کی بدسورت بہت سبق آموز ہے، کسی بھی بہن، بیٹی کے ساتھ اس طرح نہ ہو..... شہناز وسم کی بوجھ بہت عمدہ کہانی ہے۔ لیکن لوگ دوسروں کی مجبوری سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اتنے اوپر اٹھ جاتے ہیں کہ اپنے آپ کو دوسروں کی روزی کا وسیلہ سمجھنے لگتے ہیں بالکل اسی طرح کی ایک برہنہل سے مجھے بھی واسطہ پڑا تھا..... وہ محترمہ اسٹوڈنٹ پر ڈینی نارچر اور گالیاں دیتے، دیتے ان کے والدین تک پہنچ جاتی تھیں۔ ام ایمان..... بلا عنوان کے نام سے بہت سبق آموز کہانی لکھی ہے۔ جو بچوں اپنی عزت کے ساتھ والدین کی عزت اور اعتبار داؤ پر لگا دیتی ہیں ان کا انجام بھی ہوتا ہے۔ رفاقت جاوید صاحبہ کا ناولٹ فصل محبت یہ کہانی نہیں بلکہ حقیقت ہے۔ آج کل جو بہن اور بیٹی ترکے میں کچھ مانگتے تو اس کا وہ حشر کیا جاتا ہے کہ دوبارہ وہ اس بارے میں سوچتی بھی نہیں۔ اگر اسے تھوڑا سادہ بھی دیا جائے تو ساتھ ہی بھی کہا جاتا ہے کہ ہمارے لیے مرنے کی آئندہ یہاں قدم نہ رکھنا۔ حالانکہ قرآن پاک میں ترکے کی تعظیم کا ذکر بار بار آیا ہے۔ اس کے علاوہ بھی تمام کہانیاں، ناولٹ، مثنی ناول بہت محنت سے لکھے گئے ہیں..... شائستہ زریں کا سروے..... اکیسویں صدی کے تقاضے اور بچوں کی تربیت سب بہنوں نے بہت اچھا اثر و یو دیا ہے۔ تمام بیوروں کو شفاعت و اور مرجمین کے لیے دعاؤں مغفرت..... (فرخندہ بہت دنوں بعد آئیں، اللہ آپ کو صحت سے رکھے)۔

بھ ہامیک، کراچی سے بڑے حسب موقع شعر کے ساتھ آئی ہیں۔

”محفل میں آپ کی ہم چکر اور تو نہ لائے، الفاظ میں سجا کے جذبات لے کے آئے

آپ کی محفل میں پہلی دفعہ شریک ہو رہی ہوں، سب سے پہلے آپ سب کا میرے افسانے، زنجیر جنوں، پندرہ کرنے کا شکریہ..... سلامت رہے اور بہنو دوسری گزارش یہ کہ آپ اپنے ساتھ، ساتھ اپنے گھر والوں، بچوں کو بہن، بھائیوں کو بھی پاکیزہ پڑھنے اور اس میں لکھنے کی ترغیب دیجیے کیونکہ لکھے ہوئے الفاظ ہمیشہ یاد رہتے ہیں اور تاریخ کا حصہ بنتے ہیں، پاکیزہ درحقیقت پاکیزہ خیالات کا حامل رسالہ ہے۔ جسے تمام خاندان والے یکساں دیکھنے کے ساتھ پڑھ سکتے ہیں۔ خوش رہے۔“ (بہت شکر یہ ہمارے خط کا)

بھ سعیدہ منان حمزہ، خیر بختون خواہ سے۔ ”زندگی کی الجھنوں کو سلھاتے، سلھاتے وقت تیزی سے گزر رہا ہوتا ہے، اپنے اور اپنی الجھنوں کے علاوہ کچھ اور دھیان نہیں رہتا مگر جب بھی بہت مشکل سے ہم کوئی ایک ساعت..... چند لمحے حاصل کر پاتے ہیں کہ جس میں ہم نئے لوگوں، نئے رشتوں سے آشنا ہوتے ہیں تو خوشی از حد ہوتی ہے..... ایسی ہی خوشی نہتہ مجھے آپ سے بات کر کے حاصل ہوئی۔ قلم سے دوستی تو مدت سے ہے مگر اسی قلم کی بنیاد پہ جب آپ سے بات ہوئی تو انہوں کی

تقدار میں ایک عداوت اضافہ ہوتا ہوا محسوس ہوا ہوں جیسے آپ سے دوستی بھی، بہت مدت سے ہو (بہت شکر یہ بھی) آنکھیں اوپر اٹھا کے دیکھوں تو بہت ساری ڈھیروں سیر حیاں ہیں جن کا سر اللہ جانے کہاں سے جالما ہے..... ایک گھنٹے بیٹھ کر کبھی اور دور تک پھیلی ہوئی شخصیات ان سیر حیاں پر چھایا کیے ہوئی ہیں، شاخوں پر پرندے ہیں، رنگ رنگی تیتلیاں ہیں چمکتے دکتے جگنو ہیں، یقیناً یہ شجر علم کا ہے اردو کا ہے، ادب کا ہے، یہ تیتلیاں، پرندے اور جگنو شاید لکھنے والے ہیں، میں پہلی سیر حیا پر کھڑی ان پھیلی ہوئی شاخوں تیتلیوں اور جگنوؤں کو حسرت اور خوشی سے دیکھتی ہوں..... دل میں آتا ہے کاش کبھی ان سیر حیاں کو طے کر کے ان شاخوں تک پہنچوں اور کوئی تلی یا جگنو ان کے علم اور ادب کی فضاؤں میں اڑ سکوں..... (ضرور، اور پر کی سیر حیاں کو بھی آپ کے قدم چھوئیں گے) اللہ تعالیٰ سے اپنے اور تمام مسلمانوں کے لیے نفع بخش اور ہدایت سے بھرپور علم مانگتی ہوں..... اللہ ہم سب کا نگران و نگہبان ہوں..... آپ کے ڈائجسٹ اور اس سے جڑے ہوئے تمام افراد کو ہزاروں کامیابیاں ملیں..... آمین۔ اللہ میرے پاکستان کو ہمیشہ کھلے ہوئے تازہ خوشبو دار پھول کی طرح رکھنا جسے نہ خزاں آئے نہ آندھی نہ طوفان..... آمین.....“ (بہت پیارے خط کا شکریہ، اب تبصرہ بھی لکھجے گا)

بھ ذوالنورین، ہری پور ہزارہ سے۔ ”میں گزشتہ چند ماہ سے بہنوں کی محفل میں شرکت نہیں کر سکی۔ باجی آپ کو ایڈیٹر شپ کی بہت مبارک ہو اللہ پاک آپ کو یہ عہدہ مبارک کرے..... (شکریہ) انجم انصار باجی کو میرا بہت سلام اور دعا..... (ان کی طرف سے بھی سلام اور ڈھیروں دعاؤں) ڈاکٹر ذکیہ صاحبہ سے ملاقات اور ان کا مضمون اللہ اور اس کا نور بہت زبردست تھا۔ بحر ساجد کے من جاننام کا اختتام اچھا تھا۔ بحر آپ نے برصغیر میں اپنے سفر میں بکڑے رکھا تھا۔ سبر کے شمارے میں بیٹی کے ساتھ بیٹی کی اتنی تو بہن پسند نہیں آئی کہ یہ تو کھڑا ماؤں کا طریقہ ہے۔ سلسلہ واردوں ناول بھی اچھے جارہے ہیں، مصروفیت کی وجہ سے مکمل رسالہ نہیں پڑھ سکی۔ اللہ سے دعا ہے کہ ادارہ آپ کی رہنمائی میں اور آپ کے زیر سایہ مزید ترقی کرے۔ معراج رسول صاحب کو اللہ صحت و تندرستی عطا فرمائے اور عذرا رسول آئی تو ہمیشہ خوش رکھے، آمین۔ (دعاؤں کے لیے جزاک اللہ)

☆ ایمان زہرا، شیرازی، کپواں۔ پیاری بیٹی آپ کے پیچھے گئے اقوال پچھلے شمارے میں بھی ہیں اور اب بھی شامل ہیں۔ آتے تو ہیں، آپ کی چیزیں وقتاً فوقتاً لکھتی رہیں گی۔ آپ تبصرہ بھی ضرور بھیجیں۔ اپنے دل کی باتیں بھی ضرور کریں۔

بھ اما..... 1999ء سے..... پاکیزہ پڑھ رہی ہوں 2005ء میں شادی کے بعد تھوڑا وقفہ پڑھنے میں آگیا تھا۔ پر ابھی پھر پڑھنا شروع کیا ہے..... اس میں بہت ساری تبدیلیاں آچکی ہیں، تھوڑی تعریف، تھوڑی تنقید کے ساتھ اچھا لگا۔ اللہ تعالیٰ آپ کو اور تمام اسلاف کو اس محنت کا اجر دے۔“ (اللہ دعائیں دینے والوں کو سلامت رکھے)

بھ نامید، آزاد کشمیر سے۔ ”میں پاکیزہ کی مستقل قاری ہوں اور آزاد کشمیر کے ضلع باغی سے تعلق ہے ہمارے گھر سے ڈاکخانہ دور ہے کبھی بھی کسی جاننا ہوتا ہے آپ کہیں تو تبصرہ بذریعہ فون لکھوا دیا کروں (بجی لکھوا سکتی ہیں مگر کبھی خط بھی ضرور بھیجیں) بھ صائمہ بخاری، سرگودھا سے۔ ”پاکیزہ میں کچھ لکھنا چاہ رہی ہوں۔ بہت اچھا رسالہ ہے، میں شوق سے پڑھتی ہوں۔“ (بجی ضرور لکھیں)

بھ طاہرہ ضلع خوشاب سے۔ ”رسالہ کبھی، کبھی دیر سے ملتا ہے۔ مجھے پاکیزہ بہت پسند ہے، بس تفصیلی تبصرہ لکھنا مشکل ہو جاتا ہے۔

بھ سمر، یمن، لہ سے۔ ”میں دس گیارہ سال سے پاکیزہ ہا قاعدگی سے پڑھ رہی ہوں۔ اپنے پاکیزہ سے میں نے بہت کچھ سیکھا ہے۔ سب باتیں بہت اچھا لکھی ہیں، سب کا اور آپ کا بہت شکر یہ..... (آپ کے مطالعے کا شکریہ)

بھ نادیہ، راولپنڈی سے۔ ”بہت عرصے سے پاکیزہ پڑھتی ہوں، گھریلو حالات جیسے بھی ہوں، میں ہر ماہ یہ رسالہ پڑھ لیتی ہوں۔ باجی عذرا کہیں ہیں، آپ سے بات نہیں ہوئی تھی۔ انجمن باجی سے میری بات ہوئی تھی کہ میرا سلام کہیے گا انہیں شروع میں لکھ رہی تھی کہ پاکیزہ میں اب کیا ہو مگر آپ بھی بہت اچھا سنہال رہی ہیں، مجھے نگہت سیما کی صید صیافت کہانی اچھی لگی تھی۔ ایسا لگا کہ میرے حالات پر ہے۔ مجھے ذکیہ بلگرامی آپ سے دعا کرانی ہے، میرا بیٹا گیارہ سال کا ہے جو بیمار ہوتا ہے، آپ لوگ میرے رزق کے لیے بھی دعا کیجیے گا۔ پاکیزہ سے میں نے بہت کچھ سیکھا ہے ایک جمعرات سے دوسری جمعرات تک قرآن پاک بھی ختم کر لیتی ہوں۔ شہر میں حیدر کا مرنے لگتا ہے ہمارے خاندان کی کہانی ہے، زیادہ بچے اور شے دار یاں ہوں تو ایسے ہی ہوتا ہے، آپ یقین کریں گی کہ

میں تو اس ناول کے پورے صفحات فوٹو اسٹیٹ کروا کر کتاب کی شکل میں رکھ رہی ہوں۔“ (ارے واہ بھئی)

(ماشاء اللہ، بہت شکر یہ نادیہ، خوشی ہوئی آپ سے بات کر کے۔ ذکیہ آپاہر پڑھنے والے کو اپنی دعاؤں میں یاد رکھتی ہیں۔) کچھ منزل سلیم، فیصل آباد۔ آپ کہانی ضرور بھیجیں مگر پاکیزہ کا مطالعہ بھی باقاعدگی سے جاری رکھیں اس کے علاوہ نامور ادیبوں اور آج کے فنکاروں کو بھی ضرور پڑھیں۔

☆ آئیے مظلوم چوہدری، آزاد کشمیر۔ آپ کہانیاں میل کر کے فوراً پوچھا کریں کہ مل گئیں پھر اس کے ڈیڑھ ماہ کے بعد اشاعت کا پوچھ لیا۔۔۔ کریں اس طرح پریشانی نہیں ہوگی۔۔۔ یہ بات سب بہنوں کے لیے ہے۔ میل کرنے کے بعد ضرور تصدیق کیا کریں۔

کچھ ریما نور رضوان، کراچی سے۔ ”باجی میری کہانیوں پر بھی نظر کرم کر دیں۔“ (جی انشاء اللہ جلد ہی)

کچھ عجت غفار، کراچی سے۔ ”سر پر آجمل لیے نائل بہت اچھا لگا۔ مجھے کچھ کہتا ہے، ہمیشہ کی طرح بے حد مفید اور سبق آموز تحریریں۔ اللہ اور اس کا نور۔۔۔ محترمہ ذکیہ بگلاری صاحبہ کا باب انجم، بہت زیادہ باریک بینی سے مطالعہ کر کے ہم تک پہنچایا گیا ہے۔ ذکیہ صاحبہ کی تحریر قابل ستائش ہے۔ (جی بے شک) محفل میں سب سے پہلے مرحومین کے لیے مغفرت کی دعائیں اور لواحقین کے لیے صبر جمیل کی دعائیں۔ اللہ رب العزت تمام مرحومین کو اپنے دربار میں اعلیٰ مرتبے پر فائز فرمائے (آمین) پیاری نازنین آفریدی اللہ تعالیٰ آپ کو دین و دنیا کی ہر نعمت عطا کرے، آپ کو میری کہانی پسند آئی۔ حافظہ ست البنات اللہ آپ کی عمر ورا کرے آپ کی زندگی میں اللہ تعالیٰ آسانیاں پیدا کرے۔ آپ نے بہت اچھا تبصرہ کیا۔ وہی خوشی ہوئی۔ پیاری پروین افضل سدا سلامت رہیں پہلے تو یہ بتائیں آپ کی طبیعت کیسی ہے؟ آپ کو میری کہانی اچھی لگی۔ شکر یہ پاکیزہ ڈائری میں حمد باری تعالیٰ نعت رسول، بہترین فصاحت، پیغام کر بلا، دعا کیا ہے؟ مجھ سے ملیے۔۔۔ یہ تحریریں پسند آئیں۔ سب سلسلے ہی بہت پسند آئے۔ عقلمند حق کا افسانہ پڑھا۔ عنوان کی مناسبت سے افسانہ بہت سچ کر رہا تھا۔ شکر کا بھی مختصر مگر پڑا کہانی تھی۔ ہاجیک کی کہانی بھی اچھی تھی۔ باجرہ ریحان ان کی بھی کہانی مختصر مگر اچھی تھی۔“ (بہت شکر یہ تبصرے کا)

☆ نوزیدہ، لاہور۔ اللہ پاک کی ذات سے مایوسی کفر ہے۔ وہ ایک در بند کرتا ہے تو ہزار در کھولتا بھی ہے۔ دعا کی کثرت مشکلات کو کم کرتی ہے۔ آپ بھی انشاء اللہ کھلے گھڑیاں ضرور دیکھیں گی۔

☆ سارہ مشتاق، تملہ منگ۔۔۔ بیٹیاں یقیناً اللہ کی رحمت ہیں اور یہ رحمت جتنی دیر بھی ساتھ رہے مزید رحمتیں لاتی ہے سو پریشان نہ ہوں۔ اللہ تعالیٰ ہی سبب الاسباب ہے۔ دعا سے اپنی پریشانیوں کو بھگا سیں کہ دعا ہی مومن کا تھنیا رہے۔

☆ نازیہ ارشد، مہجرات۔ پاکیزہ کو پسند کرنے کا بہت شکر یہ۔۔۔

☆ سائرہ مثال، کراچی۔ آپ کی کہانی جلد لگے گی، کوشش کریں کہ آئندہ غیر ضروری طوالت نہ ہو۔

☆ ایل آرزو، اوکاڑہ۔ پاکیزہ کی پسندیدگی کا شکر یہ۔ کہانی بھی جلد لگے گی۔

☆ آپا شمیم فضل خاں، پشاور۔ کہیں ہیں آپ، اپنی کہانی کے متعلق آرا تو پڑھ لی ہوں گی۔ جی اب آپ کے تبصرے کا انتظار رہے گا۔ پاکیزہ کے مطالبہ سے اس کا شکر یہ۔

☆ نازیہ، ضلع جہلم سے۔ ”باجی ایک تجویز ہے کہ ہر ماہ ہماری جو مصنفات دنیا سے چلی گئی ہیں۔ ان کی کہانیاں دیا کریں، یا ایرانی مصنفات کی سپر ہٹ کہانی بھی دیں جو آج کے قارئین نے نہیں پڑھیں۔ پاکیزہ بہت اچھا لگتا ہے آپ بہت اچھا کام کر رہی ہیں۔“ (بہت شکر یہ، نازیہ بہن، آپ کی تجویز پر بھی مجھی، کبھی عمل کیا جاسکتا ہے)

کچھ نورین شہزاد، کراچی سے۔ ”جو شہزادہ دوسم کی ایک بہت اچھی کاوش تھی انسا ٹریک اور بہت ساری motivation ایمان کی بلا عنوان اندر تک دکھ دے گی۔ محبت زوراوا حیا بخاری کی بس ایک عام حالات پر کہ ایسا بھی ہوتا ہے۔ خواب گزیہ دردناک نوٹیں کی بھی کچھ مشرقی لیے ہوئے کچھ سنسن کے ساتھ کچھ دکھ کا جلا بخوڑی سردیوار لکھتا ہوں پس دیوار سنتا ہوں، نصرت یوسف کی مکافات عمل کا ایک چھوٹا سا نمونہ کی۔ اللہ نے جسے گناہ سے بھانا ہوتا ہے اسے بھالیتا ہے۔ بس اتنی ہی بات ناہید چوہدری کی کاوش اچھی تھی معاشرے کے کچھ لوگوں کو جھنجھوڑنے کے لیے تھی۔ نکلے جو قدم ریحانہ آفتاب کا ایک اچھا انسا ٹریک افسانہ تھا۔۔۔ عمرے کا سفر نیکل ملک اعوان نے بہت اچھی طرح ہمیں کہہ دینے کی سیر کروائی مگر بیٹھے دل سے بے ساختہ دعا لگی اللہ ہمیں بھی عمرہ۔۔۔

نصیب ہو۔ (آمین) احوال کیوں کی مہک کا خود کو بھی اس محفل میں محسوس کیا۔۔۔ ایسا ہوتا ہے کہ ہماری فیکٹور بہت اچھی ہوتی ہیں اندر سے ہم اطمینان میں ہوتے ہیں کہ ایک ماضی کی کوئی غلطی کوئی بری یاد آجاتی ہے۔ اور ہم خود کو بھی محسوس کرنے لگتے ہیں۔ یہ شیطان کی طرف سے ہوتا ہے آپ ذرا آغوش باللہ کا درد شروع کر دیں۔۔۔ اور دماغ کو آپ کے کنٹرول میں ہونا چاہیے نہ کہ آپ کا منہ کے کنٹرول میں آپ اپنے دماغ کو کہیں وہ تکلف اسی وقت کے لیے تھی اور مجھے اس لیے یاد آئی کہ مجھے کوئی سبق دینے کے لیے کہ میں کچھ سیکھ لوں بس کوئی بھی مشکل اتنی بڑی مشکل نہیں ہوتی کہ حل نہ ہو سکے ایک بات یاد رکھیں، ہمیں ہار نہ مانیں۔ نیت صاف ہوگی تو منزل آسان ہو جائے گی۔“ (بہت شکر یہ اچھی، اچھی باتیں متانے کا)

کچھ مسرت پرویز، کراچی سے۔ ”میری تو عمر گزرتی جا کیزہ پڑھتے ہوئے، ساری عمر اسکول کی جاب کی اب دل چاہتا ہے کچھ لکھنے، پڑھنے والی جاب مطلب رسالے، اخبار کی (اچھا یہ تو بہت اچھی بات ہے) کلاس سینتھ سے رسالہ پڑھ رہی ہوں۔ بہت کچھ سکھا ہے میں نے اس سے۔ اب تو میرے بیٹے کی شادی ہونے والی ہے، ایک بیٹی ڈاکٹر ہے جو لوند پڑھنے لگی ہوئی ہے۔ (اللہ آپ کو خوش رکھے، مسرت آپ بچوں کی خوشیاں دیکھیں۔)

کچھ منیرہ بیگم، لالہ موسیٰ سے۔ آپ سب لوگ کیسے ہیں؟ (بالکل ٹھیک) پاکیزہ میں اس ماہ تقریب کا احوال پڑھ کر مزہ آگیا تاں۔۔۔ انجم انصار بہت یاد آئیں۔ (جی یہ تو ہے انشاء اللہ کی اور تقریب میں دیکھ لیجیے گا) پاکیزہ میں سب کا ذکر پڑھ کر اچھا لگتا ہے۔ (آپ کا بھی اس ماہ بطور خاص ذکر ہوا ہے منیرہ)

☆ پروین عذرا تاشد، کراچی۔ آپ کتاب بھیجئے گا بہت شکر یہ۔ کہانی جلد لگے گی۔ اللہ آپ کو صحت سے رکھے۔ کچھ آسیہ عامر بگلشن اقبال کراچی سے۔ ”باجی میں نے تبصرہ بھیجا تھا۔ (ہائیں نہیں ملا بہن) تقریب کا احوال پڑھ کر خوب مزہ آیا نہت آپ کی تو بہت اسارت ہیں (تصویر سے دھوکا کھا گئی ہو) سب راسخ زود کھڑے بہت اچھا لگا۔ دونوں قسط واران ناول امرت اور یہ کہانیاں بچیں کہ دل ہے، بہت خوب جار ہے ہیں۔ نایاب جیلانی سے بھی کچھ لکھوائیں۔ (جلد لکھیں گی) مجھے بھی آئندہ کئی تقریب میں ضرور آنا ہے (جی بالکل آپ کسی وقت آفس بھی آسکتی ہیں)

کچھ نسرن یاسین، حیدر آباد سے۔ ”میں ماہ نامہ پاکیزہ ذوق و شوق سے پڑھتی ہوں اور باقاعدگی سے ان میں شائع ہونے والے مقابلوں میں بھی حصہ لیتی رہتی ہوں۔ میں آپ کی توجہ ماہ نامہ پاکیزہ ستمبر 2017ء کی طرف دلاتی ہوں جس میں بزم پاکیزہ میں انعام پایا۔ جس کے لیے میں آپ کی اور ادارے کے تمام لوگوں کی بہت مشکور ہوں کہ میرے سوال کو بہترین سوال قرار دیا اور انعام سے نوازا۔“ (جی یہ آپ لوگوں کے لیے ہی تو ہے)

کچھ ثریا فرخ، کراچی سے۔ ”مجھے کچھ کہتا ہے، آپ کی بات میرے دل میں اتر گئی۔ حقیقت ہے کہ یہ معصوم بچے مزدوری کرتے، مزدور پر لے دیکھ کر دل خون کے آنسو روتا ہے مگر ہم صرف دن مناکر ہی مطمئن ہو جاتے ہیں، اور پھر اگلے سال اسی طرح کا ایک اور دن مناکر اپنا فریضہ ادا کر دیتے ہیں۔ اللہ کرے آپ کے دل کی بات لوگوں کے دلوں میں اتر جائے۔ (آمین) آپ کی مبارک باد کا شکر یہ۔ ابھی صرف چند افسانے ہی پڑھے ہیں، تفصیلی تبصرہ ادھار رہا۔“ (جی ضرور) امرت کے ساتھ کیا رہا ہونے والا ہے۔ شیریں حیدر نے بڑے خطرناک موڈ پر کہانی کی قسط رقم کی ہے۔ احوال کیوں کی مہک کا۔ سب سے پہلے پڑھا محترمہ عذرا رسول کی یہ بات بھی بہت پسند آئی ہے کہ وہ ہر موقع پر اپنے احباب کو اپنی قلم کار بہنوں کو یاد رکھتی ہیں۔ اور دو وقتا ہم سب ہی ایسی حسین محفلوں میں شرکت کے منتہی ہوتے ہیں۔ اللہ ان کے شوق و ذوق اور جذبوں کو سلامت رکھے، میری طرف سے عذرا صاحبہ کو بھی سلام کہیے۔ (ان کی طرف سے بھی سلام دو دعائیں)

کچھ نرگس نسیم، صاحبہ موہڑہ چکوال سے۔ ”ماہ نومبر کا رسالہ لیٹ ملنے پر جتنی مجھے کوفت ہوئی۔ اتنی ہی شام کو میری یہ کوفت راحت میں بدل گئی۔ چھ نومبر کا دن تازیت مرے یادگار دنوں میں شمار ہے گا۔ صبح کو پاکیزہ رسالہ ملا۔ بہنوں کی محفل پڑھی۔ احوال تقریب کا پڑھا اور رسالہ رکھ دیا کہ رات کو تسلی سے پڑھوں گی۔ شام کو کچھ میں تھی کہ بیٹی نے کہا ائی فون ہے۔ میں نے خبر دیکھا تو کراچی کا کوڈ دیکھ کر درطرح حیرت میں مبتلا کر گراچی سے مجھے کون فون کرے گا۔۔۔ بہر حال ڈرتے، ڈرتے بیٹولیا تو آگے سے جس پیاری من موٹی سی شخصیت نے اپنا تعارف کروایا۔ میں مارے خوشی کے بے ربط بولنے لگی۔ حالانکہ یہ میرا ریکارڈ ہے کہ میں کسی سے بھی یوں متاثر نہیں ہوتی۔ میری شدت سے خواہش تھی کہ کبھی عذرا آج ہی سے بات کروں

لیکن یہ سوچ کر کہ پاکستان کی اتنی مشہور و معروف بزنس وومین نہ صرف پاکستان بالکل غیر ممالک میں پاپولر خاتون بھلا ہم بھی عام قاری سے کیونکر بات کریں گی۔ عذرا آپ نے میری دیرینہ خواہش پوری کی اور اپنے مصروف ترین ٹائم سے کچھ قیمتی لمے میری نذر کئے۔ تو تب مجھے یقین آ گیا کہ جیسا عذرا آپ کے بارے میں سنا پڑھا ہو سکی ہیں۔ (جی ہاں بالکل بھی کراچی آکر مل بھی لیے گا) میں ساتویں کلاس کی اسٹوڈنٹ تھی جب میں نے پائیز پڑھنا شروع کیا تھا۔ اب تو تقریباً پچیس سال ہو گئے ہیں پائیز پڑھتے ہوئے دلش کا اجرا ہوا تھا ہم نے دلش کو پائیز کی چھوٹی بہن کا نام دیا۔ (جی اچھا) مگر بڑی گراں گزری تھی نہیں دلش کی جدائی۔ اور آپ کا ساتھ چھوٹا۔۔۔۔۔ اب آپ نے جو پائیز کی اداوت سنبھالی تو بہت کچھ یاد آ گیا۔ (نرس نسیم بہت پیاری باتوں کا شکر یہ۔۔۔۔۔ آپ پندرہ تاریخ تک تمبرہ بھیج سکتی ہیں کہ بس اٹھارہ، انیس کو تو مل ہی جائے۔ سالانہ خریداری کے لیے 800 روپے نئی آرڈر پانک ڈرافٹ جا سو کی ڈائجسٹ چلی کیسٹرن کے نام پر ارسال کر دیں۔) کچھ سلمی غزل، کراچی سے۔ ”اس نومبر کا پائیز کافی زبردست لگا شاید اس لیے بھی کہ بہنوں کی محفل میں، میں بھی شریک تھی جو میں سب سے پہلے پڑھتی ہوں شکر یہ۔۔۔۔۔ شہناز وسیم کا بوجھ مقصد اور کہانی کے اعتبار سے لا جواب مگر حقیقت سے کسوں دور۔۔۔۔۔ کیونکہ شاید انہیں سرکاری ملازمتوں کا تجربہ نہ مشاہدہ۔۔۔۔۔ اور میں نے اسکول اور کالج دونوں کا تجربہ کیا ہے، سرکاری ملازمت کی بھی ادارے کی ہوسر صرف عیاشی اور فارغ البالی اول تو کسی سرکاری ادارے کا سربراہ خواہ اسکول ہو ٹائم نہیں آتا تو پھر ٹیچر کا کیا حال ہوگا۔۔۔۔۔ (لیکن آج کل ایسا نہیں ہے) میری جاننے والی ایک خاتون کی بہن دس سال گھر بیٹھی رہیں۔ اسکول کے میڈیا ماسٹر اور ٹرک جب میں تنخواہ ڈالتے رہے اور پھر انہوں نے دوبارہ جوائن کر لیا۔ میرے میاں اور میں نے جج کے لیے ایلانی کیا گورنمنٹ جاب کی وجہ سے N.O.C ضروری تھا۔ سب نے ڈرایا اسرپورٹ سے واپس کریں گے۔ N.O.C تمہیں نہیں ملا اور میں مطمئن جج سے واپسی کے دو ماہ بعد۔۔۔۔۔ NOC ملا۔ کیا (اوہ بڑی حیرت ہے) خدا کا شکر ہے مجھے best teacher کا ایوارڈ بھی ملا اور زلت بھی ہمیشہ 100% کیونکہ خوف خدا کی وجہ سے میں عبادت سمجھتی تھی اور خیانت نہیں کر سکتی تھی۔ ویسے گورنمنٹ اداروں میں بھی devoted لوگ ہوتے ہیں لیکن آئے میں تک کے برابر۔ رفاقت جاوید تو ہمیشہ ہی مقصد سے بھر پور تھی ہیں مگر اس پر عمل ہونا۔۔۔۔۔ مشکل بلکہ ناممکن۔۔۔۔۔ تحفہ شاہ کی عورت کتنا پڑھ کر اپنا زمانہ یاد آ گیا بالکل حقیقت ہے قریب محبت زاد اور پڑھ کر بہت دکھ ہوا۔ جا بخاری نے خوب لکھا زبردست دردناک نوٹیں کا خواب مزید مزہ نہ دے سکا حالانکہ وہ خوب لکھتی ہیں۔ ثریا فرخ نے اپنے بھو بیٹے کے جج پر اپنے تاثرات خوب قلمبند کیے۔ سبحان اللہ نصرت یوسف کا افسانہ بھی با مقصد تھا مگر پورا اختتام کے ساتھ۔۔۔۔۔ سارہ احمد کا ستو طائیں ٹھیک لگا۔ شمیم فضل خان بہت بہت شوق رائٹر ہیں مگر ان کی شادی لگتا ہی نہیں کہ یہ ان کی تحریر ہے بہر حال یہ میری رائے ہے وہ بھی ذاتی۔۔۔۔۔ تاہید چوہدری کی بس اتنی ہی بات تو چھائی کا ش بیٹے اس پر ہمیشہ عمل کر لیں اور ہوں ساتھ بھی دیں۔ رہبانہ آفتاب تو چھائیں حالانکہ اس موضوع پر پہلے بھی کئی مرتبہ لکھا جا چکا ہے لیکن ان کا انداز سفر اور الگ لگاؤ دل و ذہن رہبانہ آفتاب۔۔۔۔۔ کاش ہر ماں باپ کو کچھ آجائے اور بھی رنج چوہدری نے بھی تقریب کا حال خوب لکھا۔۔۔۔۔ اب ایک تجویز ہے آپ بے شک ہر ماہ نہ سچ چھ ماہ میں ایک مرتبہ تقریب رکھ لیں مگر بوجھ اس کا ساری رائٹرز مل کر اٹھائیں۔ صرف نئی اور پرانی رائٹرز کو مدعو کریں اور ایک مخصوص رقم طے کر دیں اضافی رقم آپ کا ادارہ ارادہ کر لے اس پر کسی پر بوجھ بھی نہیں پڑے گا اور مصنفین کو ایک دوسرے سے مل بیٹھنے کا موقع بھی مل جائے گا۔ (خوب تجویز ہے بھی) اختر شجاعت بھی خوب لکھتی ہیں اور ذہنی لکھاری کا تو کہنا ہی کیا سارے سلسلے بہت اچھے ہیں مگر نئے اور پرانے لکھنے والوں کو بھی اپنے بارے میں لکھنے کی دعوت دیں تو ایک اچھا سلسلہ رہے گا۔“ (جی اس کے لیے رائٹرز کے انٹرویوز کا سلسلہ چل رہا ہے ناں)

کچھ فریڈ جاوید فری۔۔۔۔۔ لاہور سے۔ ”نومبر کا پائیز ملا پائیز لکھا افسانوں اور ناولوں کا گلہ نہ تھا۔ ہماری صحت پہلے سے بہت بہتر ہے۔ (الحمد للہ) (سب بہن، بھائیوں کی دعاؤں سے ٹھیک ہو گئی ہوں مگر کمزوری بہت ہے سب سے پہلے ذکیہ جی کا اللہ اور اس کا نور پڑھا ہے حد درجہ اور ملا۔۔۔۔۔ اللہ تعالیٰ انہیں صحت اور لمبی عمر عطا کرے، آمین۔ اس مرتبہ تو رہبانہ آفتاب صلہ نے کمال کا افسانہ لکھا پڑھ کر بے حد چھٹکا، خوش رہو۔ ان کی شادی شمیم فضل جی نے خوب لکھا۔ سارہ احمد کا ستو طائیں اچھی تحریر تھی۔ عورت کتنا حلقہ شاہ، خواب گزیدہ، ناول تو بوجھ کیا ناول تھا پائیز کے ناول اور افسانے بہت معیاری ہوتے ہیں کہ بڑھ کر مزہ آ جاتا ہے۔ اپنی شاعری دیکھ کر خوشی ہوئی۔ اس مرتبہ میگزین میں اپنی ہم نام فریڈ کو بڑھ کر بے حوشی ہوئی۔ جیسے فریڈ فضل، فریڈہ افتخار، فریڈہ ہاشمی، فریڈہ خانم، فریڈہ سیفی تمام فریڈہ کو بے حد سلام دعا۔ کوش خالند کی نظم بیٹوں کے نام بے حد پسند

آئی۔ آخر میں اپنی پیاری دوستوں کو بے حد سلام دیا۔ احوال کلیوں کی میک کا کاش ہم بھی ہوتے۔ (آپ بھی تو تھیں ناں بھی) کچھ یاسمین اقبال، لاہور سے۔ ”مجھے پائیز کی یہ بات بہت اچھی لگتی ہے جب آؤ جیسے آؤ انہوں میں سیٹ لیتا ہے۔ اور ہماری بھیجی ہوئی کوئی تحریر ضائع نہیں کرتا ہے وہ مہینوں پرانی ہو، بہت سنبھال کر رکھتا ہے۔ مثال کے طور پر پچھلے سال بھیجی گئی میری نظم تمبر کے شمارے میں شائع ہوئی۔ میں جسے بھول بھی جی سکتی تھی۔ جیون ساسی کے نام سے شائع ہونے والی نظم کے لیے آپ کی مشکور ہوں۔ (یہ ترانے آپ کی امانت ہوتے ہیں) خاندان میں ہونے والی دھڑوں شادیوں کی مصروفیت ہے۔ بس ابھی اپنے فورٹ ناول کہاں پھیں کدول، کی قسط پڑھی ہے دیکھیے اب آگے زار اور ساحل کیا کل کھلاتے ہیں۔ انجم بھی ہیں، بہت یاد آتی ہیں ان کو میرا سلام ضرور کہیں۔ (بالکل ٹھیک ہیں اور دعائیں کہتی ہیں)

کچھ عذرا آفتاب، کراچی سے۔ ”میں آپ کے توسط سے اپنی رائٹرز بہنوں سے کچھ کہنا چاہتی ہوں کہ خدا را مگروں کو جوڑنے والی کہانیاں لکھا کریں، آج کل ٹی وی پر بھی بھائی، بہنوں کے درمیان سنگدلی کے مظاہرے دکھائے جا رہے ہیں۔ ہمارے رائٹرز اتنے سنگدل کیسے ہو گئے۔۔۔۔۔ جن گھروں میں بھائی نہیں ہوتے، وہاں نہیں، تنہا اور خود کو غیر محفوظ سمجھتی ہیں۔ اور اکثر منہ بولے بھائی بنا کر اس کی درازی عمر کی خدا سے دعا مانگتی ہیں، بھائی کی شکل سے ملتا ہوا کوئی نظر آنے تو دیر تک اس کا خیال رہتا ہے۔ کچھ ہی دن پہلے ایک ڈرامے کا ایک سین دیکھا۔ ایک بھائی اپنی بہن کو گھٹ کر بکن میں لے گیا۔ ماں راستے میں تو اسے ایک کمرے کی طرف دھکا دیا اور بہن کے اوپر تیل انڈیل کر مارجس کی تیلی روشن کر کے پھینک دی۔ اور اگلی صبح میت میں گھر آنے والے لوگوں کے درمیان بہت پرسکون بیٹھا تھا۔ ہمارے رائٹرز، ڈراما بنانے والے اور اکثر کیسے بھول گئے اپنے گھر میں اپنی بہنوں سے کیسے نظر ملائیں گے۔ نزہت اصغر آپ اپنے قلم کے ذریعے پائیز۔۔۔۔۔ اس پیاری کو معاشرے سے نکال پھینکیں جہاں رشتوں کا تقدس پامال کیا جا رہا ہو۔ ہمارے لوگ کس سوچ کی طرف جا رہے ہیں۔ اور ہم کس راستے پر جا رہے ہیں۔ ہمارے رائٹرز، ہمارے پروڈیوسر ہمارے اداکار ایسے رول بہت سنگدلی سے لکھ اور کر بھی رہے ہیں۔ ہمارے بچوں کی تربیت کسی اور انداز میں ہونی چاہیے۔ معاشرے کی خوب صورتی زندگی کی بقا ہے، ایک وقت تھا جب گھر کے سب افراد کٹھے بیٹھ کر ڈرامے کا انتظار کرتے تھے۔ اور۔۔۔۔۔ اب۔۔۔۔۔ آپ کی رائٹرز ماشاء اللہ باشعور ہیں وہ اس معاملے پر ضرور غور کریں گی۔“ (جی عذرا، آپ نے بہت حساس موضوع اٹھایا، اللہ پاک ہمیں ہدایت دے)

اچھی بہنو محفل کا اختتام کرتے، کرتے پیاری قابل صدا احترام نئی لکھاری بہنوں سے درخواست ہے اپنی کہانیاں ضرور بھیجیں مگر ایک کہانی ایک ہی رسالے میں، جس میں بھی آپ کا دل چاہے ایک ہی کہانی کئی رسالوں کو بھیجنا اخلاقی طور پر درست نہیں۔۔۔۔۔ آپ لوگ اپنے قارئین کو اچھی، اچھی باتیں بتاتے ہیں ان کو سنو اتارے ہیں اور یقیناً یہ بہت کمال کی بات ہے، ہر ایک میں یہ صلاحیت نہیں ہوتی۔ امید ہے لکھاری نہیں اپنے وقار اور ساکھ کو مد نظر رکھتے ہوئے سہوگنا ایسا نہیں کریں گی۔ اچھے وقت کا انتظار تو کیا ہی جاتا ہے اسی طرح قابل اشاعت ہونے کے بعد کہانیاں بھی ضرور لگتی ہیں۔ بے صبری تو کسی شے میں مناسب نہیں ہے ناں۔ ہمیں اپنی تمام رائٹرز بے حد عزیز ہیں اور ہم دل سے ان کی قدر کرتے ہیں۔ اصل مسودہ آپ ہمیں ارسال کریں اور ریکارڈ کے لیے ایک فوٹو اسٹینٹ اپنے پاس رکھیں۔ انشاء اللہ آپ سب کے تعاون اور ہمنائی سے ہم پائیز بہتر سے بہتر بنانے میں کوشاں رہیں گے۔ رب کا نکات کے حضور دعا گو ہیں کہ اے ہمارے پروردگار، اللہ جل شانہ تو ہماری خطاؤں لغزشوں، غروکڑاشتوں سے صرف نظر کر کے ہماری رہنمائی کر۔ ہمیں اس سیدھے حق کے راستے پر چلا جو تیرے مقربان خاص کی راہ ہے۔ اور ہماری آل اولاد اور تمام ملت اسلامیہ پر رحم فرما اور ہمارا خاتمہ بخیر ہو۔ بے شک تو ہر چیز پر قادر ہے۔

آپ کی خیر خواہ  
نزہت اصغر

### پاکیزہ میں خط لکھنے کا پتا

مدیرہ ماہنامہ پاکیزہ۔ 63.c فیز III سیکشن، ڈیفنس۔ مین کورنگی روڈ۔ کراچی۔ پوسٹ کوڈ 75500  
فون نمبر 021-35804200, 021-35386783, 021-35802552 EXT 107,118



## نام اللہ

ہر کام سے پہلے نام اللہ  
ہر کلام سے پہلے نام اللہ  
وہی تو آقا، وہی تو مولا  
وہی تو رب ہے، وہی تو داتا  
اس کے سوا نہیں کوئی اللہ  
لا الہ الا اللہ  
سارے جہاں کو اس نے بنایا  
تاروں سے پھر فلک سجایا  
پہاڑوں کو زمیں کی مٹیں بنایا  
اس کی قدرت ہر شے سے عیاں  
لا الہ الا اللہ  
ہر جن و بشر کو اس نے بنایا  
ان کو پھر زمیں پر پھیلا یا  
سیدھا سیدھا نبیوں سے سمجھایا  
اور زمیں کو دارِ فنا بنایا  
لا الہ الا اللہ  
اپنا تو خالق ہے اللہ  
اپنا تو مالک ہے اللہ  
اپنا تو رازق ہے اللہ  
اپنا تو معبود ہے اللہ  
پھر کیوں رہیں گے ہم تشنہ  
رازیہ جب پانی لیا  
لا الہ الا اللہ

کلام: پروین عذرا شہزادہ، کراچی

## نعت

ایک حسین ماہتاب آیا ہے  
حکمتوں کا نصاب آیا ہے

امام الانبیا کی ذات اقدس میں جمع ہو گئی تھیں۔  
قرآن کریم میں خود رب کائنات شہادت دے  
رہا ہے۔ ”اے محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم آپ اخلاق  
کے اعلیٰ ترین درجے پر فائز ہیں۔“

حضور کے اخلاق و عادات قرآن کریم کی عملی  
تصویر ہیں۔ آپ خادم کے ساتھ نہ صرف کھانا تناول  
فرماتے بلکہ اس کے کاموں میں مدد بھی کرتے تھے۔  
سلام میں ادنیٰ و اعلیٰ سب پر سبقت لے جاتے تھے۔  
حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو سخت کلامی سے شدید  
نفرت تھی۔ آپ نے امت کو سخت کلامی سے منع فرمایا۔

ارشاد نبوی ہے۔ ”لوگوں سے بات چیت احسن  
طریقے سے کیا کرو۔“ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی  
ذات والا صفات سادگی، اخلاص اور خاکساری و شیریں  
کلامی میں فقید المثال ہے۔ اللہ کے حبیب روزمرہ کی  
زندگی کے ادنیٰ سے ادنیٰ کام بھی خود انجام دیتے تھے۔  
حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنی پوری حیات  
مبارکہ میں بے مثال حکمت، عدیم المثال خلق و عنایت اور  
بے نظیر محبت کے اعلیٰ معیار قائم فرمائے اور نئی نوع انسان  
کو مثالی اخلاق اور بے مثال کردار کا عملی درس دیا۔

مرسلہ: ارم کمال، فیصل آباد

## جشن میلاد النبی

میلاد النبی جشن ہے آج کی رات  
بھیجو کثرت سے درود پاک آج کی رات  
کر سکوں میں بھی روئے کے آگے نعت خوانی  
ہو جائے مہرباں جو مجھ پر میرا رب آج کی رات  
بس جائے نگاہوں میں میری نور محمد  
اتنا میں کروں یاد انہیں آج کی رات  
کلام: عالیہ ضیا، کراچی

## دعا بحضور سرور کونین

ہر دم انہی کا نام ہو درِ زباں یارب  
شاید پڑے اسی طرح جان میں جاں یارب  
ان کے جو در سے پھول ملیں چند کرم کے

میرے لیے ہے مہک ہوا گلستاں یارب  
در پہ جوان کے جاؤں تو واپس نہ آؤں میں  
در پہ بنا دے ان کے میرا آستان یارب  
ان کی نگاہ کرم پہ سو جانیں واردوں  
حضورؐ پہ ہیں قربان میرے دل و جاں یارب  
کو کتب یہ آرزو ہے کہ بس ان کے واسطے  
میں پیش کرتی جاؤں یونہی نذر جاں یارب  
عقیدت گزار: نجمیہ کوکب، جہلم

## حجت کس بات کی

انسان کے لیے جب ایک دروازہ بند ہوتا  
ہے تو دوسرا کھل جاتا ہے اور دوسرے کے بعد تیسرا.....  
مگر جب تیسرا دروازہ بند ہوتا ہے تب اللہ کے فضل کا وہ  
دروازہ کھول دیا جاتا ہے جہاں سے اس کو دینے کے  
لیے اللہ کے پاس بہت کچھ ہوتا ہے۔ مگر اس بہت کچھ کو  
پانے سے پہلے ہمیں ہمارے پاس موجود سب کچھ دینا  
ہوتا ہے..... دراصل اس دینے میں ہی ہمارا سب کچھ  
پالینا پوشیدہ ہوتا ہے..... پھر اگر ہم نہیں دیں گے تو لے  
تو تب بھی لیا جائے گا..... تو پھر حجت کس بات کی!  
از: فرح طاہر، ملتان

## ذرا غور کریں

☆ زمانے کا شکوہ مت کرو بلکہ خود کو بدلو کیونکہ  
پاؤں کو گندگی سے بچانے کا طریقہ جوتا پہننا ہے.....  
نہ کہ سارے شہر میں قالین بچھانا۔  
☆ پھولوں کی مہک کچھ دن بعد ختم ہو جاتی ہے  
مگر..... حسن سلوک اور اخلاق کی مہک انسان کی موت  
کے بعد بھی قائم رہتی ہے۔  
☆ زندگی کا المیہ یہ نہیں کہ یہ بہت جلد ختم ہو جاتی  
ہے..... بلکہ اصل المیہ یہ ہے کہ ہم جینا ہی بہت دیر سے  
سکھتے ہیں۔ (مولانا روم)

از: زرین کمال، کوٹ ادو

## عورت

عورت تو مٹی ہے  
ہر بل جواڑتی ہے

اثرات مرتب ہو رہے ہیں یہاں والدین اور اساتذہ کو اپنا مثبت کردار ادا کرنا ہوگا۔ تاکہ بچوں کو برائی سے دور رکھا جاسکے۔ ہماری تھوڑی سی کوششوں سے ہماری نوجوان نسل تباہ ہونے سے بچ سکتی ہے۔

از: صدف نورین، لاہور

## خلاف ورزی

ایک خاتون تیز رفتاری سے ٹریفک سٹل توڑتی ہوئی نکل گئی۔ کانسٹیبل وہاں موجود ایک مینی گواہ خاتون کے پاس آیا اور کہنے لگا۔

”کیا آپ اس گاڑی والی خاتون کے بارے میں بتا سکتی ہیں؟“ خاتون کہنے لگی۔ ”اس نے گرے مگر کی ساڑی پہن رکھی تھی، لاکٹ میں زمرہ لگا ہوا تھا۔ پنک لب اسٹک، آؤٹ لائنز کے ساتھ استعمال کی گئی تھی۔ پنک نیل پالش اور مسکارا بھی استعمال کیا ہوا تھا۔“

”اب آپ جلدی سے گاڑی کا نمبر بھی بتادیں۔“ کانسٹیبل خوش ہو کر کہنے لگا۔

”سوری جناب، نمبر دیکھنا تو مجھے یاد ہی نہیں رہا۔“ خاتون ایک دم گھبرا کر بولی۔

از: صبا نور، لیہ

## غزل

بنا گلاب تو کانٹے چھپا گیا اک شخص  
ہوا چراغ تو گھر ہی جلا گیا اک شخص  
میں کس ہوا میں اڑوں کس فضا میں لہراؤں  
دکھوں کے حال ہر اک سو بچھا گیا اک شخص  
پلٹ سکوں نہ میں آگے یہ بڑھ سکوں جس پر  
مجھے یہ کون سے رستے لگا گیا اک شخص  
محبتیں بھی عجب اس کی نفرتیں بھی کمال  
مری ہی طرح سے مجھ میں سما گیا اک شخص  
کھلا یہ راز کہ آئینہ خانہ ہے دنیا  
اور اس میں مجھ کو تماشا بنا گیا اک شخص  
انتخاب: تبسم گل، بلوچستان

☆☆☆

بول بھی سکتا ہے۔  
☆ انسان تلواری سے نہیں طعنے سے مر جاتا ہے۔  
☆ زہر مرنے کے لیے تھوڑا مگر جینے کے لیے  
بہت سارا پینا پڑتا ہے۔

از: ایمان زہرا شیرازی، ڈھڈیال، چکوال

## بگلی

چپ چپ تھا تنہا  
رہتی کیوں ہو ہر دم جاناں  
زلف پریشاں زرد سا چہرہ  
بکھرا کا جل ٹوٹا گجرا  
میں نے جب یہ اس سے پوچھا  
کس نے کیا ہے حال یہ تیرا  
آنکھ میں اس کے آگے آنسو  
زنجی نظر سے مجھ کو دیکھا اور پکاری  
تیری نظر سے ہو گئی گھاسل  
تیرے پیار میں ہو گئی پاگل

فریدہ جاوید فری، لاہور

## غورو فکر

آج جس بات نے مجھے لکھنے پر مجبور کیا ہے وہ  
ہے میڈیا کے اثرات ہماری زندگیوں میں کیا  
تبدیلیاں لے کر آرہے ہیں، آج کل بچے، بڑے  
سب انٹرنیٹ اور سوشل میڈیا کے زیر اثر ہیں۔ ہر چیز  
کا زیادہ استعمال نقصان دہ ہوتا ہے۔ ہماری نوجوان  
نسل جو ہمارے ملک کا سرمایہ ہے، بے راہ روی کا  
شکار ہو رہی ہے۔ ہمارے بچے جس تباہی کی طرف  
جارے ہیں ہم اس سے لائق ہیں والدین اور  
اساتذہ کو چاہیے کہ وہ رہنمائی کریں، اچھی اور بری  
چیزوں کے بارے میں آگاہی دیں۔ قرآن و  
حدیث کی معلومات بچوں کو دیں تاکہ بچے اپنے دین  
اسلام سے روشناس ہو سکیں۔

ہماری نوجوان نسل ٹی وی اور انٹرنیٹ پر گانے اور  
لمپن ویڈیو دیکھ سکتے ہیں پر کچھ وقت دین کی باتیں سیکھنے کے  
لیے نہیں نکال سکتے۔ بچوں کے ذہنوں میں اس کے منفی

ماہنامہ پاکیزہ 291 دسمبر 2017ء

تری باتیں تری یادیں  
محبت تیرے صدقے میں  
بہی ملتی ہے سوغاتیں  
ہنسیں گے دل سے مل کر ہم  
گلے دل کو لگائیں گے  
تمہیں ہم یاد کر لیں گے  
تجھے ہم بھول جائیں گے  
چلو منزل سے پہلے ہم رستہ موڑ جاتے ہیں  
کہ جن کو دل میں رکھتے ہیں وہی دل توڑ جاتے ہیں  
محبت تم سے نفرت ہے  
انتخاب: سیدہ جیہ عباس، تلہ گنگ

## غزل

صرف اتنا اسے بتا دینا  
مجھے آتا نہیں بھلا دینا  
میری باتیں تو صرف یادیں ہیں  
یاد آئیں تو مسکرا دینا  
کبھی گزرو تو یوں صدا دینا  
اپنے ہونے کا پھر بتا دینا  
یاد آجاؤں عبادت میں اگر  
ہاتھ اٹھا کے بس دعا دینا  
کاوش: مسز یسین، لیہ شہر

## حسین لمحات

زندگی کے حسین لمحات واپس نہیں آتے لیکن  
ایک لمحہ لوگوں سے تعلقات اور ان سے وابستہ اچھی یادیں  
ہمیشہ دلوں میں زندہ رہتی ہیں۔  
☆ علم بھی کامل ہوتا ہے جب انسان رب کے  
لیے جھکنا اور اس کے بندوں کے کام آتا سیکھ لے کیونکہ  
علم کی پہچان عاجزی اور جہل کی پہچان تکبر ہے۔  
☆ انسان جب اندر سے ٹوٹ جاتا ہے تو باہر  
سے خاموش ہو جاتا ہے۔

☆ براجمی وہی بنتا ہے جو اچھا بن کر ٹوٹ جاتا ہے۔  
☆ ادب کی بات ہوتی ہے ورنہ جو سن سکتا ہے وہ

ذرا جو کہیں ٹھہرے  
اپنی خوشبو بھی چھوڑ جاتی ہے  
لفظوں میں بکھر جاتی ہے  
جذروں سے سمٹ آتی ہے  
آنکھوں میں خوابوں کو بیاتے  
ادھوری تعبیروں پر روتی ہے  
حساس دل کی ہے مگر  
مضبوط سی بنی ہوئی ہے  
عورت محبت کی پجاری ہے  
اسی پر جیتی اسی پر مرتی ہے  
ہاں محبت ملے تو نکھر اُٹتی ہے  
عزت نہ ملے تو بکھر جاتی ہے

کاوش: نزمین سرہیو، سندھ

## خوب صورت دعا

دل سے لگی ہوئی دعا ضرور قبول ہوتی ہے یہ  
خدا اور بندے کے درمیان ایک ایسا رشتہ یا راستہ  
ہے جسے صرف کرنے والا ہی جانتا ہے۔ ہر کوئی  
طالب دعا ہوتا ہے۔ کب، کہاں کس کی دعا ہمارے  
کام آجائے یہ کوئی نہیں جانتا شرط صرف یہ ہے کہ  
خلوص دل سے مانگی جائے۔  
برسوں سے میری خواہش حج پر جانے کی تھی۔  
بھائی، بہن، امی، ابا سب اس کے دربار میں جا چکے  
تھے۔ میری نانی نے مجھے دعا دی تھی اور صرف اتنا کہا  
تھا امی سے کہ اسے بھی ساتھ لے جاؤ۔ اس وقت تو  
میرے پاس پاسپورٹ بھی نہیں تھا۔ لیکن شاید اللہ  
تعالیٰ کی طرف سے اذن تھا اور اسی سال یعنی  
1987ء چار دن میں تیاری کر کے میں پہنچ گئی تھی۔  
اس حج کی خوشی مجھے آج تک یاد ہے۔

ترس رہی ہوں کوئی ماں سا مہربان وجود  
دعائے نور پڑھے اور مجھ پر دم کر دے  
تحریر: فریدہ فضل، یو۔ ایس۔ اے

## محبت سے نفرت

چلو ہم پاس رکھ لیں گے

☆ جیسے نیاز..... ملتان  
اپنی حالت کا خود احساس نہیں ہے مجھ کو  
میں نے اوروں سے سنا ہے کہ پریشان ہوں میں  
☆ عروہ نیاز..... کوٹلی  
اب پوچھتے ہیں مجھ سے میری داستانِ غم  
جب عرض حالِ زار کی طاقت نہیں رہی  
☆ ارم خان..... ڈیرا غازی خان  
ہم فقیروں کو برائی سے سروکار نہیں  
ہم زمانے میں فرشتوں کی طرح رہتے ہیں  
لوگ کہتے ہیں برا ہم کو تو حیرت کیا ہے  
کہنے والے تو خدا کو بھی برا کہتے ہیں  
☆ مرزنگھت غفار..... کراچی  
جس کی خوشبو سے برہم ہیں تیرے شہر کے لوگ  
ابھی وہ لفظ تو میں نے تجھے کہا بھی نہیں  
تمہیں اس لیے بھی اپنا مقدر نہیں مانا  
کہ مقدر کا لکھا ہمیں کبھی ملا بھی نہیں  
☆ ناطقہ شاہن..... واہ کینٹ  
وہ پھر دل کی لکین ہمارا بھی یہ دعویٰ ہے  
ہمارے لب جنہیں چھو لیں وہ پھر بول اٹھتے ہیں  
☆ صبا نور..... لیہ  
مجھ کو لگتی ہے اپنی ہر آواز  
جیسے خالی مکان بولتا ہے  
کس سے چھپتا ہے خون کا لہجہ  
میرے قاتل نشان بولتا ہے  
☆ رانی..... کمالیہ  
مہکتا نہیں بارشوں سے کبھی  
مجھے پکا آئین نہیں چاہیے  
میں چمکتے سورج کی کرتی ہوں دعا  
گھر اپنا ہی روشن نہیں چاہیے  
☆ فرح طاہر..... ملتان  
اب تری چاہ سے رخصت طلب ہوں میں  
اس بار میرے دل سے سچ بخ اتر گیا تو  
☆☆☆

☆ ارم کمال..... فیصل آباد  
پانی میں بہی، ریت پہ تڑپی، چنی گئی  
بنتی رہی ہے درد کا عنوانِ محبت  
طاقت سے بناتی ہے کبھی تاج محل یہ  
جذبوں کے دیس کی ہے حکمرانِ محبت  
☆ صائمہ ممتاز خان..... اسلام آباد  
تو تو سرمایہ ہستی ہے تیرا ذکر ہی کیا  
ہم تو دشمن کو بھی اے دوست دعا دیتے ہیں  
☆ نگینہ منیا کش..... کراچی  
چوک میں لوگ جب کھڑے ہوں گے  
وہ کسی سوچ میں پڑے ہوں گے  
اس زمانے میں سچ جو بولے گا  
اس کے پیچھے ہی سب پڑے ہوں گے  
☆ نیلوفر خان..... کراچی  
ان سے فضا میں رنگ ہوا میں کھلک سی ہے  
اڑتے ہوئے پرندوں کو زنجیر مت کرو  
☆ صائمہ سجاد کش..... کوہاٹ  
دیرانے میں جا کر کبھی دیکھو تو  
سنائے بہت ہی شور کرتے ہیں  
☆ ارم سلیم..... مردان  
مرجھائے تو پھر پیرنے بھی گوارا نہیں کیا  
چلی ہوا تو خود ہی بکھر گئے پتے  
☆ امین رانی..... ٹوبہ ٹیک سنگھ  
آسان نہیں زیست کی منزل سے گزرتا  
اس راہ میں کچھ مرطے دشوار بہت ہیں  
پر درد گزر جائیں تو بیکار ہیں صدیاں  
لے جو سکون بخش ہوں دوچار بہت ہیں  
☆ ماہا احمد..... کراچی  
آہ! معلوم نہیں، ساتھ سے اپنے شب و روز  
لوگ جاتے ہیں چلے، سویہ کدھر جاتے ہیں  
☆ سعیدہ..... مردان  
آمد جو سنی ان کی اللہ رے انتظار  
آنکھیں بچھادی ہم نے جہاں تک نظر گئی



☆ کوثر خالد..... جزائوالہ  
کسی مقصد کو پانے میں زمانے بیت جاتے ہیں  
نئے رشتے بنانے میں زمانے بیت جاتے ہیں  
وفا کی بھٹیوں میں ذات کو ایندھن بناتے ہیں  
جفاؤں کو مٹانے میں زمانے بیت جاتے ہیں  
☆ ساجدہ ظفر..... کمالیہ  
چھت ٹپتی ہے تو کچھ نہیں ہونے دیتے  
کتنے اچھے ہیں مرے گھر کے پرانے برتن  
☆ انجم طاہر..... کراچی  
سچ بات پہ ملتا ہے سدا زہر کا پیالہ  
جینا ہے تو پھر جراتِ اظہار نہ مانگو  
☆ یاسمین کنول..... پرورد  
بن جائیں کوئی جتنو یا بن جائیں اک کرن  
روشن کریں چراغ کوئی تیز ہوا میں  
کہتے ہیں لوگ ہم کو عبادت ہے محبت  
اب کون کرے پیار بھی نفرت کی فضا میں  
☆ نسیم کوثر..... کراچی  
ہم ان کے دل میں اگر کچھ جگہ عدم رکھتے  
تو اتنا سہل نہ ہوتا ہمیں بھلا دینا  
☆ عرشہ جنید..... کراچی  
زمانہ لاکھ تجھے بے وفا کہے لیکن  
میری نگاہ تیرا احترام کرتی ہے  
☆ سعیدہ بانو..... مری  
دکھاؤں داغِ محبت جو ناگوار نہ ہو  
سناؤں قصہٴ فرقت اگر برا نہ لگے  
☆ زبیدہ..... پرورد  
اپنے اندر کر لے یقیں پیدا  
وہ جو ہم کو پرکھنے آیا ہے

☆ حنفی قدیل..... کمالیہ  
آسائشِ حیات تو مل جائے گی کہیں  
لیکن سکونِ دل تو مقدر کی بات ہے  
☆ زرینہ خان..... بہارہ کبو  
بھونچال میں کفن کی ضرورت نہیں پڑی  
ہر لاش نے مکان کا ملہ پہن لیا  
☆ گلشاوندیہ..... اسلام آباد  
حادثوں سے ہار جانا فطرتِ انساں نہیں  
حادثے تو کھیلنے ہیں عظمتِ انساں کے ساتھ  
☆ شمیمہ کوکب..... جہلم  
احباب کے فریب بڑے کام کر گئے  
مجھ پر کبھی خلوص کا مطلب کھلا نہ تھا  
☆ زرتاب..... ٹوبہ ٹیک سنگھ  
نہ آپ یوسف ہیں نہ میں مصر کا کوئی تاجر  
اپنی اس بے رخی کے دام ذرا کم کیجئے  
☆ نازنین آفریدی..... پشاور  
پھر ان کی کھلی میں جائے گا  
پھر سہو کا سجدہ کر لے گا  
اس دل پہ بھروسا کون کرے  
ہر روز مسلمان ہوتا ہے  
☆ فرخندہ جعفری..... گجرات  
دنیا نے ضبطِ غم کے سلیقے سکھا دیے  
حد سے بڑھا ملال تو ہم مسکرا دیے  
☆ ممتاز خانم..... کراچی  
تو نے کہا تھا میں تیری مٹتی پہ بوجھ ہوں  
چہرے کو اب نہ ڈھانپ مجھے ڈوبتا بھی دیکھ  
☆ تہمینہ حیات..... پشاور  
ہم کو ہمارے منہ پہ وہ کہتے ہیں بے وفا  
احسان ہم خدا کی قسم بولتے نہیں

# منتخب غزلیں



بہترین شعری ذوق رکھنے والے آپ جیسے فارغین کے لیے اپنی طرز کے منفرد شاعر جون ایلیا کے ماہ پیدائش کی مناسبت سے ان کی دو خوب صورت غزلیں پیش کی جارہی ہیں۔



دل کا دیارِ خواب میں دور تک گزر رہا  
پاؤں نہیں تھے درمیاں آن بڑا سفر رہا

ہو نہ سکا ہمیں کبھی اپنا خیال تک نصیب  
نقش کسی خیال کا لوح خیال پر رہا

نقش گردوں سے چاہئے نقش و نگار کا حساب  
رنگ کی بات مت کرو رنگ بہت بکھر رہا

جانے گماں کی وہ گلی ایسی جگہ ہے کون سی  
دیکھ رہے ہو تم کہ میں پھر وہیں جا کے مر رہا

دل مرے دل مجھے بھی تم اپنے خواص میں رکھو  
یاراں تمہارے باب میں میں ہی نہ معتبر رہا

شہرِ فراق یار سے آئی ہے اک خبر مجھے  
کوچہ یاد یار سے کوئی نہیں ابھر رہا

ہم جی رہے ہیں کوئی بہانہ کیے بغیر  
اس کے بغیر اس کی تمنا کئے بغیر

انبار اس کا پردہ حرمت بنا میاں  
دیوار تک نہیں گری پردا کیے بغیر

یاراں وہ جو ہے میرا مسجائے جان و دل  
بے حد عزیز ہے مجھے اچھا کیے بغیر

میں بسترِ خیال پہ لیٹا ہوں اس کے پاس  
صبحِ ازل سے کوئی تقاضا کیے بغیر

اس کا ہے جو بھی کچھ ہے مرا اور میں مگر  
وہ مجھ کو چاہئے کوئی سودا کیے بغیر

یہ زندگی جو ہے اسے معنی بھی چاہیے  
 وعدہ ہمیں قبول ہے ایفا کیے بغیر

اے قاتلوں کے شہر بس اتنی ہی عرض ہے  
میں ہوں نہ قتل کوئی تماشا کیے بغیر

## گوشتِ آلو میتھی

اشیا کھ آلو، (مکڑے کر لیں) دو عدد، بڑے۔  
میتھی، چھوٹے پتوں والی چار گڈی۔ (کاٹ کر اچھی  
طرح دھولیں) مٹن، آدھا کلو۔ پیاز، (سلاکس کاٹ  
لیں) 4 عدد۔ نمائز، (چوپ کر لیں) دو عدد۔ (بڑے)  
نمک، حسب ذائقہ۔ لال مرچ پاؤڈر، ایک کھانے کا  
چمچ۔ ہلدی پاؤڈر، ایک چائے کا چمچ۔ ہری مرچیں،  
4 چار عدد۔ ادراک، لہسن، پیسٹ، دو کھانے کے  
چمچ۔ تیل، ایک کپ۔

ترکیب کھ کڑا ہی میں تیل گرم کر کے مٹن، پیاز،  
نمک، لال مرچ پاؤڈر، ہلدی پاؤڈر، ادراک، لہسن  
پیسٹ، ہری مرچیں ڈال کر گھلے دیں۔ گل جائے تو  
اس میں نمائز ڈال کر بھونیں مسالا بھننے لگے تو اس  
میں آلو میتھی ڈال کر مزید بھونیں اتنا کہ میتھی کی اچھی سی  
خوشبو آنے لگے اور تیل الگ ہونے لگے تو آلو گھلنے تک  
دھیمی آگ پر دم پر رکھ دیں۔ (چائیں تو سوکھی قصوری  
میتھی بھی استعمال کر سکتے ہیں)

مرسلہ، میمونہ انیس، کراچی

## سبزیوں کی بریانی

اشیا کھ آلو، تین عدد (درمیانے)۔ گاجر، تین  
عدد۔ پیاز، دو عدد (درمیانے)۔ لہسن، ادراک کا پیسٹ  
دو کھانے کے چمچ۔ پھول گوشت، ایک پاؤ۔ (پھول  
ہوں صرف) سفید بینگن، دو عدد۔ شامبھ، تین عدد۔ تازہ  
مٹر کے دانے، ایک پیالی۔ ہری مرچ، نمائز، دو عدد۔  
(کیوبز کاٹ لیں) پوویہ، حسب پسند، ہرا دھنیا،  
نمک، کٹی لال مرچ اور تیل حسب ذائقہ اور حسب  
ضرورت۔ ثابت کا لازیرہ، ایک کھانے کا چمچ۔ ثابت  
گرم مسالا ایک کھانے کا چمچ سب ملا کر (دارچینی، لونگ،  
کالی مرچ، تیز پتا ..... بڑی الائچی، چھوٹی



الائچی، بادیان کے پھول) چاول بریانی، تین کپ۔  
چکن کیوبز، ایک عدد۔ دہی، آدھی پیالی۔  
ترکیب کھ دہی میں حسب ضرورت تیل ڈال کر  
پیاز باریک کاٹ کر گولڈن کریں ..... تھوڑی سی تلی ہوئی  
پیاز نکال لیں۔ گارنشنگ کے لیے باقی پیاز میں لہسن،  
ادراک پیسٹ، نمک، مرچ، زیرہ گرم مسالا، دہی، چکن  
کیوب اور نمائز ڈال کر تھوڑا بھونیں۔ پھر مٹر، گاجر، آلو  
ڈالیں اور دس منٹ بعد باقی کی سبزیاں بھی ہری مرچ  
سمیت ڈال دیں ..... پانی کی ضرورت ہو تو تھوڑا سا  
ڈال لیں۔ اب سبزیاں گل جائیں تو اسی میں بجکے  
چاول ڈال دیں اور اندازے سے پانی ڈال کر ڈھکن  
ڈھک دیں۔ پانی خشک ہونے لگے تو دم پر رکھ دیں۔  
اندازہ کر لیں کہ اسی پانی میں چاول گل جائیں گے۔  
نہیں تو ہلکا سا چھینٹنا ڈال دیں۔ تیار ہونے پر ہرا دھنیا یا  
پودینے کی پٹیاں اور پیاز چھڑک دیں۔ مزیدار سبزی  
بریانی، چٹنی اور اچار کے ساتھ نوش فرمائیں۔

از نعمت زیدی، بہارہ کہو

## اسیائسی گارلک بیف

اشیا کھ بیف، آدھا کلو۔ لہسن کے جوئے، چھ  
سے سات عدد۔ نمک، حسب ذائقہ۔ کالی مرچ پیسی  
ہوئی، ایک چائے کا چمچ۔ ثابت لال مرچیں، چار سے  
چھ عدد۔ چینی، آدھا چائے کا چمچ۔ انڈے کی زردی،  
ایک عدد۔ سرکہ، آدھا چائے کا چمچ۔ کوئنگ آئل،  
حسب ضرورت۔ (اس میں چکن بون لیس بھی استعمال  
کر سکتے ہیں)

ترکیب کھ اس ڈش کو بنانے کے لیے سب سے  
پہلے چٹنی سی مایونیز بنالیں۔ وہ اس طرح کہ صاف  
خشک پیالے میں انڈے کی زردی ڈال کر اس میں  
چینی، نمک، آدھا چائے کا چمچ کالی مرچ اور دو جوے

## پاکیزہ پاکستان پاکستان

## پاکیزہ بہنیں



### بیلا انعام یافتہ سوال

☆ ایمین رانی..... ٹوبہ ٹیک سنگھ

سوال: دلہن، دولہا کے بڑے بھائی کو جیٹھ اور چھوٹے بھائی کو دیور کہتی ہے، وہ دولہا کے بڑا وال بھائی کو کیا کہے؟

جواب: واہ بڑے پائے کا سوال لائی ہو، بھئی بڑا وال بھی پانچ منٹ چھوٹا بڑا تو ہوتا ہی ہے ناں۔

### دوسرا انعام یافتہ سوال

☆ زمین مرھیو..... حیدر آباد

سوال: لوگ یہ کیوں سمجھ لیتے ہیں کہ یہ ہم سے اچھی تو سب سے اچھی ہوگی اور..... یہ ہمارے ساتھ بری ہے تو سب کے ساتھ بری ہوگی؟

جواب: ایسا تو ہوتا ہے ناں بھئی..... ایک ہی انسان بیک وقت برا اور اسی وقت کسی اور کے لیے اچھا ثابت ہو جاتا ہے۔ یہ تو جس کے ساتھ برا ہے اسے سوچنا چاہیے ایسا کیوں ہے۔

☆ محسنی قدیل..... کمالیہ

سوال: آسمان کے تاروں اور پلکوں کے تاروں میں کیا فرق ہے؟

جواب: ایک کو عاشق آج تک توڑ کے نہ لاسکا ہاں پلکوں پر لانے کا باعث ضرور بن جاتا ہے۔

سوال: باہر کا موسم اندر کے موسم سے کب ملتا ہے؟

جواب: جب دل دماغ میں اختلاف نہ ہو۔

☆ پروین افضل شاہین..... بہاول نگر

سوال: کہتے ہیں کہ منہ پر تعریف نہیں کرنی چاہیے پھر لوگ کیوں میری اتنی تعریف کرتے ہیں؟

جواب: تم نے یہ نہیں بتایا تمہارے منہ پر کس کی

پھر چینی اور دودھ کا بھی اضافہ کریں۔ دیکھی پڑ کر ہلائیں اور اب چچہ زیادہ نہ چلائیں۔ اب چولہے سے اتار کر سویا ساس ملائیں اور ڈش میں نکال کر سرو کریں۔ مزید ارسپ سے لطف اٹھائیں۔

از: نگین ضیاء بخش، کراچی

### جھٹ بیٹ مٹر

دو پیالی مٹر کے دانے ایک ٹیبل اسپون تیل میں ہلکی آچ پر فرائی کریں۔ اس میں دو چٹکی سفید ثابت زیرہ اور نمک وکالی مرچ پاؤڈر حسب ذائقہ اضافہ کریں اور باریک ہری مرچ اور ہرا دھنیا کاٹ کر ڈش میں سجا کر گرم، گرم چائے سے تناول فرمائیں۔ اس میں آپ فرنیج فراز اور ابلے انڈوں کے سلاسل سے سجاوٹ بھی کر سکتی ہیں۔

از: زرینہ خان، بہارہ کہو

### مونگ کی دال کا حلو

اشیا کے مونگ کی دال، ایک کلو (دو گھنٹے کے لیے بھگو دیں)۔ بنا پستی یاد کیسی تھی، آدھا کلو۔ بادام، پستہ، اخروٹ، حسب پسند، کھویا، ایک پاؤ۔ الائچی، دو سے چار عدد۔ چینی، ایک کلو سے دو ٹھی لم لے لیں۔ پانی، آدھا لیٹر، زردے کا رنگ، آدمی چائے کی بیج۔

ترکیب کے مونگ کی دال کو گرائنڈر میں پیس لیں۔ اب ایک کڑا ہی میں بنا پستی تھی اور دال ڈال کر فل آچ پر پکائیں اور برابر پیچ چلاتی رہیں تاکہ دال کڑا ہی میں چپک نہ جائے۔ جیسے پنے کی دال کا حلو بناتے وقت پیچ چلاتے رہتے ہیں۔ اب ایک دیکھی میں پانی، زرد رنگ، الائچی کوٹ کر چولہے پر رکھ کر ابال لیں کہ شکر مکھل جائے۔ اب اسی پانی کو دال میں ملا دیں اور درمیانی آچ پر اتنا پکائیں کہ اس کا پانی خشک ہو جائے لیکن پیچ کو برابر چلاتی رہیں۔ تیل چھوٹے گے تو کچھ دیر پکائیں اب ڈش میں نکال لیں اور بادام، پستہ، اخروٹ سے سجا کر پیش کریں۔

از: علیہ حیدر، کراچی

☆☆☆

لہسن کو کچل کر ڈالیں۔ ایک منٹ الیکٹرک بیٹر سے پھینٹ کر اس میں تھوڑا، تھوڑا کر کے آدمی پیالی کو تنگ آئل شامل کریں اور گاڑھا ہونے پر آخر میں اس میں سرکہ ڈال کر ایک منٹ پھینٹ لیں۔ گوشت کی چھوٹی بوٹیاں کر کے صاف دھو کر چھتلی میں رکھ کر خشک کر لیں۔ پتلی میں دو کھانے کے چمچ کو تنگ آئل ڈال کر

ایک منٹ گرم کریں، اس میں لال مرچوں کو سنہری فرائی کر کے نکال لیں۔ پھر اس میں لہسن کے جوڑوں کو پیس کر ڈالیں۔ ایک سے دو منٹ فرائی کر کے اس میں گوشت کی بوٹیاں، نمک اور کالی مرچ ڈالیں اور اسے ہلکی آچ پر ڈھک دیں (ضرورت محسوس کریں تو تھوڑا سا پانی شامل کر دیں)

جب گوشت مکھنے پر آجائے تو اس میں فرائی کی ہوئی لال مرچیں اور مایونیز ڈالیں۔ تین سے چار منٹ دم پر رکھ کر اتار لیں۔ (اس ڈش کو ابلے ہوئے چاولوں کے ساتھ پیش کریں۔)

نگہت آصف، اسلام آباد

### میٹ بال سوپ

اشیا کے مرغی، آدھا کلو۔ ہری پیاز و ہرا لہسن (سکٹا ہوا) آدمی پیالی۔ کارن فلاور، پون پیالی، نمک، کالی مرچ، سویا ساس، دو، دو کھانے کے چمچ۔ چینی، آدمی چائے کی بیجی۔ دودھ، ایک پیالی۔ مکھن، دو کھانے کے چمچ۔

ترکیب کے مرغی ابال کر بجنی نکال لیں اور گوشت کے باریک، باریک ریشے کریں۔ ان ریشوں کو کارن فلاور اور پانی کے چھیننے کی مدد سے گول، گول بنا لیں جیسے چھوٹے، چھوٹے کو فٹے بناتے ہیں۔ (بجنی نکالتے وقت تھوڑا نمک اور ثابت کالی مرچ ضرور ڈالیں) اب ایک برتن میں مکھن گرم کر کے اس میں کارن فلاور مکس کریں۔ گھٹیاں نہ بننے دیں پھر لہسن اور پیاز بھی ڈال دیں اور باقی نمک، مرچ بھی ملا دیں۔ اب اس میں بجنی ڈال کر خوب پکائیں۔ کچھ گاڑھا ہونے لگے تو گوشت کے گولے بھی ڈال دیں

آتے ہی ہیں۔

سوال: محبت کے دم سے یہ دنیا حسیں ہے محبت نہیں ہے تو کچھ بھی نہیں ہے؟

جواب: سوئی صدمہ چائی۔

سوال: موسم کی نگڑائی ہماری زندگی کو کتنا متاثر کرتی ہے؟

جواب: یہی انگڑائیاں ہی تو ہمارے مزاج کو قابو میں رکھتی ہیں۔ ورنہ یکسانیت سے ہم گھبراہٹیں جاؤ گی۔  
☆ صائمہ سید..... کراچی

سوال: کرسی تو نگڑی کی ہوتی ہے پھر ہمارے ساتھ اس کے لیے اتار ڈالتے کیوں ہیں؟

جواب: اس لیے کہ وہ عام نگڑی کی نہیں ”اروں“ کی ہوتی ہے۔  
سوال: دیواروں کے صرف کان ہوتے ہیں آنکھیں یا ناک کیوں نہیں ہوتیں؟

جواب: وہ بھی ہوتی ہیں جیسی تو پڑوسی کے گھر کے پکوان کی خوشبو آ جاتی ہے اور ان کے ہاں کون، کون آیا ہے یہ بھی نظر آ جاتا ہے، کیوں ٹھیک ہے ناں.....

سوال: دیکر اور گشت کی بارشوں میں کیا فرق ہوتا ہے؟

جواب: وہی فرق جو جنوری اور جولائی کی بارشوں میں ہوتا ہے۔

☆ ہانسہ..... جہلم

سوال: اگر پہلی تاریخ روز آتی تو؟

جواب: روز جب گرم اور کیا۔  
☆ شازیہ ہاشم..... قصور

سوال: یاور کی قسمت میں خزیہ ڈوفا ہے بس.....؟

جواب: سفید حیات میں وفائے لازوال جن.....  
☆ صبغہ ہاشم..... قصور

سوال: م، ج، ب، ت..... نے توڑ دیا مجھے؟ آخر اُن کی وہ جو ہوئی.....؟

جواب: بچارے لفظ کو توڑ مروڑ کر کھسوگی تو یہی ہوگا ناں.....

☆ یاسمین اقبال..... لاہور

سوال: وہ کون سی قدیم بیماری ہے جسے حضرت آدمؑ

کے بعد پیدا کیا گیا؟

جواب: تم کیا آج کل بیمار یوں پر ریسرچ کر رہی ہو۔

سوال: ہم رات بہت روئے بڑی آہ و فغاں کی۔ دسو جی بھلا کیوں؟

جواب: دانت کے درد نے سونے نہ دیا ہوگا اور بھلا کیوں.....

سوال: کیا آپ مانتی ہیں کہ خوشیاں پیہوں سے نہیں خریدی جاسکتیں۔ اگر آپ کا جواب ہاں میں ہے تو کیا اپنے تمام پیسے میرے اکاؤنٹ میں جمع کروادیں گی؟

جواب: اگر جواب نہیں میں ہوں تو کیا تم ایسا کرو گی۔

سوال: عورت تو ہر لمحہ بچاری کہلاتی ہے، مرد بچارہ کب کہلاتا ہے؟

جواب: لمحے کے ہزاروں حصے میں، بس اتنی ہی دیر بچارہ رہتا ہے۔

☆ فرخندہ جعفری..... کجرات

سوال: انسان کے آنسوؤں اور مگر مچھ کے آنسوؤں میں کیا فرق ہے؟

جواب: ظاہر ہے جانور اور اشرف المخلوقات کے آنسوؤں میں فرق تو ہوگا ناں۔

سوال: دنیا داری بھانے کا کوئی ایک طریقہ بتائیں؟

جواب: اللہ کی خوشنودی کی نیت سے لوگوں کے کام آتے رہو سب طریقے آپ کی سمجھ میں آ جائیں گے۔

☆ نرگس نسیم..... صابہ موہڑہ

سوال: بی وی اور ٹی وی میں کیا فرق ہے؟

جواب: سمجھتی بہت پرانا سوال لائی ہو، ٹی وی کو تو سوچ آف کیا جاسکتا ہے مگر.....

سوال: پچھتی پچھتی آؤ نہیں تو.....؟

جواب: کی کرے گی کڑی پچھتی دس.....

سوال: آج میری جیٹھانی نے جو میرے چند بال بچے ہیں کچڑ کر؟

جواب: تیل لگا کر کس کر چٹیا بنا دی..... ہیں ناں۔

☆ ☆ ☆

## حسن نگہ چاہیے

پیاری، پیاری خوب صورت وحسین بہنوں کو مزید نکھار کے ہم گھریلو نئے بناتے ہیں۔ آپ ہمیں ہماری معلومات سے استفادہ کر رہی ہیں یہ تو اچھی بات ہے۔

موسم سرما کا آغاز ہو چکا ہے، اس کا مطلب ہے خشک و کھردری جلد کی شکایات بھی عام ہو گئی ہیں۔ بس جلدی سے مطلوبہ سامان مہیا کریں اور جلد کی حفاظت کے لیے تیار ہو جائیں۔

خشک میوہ جات کھائیں بھی اور دو تین اپنی جلد کے حیر دنی استعمال کے لیے رکھ لیں۔

☆ چار عدد بادام، دو عدد دوسھی خوبانی، (سمٹھلی نکال لیں) دو چمچ عرق کلاب، دو چمچ بکری کا کچا دودھ اور ایک چمچ جو کا آٹا (اوٹ میل) ہار یک پیس لیں۔ اور دن میں دو دفعہ اس کا لپٹے جگہ ہاتھوں سے کریں۔ پندرہ منٹ بعد ہلکے گرم پانی سے چہرہ اور ہاتھ دھو لیں، لہانے سے پہلے گردن پر بھی یہی عمل کریں۔

☆ رات کو چہرے کی کلیننگ کر کے زیتون کا تیل اور اگر میٹھے بادام کا تیل میسر ہو تو دو، دو چمچ دونوں کو ایک پیالی میں کس کر لیں اور چہرے ہاتھ، پیہر، گردن کا مساج کریں یہاں تک کہ جلد تمام چکنائی پی جائے صبح اٹھ کر نیم گرم پانی سے دھو لیں۔

نوٹ: (اکثر ہمیں کہتی ہیں کہ تہہ یا فجر میں وضو کے لیے مشکل ہوتی ہے تو نماز سے کچھ وقت پہلے اٹھ کر اپنے ریگولر فیس واش سے منہ ہاتھ دھو کر خشک کریں پھر وضو بنائیں۔ چکنائی نہیں رہے گی)

☆ زیتون کے تیل میں نمک ڈال کر ہاتھ پیہر پر اچھی طرح ملیں پھر صابن سے دھو لیں۔ کھردری جلد

نرم و ملائم محسوس ہوگی۔

## خشک بالوں کے لیے ٹوٹکا

چار چائے کے چمچ میٹھے بادام کا تیل، ایک چمچ شہد اور ایک انڈے کی زردی خوب پھیٹ کر یہ آمیزہ بالوں کی جڑوں میں لگائیں۔ دس منٹ تک پوروں سے مساج کریں پھر پلاسٹک کیپ یا گرم پانی میں بھگو یا ہوا تو لیا سر پر اچھی طرح لپیٹ لیں اور آدھے گھنٹے بعد شیمپو سے بال دھو لیں۔ بہترین نتیجہ آپ خود دیکھ لیں گی۔

دنی اور ایک انڈا خوب پھیٹ کر بالوں میں لگائیں اور آدھے پون گھنٹے بعد بال دھو لیں۔ تیز گرم پانی سے سردھونے اور نہانے سے گریز کریں۔

سردیوں میں نہانے سے پہلے روغن زیتون سے اگر جسم کی مالش کریں اور پھر نہائیں تو جلد پر خشکی نہیں ہوگی..... یہ عمل ہفتے میں ایک مرتبہ تو ضرور ہی کریں۔

خصوصی نسخہ از طرف فضاء بٹول، بہارہ کہو

مہ جبین باجی میں اپنی بہنوں کے لیے لیموں کا ایک نسخہ لائی ہوں۔ لیموں کا رس یا گودا اگر چہرے پر ملا جائے تو اس سے جھانیاں دور ہو جاتی ہیں۔ بشرطیکہ

چہرے پر دانے نہ ہوں۔ اگر یہ گودا دانتوں اور مسوڑھوں پر ملا جائے تو دانتوں کی پیلاہٹ دور ہوتی ہے اور اگر لیموں کے چھلکوں کو گیلیا ہی یا سکھا کر باریک

پیس کر کسی بھی کولڈ کریم میں ملا کر آنکھوں کے حلقوں پر لگایا جائے تو حلقے دور ہو جاتے ہیں۔

☆☆☆

یہ دونوں سورتیں پوری پڑھیں۔ پھر اپنے اوپر دم کر لیں۔ (بخاری مسلم۔ موطا وغیرہ) جسم کے دردوں اور عام شکایتوں کے لیے یہ وظیفہ بڑا موثر ہے۔

### جمعہ کے روز کثرتِ درود

حضرت ابو ہریرہؓ کی حدیث میں یہ نقل کیا گیا ہے کہ جو شخص جمعہ کے دن عصر کی نماز کے بعد اپنی جگہ سے اٹھنے سے پہلے اسی مرتبہ یہ درود شریف پڑھے۔

اللَّهُمَّ صَلِّ عَلَى مُحَمَّدٍ النَّبِيِّ الْأُمِّيِّ  
وَعَلَى آلِهِ وَسَلِّمْ تَسْلِيمًا اس کے اسی سال کے گناہ معاف ہوں گے اور اسی سال کی عبادت کا ثواب اس کے لیے لکھا جائے گا۔

### فضائل و فوائد

نقش و تعویذات کے مقابلے میں آیات قرآنیہ اور وہ دعائیں جو حدیث پاک میں وارد ہوئی ہیں یقیناً بہت زیادہ مفید اور موثر ہیں۔  
عملیات میں انہیں چیزوں کا اہتمام کرنا چاہیے۔  
فخر الرسل حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے دینی یا دنیاوی کوئی حاجت اور غرض ایسی نہیں چھوڑی جس کے لیے دعا کا طریقہ نہ تعلیم فرمایا ہو۔ اسی طرح بعض مخصوص آیات کا مخصوص مقاصد کے لیے پڑھنا مشائخ کے تجربات سے ثابت ہے۔

### مجرب عمل

”اگر کسی پر آسیب کا شہ ہو تو سورہ ہشر کی آخری چار آیات لکھ کر مریض کے گلے میں ڈال دیں اور پانی پر دم کر کے مریض پر چھڑک دیں اور اگر گھر میں اثر ہو تو ان آیات کو پانی پر پڑھ کر گھر کے چاروں گوشوں میں چھڑک دیں۔

اسی طرح سورہ حدید کے آغاز کی چار آیات کا ورد اپنا معمول بنالیں کہ جس میں زمین و آسمان کی منافی کا ذکر ہے۔

☆☆☆

کرے تو موزی جانور اور دشمن کے حملوں سے محفوظ رہے گا اپنے پاس رکھنے سے ہر قسم کے ضرر سے محفوظ رہے گا۔ صبح کی نماز کے بعد سات مرتبہ پڑھنے سے ہر قسم کے ضرر و نقصان سے محفوظ رہے گا۔ اور روزی کے دروازے دن بھر کھلے رہیں گے۔

### غم دور ہونے کی دعا

حضرت انسؓ سے روایت ہے کہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو کوئی امر غمگین کرتا تو آپ پڑھتے۔

یا حسی یا قیوم برحمتک استغیث  
(ترمذی)

اے سدا زنده، سب کو تھانے والے، ساتھ تیری رحمت کے فریاد کرتا ہوں۔

ملاحظہ: یہ بڑا مجرب اور مستجاب وظیفہ ہے اگر پانچ صد بار روزانہ صبح یا شام پڑھتے رہیں تو غم و اندوہ کے پہاڑ ٹکڑ ٹکڑ اور اللہ تعالیٰ کی رحمت سایہ فگن رہے۔

### سورہ بقرہ

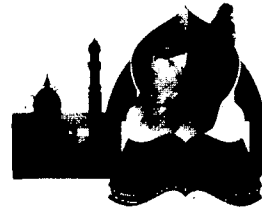
سورہ بقرہ کی ابتدائی آیات ہم المفلحون تک کا ورد اپنی حاجت کو ذہن میں رکھ کر ہر فرض نماز کے بعد پانچ مرتبہ کریں۔

### ہر درد کی دعا

جس شخص کو اپنے بدن میں درد یا کسی اور چیز کی شکایت ہو اسے چاہیے کہ دایاں ہاتھ درد کی جگہ پر رکھے اور پڑھے۔ بسم اللہ (تین بار) اور یہ دعائیں بار بار۔۔۔۔۔۔

اَعُوْذُ بِاللّٰهِ وَقُدْرَتِهِ مِنْ شَرِّ مَا اُجَدُّ اُحَاذِرُ  
پناہ مانگتا ہوں ساتھ اللہ کے غلبے کے اور اس کی قدرت کے اس کی برائی سے جو میں پاتا ہوں اور ڈرتا ہوں آئندہ کو۔

پھر قل اَعُوْذُ بِرَبِّ الْفَلَقِ قل اَعُوْذُ بِرَبِّ النَّاسِ



### ادارہ

## روحانی مشورے

الحرام (۴) مسجد نبویؐ اور مدینہ منورہ (۵) مسجد کوفہ (۶) بیت المقدس (۷) تمام مساجد (۸) مقابر شہداء صلحاء والوالدین۔

### آیت الکرسی کی فضیلت

حضور انور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا۔ اللہ کی کتاب میں سب سے اعظم آیت آیت الکرسی ہے۔ (مسلم شریف)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے ہیں۔ ہر چیز کے لیے زورۂ اعلیٰ و چوٹی ہے اور قرآن کے لیے ذورہ اعلیٰ و چوٹی سورہ بقرہ ہے اور اس میں ایک آیت ہے (آیت الکرسی) جو آیات کی سردار ہے (ترمذی)

حدیث انسؓ میں ہے کہ آیت الکرسی چہارم قرآن ہے (رواہ احمد)  
ہر فرض نماز کے بعد آیت الکرسی پڑھنے والا داخل جنت ہوگا (طبرانی)

سوتے وقت آیت الکرسی پڑھنے سے اللہ تعالیٰ اس کی، اس کی اولاد کی، اس کے گھر کی اور اس کے گھر کے ارد گرد سب گھروں کی حفاظت کرتا ہے اور جن کے مکرو فریب سے بچاتا ہے۔ (مشکوٰۃ)

### آیت الکرسی

اس آیت کا پڑھنا بہت ہی زیادہ اجر و ثواب کا باعث ہے۔ ہر نماز کے بعد اس آیت مبارکہ کا پڑھنا فراخی رزق کا باعث ہے۔ اگر روزانہ رات کو تلاوت

تمام اور ادو وظائف اپنی زبان پر لانے سے قبل اپنے دل و دماغ کو بدی، غیبت، طعنہ زنی اور بدگوئی سے ہر حال میں بچائیں تاکہ زبان میں تاثیر ہو اور دعائیں مستجاب ہوں پہلے اپنے مومن، مسلم بھائی کے لیے دعا کریں پھر اپنے لیے۔

### اوقات قبولیت دعا

کتاب کافی میں حضرت رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا ہے۔ بہترین وقت دعا وقت سحر ہے۔ اور حضرت امام علیؓ ابن ابی طالب فرماتے ہیں کہ دعا کے لیے چار اوقات غنیمت ہیں۔  
(۱) تلاوت کلام پاک کے بعد (۲) اذان کے وقت۔

(۳) بارش برسنے اور ہواؤں کے چلنے کے وقت اور علی الخصوص نصف شب کے بعد جو دعا کا بہترین وقت ہے

(۴) وقت جہاد جبکہ دونوں صفیں آپس میں ملیں۔

حضرت امام علیؓ ابن ابی طالب نے فرمایا ہے کہ جس وقت تم کو وقت طاری ہو تو اس وقت دعا کیا کرو کیونکہ جب تک خلوص نہ ہو وقت طاری نہیں ہوتی۔

### مقامات قبولیت دعا

کتاب تجتہ الدعوات میں ہے کہ دعا کی قبولیت کے بہترین مقامات مندرجہ ذیل ہیں۔

(۱) مسجد الحرام (۲) میدان عرفات (۳) مشعر



ہوں۔ برائے مہربانی میرا کوئی  
اچھا سا علاج تجویز کریں۔  
جواب: کھانے کے ساتھ

اور بعد پانی کا استعمال نہ  
کریں۔ کھانا اچھی طرح چبا کر کھائیں۔ مرغن اور بھاری  
کھانے سے پرہیز کریں۔ میٹھی، چٹ پٹی چیزیں، تلی  
ہوئی، بھنی ہوئی چیزیں اور ترش پھل بھی تیزابیت پیدا  
کرتے ہیں۔ اس لیے چیک کریں کہ کس چیز سے  
تیزابیت ہوتی ہے؟ غم، فکر بھی تیزابیت کا باعث بنتے  
ہیں۔ آپ ڈاکٹر ولما شوابے جرمنی کی Nux  
vomica Pentarkan Ptk 63 کے دس  
قطرے آدھا گلاس پانی میں دن میں تین مرتبہ لیں۔  
ایک ماہ بعد حال بتائیں۔

گردے کی پتھری

شہناز..... ضلع بدین

میرا مسئلہ یہ ہے کہ مجھے عرصہ 6 سال سے  
گردے میں بار بار پتھری بن جاتی ہے۔ پہلی مرتبہ  
جب پتھری ہوئی تو ہومیو پیتھک ڈاکٹر سے دوائی لی  
جس سے پتھری نکل گئی۔ سال کے بعد پھر بن گئی علاج  
کرایا پھر نکل گئی۔ پتھری تقریباً ہر سال ہو جاتی ہے۔  
آخری مرتبہ جب پتھری ہوئی تو الٹراساؤنڈ کرایا اس  
وقت تقریباً 2cm کی پتھری تھی دایں گردے میں۔  
اس وقت ڈاکٹر نے کہا کہ کوئی علاج نہ کروانا صرف  
آپریشن ہوگا۔ آخر تک ہو کر آپریشن کرایا۔ اب تقریباً  
دو سال ہو گئے ہیں آپریشن کو۔ اب دونوں گردوں  
میں درد اور کھنچاؤ رہتا ہے۔ یورین ٹیسٹ کرایا تو ڈاکٹر  
کہتے ہیں کہ اس میں کرسٹل نہیں آتے۔ بائیں گردے  
میں تقریباً پچھنے کے برابر پتھری ہے۔ برائے مہربانی  
کوئی اچھی سی دوائی تجویز کر دیں تاکہ پھر آپریشن نہ  
کرانا پڑے۔

جواب: گلتا ہے کہ آپ بھی علاج بے قاعدگی  
سے کراتی ہیں جسی تو پتھری بار بار بن رہی ہے۔ ٹیسٹیم کی

Magnesium Phos Pentarkan  
Ptk 60 کی ایک ایک گولی دن میں تین مرتبہ  
..... لیں۔

لیکچور یا

اقصی..... سکھر

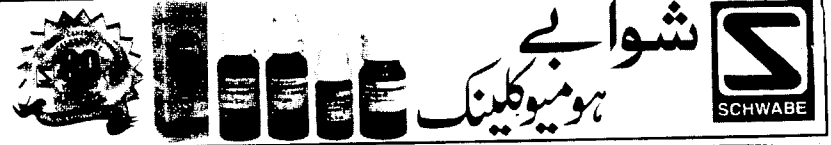
میرا مسئلہ لیکچور یا کا ہے۔ یہ تقریباً 14 سال سے  
ہے۔ میرا پیٹ بڑھ گیا ہے۔ میں نے لیکچور یا اور پیٹ  
کے لیے کافی دفعہ لیڈی ڈاکٹر سے بھی رابطہ کیا مگر دوائیوں  
سے وقتی طور پر افادہ ہوتا ہے پھر بعد میں پہلے سے بھی  
زیادہ ہو جاتا ہے۔

جواب: غم، فکر، ناقص غذا، پانی اور کچھ جسمانی  
تبدیلیاں جو وقت و عمر کے ساتھ ہوتی ہیں۔ جسم پر اثر  
انداز ہوتی ہیں۔ ہمیں لگتا ہے کہ آپ لگ کر علاج نہیں  
کراتیں، افادہ ہونے پر علاج چھوڑ دیتی ہیں۔ ایسا نہ  
کریں بلکہ مستقل مزاجی کے ساتھ علاج کریں ورنہ مسئلہ  
بچیدہ ہو جائے گا۔ ڈاکٹر ولما شوابے جرمنی کی مندرجہ  
ذیل ادویات استعمال کریں۔ Borax-30،  
Calc. carb-30، Pulsatilla-30  
ہریشی میں سے 7-7 قطرے آدھے کپ پانی میں ڈال  
کر دن میں 3 مرتبہ پیئیں۔ Magnesium  
Phos Pentarkan Ptk 60 کی ایک ایک  
گولی دن میں تین مرتبہ میں لیں۔ دو ماہ بعد کیفیت سے  
مطلع کریں۔

معدے کا مسئلہ

عبدالرحمان..... کراچی

میرا مسئلہ معدے کا ہے اور یہ تقریباً ۲ سال سے  
ہے۔ معدے میں درد ہوتا ہے۔ کھانے کے بعد کبھی فوراً  
اور کبھی کچھ دیر بعد جلن کی شکایت ہو جاتی ہے۔ کافی  
علاج کراچکا مگر فائدہ نہیں ہوا۔ ڈاکٹر اس کو معدے  
کا السر بتا رہے ہیں۔ الٹراساؤنڈ رپورٹ تھی کر رہا



اس بات کی ضرورت کافی عرصے سے محسوس کرائی جا رہی تھی کہ کسی مستند ادارے کے تحت ماہر تجربہ کار  
ہومیو پیتھک ڈاکٹروں کا بورڈ ہو جو لوگوں کی صحت کے مسائل کو اپنی ماہرانہ رائے اور تجربے کی روشنی میں نہ  
صرف حل کرے بلکہ ان کی رہنمائی بھی کرے۔ لہذا اس سلسلے کے تحت ہماری کوشش ہوگی کہ ہم آپ کو مختلف  
امراض کے متعلق آگاہی بھی فراہم کریں اور آپ کے جو صحت کے مسائل ہوں اس کو بورڈ کے ماہر و تجربہ کار  
ڈاکٹرز کے ذریعے حل کرائیں تاکہ آپ کا معیار صحت بلند ہو لہذا آپ کے جو بھی صحت کے مسائل ہیں انہیں  
ہمیں اس پتے پر لکھ بھیجیں، ڈاکٹر حامد جنرل ہومیو پرائیویٹ لیڈنگ آرام باغ روڈ کراچی 74200۔ ہم  
ماہنامہ پاکیزہ کے ذریعے آپ کی بیماری کے متعلق آپ کی رہنمائی کریں گے لیکن اس کے لیے اپنا مکمل نام،  
عمر، پتہ اور جو کام کرتے ہیں اس کے متعلق، ازدواجی حیثیت، بیماری کے متعلق، کب سے ہوئی، کیا علاج کیا؟  
کسی قسم کی کوئی رپورٹس ہوں تو اس کی فوٹو کا پی جو پڑھنے کے قابل ہوں ساتھ بھیجیں تاکہ صحیح تشخیص کی جاسکے  
اور دوا بھی صحیح تجویز ہو۔ (اپنے علاقے میں دوا نہ ملنے کی صورت میں ہم سے رجوع کریں)

ڈسمبر ۲۰۱۸

منیبہ..... فیصل آباد

مجھے ماہانہ ایام کے وقت النیاس شروع ہو جاتی ہیں

ٹوکن

برائے شوابے ہومیوکلینک

جنوری 2018ء

اپنا مسئلہ اس ٹوکن کے ساتھ روانہ کریں۔ ٹوکن کے  
بغیر آئے ہوئے مسئلوں پر توجہ نہیں دی جائے گی۔ اپنا  
مسئلہ جس مینے بھیجیں اسی مینے کا ٹوکن استعمال کریں۔

نام: \_\_\_\_\_

پتہ: \_\_\_\_\_



گولی یا اس کے مرکبات کے استعمال سے بھی پتھری بننے کے چانس بڑھتے ہیں۔ پورین آنے پر اس کو روکنے سے بھی پتھری بنتی ہے۔ پانی کا کم استعمال کیا جائے تو بھی پتھری بنتی ہے۔ کینیکیم کی گولیاں استعمال نہ کریں۔ پانی کم از کم 15 گلاس روزانہ پئیں۔ پورین جیسے ہی آنے ویسے ہی کریں روکنے کی عادت ترک کر دیں۔ کیلا، پالک، ٹماٹر، دودھ کا استعمال فی الحال نہ کریں۔ وزن نہ اٹھائیں۔ البتہ چلتی پھرتی ضرور رہیں بلکہ سیرھیال اتارنے چڑھنے کی ورزش کیا کریں۔ ڈاکٹر ولمار شوابے جرمنی کی مندرجہ ذیل ادویات ایک ماہ استعمال کریں پھر کیفیت سے مطلع کریں۔ Calc. carb-30 کے 7-7 قطرے ایک گلاس پانی میں جبکہ Berberis Pentarkan 15 کی ایک گولی تھوڑے پانی کے ساتھ دن میں تین مرتبہ لیں۔

### جوڑوں کا مسئلہ

#### ارسلان..... ضلع جھنگ

ڈاکٹر صاحب مجھے بچپن سے ہی گھٹنوں کے جوڑوں میں درد رہا ہے۔ جب میں ٹانگ ہلاتا تھا تو تک تک کی آواز آتی تھی اور مجھے سکون مل جاتا تھا۔ اب مجھے درد تو نہیں ہوتا البتہ اٹھتے اور بیٹھتے وقت گھٹنوں کے جوڑوں سے تک تک کی آوازیں آتی ہیں جیسے جوڑ کی دونوں ہڈیاں آپس میں رگڑ رہی ہیں۔ اٹھتے بیٹھتے وقت ایسا زیادہ ہوتا ہے۔ ڈاکٹر صاحب جلد از جلد مجھے اس کا علاج بتائیں۔

جواب: ارسلان قرآن و حدیث کا مطالعہ کیجئے۔ نماز کی پابندی کیجئے۔ اور پھر اپنی صحت کے لیے دعا کیجئے۔ غذا متوازن لیں۔ اپنے سونے جاگنے کا وقت مقرر کریں۔ بے مصرف کاموں میں وقت نہ گزاریں۔ ڈاکٹر ولمار شوابے جرمنی کی مندرجہ ذیل ادویات 3 ماہ

تک استعمال کریں اور پھر تمام حالت تفصیل سے لکھیں۔ Staphisagria-30, Calc. phos-30 کے 7-7 قطرے آدھے گلاس پانی میں ڈال کر دن میں 3 مرتبہ پئیں۔

### یادداشت کی کمزوری

#### یاسمین..... مالا کنڈ

میں انٹری طالب ہوں۔ مجھے پڑھا ہوا یاد نہیں رہتا۔ پیپر والے دن تو گھبراہٹ میں سب بھول جاتی ہوں۔ ماہنامہ پاکیزہ میں کرٹیکس (Cratex) کے بارے میں پڑھا۔ مہربانی فرما کر میری راہنمائی فرمائیں۔

۱: اس دوا کے کوئی منفی اثرات تو نہیں؟

۲: ایام کے دنوں میں استعمال کر سکتی ہوں؟

۳: کرٹیکس کب سے شروع کروں اور کب تک کھاؤں؟

۴: اس کی دوا قیمت؟

جواب: بی بی کی دواغی صلاحیت اور جسمانی نشوونما کو بڑھانے کے لیے کرٹیکس ڈاکٹر ولمار شوابے جرمنی کی ایک بے مثال دوا ہے۔ اس کے اب تک کوئی منفی اثرات مرتب نہیں ہوئے ہیں۔ ماہنامہ ایام کے دنوں میں بھی اس کو لیا جاسکتا ہے اس سے کوئی خراب اثر نہیں پڑتا۔ بلکہ قوت اور توانائی بڑھتی رہتی ہے۔ اس کو کم از کم ایک ماہ تک استعمال کریں۔ ایک ڈبے کی قیمت 420 روپے ہے جس میں 20 گولیاں ہوتی ہیں۔ صبح اور شام ایک ایک گولی تھوڑے پانی کے ساتھ لگیں۔ اس کے علاوہ Ancardium 30 شوابے جرمنی کے 5 قطرے دن میں تین مرتبہ لیں۔ 2 ماہ بعد کیفیت سے مطلع کریں۔

### آنکھوں کی کمزوری

#### اسامہ..... بھکر منڈی

میری بیٹی کی عمر ساڑھے پانچ سال ہے اسے

ڈیڑھ سال سے عینک لگی ہے۔ اس کے سر میں شدید درد ہوتا تھا اور سنی کی کیفیت ہوتی تھی۔ بائیں آنکھ کو لیزرھا کر کے دیکھتی تھی۔ اب یہ صورت حال ہے کہ ہر چھ ماہ بعد نظر چیک کروانے پر پہلے سے کمزور رہی نکلتی ہے۔ اس کے علاوہ وہ ہر بات کی ٹینشن لیتی ہے اور چھوٹی چھوٹی باتوں کو خود سے سوار کر لیتی ہے۔ حد سے زیادہ حساس ہے۔ برائے کرم ایسی دوا تجویز کریں جو نہ صرف نظر کو ٹھہرنے میں مدد دے بلکہ نظر بہتر بھی ہو جائے۔ شکریہ۔

جواب: بچی کو صبح سویرے سورج نکلنے ہوئے باغ کی سیر کرائیں۔ نہار منہ سوف، مصری، بادام سب کو ہم وزن لے کر پیس کر رکھ لیں اور روزانہ ایک کھانے کا چمچ کھلا کر دودھ ایک پیالہ پلا دیں۔ گاجر کا استعمال خوب کرائیں۔ ڈاکٹر ولمار شوابے جرمنی کی درج ذیل ادویات تین ماہ تک استعمال کرائیں۔ Physostigma 30, Calc Phos 30, Calc. Flour 30 کے 5,5 قطرے آدھا گلاس پانی میں دن میں تین مرتبہ استعمال کرائیں۔

### نسوانی بیماریاں

#### روحانہ الماس..... راولپنڈی

کافی عرصے سے پاکیزہ میں آپ کا کالم پڑھ رہی ہوں۔ سوچا آج اپنا مسئلہ بلکہ مسائل آپ کو لکھوں۔ چہرے پر دانے اور داغ دھبے ہیں، میری..... پیٹھ پر بھی دانے ہیں جن کی وجہ سے زیادہ دیر بیٹھنے سے جلن ہونا شروع ہو جاتی ہے۔ معدے کا مسئلہ، بالوں کا گرنا، سفید ہونا، دبلا پتلا جسم بالکل ہڈیاں ہیں گوشت بالکل بھی نہیں، نسوانی حسن بھی بالکل نہیں۔ خون کی کمی اور کینیکیم کی کمی بہت کمی ہے۔ بلڈ ٹیسٹ، الٹرا ساؤنڈ، وغیرہ کی رپورٹس بھیجوا رہی ہوں۔ کوئی کریم یا میڈیسن بتا دیں۔ چہرے اور جسم کے لیے بھی دوا تجویز کر دیں۔ آپ کی بہت نوازش

ہوگی۔

جواب: اللہ تبارک و تعالیٰ

کی ذات سے یاپوس نہیں ہوتا

چاہیے۔ اگر ہم صحیح تشخیص کر کے

صحیح قسم کا علاج کریں (ہومیوپیتھک) تو کوئی وجہ نہیں

کہ مرض سے نجات نہ ملے۔ ہاں صحت کے اصولوں کی

پابندی یقیناً صحت اور حصول صحت کے لیے شرط ہے۔

متوازن غذا کا استعمال کریں۔ لال گوشت (بکرا،

گائے) ٹماٹر، پالک، سلاد، کدو، چھولے، آم، چیری،

قالہ، آلو بخارا سیب، انار سنگترہ وغیرہ کا بھرپور

استعمال کریں۔ صبح سویرے انھیں۔ نمازوں کی پابندی

کریں۔ کوشش کریں کہ صبح کی نماز کے بعد کسی باغ میں

چہل قدمی کریں۔ پانی کا استعمال زیادہ سے زیادہ

کریں۔ کم از کم 12 گلاس روزانہ پئیں۔ کھانے سے

پہلے اور کھانے کے دو گھنٹے بعد پانی کا استعمال کریں۔

شریت اور کولڈ ڈرنکس بالکل استعمال نہ کریں ان سے

بھی دانے نکلتے ہیں۔ البتہ ستو، لسی اور تازہ پھلوں کے

جوس مفید ہیں۔ ڈاکٹر ولمار شوابے جرمنی کی مندرجہ ذیل

ادویات استعمال کریں۔ Calc. sulph-30،

Ferrum met 30 کے 5-5 قطرے آدھے

گلاس پانی میں ڈال کر دن میں 3 مرتبہ پئیں۔ جبکہ

Alfalfa-Ø کے 11 قطرے ہر کھانے کے بعد

آدھے کپ پانی میں ڈال کر دن میں 3 مرتبہ استعمال

کریں۔ Asa foetida Petarka Ptk 12،

Nux vomica Pentarkan Ptk 63 کے دس قطرے تھوڑے سے پانی میں ڈال کر دن

میں تین مرتبہ پئیں۔ دو ماہ بعد کیفیت سے مطلع کریں۔

### سفید بال

میرا مسئلہ یہ ہے کہ میرے سر کے تقریباً 80%

بال سفید ہو چکے ہیں۔ بال بھی گرتے ہیں جس کی وجہ

سے میں بہت پریشان ہوں۔ آپ پلیز کوئی اچھی سی دوا

تجویز کریں کہ میرے بال کالے ہو جائیں اور گرنا بھی

دن میں 3 مرتبہ چبا کر کھائیں Cinnabaris  
Pantarkan Ptk-31، 10 قطرے آدھے  
کپ سادہ پانی میں دن میں 3 مرتبہ لیں Spigelia  
Pantarkan- Ptk-81 کے۔ ایک ماہ بعد

دوبارہ حال بتائیں۔  
جوڑوں کا درد

سلطانہ بیگم..... راولپنڈی

40 ڈیڑھ ساری دعاؤں کے بعد عرض ہے کہ 40 سال ہو گئے ہیں میرے جوڑوں میں درد ہوتا ہے جس کی وجہ سے آہستہ آہستہ میرے ہاتھوں کی انگلیاں ٹیڑھی ہونے لگی ہیں..... اب تو مکمل ہاتھ ٹیڑھے ہو گئے ہیں۔ ہاتھوں سے میں کوئی کام بھی نہیں کر سکتی۔ یوڑھی ہوئی ہوں مگر کتا میں پڑھنے کا ابھی بھی بہت شوق ہے۔ بچپن سے رسالے پڑھنے کا شوق ہے۔ میری نظر بھی کمزور ہے۔ ایک آنکھ کا آپریشن کروایا ہے دوسری آنکھ کا ابھی کرانا ہے۔ سالوں سے یہ حالت ہے کہ کچھ دور تک چلتی تھی تو تھک جاتی تھی، کسی اونچی جگہ پر بیٹھ جاتی تھی، نیچے بھی نہیں بیٹھ سکتی کہ گھٹنے ٹیڑھے نہیں کر سکتی تھی پھر آہستہ آہستہ یہ ہونے لگا کہ نچلے دھڑنے.... کام کرنا چھوڑ دیا۔

جواب۔ اللہ آپ کو صحت دے۔ آپ ڈاکٹر ولمار شوابے جرمنی کی Rhus  
toxicodendron Ptk-73 15 قطرے  
ہر 3 گھنٹے بعد لیں، Kali، Calc.Carb-30  
Phos-30 کے 7.7 قطرے دن میں 4 مرتبہ لیں،  
تین ماہ بعد طبیعت سے دوبارہ مطلع کریں۔

☆☆☆

رک جائیں۔  
جواب: غم، فکر، ناقص غذا، پانی غیر معیاری،  
شیپو، تیل اور کچھ جسمانی تبدیلیاں جو وقت و عمر کے  
ساتھ ہوتی ہیں بالوں پر اثر انداز ہوتی ہیں۔ پھلوں  
سبزیوں اور گوشت کا استعمال بڑھائیں۔  
ڈاکٹر ولمار شوابے جرمنی مندرجہ ذیل ادویات

Cantharis 30، Lycopodium-30  
کے 5.5 قطرے آدھا گلاس پانی میں دن میں تین مرتبہ  
استعمال کریں۔ ایک ماہ بعد حال بتائیں۔

ناک کا گوشت

کا مران ندیم..... بوہڑے والا

مسئلہ نمبر 10 تقریباً 10 سال کی عمر میں میری ناک  
میں بائیں جانب غدود ہو گئے تھے۔ جیسے جیسے بڑا ہوتا  
گیا میرے سر میں درد رہنے لگا۔ دوسرا مسئلہ تقریباً ۴  
سال سے گرمیوں میں میرے پورے منہ میں چھالے ہو  
جاتے ہیں اور شدید درد ہوتا ہے۔ دوائی کھاتا رہوں تو  
ٹھیک رہتے ہیں۔ دوائی چھوڑ دوں تو پھر چھالے بن  
جاتے ہیں۔ اور تین چار سال سے سینے میں بھی درد رہتا  
ہے۔ E.C.G. کرائی تو ڈاکٹر نے کہا کہ گیس کا درد  
ہے۔ ٹھیک ہو جائے گا۔ 24 گھنٹے ہلکا، ہلکا سرد درد رہتا  
ہے۔ سرد درد کے لیے پیناڈول ایکسٹرا کی گولی کھاؤں تو  
کچھ دیر کے لیے آرام ہو جاتا ہے۔ جب تیز ہوا چلتی  
ہے تو سانس بھی رک جاتی ہے۔ عرصہ تقریباً دو تین سال  
سے دائیں ناک میں گھٹنے سے لے کر ہیر کے اوپر تک  
درد ہوتا ہے۔

جواب۔ آپ نفسیاتی ہوتے جا رہے ہیں۔ نزلے  
کا مسئلہ ہے، ٹھنڈی، کھٹی چیزیں، شربت، کولڈ ڈرنکس  
وغیرہ سے بچیں۔ ڈاکٹر ولمار شوابے جرمنی کی 2 گولیاں



**Dr. Willmar Schwabe Germany**

Available at All Medical & Homoeopathic Stores

شوابے سنگل ریمیڈیز گھر بھر کی صحت کے لیے کلاسیکل ہومیوپیتھی